صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
جمالِ رسول
جذبۂ عشق رسولؐ میں ڈوبی ہوئی ایک عالمانہ تحریر
— نذرِ عقیدت —
شمسِ شریعتِ محمدیہ مہرِ طریقتِ سہروردیہ
حضرت مولینا الحاج سید ابوالفیض قلندر علی سہروردیؒ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

جمالِ رسول

— نذرِ عقیدت —

شمسِ شریعتِ محمدیہ مہرِ طریقتِ سہروردیہ

حضرت مولٰینا الحاج سید ابوالفیض قلندر علی سہروردی رح

۱۳۱۴ھ — ۱۳۷۷ھ

اورینٹل پبلی کیشنز

35-رائل پارک، لاہور فون: 36363009

بیادِ: حجۃ العارفین غریب نواز حضرت میاں غلام محمد سہروردی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۳۷۱ھ/۱۹۵۱ء)

حیات گڑھ کھیوا، گجرات (پنجاب) شیخِ کریم حضرت سید ابوالفیض قلندر علی سہروردی رحمۃ اللہ علیہ

دوران اشاعت فہرست سازی:

سہروردی، سید قلندر علی (۱۳۷۸ھ-۱۹۵۸ء)

جمال رسول

لاہور، اورینٹل پبلی کیشنز پاکستان، ۲۰۰۹ء، ۳۸۴ ص

ا-عنوان: I سیرت، II سوانح، III شمائل نبوی

ISBN: 969-8461-04-7

جمالِ رسول ﷺ

مولفہ: شیخ الاسلام حضرت سید ابوالفیض قلندر علی سہروردی رحمۃ اللہ علیہ

بسعی واہتمام: سیّد اویس علی سہروردی (کمترین از بندگانِ سیدنا ابوالفیض قلندر علی سہروردی رحمۃ اللہ علیہ)

پروف خوانی: احسان الحق خاور سہروردی (مؤلف: تذکرہ وملفوضات ابوالفیض قلندر علی سہروردی، یادگار سہروردیہ)

ترتیب اشاعت: (سن وار) 1950ء، 1953ء، 1991ء، 2002ء

اشاعت پنجم: (موجودہ) ۱۴۳۳ھ/2012ء **طبع:** حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹر، لاہور

حروف نگاری: گرافک اِن، فون: 042-36363009

صفحات: 400

قیمت: =/800 روپیہ =/15 ڈالر

اورینٹل پبلی کیشنز

35-رائل پارک، لاہور فون: 042-3636 3009

اس کتاب سے حاصل شدہ جملہ آمدن معارفِ سہروردیہ عام کرنے پر صرف ہوتی ہے

اِنتساب

فقیر اپنی اِس ناچیز تالیف موسومہ بہ

''جمالِ رسول'' کو بصورتِ نذرِ عقیدت

براہِ راست، بغیر درمیانی واسطوں کے

حضور سید المرسلین افضل النبیین رحمۃً للعلمین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے بلند و بالا اور لاثانی دربار میں پیش کرتا ہے۔

ع گر قبول افتد زہے بخت و نصیب

فہرست مضامین

اِلتجا

اے بادشاہوں کو بادشاہت عطا فرمانے والے، غریبوں کی غریبی پر ترس کھانے والے
امیروں کو ثروت و امارت بخشنے والے اور بے آسرا دکھیاروں کی پکار کو سننے والے واحد و قدوس خدا
ایک خاطی و عاصی بندہ پکارنے کی تمنا رکھتا ہے. اُس کو توفیق رفیق عطا فرما!
کہ وہ تجھے دل کی اُس گہرائی سے جو اخلاص وللہیّت کا مسکن
اور روح کے اُس عمق سے جو تیرے خوف وخشیت کا مخزن ہو، پکارے.
تو وہ داتا ہے، جو ہر پکارنے والے کی پکار کو سن کر ہمیشہ اُس کے استحقاق سے زیادہ
اُس کے دامن مراد کو بھرتا ہے.

اِس سائل کی روح کانپ رہی ہے اور خطا کار کا ایک ایک ریشہ لرز رہا ہے کہ زندگی کا کوئی نیک عمل
اور عمر بھر کا کوئی مستحسن کارنامہ نہیں جس کی امید پر ایسی عظیم وجلیل دولت کی شمع لے کر
تیری بارگاہِ فضل وعطا میں کچھ لب کشائی کر سکے.
مگر یاس وقنوط کی افسردگیوں میں صرف ارشادِ لَا تَقْنَطُوْا کی ڈھارس ہی جرأت کراتی ہے
کہ آس کا دامن پھیلا اور غنی وکریم آقا سے مانگ، وہ ذرّہ نواز ہے.
نعائم کے خزانے بے منّت وبے استحقاق جس پر چاہتا ہے کھول دیتا ہے.

پس اُس رحمتِ لا متناہی کے صدقے اِس ذرۂ ناچیز کو اپنے حبیبِ پاک صاحبِ لولاک،
متصرفِ افلاک کے بیانِ رفعتِ ذکر کی وہ وسعت وپاکیزگی عطا فرما کہ
جس کو سندِ دوام کے ساتھ قبولیّتِ تام بھی حاصل ہو اور اِس تذکرۂ حبیب میں وہ تاثیر واثر دے
کہ اِس کے ہر قاری وناظر کا قلب تیرے اور تیرے محبوب کے عشق سے معمور ہو جائے.

یا صاحب الجمال و یا سید البشر

من وجهک المنیر لقد نور القمر

لا یمکن الثناء کما کان حقہ

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

۱۳۵۱ھ

عبدالمجید پرویں رقم

حمد

تمام حمد ہر حامد سے، ہر زمانہ میں اُسی ذاتِ معبود و محمود
جَلَّ وَعَلا شانہٗ کے لیے ہے.

جو چشم جہاں میں شاہد و مشہود اور قبلہء جاں میں موجود و مسجود
بے گوش و زباں اور بے ظن و نشان معہود و مقصود ہے.

اُسی کی بارگاہِ کریمی میں التفاتِ دلِ عشّاق اور اُسی کی نظرِ رحیمی
کی اسیر جانِ مشتاق ہے.

وَهُوَ اللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَا شَرِيْكَ لَهٗ
شَهَادَةَ اَشْهَدُ بِهَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ

بَلَغَ العُلیٰ بِکَمَالِہٖ
کَشَفَ الدُّجیٰ بِجَمَالِہٖ
حَسُنَت جَمِیعُ خِصَالِہٖ
صَلُّوا عَلَیہِ وَآلِہٖ

نعتِ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم

اے حبیبِ کبریا اے منبعِ جُود و صفات
باعثِ تکوینِ عالم مرکزِ کل کائنات

ہو گیا پیدا تیری خاطر نظامِ ہست و بود
بارگاہِ حق میں ہے مقبول کتنی تیری ذات

تو نہیں، کچھ بھی نہیں، تو ہے تو سب موجود ہے
تیرے ہی دم سے ہوا قائم وجودِ شش جہات

کیوں نہ ہم سمجھیں محبت کو تری، ایمانِ اصل
جب اسی اک بات پر موقوف ہے اپنی نجات

جس کے منہ میں پڑ گیا اک مرتبہ تیرا لعاب
اُس نے ٹکڑے کر دیا پیمانۂ آبِ حیات

تو نے فرمایا ھُوَ اللّٰہُ اَحَد دُنیا میں جب
سر بسجدہ تیرے قدموں میں گرے لات و منات

ریزہ چیں تیری بساطِ حسن کے شمس و قمر
اے مجسّم نورِ حق!، اے مشعلِ کُل کائنات!

عاصیوں کو ناز ہو کیوں کر نہ تیری ذات پر
مانی جائے گی تری، محشر کے دن ہر ایک بات

تیرے نورِ پاک سے ضو ریز مہر و ماہ ہوئے
تیرے حسنِ لم یزل کی اس طرح نکلی زکات

مرجعِ خلقِ خدا ہے تیری ذاتِ باصفا
ہو ریاضؔ دل حزیں پر بھی نگاہِ التفات

مقصدِ کتاب

معترض کے لیے یہ کہنا کافی ہے کہ وہ بلاتحقیق اپنی نکتہ چینی کو حرکت نہ دے. فقیر نے یہ کتاب ایسے شخص کے لیے نہیں لکھی، جو سرورِ کائنات مختارِ شش جہات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا منکر، معجزات میں طعنہ زن، معیّن آثار ونشانات سے منحرف، وقیع خصائل وجمیع کمالات سے روگرداں اور خصائصِ کبریٰ وفضائل عظمیٰ میں شک وشبہ کرنے والا ہو، اگر معترضین کے لیے ہوتی تو اس میں دفع اعتراضات پر وہ دلائل قائم کیے جاتے جن سے ایسے لوگوں کے اقوالِ باطلہ واعتراضاتِ واہیہ کا خاتمہ ہو جاتا. لہٰذا اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے اہل محبت کے لیے ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر دعوت پر لبیک کہنے والے اور نبوّتِ مختتمہ ورسالتِ تامہ کی تصدیق کرنے والے ہیں تاکہ ان کی محبت میں تاکید، ایمان میں مضبوطی اور اعمال میں زیادتی ہو.

خداوندِ عالم جلّ مجدہٗ اس امر پر قادر ہے کہ وہ نبوّتِ محمدیہ علیہا الصّلوات وتسلیمات کے اس روشن پہلو ہی سے لوگوں کے دلوں میں وہ نورِ معرفتِ نبوّت پیدا فرما دے جو بغیر کسی واسطہ کے ان کو اس کا اہل بنا دے اور وہ بے ساختہ بول اٹھیں.

خدا کو مانا ہے دیکھ کر تجھ کو، اُس کی شانِ جمیل تُو ہے
خدا کی ہستی پہ میرے نزدیک، سب سے روشن دلیل تو ہے

ولادتِ آنجناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم

حضور پُر نور شافع یوم النشور صلی اللہ علیہ وسلم ۱۲ ربیع الاوّل مطابق ۲۰ اپریل ۵۷۱ء کو کتمِ غیب سے منصۂ شہود پر جلوہ افروز ہوئے اور پوری کی پوری کائنات نے اس ظہورِ قدسی پر بصد ادب واحترام سر جھکا لیا. فضائے بسیط میں ایک شورِ مسّرت وشادمانی بلند ہوا کہ وہ مختار نبی آ گیا جو کفر وشرک کی ظلمتوں کے طلسم کو توڑ کر رکھ دے گا. وہ باعثِ تخلیقِ کائنات تشریف لے آیا. جو ایک دنیا کو خارزارِ غم والم سے نکال کر آرام وراحت کے فردوس میں پہنچا دے گا. وہ پھول کھلا جس کی نگہت بیزیاں اور تر دستیاں مشامِ عالم کو معطر اور معنبر کر دیں گی. وہ ہادی نمودار ہوا جس کی تعلیم وتلقین تا قیامِ قیامت مخلوقِ خدا کو ہدایت ونجات کی سند دیتی رہے گی. وہ آفتابِ قطب نکلا جس سے اس جہانِ آب وگِل کا ذرّہ ذرّہ قدوسیوں کے ساتھ مل کر اس نورِ ایزدی کی درخشانیوں سے ابدی طور پر کسبِ ضیا کرتا رہے گا اور دنیا کی ماسوا پرستی خدا پرستی سے بدل جائے گی. غلام وآقا برابر اور شاہ و گدا ہمسر ہو جائیں گے. ویرانے گلستان اور دیوانے علم وحکمت کے پاسبان نظر آئیں گے. ہر متکبر کی کبریائی کو اس کے فقیر اور ہر فرعونِ بے سامان کی باطل خدائی کو اس کے نخچیر ٹھکرا دیں گے.

صَلُّوْا عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ

(مقتبس از معارف)

میلاد نامہ منظوم

دو عالم تجھ پہ صدقے اے زمینِ گنبدِ خضرا
تری آغوش میں آسودہ ہے وہ برزخِ کبریٰ

وہ جس کی ذاتِ والا اک نویدِ رحمتِ عالم
وہ جس کا روئے زیبا شمع ظلمت خانۂ دنیا

وہ جس کا نُطق شیریں، نغمۂ الہامِ ربّانی
وہ جس کا خُلق نوشیں، شہد سے بڑھ کر حلاوت زا

وہ جس کی ہستیٔ اقدس، سراپا معنیٔ قرآن
وہ جس کا ہر نفس، وقفِ پیامِ ملتِ بیضا

وہ جس کے درگہِ سامی کا جبریلِ امیں چاکر
وہ جس کے عتبۂ عالی پہ قدسی، ناصیہ فرسا

وہ جس کے آستاں پہ رفعتِ عرش بریں صدقے
وہ جس کے بوستاں میں نغمہ پیرا بلبلِ طوبےٰ

وہ جس کے عالمِ جاں میں نوائے قدس برق افشاں
وہ جس کے ذوقِ ایماں میں پیامِ شوق، شور افزا

وہ جس کے قدسیان پاک گوہر، دید کے طالب
وہ جس کے نوریانِ عرشِ اعظم، والا و شیدا

وہ جس کی مدحتِ خوبی میں ہے رطبِ اللساں قرآں
وہ جس کی شانِ محبوبی ہے سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْریٰ

وہ جس کے خم کدہ کے، حضرتِ فاروق صہبائی
وہ جس کے گل کدہ کے حضرتِ صدیق، اک طوبیٰ

وہ سرشارِ مئے باقی، تصدّق جس پہ مے خانہ
وہ ساقی، جس کے دم سے ضوفشاں خمخانۂ بطحا!

وہ جس کے بادہ نوشوں میں، بلالؓ و بوذرؓ و سلمانؓ
وہ جس کے سرفروشوں میں ابنِ زیدؓ و سید الشہداؓ

وہ جس کی موجِ مۓ میں جلوہ پیرا برقِ سینائی
وہ جس کا تا ابد باقی خمارِ نشۂ صہبا!

وہ جس کا نقشِ پا سجدہ گہِ مہر و مہِ کامل
وہ جس کا داغِ سیما مطلعِ نورِ سحر گویا

وہ جس کی برقِ ایماں بیقرارِ جلوۂ ایمن
وہ جس کا ذوقِ عرفاں، زندہ دارِ خلوتِ شبہا

وہ جس کے بوریا پر سطوتِ تختِ شہی قرباں
وہ جس کے فقر سے لرزاں، شکوہِ قیصر و کسریٰ

محمدؐ وہ، کمالِ آخرینِ محفلِ عالم
محمدؐ وہ، جمالِ اوّلینِ شاہدِ معنیٰ!

محمدؐ وہ، نسیمِ نوبہارِ گلشنِ ہستی
محمدؐ وہ، شمیمِ مشک بارِ جنت الماویٰ

محمدؐ وہ، شبستانِ ازل کی شمع نورانی
محمدؐ وہ، زِ سرتاپا جمالِ جلوۂ سینا

محمدؐ وہ، دُرِ تاجِ الرُّسل، وہ خاتمِ المُرسَل
محمدؐ وہ، ظہورِ نورِ کُل، وہ جلوۂ یکتا

محمدؐ وہ، گروہِ اولیاء کے سیّدِ والا
محمدؐ وہ، کلاہِ انبیاء کے طرۂ زیبا

محمدؐ وہ، نبوت کے شرف کے مبداءُ و خاتم
محمدؐ وہ، رِسالت کی صدف کے لولوئے لالا

محمدؐ وہ، شہنشاہِ دو عالم، سرورِ انجم
محمدؐ وہ، مہِ دوہفتۂ یثرب، شہِ بطحا!

محمدؐ وہ، نویدِ لطفِ عام و رحمتِ عالم
محمدؐ وہ، پیامِ نو بہارِ گلشنِ دنیا

محمدؐ وہ، سحابِ رشحہ بارِ مزرعِ گیتی
محمدؐ وہ، شبابِ روزگارِ ملتِ بیضا

محمدؐ وہ، بہارِ تازۂ باغِ براہیمی
محمدؐ وہ، چمن پیرائے باغِ ملّتِ آباء

وہ خورشیدِ ضیاء بارِ عرب جس کی تجلّی سے
عرب کا ذرّہ ذرّہ آسمانِ قدس کا تارا

وہ رشکِ مہرِ عالمتاب جس کی جلوہ ریزی سے
شبستانِ جہاں میں پھر ہوا نورِ سحر پیدا

ہوا پھر مطلعِ انوارِ ظلمت خانۂ عالم
سرِ فاراں جو ماہِ ضوفشانِ مصطفٰے چمکا

سیاہی ہو گئی کافور یکسر شامِ ظلمت کی
صبا لائی پیامِ نور پھر صبحِ سعادت کا

نئے اندازِ بیداری سے کروٹ لی زمانے نے
خمارِ خوابِ نوشیں سے یکایک جاگ اُٹھی دنیا

جہاں کے گلشنِ پژمردہ میں تازہ بہار آئی
رگِ افسردۂ ہستی میں خونِ زندگی دوڑا

دلِ بے نور میں رخشاں ہوئی پھر شمعِ ایمانی
یہ خاکستر ہوئی پھر سوزِ ایماں سے شرر افزا

نگاہِ معرفت پیدا ہوئی پھر دیدۂ دل میں
عطا ہر کور باطن کو ہوئے پھر دیدۂ بینا

عرب کی وادیاں تکبیر کے نعروں سے گونج اٹھیں
ہوا عالم میں آوازہ بلند، ''اللہ اکبر'' کا!

زبانِ کفر، وقفِ کلمۂ حق ہو گئی یکسر
زمیں سے آسماں تک غلغلہ توحید کا اٹھا

فضائے کفر و باطل ہو گئی پر شور شیون سے
نوائے اہلِ دل سے ہو گئی معمور پھر دنیا

جھکا دیں گردنیں اربابِ طُغیانِ تمرّد نے
ہوئے نام آورانِ کفر، اک اک بندۂ مولا

ہر اک کافر بڑھا لبیک کہہ کر دعوتِ حق پر
ہر اک منکر نے مضبوطی سے پیمانِ وفا باندھا

فدایانِ محمدؐ بن گئے، جو دشمنِ جاں تھے
تہِ تیغِ محبت ہو گئی یکسر، صفِ اعدا

کہیں لطف و محبت تھی، کہیں تہدید و شدت تھی
کہیں شانِ جمالی تھی، کہیں فرِّ جلالی تھا

جہاں کے گوشہ گوشہ میں صدائے دین حق پہنچی
لوائے حق پرستی مشرق و مغرب میں لہرایا

دیا علم و عمل سے درسِ آئینِ جہانبانی
پڑھایا پھر سبق دنیا کو تدبیر و سیاست کا

''شتربانی'' بھی کرتے تھے، ''جہانبانی'' بھی ہوتی تھی
ابھی وہ بینوا تھے، اور ابھی تھے وہ جہاں آراء

ہوا سکّہ رواں عدل و مساوات و اخوّت کا
ہوئی پھر از سرِنو مجلسِ صدق و صفا برپا

فضائل سے ہوئی آراستہ پھر بزم انسانی
محاسن کا بنی گہوارہ پھر، یہ فسق کی دنیا

دلوں کی خشک کھیتی لہلہائی جوشِ باراں سے
سدا بُستانِ جاں میں چشمہ پھوٹا، نورِ عرفاں کا

شرف بخشا گیا انسانیّت کو پھر سعادت کا
بلند اِس دور میں پایہ ہوا، پھر آدمیّت کا

مِٹی ظلمت سرائے دہر سے لعنت غلامی کی
زمانہ سے اُٹھی، رسمِ تمیزِ بندۂ و آقا

جسے دیکھو وہ اب سرشارِ صہبائے اخوّت ہے
جسے دیکھو وہ اب ہے بادۂ وحدت کا متوالا

ہوا ختم آہ وہ دورِ شرابِ مجلسِ دوشیں
نہ وہ ساقی ہے اب باقی، نہ وہ خمخانہ بطحا!

کہاں وہ عہد سرشاری، کہاں یہ دورِ محرومی
کہاں کیفِ مئے عرفاں، کہاں رنجِ خمار افزا

وہی مینا ہے اب بھی، پر نہیں وہ بادۂ رنگیں
وہی صہبا ہے اب بھی، پر نہیں وہ شورشِ صہبا

کرے گو دورِ گردوں لاکھ اپنی سعیِ امکانی
پلٹ کر پھر کبھی وہ عہدِ اقدس آ نہیں سکتا

نہ دیکھی ہوگی چشمِ آسماں نے بزمِ قدس ایسی
سنے ہوں گے نہ عالم نے یہ نغماتِ طرب افزا

نہ پائے گا زمانہ پھر کبھی، مجدّ و شرف ایسا
نہ ایسی پھر سعادت دیکھے گی، یہ دیدۂ دنیا

مظاہر تھے یہ سارے رحمت اللعالمینی کے
کرشمے تھے یہ سب، بس آپؐ کی لطف آفرینی کے

اجمالِ صفات

اِس کائناتِ آب وگل میں ہر پیدا ہونے والے انسان کا کوئی نہ کوئی ایک نام پیدائشی اور زیادہ بھی بطورِ کنیت وخطاب کے مشہور ہوتے ہیں جنس میں بعض سے محض ایک وقتی فوقیت وفضیلت کی تشہیر مراد ہوتی ہے اور بعض سے صرف پکارنے کا کام لیا جاتا ہے مگر اُن افراد میں ناموں کے لحاظ سے معنوی واقعیت وحقیقت بہت کم پائی جاتی ہے بلکہ یوں سمجھئے کہ ہوتی ہی نہیں. آج ناموں کے لحاظ سے تو لاکھوں علی، حسین، حسن، احمد، خالد، طارق وغیرہ وغیرہ نظر آئیں گے. مگر اُن کے یہ اسماء محض شناخت تک محدود ہوں گے اور اپنی صفاتِ عملیہ سے جو اُس نام سے متعلق ہیں کوسوں دور۔ چونکہ یہ بات زبان زد خلائق ہے کہ اچھے ناموں میں بلحاظ اپنی تاثیرات کے ہزاروں برکات سے انسان بہرہ مند ہوتا ہے اِس لیے نام اچھے رکھنے چاہیں مگر اُن کی حقیقتِ معنوی کا ورود اور تاثیرات کا ظہور بہت کم پایا جاتا ہے۔ سعادت ازلی اور چیز ہے اور نام نہاد تفوق اور۔

کتبِ تاریخ میں لکھا ہے کہ آنحضور سرورِ کائنات، فخرِ موجودات، مختارِ شش جہات صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے قبل جب یہ بات مشہور ہوگئی کہ ایک نبیُ رحمت، بنی آخر الزمان عنقریب دنیا میں تشریف لانے والے ہیں. جن کا اسمِ پاک محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہوگا تو عرب میں بعض لوگوں نے اپنے بچوں کا نام محمد صلی اللہ علیہ وسلم رکھنا شروع کردیا کہ شاید وہ وجود باجود ہمیں میں سے پیدا فرمادیا جائے. مثلاً چھ بچوں کے نام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے قبل رکھے جاچکے تھے. جو یہ ہیں. (۱) محمد بن احیحہ بن الجلاح الاوسی، (۲) محمد بن سلمہ انصاری، (۳) محمد بن براء البکری، (۴) محمد بن سفیان بن مجاشع، (۵) محمد بن حمران جعفی، (٦) محمد بن خزاعی سلمی۔ مگر اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے. جہاں اُس نے اپنے انعامِ رسالت کو رکھنا ہوتا ہے اور یہ رازِ معرفت صرف محمد بن عبداللہ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی میں رکھا. جو ازلی وابدی طور پر اِس کے لیے حقیقتاً منتخب تھے.

کائنات میں صرف سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ایک جامع صفات ہستی ایسی ہے. جس کے اسماء گرامی جہاں بھر کے موسوم افراد سے زیادہ اور جس کی ذات بابرکات ہر اپنے اسم کا کُلّی مصداق اور اُس کی

حقیقتِ صوری و معنوی کی صحیح حامل و عامل ہے. اللہ کریم نے جو اسم مبارک اپنے محبوب کے لیے خاص کرنا چاہا. اُس کے ارشاد فرمانے سے قبل اپنے محبوبِ بے عیوب کو اُس کی خصوصیتوں کا حامل اور حقیقتوں کا اہل کر کے، پھر فرمایا: وہ محبوبِ خدا صرف اسماءِ عالیہ سے موسوم ہی نہیں بلکہ تمام اسماءِ طیبہ کے حقائق حضور کی ذاتِ گرامی میں مجتمع ہیں. وہ عوام کی طرح محض اسماءِ مبارکہ کی فہرست ہی نہیں رکھتے بلکہ وہ حضور ﷺ کی ذات پر ہر لحاظ سے منطبق اور صادق آتے ہیں اور یہ ایک وہ خوبی ہے جو جہاں بھر کے اوّلین و آخرین افراد میں اسماء کی اِس بہتات کے ساتھ قطعاً نہیں پائی جاتی اور نہ پائی جائے گی۔ بلکہ اکثر انبیاء علیہم السلام کو بھی جو اسماء کی ایک ایک بزرگی کے ساتھ خاص کیا گیا ہے. مثلاً ابراہیم علیہ السلام کا اسم شریف حلیم، نوح علیہ السلام کا شکور، عیسیٰ و یحییٰ علیہما السلام کا برّ وسید، موسیٰ علیہ السلام کا کریم و قوی، یوسف علیہ السلام کا حفیظ و علیم، ایوب علیہ السلام کا صابر اور اسماعیل علیہ السلام کا صادق الوعد، اِن سب پر بھی آنحضرت ﷺ کو زیادتی اسماء میں فضیلت تامہ حاصل ہے.

لٰہذا فقیر چاہتا ہے کہ حضور ﷺ کے تمام اسماء مبارکہ کو یکجا جمع کر کے حضور ﷺ ہی کے علم و عمل کی روشنی میں اُسے خلقِ خدا تک ذرا تفصیل کے ساتھ پہنچا دے، جو ابھی تک ظلمت کدۂ جہان میں آفتاب و مہتاب کی پرستار، دیوتاؤں اور طاغوتی طاقتوں کی شکار، تثلیث کے عقیدہ کی دلبند، شجر و حجر کی عبادت میں پابند، رینگنے والے جانوروں سے مرغوب، جگالی کرنے والے معبودوں کی مرغوب، اگنی دیوی سے پُرخوف اور نسل و رنگ کے امتیاز میں مالوف، دنیا کے مبلّغِ اعظم کی تعلیم سے نا آشنا رہ کر معبودِ حقیق کی معرفت سے محروم ہے. وباللہ التوفیق.

اسماء شافیہ مبارکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معہ تشریح

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

مُحَمَّدٌ	اَحْمَدُ	حَامِدٌ	مَحْمُوْدٌ
تعریف والا	بہت حمد والا	سراہنے والا	سراہا گیا
قَاسِمٌ	عَاقِبٌ	فَاتِحٌ	خَاتِمٌ
بانٹنے والا	پیچھے آنے والا	کھولنے والا	ختم کرنے والا
حَاشِرٌ	مَاحٍ	دَاعٍ	سِرَاجٌ
اٹھنے والا	محو کرنے والا	بلانے والا	چراغ
رَشِیْدٌ	مُنِیْرٌ	بَشِیْرٌ	نَذِیْرٌ
بزرگ	نورانی	خوشخبری دینے والا	ڈرانے والا
ھَادٍ	مَھْدٍ	رَسُوْلٌ	نَبِیٌّ
ہادی	ہدایت والا	بھیجا گیا	مخبر صادق
طٰہٰ	یٰسٓ	مُزَمِّلٌ	مُدَثِّرٌ
طہ	یٰس	گلیم پوش	چادر اوڑھنے والا
شَفِیْعٌ	خَلِیْلٌ	کَلِیْمٌ	حَبِیْبٌ
شفاعت والا	دوست	کلام کرنے والا	محبت والا
مُصْطَفٰے	مُرْتَضٰی	مُجْتَبٰی	مُخْتَارٌ
چنا ہوا	برگزیدہ	قبول کیا گیا	اختیار دیا گیا

نَاصِرٌ	مَنْصُوْرٌ	قَائِمٌ	حَافِظٌ
مدد دینے والا	مدد دیا گیا	قیام والا	حفاظت والا
شَهِيْدٌ	عَادِلٌ	حَكِيْمٌ	نُوْرٌ
گواہ	عدل والا	حکمت والا	نور
حُجَّةٌ	بُرْهَانٌ	اَبْطَحِيٌّ	مُؤْمِنٌ
دلیل	دلیل دیا گیا	بطحے والا	امن والا
مُطِيْعٌ	مُذَكِّرٌ	وَاعِظٌ	اَمِيْنٌ
تابعدار	نصیحت کرنے والا	نصیحت والا	امانت دار
صَادِقٌ	مُصَدِّقٌ	نَاطِقٌ	صَاحِبٌ
سچا	سچ کردکھانے والا	بولنے والا	عزت دار
مَكِّيٌّ	مَدَنِيٌّ	عَرَبِيٌّ	هَاشِمِيٌّ
مکے والا	مدینے والا	عرب والا	اولاد ہاشم
تِهَامِيٌّ	حِجَازِيٌّ	تَرَازِيٌّ	قُرَيْشِيٌّ
تہامی	حجاز والا	تراز کی نسل سے	قریشی نسب
مُضَرِيٌّ	اُمِّيٌّ	عَزِيْزٌ	حَرِيْصٌ
مضر والا	بے پڑھا	غالب	حرص والا
رَؤُوْفٌ	رَحِيْمٌ	يَتِيْمٌ	غَنِيٌّ
شفیق	رحمت والا	یتیم	بے پرواہ
جَوَّادٌ	فَتَّاحٌ	عَالِمٌ	طَيِّبٌ
سخاوت والا	فتح والا	جاننے والا	پاک

طَاهِرٌ	مُطَهَّرٌ	خَطِيبٌ	فَصِيحٌ
پاک کرنے والا	پاک کیا گیا	خطبہ دینے والا	عمدہ بیان والا
سَيِّدٌ	مُنَقًّى	اِمَامٌ	بَارٌّ
سردار	صاف کیا ہوا	پیشوا	نیکوکار
شَافٍ	مُتَوَسِّطٌ	سَابِقٌ	مُقْتَصِدٌ
شفا دینے والا	اعتدال پسند	سبقت کرنے والا	میانہ رو
مَهْدِيٌّ	حَقٌّ	مُبِينٌ	اَوَّلٌ
ہدایت والا	سچائی بخشنے والا	ظاہر	پہلا
اٰخِرٌ	ظَاهِرٌ	بَاطِنٌ	رَحْمَةٌ
پچھلا	ظہور والا	پوشیدہ	رحمت
مُحَلِّلٌ	مُحَرِّمٌ	اٰمِرٌ	نَاهٍ
حلال کرنے والا	حرام کرنے والا	حکم دینے والا	منع کرنے والا
شَكُورٌ	قَرِيبٌ	مُنِيبٌ	مُبَلِّغٌ
شکر گذار	آگے	رجوع کرنے والا	پہنچانے والا
طٰسٓ	حٰمٓ	حَسِيبٌ	اَوْلٰى
طس	حم	حساب لینے والا	بہتر

رَحْمَةٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ

اول و آخر، حاضر و غائب جہانوں کے لیے رحمت

وَ صَلَّى اللّٰهُ عَلٰى حَبِيْبِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَ اَزْوَاجِهٖ وَ اَصْحَابِهٖ وَ اِتْبَاعِهٖ اَجْمَعِيْنَ ط

تشریح

مولا کریم جل وعلا شانہٗ نے حضور ﷺ کے یہ اسماء شریف ہر مرتبے کے مطابق جداگانہ اِس لیے بیان فرمائے کہ تصدیق کرنے والوں اور ایمان کے متلاشیوں کو تردّد نہ پیدا ہو اور محبوب ومحبوبیت اورشانِ رسالت ونبوت کا ہر پہلو ایسا واضح نظر آئے کہ ایک حاسد آنکھ کے سوا (جو اعجاز کو بھی ھٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ کہہ کر انکار کر دے) ہر شخص اِس پر گواہی دے سکے. چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اِس کی ہزار ہا مثالیں احادیث سے ملتی ہیں مگر فی زمانہ عقائدِ کفار کا تو جھگڑا ہی نہیں، مخالفانہ نظریے کے ماتحت اہلِ اسلام کہلاتے ہوئے وہ لوگ میدان میں آ رہے ہیں جن کے نزدیک آنحضرت ﷺ کی بلندیٔ شان کا تذکرہ، ایک نیک عقیدہ مسلمان کا یہی سب سے بڑا گناہ ہے. جہاں کہیں یہ آواز کانوں میں آئی انکے کفر و بدعت کے فتوے فوراُ حرکت میں آ گئے. گویا وہ نہیں چاہتے کہ محبوب خدا ﷺ کا اُن کے تمام فضائل ومحاسن کے ساتھ ذکر کیا جائے، کیوں کہ ہر وہ حمد ونعت اُن کے عقائد کے خلاف ہوگی جس میں آنحضور ﷺ کی ذات، باری تعالیٰ سے لفظی مطابقت ومشابہت پائی جاتی ہو حالانکہ اُن کا یہ عقیدہ خود رب العزت کے ارشاد وسنت کے خلاف ہے۔ جب خالق الکل خود ہی وہ اوصاف بیان فرمائے جو اُس کی اپنی ذات کے لیے خاص اور حضور ﷺ کے لیے عام اُس کے عطا فرمودہ ہوں تو پھر اُن کی یہ بے جا منطق اور لغو تاویل سازی کیا معنی رکھتی ہے. کیا آنحضرت ﷺ کے تمام اسماء مبارکہ حضور کی شانِ بلند پر من کل الوجوہ دال نہیں۔ اگر نہیں تو نَعُوْذُ بِاللّٰہِ کیا ان اسماء کو محض پکارنے کے لیے حضور ﷺ کی جانب منسوب فرمایا گیا ہے اور اگر یہی عقیدت ہے کہ حضور ﷺ میں یہ اوصاف جمع نہ تھے تو معاف فرمایئے گمراہی اور بے دینی دوسری کس شے کا نام ہوگا.؟

معلوم ہوتا ہے کہ ایسے لوگ ابھی تشبیہِ الوہیّت ونبوّت یا مولا کریم جل شانہٗ ونبی کریم عزّ اسمہٗ کے مسئلہ مماثلت کو سمجھنے سے عاری ہیں، جو بات بات میں اڑ کر یہ کہہ دیتے ہیں کہ اِن عاشقوں نے نبی ﷺ کو رب العزت سے ملا دیا ہے، حالانکہ جمیع علماء کرام اہلسنت والجماعت یہ عقیدہ رکھتے ہوئے کہ مولا کریم خالق، نبی مخلوق. اللہ کریم کا علم اور جمیع صفات ذاتی، جبکہ حضور ﷺ کی عطائی. خداوندِ عالم جل شانہٗ کا علم ناممکن التغیر اور رسول اکرم ﷺ کا ممکن التبدل. اللہ تعالیٰ جل مجدہٗ کا علم غیر ممکن الفناء، حضور کا ممکن الفناء. مماثلت و برابری کو شرک وکفر فرماتے ہیں. جو معترضین کے ذہن میں ہے. قاضی ابوالفضل رحمہ اللہ تعالیٰ نے اِس مسئلہ کو ایسا واضح بیان فرما دیا ہے کہ اِس کے پڑھنے کے بعد کوئی شخص تشبیہہ کے چکر اور ملمع سازمخربِ الایمان باتوں میں نہیں پڑ سکتا۔ فرماتے ہیں کہ اللہ کریم جلّ مجدّہٗ اپنی عظمت، بڑائی،

حکومت، عمدہ ناموں اور بڑی صفات میں اِس حد تک بزرگ و برتر ہے کہ مخلوقات میں سے قطعاً مشابہ نہیں اور نہ کسی مخلوق کو اِس سے تشبیہ ممکن ہے اور بلاشبہ جو شرع میں خالق و مخلوق پر بولا گیا ہے. اِن دونوں میں حقیقی معنوں کے لحاظ سے کوئی مشابہت نہیں، کیوں کہ قدیم کی صفات حادث کے خلاف ہوتی ہیں. پس جس طرح خداوند عالم کی ذات اور ذاتوں کے مشابہ نہیں، ایسا ہی اُس کی صفات بھی مخلوق کی صفات کے مشابہ نہیں. کیوں کہ مخلوق کی صفات اعراض و اغراض سے جدا نہیں ہوتیں اور باری تعالیٰ اِس سے پاک ہے۔ بلکہ وہ ہمیشہ اپنی صفات و اسماء کے ساتھ ہے اور اِس بارے میں خداوند عالم کا یہ قول کافی ہے ﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ﴾ یعنی اُس کے مثل کوئی نہیں اور یہ حقیقت تمام تر مسائلِ توحید کو شامل ہے۔ علماء عارفین و محققین نے فرمایا ہے کہ توحید اُسی ذات کے ثابت کرنے کا نام ہے جو کہ اور ذاتوں سے مشابہ نہیں اور نہ صفات سے معطل ہے. غرض یہ کہ نہ اُس کی ذات کی طرح کوئی ذات ہے اور نہ اُس کی صفات کی طرح کوئی صفت اور نہ اُس کے نام کی طرح کوئی نام اور نہ اُس کے کام کی طرح کوئی کام ہے مگر صرف لفظ کی لفظ کے ساتھ مطابقت و مشابہت کی وجہ سے ہے اور ذاتِ قدیمہ اُس سے بری ہے کہ اُس کی صفت حادث ہو جیسا کہ یہ محال ہے کہ ذاتِ محدثہ کی صفت قدیم ہو اور یہی مذہب جمہور حضرات اہل الحق کا ہے پھر اُس تشبیہ کا الزام یا برابری کا طعن محض افترا نہیں تو اور کیا ہے؟

فقیر کہتا ہے کہ قرآنِ کریم سے استفادہ کرنے کی اگر قوتِ ایمانی نہ ہو تو مسلمان ہوتے ہوئے صرف آنحضرت ﷺ کے اَسماء مبارکہ ہی کے مطالب و معانی پر غور کر لیجیے. سرکارِ رسالت مآب ﷺ کی شان ارفع و اعلیٰ اور تعلقِ الٰہی کی قربت کا ہر پہلو روشن ہو جائے گا. اِس پر بھی کوئی مماثلت و بشریت کی تنگ گلیوں میں بھٹکنا اپنا جز و ایمان بنا لے تو اللہ کریم اُس کو ہدایت فرمائے:

ادب گاہیست زیرِ آسمان از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ اینجا!

حضور محمد ﷺ ہیں

اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ خصوصیت دی ہے کہ آپ کے اَسماء کے ضمن میں آپ کی تعریف فرمائی ہے. آپ کے ذکر کے اثناء میں آپ کے بڑے شکر کا ذکر مخفی رکھا ہے. اِس اسم شریف میں جو بروزنِ مفعل ہے، کثرتِ حمد میں مبالغہ ہے یعنی حضور حمد کرنے والوں میں سب سے بڑھ کر ہیں اور اُن سب سے افضل ہیں جن کی تعریف کی جاتی ہے. اِسی لیے کائنات کا ذرّہ ذرّہ آج تک حضور ﷺ کا ثنا گستر و مدح خواں ہے اور اُن کے پیارے نام کی نوبت شاہانہ رات دن کے چوبیس گھنٹوں میں پانچ مرتبہ مساجد کے بلند ترین میناروں سے سامعہ نواز ہے اور قیامت کے دن بھی حمد کا جھنڈا حضور کے ہاتھ میں

ہوگا تاکہ کمالِ حمد آپ کے لیے پورا ہو اور اِس میدان میں آپ حمد کی صفت سے مشہور ہو جائیں. آپ کا رب آپ کو مقامِ محمود پر اٹھائے گا. اِس مقام میں آپ سب کی شفاعت فرمائیں گے اور آپ پر تعریفوں کے وہ دروازے کھلیں گے جو کسی اور پر نہ کھلے ہیں اور نہ کھولے جائیں گے.

حضور احمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں

اور یہ آپ کا وہ اسم مبارک ہے جو پہلی کتابوں میں آ چکا ہے اور انبیاء علیہم السلام سوابق نے اِسی اسم مبارک کی خوش خبریاں دی ہیں. آپ سے پہلے کوئی اِس نام سے نہیں پکارا گیا تاکہ کسی ضعیف قلب پر اِس سے اشتباہ یا شک نہ پڑے. مسیح علیہ السلام کا ارشاد قرآن پاک میں بھی اِسی اسم شریف کے ماتحت ذکر ہوا ہے. ﴿مُبَشِّراً بِرَسُوْلٍ يَّاْتِیْ مِنْ بَعْدِی اِسْمُهٗ اَحْمَدُ ط﴾ اور اِسی اِسم مبارک سے آپ تمام حمد کرنے والوں میں ممتاز ہیں.

حضور حامد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں

جنہوں نے چار دانگ عالم میں اپنے مالک و خالق رب کی وہ حمد و ثنا پھیلائی جس کی ماقبل میں مثال نہیں. اور مابعد میں قیامت تک نہ ہو سکے گی. ساری کائنات ارضی و سماوی میں اپنے معبود برحق کے ذکر کو بلند کرنا صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا حصّہ ہے. غلام تو غلام ہے اغیار بھی معترف ہیں کہ مسلمانوں کے نبی کو خدا سے عشق ہے. کوئی بلندی ایسی نہیں جہاں وہ چڑھتا ہوا لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ اور اَللّٰهُ اَكْبَرُ کے نعرے نہیں مارتا اور کوئی پستی ایسی نہیں جہاں وہ اُترتا ہوا اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ نہیں پکارتا.

حضور محمود صلی اللہ علیہ وسلم ہیں

جن کی حمد و ثنا پر تمام انبیاء علیہم السلام نے آدم علیہ السلام سے لے کر مسیح علیہ السلام تک یکتائی والوالعزمی کی مہر لگا دی ہے. حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ بلند مرتبہ رسول ہیں جن کی نسبت یومِ میثاق میں تمام رسولوں سے اتباع کا عہد لیا گیا اور قیامت کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی عرشِ معلےٰ کی دائیں جانب قیام فرما کر (جہاں کوئی اور نہیں کھڑا ہو سکے گا) اپنی اُمت کی اور سب لوگوں کی شفاعت فرمائیں گے. یہ مقام مقامِ محمود ہوگا جس پر اوّلین و آخرین رشک کریں گے.

حضور صلی اللہ علیہ وسلم قاسم ہیں

جن کے دستِ تصرف میں رب العزت کے خزانوں کی چابیاں ہیں. گو ہر شخص کو ہر وقت ہر شے دینے والا اللہ کریم ہی ہے مگر تقسیم حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں. حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے درِ دولت سے کبھی کوئی سائل

خالی نہیں گیا. خدا کے خزانوں پر قبضہ ہے. قدموں میں اشرفیوں کے ڈھیر ہیں جسے چاہتے ہیں مالا مال فرما دیتے ہیں مگر ایسا قاسم کون ہوگا جو دوسروں کو تقسیم کر کے خود خالی ہاتھ رہنا پسند فرمائے. جو کی روٹی پر قانع ہو. گھر والے پانی اور کھجوروں پر گزارا کریں. پورا پورا مہینہ چولہا گرم نہ ہو پھر بھی شان. ((وَاللّٰہُ یُعْطِیْ اِنَّمَا اَنَا الْقَاسِمُ)) میں فرق نہ آنے دے اور کنیت ابوالقاسم ہی سے مشہور ہو.

حضور عاقب صلی اللہ علیہ وسلم ہیں

یعنی سب سے پیچھے آئے ہیں اور یہ بھی ایک ایسی فضیلت ہے جو کسی دوسرے نبی کو حاصل نہیں کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء علیہم السلام کے بعد آئے ہیں. حدیث شریف میں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ میں وہ عاقب یعنی تمام انبیاء علیہم السلام سے پیچھے آنے والا ہوں کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا. ایک حدیث میں ہے کہ نبوت کے محل کی وہ آخری اینٹ جس سے اُس کی تکمیل ہوئی، میں ہی ہوں.

حضور فاتح صلی اللہ علیہ وسلم ہیں

اُن انعامات کے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے تک بند تھے. حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے اُن کو کھولا اور خلقِ خدا کو سرفراز فرمایا تاکہ اپنے اِس اسم شریف کی حقیقت کو ظاہر فرمائیں، کیوں کہ آپ رحمت کے دروازوں کو اپنی اُمت پر، اُنکی عقلوں کو معرفتِ الٰہی اور اللہ پر ایمان لانے کے ساتھ کھولنے والے ہیں.

حضور خاتم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں

جنہوں نے انبیاء سابقین کے تبلیغی کارناموں پر ختمِ نبوت و رسالت کی مہر ثبت فرمادی اور دنیا والوں کو اپنی تخلیق کے لاکھوں برس بعد دینِ فطرت کی تکمیل کا وہ مژدۂ جانفزا سنایا جس کے بعد کسی نبی کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی. گویا آپ کا ظہور ہی ختمِ نبوت کی بیّن دلیل ہے.

حضور حاشر صلی اللہ علیہ وسلم ہیں

یعنی آپ بروزِ قیامت سب سے پہلے اُٹھیں گے اور تمام لوگ آپ کے قدم پر حشر کریں گے یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے قبروں سے اٹھائے جائیں گے. قدم کے یہ بھی معنی کتابوں میں لکھے گئے ہیں کہ لوگ شفاعت کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب جمع ہوں گے.

حضور ماحی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں

کہ آپ کے ذریعے اور واسطے سے آپ کے غلاموں کے گناہ یا جہان والوں سے کفر مٹایا گیا ہے. اِس کے معنی بعض اہل اللہ نے غلبۂ دین مراد لیا ہے یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے کفر کمزور اور

اسلام غالب ہوگا جس سے وعدہ خلافی، جھوٹ بولنا، بدی کی حمایت، ظالموں کا ظلم، ضعیفوں کا ستایا جانا، مظلوموں کی دل آزاری، بیواؤں پر بے دردی سب مٹ جائیں گے اور تمام ادیان پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دینِ اسلام کو غلبہ ہوگا۔

حضور داعِ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں

یعنی وہ اللہ کی جانب بلانے والا اور روح الحق جس کا عام منصب ہی تمام سچائیوں کی طرف دعوت دینا تھا، جس کے حیات افزا اور زندگی بخش پیغام سے بے شمار مردہ دل اور مردہ روح زندہ ہوئے اور ہمیشہ رہتی دنیا تک ہوتے رہیں گے۔ آپ کے بیان کی فصاحت، خوش بیانوں پر بھی وجد طاری کرتی تھی اور زبان کی طلاقت، آنکھوں سے نیر جاری، آپ کی نظر کی احساس آفرینی، دلوں کو درد آشنا اور کلام کی بلاغت کفار کو باخدا کرتی۔

حضور سراج صلی اللہ علیہ وسلم ہیں

جن کا وجودِ مقدس کمالاتِ انسانی کا وہ روشن چراغ تھا جس نے ظلمت کدۂ دنیا میں اپنی ضیاء پاشی سے تمام اجسام کی جسمانی وروحانی تاریکیوں کو دور کر کے اِس قابل بنا دیا کہ وہ رب العزت کی تجلیات سے کسبِ ضیاء حاصل کر سکیں اور اُس سے لو لگا سکیں۔

حضور رشید صلی اللہ علیہ وسلم ہیں

جن کی ذات ستودہ صفات سے تمام جہان والوں پر رشد و ہدایت کے وہ دروازے کھلے جو ساڑھے تیرہ سو سال سے لے کر آج تک بند نہیں ہوئے۔ جب تک یہ دنیائے کون وفساد قائم ہے، بند نہیں ہوں گے کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے لوگوں کو جو محبت و اخلاص، امن و سلامتی، نیکی و پاکیزگی، توحید پرستی وعلم پروری، راست بازی واخوت نوازی، رواداری وعدل گستری اور پارسائی و تقویٰ کی دعوت دی جا چکی ہے۔ دنیا والے بالواسطہ یا بلاواسطہ قیامت تک اُسی سے مستفیض اور مستفید ہوتے رہیں گے اور یہی اُس کے رشید ہونے کا ابدی اقتضا ہے۔

حضور منیر صلی اللہ علیہ وسلم ہیں

جنہوں نے تمام کائناتِ رنگ و بو کو ایسا روشن فرمایا کہ فضائے ہستی اِس شعلۂ طور سے وادیٔ ایمن بن گئی اور اپنی ضیاباری کا وہ جلوہ دکھایا کہ نورِ ازل بھٹکی ہوئی مخلوق کے قلوبِ قاسیہ میں بھی لہریں لینے لگا اور صرف اُنہی قلوب کو نہیں بلکہ اُن کے تمام ماحول کو بھی منور فرما دیا۔

حضور بشیر صلی اللہ علیہ وسلم ہیں

یعنی فرمانبرداروں کو اُن کے حق وصلہ کی اور نافرمانوں کو اُن کے ابدی وسخت عذاب کی خوش خبری دینے والے ہیں جو ایک ہادی کے اوصاف میں لابدی وصف ہے کہ جس جماعت یا قوم کی جانب آئے اپنی ہدایت کے قبول کرنے یا ٹھکرانے والوں کو اُن کی آخری منزل کا پتا دے۔ اِسی لیے آپ نے اہل ایمان کو خوش خبری اور بشارت دی اور بے ایمانوں و نافرمانوں کو ابدی عذاب جہنم کا مژدہ سنایا۔

حضور نذیر صلی اللہ علیہ وسلم ہیں

کہ حق بات کہہ کر ڈرائیں تا کہ وہ گمراہی اور بد اعمالی کی جزاء سے بچ جائیں چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے نفس پسندوں، بت پرستوں اور خونخوار وحشیوں کو یہ کہہ کر ڈرایا کہ تمہارے بت تم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ یہ جہنم کا ایندھن ہیں اِن کو چھوڑ دو اور ایک خدا کی پرستش کرو۔

حضور ہادی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں

جن کی ہدایت کا مخاطب ہر ذرّہٴ کائنات ہے اِس لیے کہ آپ کی ہدایت ہر اسود و احمر ہر زرد و سفید کے لیے قیامت تک کو حاوی ہے۔ اِس جہان میں جس قدر ہادی آئے اُن کا دائرہ ہدایت اُن کی تعلیم کے ماتحت ایک ایک قوم، ایک ایک گروہ یا جماعت کے لیے محدود تھا مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کافّةً للناس کے لیے یوم محشر تک غیر محدود دائرہ رکھتے ہیں۔ نہ تعیّنِ تعلیم، نہ تعیّنِ وقت، نہ تعیّنِ قوم ﴿ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا ﴾۔ اسی ہادی کی شان ہے۔

حضور مُہدِ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں

یعنی وہ ہدایت والا جس کو ہدایت کی توفیق بھی حاصل ہو اور اُس کی ہدایت کے غلغلے عرش و فرش کی پنہائیوں اور سمندر کی گہرائیوں میں ہیجان برپا کر دیں جس پر نظر ڈال دے قطرے کو دریا اور کافر کو باخدا بنا دے۔

حضور رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں

جو مولا کریم کی طرف سے منشاءِ ایزدی کا مخلوق پر اظہار فرمانے کے لیے بھیجے گئے اور وہ حکم پہنچانے کے لیے تشریف لائے جو آپ کو راہ نمائی کی صورت میں پہنچا۔ بحیثیت مستقل کتاب و قانون کے حامل، مستقل شریعت میں کامل اور نبوتِ تامہ کے مالک ہونے کے۔ آپ وہ رسول ہیں جن پر رسالت و نبوت ختم کی گئی ہے اور آپ سے بعد کوئی نبی و رسول نہیں آ سکتا۔ آپ کے نفس کی لرزش کو ہمیشگی

کی سند حاصل ہے۔ آپ کے ارشاد فرمائے ہوئے جملے آج تک محفوظ ہیں اور قیامت تک رہیں گے۔

حضور نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں

جن کا مرتبہ اللہ کریم کے نزدیک نہایت بلند ہے۔ آپ کو علومِ غیبیہ پر ایسا مطلع کیا گیا ہے کہ آپ کے اقوال و افعال اور ارشادات و اخبار نے لامکان سے تحت الثریٰ اور اُن کے علاوہ اسرار الٰہی و کائنات از ماہ تا ماہی کو طشت از بام کر دیا ہے۔ آفتاب و مہتاب کو تہ و بالا فرمانا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوتِ تامہ اور مدارجِ عامہ کی ایک ادنیٰ سی دلیل ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ نبی غیب دان ہیں جن کی تعلیمِ کامل نے اُمت کے غلاموں کو بھی مغیبات پر مطلع ہونے کا اہل بنا دیا ہے اور یہی اِس نبوت کی خصوصیات میں سے ایک وہ دلیل ہے جو ختمِ نبوت کا ثبوت بہم پہنچاتی ہے۔

حضور طٰہٰ و یٰسین صلی اللہ علیہ وسلم ہیں

یعنی یہ وہ رازدارانہ اَسماءِ شافیہ ہیں جن میں محبوب و محبّ کی ایسی رموز پوشیدہ ہیں جن کو صرف آپس کی پکار کے لیے خاص کر لیا گیا ہے۔ غیر کو اس رازداری میں دخل نہیں اور یہ وہ بلندیٔ تعلق ہے جو ماقبل میں کسی رسول و نبی، جن و ملائکہ کسی کو حاصل نہیں اور مابعد میں تو یہ اہلیت ہی محال و ناممکن ہے۔ اِن تمام اسماء و دیگر حروفِ مقطعات کی تاویلات کتب میں مذکور ہیں مگر صحیح حقیقت و علم کو فرمانے والا ہی جانتا ہے۔ نااہل اس کو کیا بیان کرے۔

حضور مزمل صلی اللہ علیہ وسلم ہیں

وہ شہنشاہِ کونین جن کے اختیار میں سب کچھ تھا۔ جو چاہتے کر سکتے مگر آپ نے وہ سادہ زندگی بسر کی کہ رب العزت نے اُن کی سادگی ہی کی تعریف فرمانے میں محبوبیت و محبت کا راز منکشف فرمایا۔ اسلام چونکہ محبوب کی اداؤں ہی کے مجموعے کا نام ہے۔ اِس لیے محبوب کی کملی پوشی ایسی پسند آئی کہ "کملی والے" کہہ کر پکارا اور اُس کملی میں وہ کمال بھرے کہ تمام خدائی کے کمال اُسی سے بنائے اور ساری خدائی اُسی کملی پر سے قربان و نثار کر دی۔ اُسی کملی کے طفیل تمام خاصانِ خدا کو گلیم پوشی، مقبولانِ بارگاہ کو صفا کوشی اور سلاطینِ کارفرما کو حق نیوشی نصیب ہوئی۔

حضور مدثر صلی اللہ علیہ وسلم ہیں

جو خاندانِ نبوت و رسالت کا آخری تاجدار ہوتے ہوئے اپنی پاک و سادہ زندگی کا ایک ایک لمحہ آفتابِ عالم تاب کی طرح ایسا روشن وجود رکھتے ہیں جس کی ہر شام صبح کی طرح مسکراتی اور ہر رات دوپہر کی طرح پاک دامن ہے۔ اُس نور بار و نور پاش زندگی کی کوئی کرن اور کوئی ادا ایسی نہیں جو اُس چادر

کی لپیٹ سے نکل کر اہل دنیا کی آنکھوں کو چندھیا نہ دے. اس لیے محبوب کی ردا پوشی بھی عشاق کی نگاہوں میں مستور فرما دی تا کہ تخت و تاج کی تمنا نہ رہے.

حضور شفیع صلی اللہ علیہ وسلم ہیں

اور شفاعتِ کبریٰ کی خصوصیت سے ممتاز ہیں. میدانِ قیامت روزِ محشر، اعمال کے حساب کے دن، جہاں بڑے بڑے اولوالعزم لرزتے ہوں گے، وہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم عرش کا پایہ پکڑ کر اور بارگاہِ خداوندی میں سر بسجود ہو کر گنہ گاروں کی شفاعت فرمائیں گے اور اپنی اُمتِ عاصی کو بخشوائیں گے.

حضور خلیل صلی اللہ علیہ وسلم ہیں

جن کے لیے محبت کے تمام مراتب وقف کر دیے گئے ہیں. وہ ہر میدانِ ابتلاء میں پورے اُترنے والے، مغفرت کی حدِ طمع سے باہر، سچی زبان اور سچے کردار کے حامل، خداوند جل وعلا شانہ کے سوا تمام دنیا و مافیہا سے علیحدہ، غیر کی پرستش سے دور رہ کر اپنی خلّت کی حقیقت اُن اشارات میں پیش فرماتے ہیں "اگر خداوندِ عالم تو مجھ سے راضی ہے تو مجھے تکلیفوں کی پرواہ نہیں. میرے لیے تیرے چہرے کے نور کی پناہ کافی ہے. میں اسی پناہ میں آتا ہوں جس کے سامنے ساری تاریکیاں نابود ہو جاتی ہیں اور جس کی بدولت دنیا اور آخرت کے تمام امور اصلاح پذیر ہوتے ہیں".

حضور کلیم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں

حق تعالیٰ نے اُن کو اپنی قدرت کا سماں دکھا کر معراج اور ایقان کے بلند درجہ تک پہنچایا- یعنی ایک رات کے بعض حصہ میں مسجدِ حرام سے لے کر بیت المقدس اور پھر وہاں سے اجرامِ سماوی اور بہشت و دوزخ کی سیر کرائی اور اُسے اپنے قرب میں اُس مقام پر بُلا کر جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کوئی نہیں پہنچ سکا اور نہ کوئی پہنچے گا، راز و نیاز کی گفتگو فرمائی اور عالمِ غیب کے اسرار اُن پر آئینہ کیے.

حضور حبیب صلی اللہ علیہ وسلم ہیں

اور آپ کو رب العزت جل وعلا شانہ نے اپنی محبت کے ساتھ خاص کیا ہے یعنی حبیب کسی اور کو نہ فرمایا، نہ پیدا کیا- حبیب کی شانِ بلند وہ ہے جس کی مغفرت میں کوئی کلام نہ ہو بلکہ حدِ یقین سے بڑھ کر ہو کیوں کہ حبیب اُس کی جانب بذاتہٖ پہنچتا ہے اور باقی بالواسطہ، اور وہ جو چاہتا ہے، ہوتا ہے. رب العزت کو اُس کی مرضی مطلوب ہوتی ہے اور اُس کو بغیر سوال کے وہ کچھ ملتا ہے جو باقیوں کو سوال پر بھی ملے یا نہ ملے.

حضور مصطفےٰ ﷺ ہیں

جن کو مولا کریم نے اپنے دیدارِ بے حجابانہ اور مکالمہ بالمشافہ کے لیے ازل سے ہی خاص کر لیا تھا. اُمّ الکتاب کے پانے اور عرشِ معلےٰ پر جانے، اللہ کا آخری کلام پہنچانے، حسن بے پناہ کا قدیمی روپ دکھانے، خلقِ خدا کو گناہ سے بچانے میں آپ کو ابتدا ہی سے معصوم و مصطفےٰ فرمایا گیا. گویا حضور جمالِ ازل کا ایک جلوہ تھے جس کی تابش سے پتھروں میں گداز پیدا ہوا اور مشتاقینِ جمال کے قلوب کو ابد کے نور سے معمور ہونا نصیب ہوا.

حضور مرتضیٰ ﷺ ہیں

اِس لیے کہ آپ عالمِ ما کان و ما یکون و جمیع اسرار و علوم ہیں. آپ کا سینہ انوارِ الٰہی کا گنجینہ و معارف ربّانی کا خزینہ ہے. آپ کے رُخِ انور، پاکیزہ زندگی و مسکن پاک کی، اللہ کریم نے قسمیں کھائی ہیں. آپ کا پیشاب پاک، پاخانہ خوشبودار و پسینہ معطر تھا. آپ کی زبان خدا کی زبان، آپ کی گفتگو خدا کی گفتگو، آپ کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ، آپ کا لعابِ دہن ہر مرض کی دوا، آپ کا بال بال برکت و رحمت اور آپ کا وجودِ مقدس سرتاپا برہان تھا، ایک ایک عضو میں ایسے الگ الگ اعجاز پوشیدہ تھے کہ منکرین صرف چہرۂ انور پر نگاہ ڈالتے ہی کہہ اٹھتے، کہ یہ جھوٹے کا چہرہ نہیں.

حضور مجتبےٰ ﷺ ہیں

آپ کو، سَنل! تعطیٰ 'یعنی مانگ! جو مانگے گا دیا جائے گا، کے مترادف شرفِ اجابت سے نوازش فرمائی گئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمام انسانوں میں مکرّم اور تمام انبیاء علیہم السلام میں معظم ہیں.

حضور مختار ﷺ ہیں

ہر اُس معاملے میں جو ربّ العزّت کی طرف سے آپ کو بحیثیتِ محبوب ودیعت ہوا. جس کو چاہا جنتی فرما دیا اور جس چاہا جہنمی کر دیا اور اِس کی بے شمار مثالیں تو آیات و احادیث میں پائی جاتی ہیں. استنِ حنانہ کا جنت میں گاڑ دینا، اکیلے حضرت خزیمہ کا دو گواہوں کے برابر گواہی میں فرمانا. ایک صحابی کو 'جو مانگنا ہے مانگ لے!'' کے اختیارات سے اجازت فرمانا، چاند کے دو ٹکڑے کر دینا، غروب سورج کو لوٹانا، آپ کے اختیارات کے معمولی دلائل میں سے ہے کیوں کہ حضور ﷺ صاحبِ امر و نہی ہیں اور حضور ﷺ کے سوا بفضلہٖ تعالیٰ جہان میں اور کوئی مختار و حاکم نہیں ہے.

حضور ناصر ﷺ ہیں

جو خدمت میں آیا، جو کچھ کسی نے مانگا، جس قسم کی مدد چاہی، سرکارِ دوعالم ﷺ نے دل کھول کر فرمائی، یہاں تک کہ مدد مانگنے والا مدد کے بارے عاجز آ گیا. ظاہری و باطنی، حاضر و غیر حاضر، قرب و بُعد، زمانۂ حیاتِ ظاہری اور وقتِ نقل مکانی میں، حضور ﷺ یکساں امداد فرماتے ہیں. جیسے کوئی مانگے، ویسے ہی عطا ہوتا ہے اور اِن کیفیات میں سرِ مومبالغہ کو دخل نہیں اور اِس کی اِس قدر مثالیں احادیث میں موجود ہیں، جن کو شمار کرنا محالات سے ہے.

حضور منصور ﷺ ہیں

یعنی حضور ﷺ ایسے منصور (مدد دیئے گئے ہیں) کہ گویا کوئی ایک کام بھی دینی و دنیوی ایسا نہیں جس میں رب العزت کی نصرت حضور ﷺ کے شامل حال نہ ہو بلکہ یوں کہیے کہ حضور ﷺ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اِسی نصرت کے سائے میں بسر ہوتا ہے بلکہ سرکار کی ذاتِ بابرکات ہی اول سے آخر تک مجسم نصرتِ الٰہی تھی. جس کا ایک پہلو وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ تھا. یہی وجہ تھی کہ اعداء کی تمام تر قوتیں مٹ گئیں مگر حضور ﷺ کا ایک بال بیکا نہ ہوا.

حضور قائم ﷺ ہیں

آپ کے نزدیک ہر ایک حال کی تیاری قائمی تھی. حق سے قصور نہ کرنا اور غیر حق کی طرف تجاوز نہ فرمانا، حضور ﷺ کا شیوہ تھا. آپ کی نشست و برخاست، رفت و گذشت، گفت و شنید، غرضِ کہ ہر حال و قال، خداوندِ عالم جل مجدہٗ کے ذکر پر ہوتا تھا. آپ کسی جگہ کو وطن معین نہ فرماتے بلکہ وطن بنانے سے منع کیا جاتا. ہر ہم نشین کو اُس کا نصیب عطا فرماتے، یہاں تک کہ ہر ایک کو یہی خیال ہوتا کہ حضور ﷺ کے نزدیک مجھ سے بڑھ کر دوسرا کوئی مکرم نہیں. جو کوئی کسی کلام یا کام کے لیے حضور ﷺ کے ساتھ یا سامنے کھڑا ہوتا، حضور ﷺ اُس وقت تک صبر فرماتے جب تک کہ وہ خود اجازت طلب نہ کرے. آپ کا ہاتھ اور خلق تمام لوگوں پر وسیع تھا. آپ کی مجلسِ حلم و حیا اور صبر و امانت کی مجلس ہوتی جس میں بڑوں کی عزت اور چھوٹوں پر رحم کیا جاتا. اہلِ حاجت ہمیشہ بامراد جاتے کسی کو ناامیدی نہ ہوتی. آپ کسی کی مذمت نہ فرماتے، عیب نہ ڈھونڈتے اور شرم و عار نہ دلاتے تھے. آپ کو کسی شئے نے کبھی غضب ناک نہیں کیا جو آپ کو ہلکا کر دے اور گھبرا ڈالے. اُمت کے لیے ہر اُس بات پر قائم ہوتے جس سے اُن کی بنیادِ آخرت درست ہو.

حضور حافظ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں

جو اپنے اخلاقِ حمیدہ وفضائلِ مجیدہ میں وہ وسعت رکھتے ہیں، جن کے بیان کے اختتام سے پہلے دلائل منقطع ہو جاتے ہیں. آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خوفِ الٰہی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مشقت، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر امر میں حفاظت، اِس قدر تھی جس قدر کہ آپ کو ربّ العزّت کا قرب اور علم تھا. آپ صلی اللہ علیہ وسلم اِس قدر نماز پڑھتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک متورّم ہو جاتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر عمل بطورِ دوام کے ہوتا تھا.

حضور شہید صلی اللہ علیہ وسلم ہیں

جن پر حقائق مخفیہ کو آشکار فرمایا گیا اور سب پر گواہ رکھا گیا. حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے پیشتر لکھوکھا بندگانِ خدا کو نہ صرف اِس شہادت پر قائم کیا بلکہ آئندہ نسلوں پر گواہ بنا دیا. بلاشبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ربّ العزّت کی طرف سے شاہد ہیں تاکہ قیامت کو سب پر گواہ ہوسکیں. قرآنِ کریم نے فرمایا ہے کہ قیامت میں جب انبیاء اور اُمتوں میں جھگڑا ہوگا. اُمتیں اپنی معصیت کاری پر پردہ ڈالنے کے لیے یہ کہیں گی کہ ہمارے پاس کوئی داعِی اِلَی اللّٰہِ نہیں آیا تو دوسرے انبیاء علیہم السلام فرمائیں گے کہ ہم گئے تھے. اُس وقت اُن پر حجت قائم کرنے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ گزارا جائے گا.

حضور صلی اللہ علیہ وسلم عادل ہیں

جو وعدے کے پکے، قول کے سچے، نیکوں کے طرف دار، بے کسوں کے دستگیر، ضعیفوں کے سہارے، مظلوموں کے چارے، یتیموں اور بیواؤں کے ہمدرد تھے. وہ عزت وخودداری، عزم واستقلال اور عظمت ووقار کے پیکر، عدل وانصاف کے معاملے میں اپنے بیگانے کی تمیز نہ کرتے تھے. جہانِ ظلم میں وہ عدالت قائم فرمائی، جس کی کوئی ایک مثال دنیا بھر میں ملنی مشکل ہے. جس نے آپ کی عدل گستری کو دیکھا مسحور ہوگیا اور جس نے اُس کے سمجھنے کی کوشش کی وہ فدائی بن گیا.

حضور حکیم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں

جب کہ تہذیب وتمدّن، علم وحکمت، موت کی نیند سلائے جا چکے تھے. حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہر قسم کی تربیت وتعلیم ظاہری سے محروم رہنے کے باوجود اہلِ جہان کو علم ومعرفت اور عقل وحکمت کے وہ رموز بتائے جو محفلِ علم وحکمت کے صدر بن گئے اور تمام دنیا کے عقلاء وحکماء اُن کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے پر مجبور ہو گئے.

حضور نور ﷺ ہیں

اور وہ نورِ خدا ہیں جو سب سے پہلے پیدا ہوا اور باقی کائنات حضور ﷺ کے نور سے پیدا فرمائی گئی. گو حضور ﷺ کی ذاتِ گرامی بادی النظر میں پوست و گوشت اور استخوان و اعصاب سے مملو نظر آتی تھی. انسان تھے اور انسانوں کی طرح رہتے سہتے، چلتے پھرتے اور کھاتے پیتے تھے مگر تھے پیکرِ نور، سراپاءِ ضیاء، مجسمہ جمال. ایک خاکی غلاف تھا جو بشریت کے نام سے اُس نورِ یزدانی پر پڑا ہوا تھا. اہلِ نظر اس کالبدِ خاکی میں ضیاء و نور کی تجلیاں مشاہدہ کرتے تھے اور عوام بھی یہ معلوم کرتے اور دیکھتے تھے کہ عام انسانوں کی طرح حضور کا سایہ نہ تھا. آفتاب و ماہتاب کی روشنی میں آپ کا کوئی عکس زمین پر نمایاں نظر نہ آتا تھا اور نہ ہی آ سکتا تھا کیوں کہ نور کا سایہ ہو ہی نہیں سکتا. آپ کا ظاہر نور، باطن نور، سینہ نور، دل نور، دماغ نور، جسمِ اطہر نور، غرض یہ کہ سرتا پا مجسم نور تھے اور یہی وہ نور تھا جو تخلیقِ عالم سے پیشتر ایک نا معلوم زمانہ تک عرشِ ربانی پر جلوہ گستر رہا اور ملاء الاعلیٰ کی پہنائیاں اور فضائیں اُس سے بقعہ نور بنی رہیں. ملائکہ اُس کا طواف کرتے اور پروانہ وار نثار ہوتے رہے. پھر اُسی نور کی بدولت نیابتِ الٰہی، وراثتِ ربانی اور خلافتِ ایزدی کی تمام نعائم معرضِ وجود میں آئیں اور یہی نور ﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِىٓ ءَادَمَ﴾ کے خطاب کی تخلیق کا باعث بنا اور اِسی نور کے ماتحت حضرت آمنہ کی گود کو چار چاند لگے جس نے اِسی کی بے پناہ روشنی میں شام و روم کے مکانات کا نظارہ کیا اور مشرق و مغرب کی فضائیں منور دیکھیں.

حضور ﷺ حجتہ ہیں

اور آپ خداوند جل مجدہٗ کی ہستی پر سب سے بڑی حجت ہیں جن کے مقابلے میں باقی تمام دلائل ہیچ ہیں. حضرت سراج الامت، سند الفقراءؒ شیخ احمد سرہندی مجددّ الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ نے (جب ہستی باری تعالیٰ کی پرستش پر آپ پر اعتراض کیا گیا) تو کیا خوب جواب فرمایا کہ "من بایں طور خدارا می شناسم کہ خدائے محمد است" یعنی خداوند جل علا شانہٗ کو میں اِس طریق پر پہچانتا ہوں کہ محمد ﷺ کا خدا ہے.

حضور ﷺ برہان ہیں

کوئی بصارت و بصیرت رکھنے والا انسان اگر حضور ﷺ کے تمام مراتبِ مخصوصہ و جملہ اوصاف مدحیہ کا مطالعہ کرے تو اُس پر خود بخود واضح ہو جاتا ہے کہ حضور ﷺ سرتا پا برہان ہیں اور آپ کا بال بال برکت و رحمت ہے. آپ کو اہلِ معصیت کے لیے چراغِ ہدایت اور اہلِ تقویٰ کے لیے مشعلِ راہ بنا کر مبعوث فرمایا گیا ہے. مخالفین و معاندین اور معترضین و منکرین نے آزمائش و ابتلاء کے جس پہلو سے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پرکھا، ہر لحاظ سے اپنے دعویٰ نبوت و رسالت کی ایک بولتی چالتی دلیل پایا، جس کا نہ کوئی جواب ہوا نہ ہوسکتا ہے.

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ابطحی ہیں

یعنی بطحا کے ساکن. گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسے شہر، ایسے مقام میں رہنے والے ہیں جس کی تقدیس و بزرگی پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں اور نہ اس میں کوئی اَمر مشکل و مخفی ہے. آپ سابق سکونت و رہائش کے لحاظ سے مکی اور مابعد کی ابدی زندگی کے لحاظ سے ابطحی ہیں جن کی فضیلت خدا کی تمام نیک مخلوق کے نزدیک زیادہ مکرّم و مسلّم ہے. حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں خدا نے مخلوق کو پیدا فرمایا تو مجھے اُن کے بہتروں میں رکھا، پھر بہت افراد میں سے قبائل کو پسند فرمایا تو مجھے بہتر قبیلہ میں پیدا کیا، پھر گھروں کو پسند فرمایا تو مجھ کو بہتر گھر میں رکھا.

حضور صلی اللہ علیہ وسلم مومن ہیں

یعنی امن و امان والے. تاریخ شاہد ہے کہ غلاموں پر عرصۂ حیات تنگ ہو چکا تھا انسانیت تذلیل کے انتہائی درجہ پر پہنچ چکی تھی اور اُس سے وہ وحشیانہ سلوک ہو رہا تھا کہ روح لرز اٹھتی ہے مگر اس امن و امان کی سرکار نے اور مساوات کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر ذلیل و غلام مخلوق کو وہ آزادی کا منشورِ اعظم عطا فرمایا کہ اُن کو تاج و تخت کا مالک بنا کر شرف و مجد کی مسندوں پر بٹھا دیا.

حضور صلی اللہ علیہ وسلم مطیع ہیں

جن کے نقشِ قدم کو وہ ثبات نصیب ہوا کہ جن کے فرمودہ رستے پر چلنے والا کبھی گمراہ نہیں ہوسکتا اور خدا کے ایسے فرمانبردار کے لیے اُن کی اطاعت میں اللہ تعالیٰ کی فرمان پذیری پنہاں ہے.

حضور صلی اللہ علیہ وسلم مذکر ہیں

جنہوں نے اپنے خالق و مالک خدا وحدہٗ لاشریک کا پیغام پہنچانے اور بھٹکی ہوئی مخلوق کو اُس کا دروازہ دِکھانے کے لیے نہایت بے بسی کی حالت میں تنِ تنہا وہ پند و نصائح کے دریا بہائے کہ قوم کو باوجود اختلاف کے اُس کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں جھکنا اور صداقت کو تسلیم کرنا پڑا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بے ریائی سے اپنے فریضۂ منصبی کو ادا فرمایا کہ اپنی بیٹی تک کو عملی زندگی بہتر بنانے کی ٹھوس تلقین کر دی.

حضور صلی اللہ علیہ وسلم واعظ ہیں

جن کی زندگی کا علم و عمل دونوں برابر تھے جو فرماتے اُس کا عمل پہلے آپ میں موجود ہوتا یعنی

آپ ﷺ کا قال حال کے مطابق تھا. آپ ﷺ دنیا میں تھوڑے پر قناعت کرتے. ہر حال میں عقبیٰ کو ترجیح فرماتے. دنیا کی بناوٹ اور خوب صورتی سے اعراض فرماتے. کبھی پیٹ بھر کھانا نہ کھاتے، روزہ کو محبوب رکھتے، ساری رات یا اُس کا اکثر حصہ بیدار رہتے اور اللہ تعالیٰ کی بندگی و شکر گزاری کو آرام اور تن آسانی پر پسند فرماتے.

حضور ﷺ امین ہیں

جن کا بچپن معصوم، جوانی بے داغ اور تمام زندگی ایسی صاف اور پاکیزہ تھی کہ دوست تو کیا کوئی دشمن بھی اُس پر کسی قسم کی نکتہ چینی نہیں کر سکتا. ابوسفیان جیسا دشمنِ اسلام عرب سے باہر ایک غیر مسلم سلطنت کے دربار میں کھڑا ہو کر آپ کے حالات بیان کرتا ہے تو بے ساختہ اُس کے منہ سے نکلتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے ہر پہلو میں امین ہے، آپ میں کوئی اخلاقی کمزوری نہیں، حضور ﷺ کی دیانت و امانت پر قوم کا یہ اعتماد ہے کہ اپنی قیمتی اشیاء اُن کے پاس امانت رکھتی ہے اور محفوظ واپس لیتی ہے. آپ نے جس دیانت داری کے ساتھ وحیءِ آسمانی کی دولتِ سرمدی دوسروں تک پہنچائی، اُس پر قرآنِ کریم کا دعویٰ ہے کہ وہ نبوت سے پہلے بھی تو تم ہی میں رہتا تھا، کیا اُس نے کبھی جھوٹ بولا یا وحی کا نام لیا. جو بندوں سے جھوٹ نہ بولے، وہ خدا پر کیوں کر افترا باندھے گا.

حضور ﷺ صادق ہیں

آپ کی زندگی بعثت کے بعد جن زہرہ گداز مظالم میں گھری رہی اور اُن کا مقابلہ جس فوق العادۃ اِستقلال و ثبات کے ساتھ حضور ﷺ نے کیا، حقیقتاً وہ ایک صادق ہی کا کام تھا، ورنہ تمام شیطانی قوتیں جب اپنے ابلیسی جنود اور تمام ہولناکیوں کے ساتھ سچائی کو مٹانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں تو وہاں جھوٹے اور ریا کار و مکار کا کیا کام کہ مقابلہ کر سکے. پتھر برسائے گئے، آب و دانہ بند کیا گیا، گرم ریت پر لٹایا گیا، قتل کے منصوبے کیے گئے اور لالچ دیے گئے، پھسلایا گیا، ستایا گیا، بہکایا گیا، بڑے بڑے توبہ شکن حُسن اور بڑے بڑے استقلال سوز جواہرات دکھائے گئے مگر وہ نبوتِ صادقہ کی چٹانِ صد ہزار تموّج میں بھی نہ ہلی اور اپنی صداقت پر قائم رہی اور اُس کے اِس قیام نے نہ صرف چراغِ توحید کو بجھنے سے بچا لیا بلکہ ساری دنیا کو ایک اَن دیکھے خدا کی پرستش پر مائل کر دیا.

حضور ﷺ مصدّق ہیں

آپ ﷺ نے اپنی سچائی کے ماتحت انسانوں کو اس دنیا میں رہنے سہنے کے قابل بنا دیا. اُن کے قلوبِ قاسیہ کو روشن کر کے بالکل خدا کے سامنے کر دیا. سیاست کی بساط الٹ گئی. امنِ عامہ کا اعلان ہو

گیا. غیر الٰہی غلامی سے نجات مل گئی اور کسی کے دل میں خدائے وحدہٗ لاشریک کے خوف کے سوا کسی کا ڈر نہ رہا.

حضور ﷺ ناطق ہیں

جن کے متعلق قرآنِ کریم گواہ ہے کہ کبھی خدا کی مرضی کے بغیر اور اپنی خواہش کے ماتحت کلام ہی نہیں کرتے. جب اُس نے بولنے کا ارشاد فرمایا بولے، جب سکوت کا حکم ہوا چپ ہو گئے. بے زبان جانوروں نے اُس سے اپنے دکھ کی کہانیاں سنا کر نفع پایا اور بے جان اشیاء نے اُس کے پاکیزہ نطق کی بدولت خدا سے شرفِ ہمکلامی حاصل کیا. یہاں تک کہ دنیا کی کوئی شے اُس کی رحمت سے محروم نہ رہی.

حضور ﷺ صاحب ہیں

ہر ایک کے صاحب اور ہر بات میں ممتاز و اشرف. عربی ہوں یا عجمی حضور اصل و شرافت و نسب میں سب سے زیادہ پاکیزہ و افضل، عقل و حکمت میں غالب، یقین و ارادہ میں قوی، مہربانی اور رحم میں سب سے بڑھ کر، روح و جسم میں نفیس تریں اور بے عیب، عیب و نقص و خامی و کمزوری اور عصیان و طغیان و عار و خار سے صاف ہیں. انبیاء کے صاحب، صدیقین کے صاحب، شہدا کے صاحب اور صالحین و مومنین کے صاحب، ملائکہ کے صاحب، جنات کے اور جنّات کے صاحب، شجر و حجر، چرند و پرند، ارض و فلک، غرضیکہ بعد از خدا حضور ﷺ ساری کائنات کے صاحب ہیں.

حضور ﷺ مکی ہیں

یعنی مکۂ مکرمہ آپ کی جائے ولادت ہے. جو رب العزت کے نزدیک مقدس ہونے کے علاوہ ساری کائنات کا روحانی اور جغرافیائی مرکز ہے. یہ وہ شہر ہے جسے دنیا بھر کے شہروں کے مقابلے میں اُمنیّت کی ڈگری دی گئی ہے اور جہاں پر خدا کے سچے اِحکام کے ماتحت انسان تو انسان رہے کسی حیوان پر بھی ظلم و ستم اور قتل و نہب روا نہیں رکھا گیا اور یہی وجہ اِس کے بلدالامین ہونے کی ہے. جس کی خداوندِ عالم نے بطریقِ احترام قسم کھائی ہے اور تعریف فرمائی ہے.

حضور ﷺ مدنی ہیں

مدینہ طیبہ میں سکونت فرمانے والے ہجرت کرنے والے اور مدنی لوگوں کو اپنی رحمت اللعالمینی سے سرفرازی بخشنے والے ہیں. اِس مقام کو بھی حرم شریف ہونے کی وہی حیثیت حاصل ہے جو مکۂ مکرمہ کو ہے. مسجدِ حرام میں نماز کا ثواب اگر ایک لاکھ نماز کا ہے تو مدینہ منورہ مسجد نبوی میں پچاس ہزار نماز کا، شبِ معراج جبرائیلؑ نے اِسی شہر کی حرمت کے لیے حضور ﷺ سے دو نفل پڑھوائے اور بعض علمائے

کرام وعاشقانِ ذی الاحترام نے تو لکھا ہے کہ یہ حرم افضل ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسمِ اطہر جس آخری آرام گاہ کی مٹی سے مس فرما رہا ہے وہ عرشِ اعظم سے زیادہ مرتبہ رکھتی ہے۔

ادب گاہیست زیرِ آسمان از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ اینجا!

حضور صلی اللہ علیہ وسلم عربی ہیں

اور اِسی نسبت سے ہر عقیدت مند آنکھ خاک عرب کو محبت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ بطحٰی کا ذرہ ذرہ اُسی ذاتِ گرامی کے سبب سے آفتابِ جہاں تاب نظر آتا ہے۔ فرشتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مولد پر انوارِ الٰہی کے روشن طبق لے کر اترتے ہیں تو عشاق آپ کی آرام گاہ پر اپنی جانوں کو نچھاور وقربان کرتے ہیں۔ مکۂ ومدینہ کی گلیاں سرکار کی ضیا پاشیوں سے ایسی بقعۂ نور بن گئی ہیں کہ رب العزت بھی پیار سے اُن کی قسم کھاتا ہے۔ غرضیکہ عرب روحانیوں کی نگاہ میں ہزار حسن اور لاکھ جلوؤں کی جنت گاہ ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہاشمی ہیں

جو عرب میں ایک مشہور ترین باوقار، سلیقہ شعار، حیادار، الوالعزم قبیلہ تھا۔ عاداتِ عالیہ اور تہذیبِ مثالیہ اُس کی ادنیٰ خصوصیات سے تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ رب العزت جل وعلا شانہٗ نے نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کو اِسی اعلیٰ گھرانے میں چمکایا کیونکہ یہ نور اگر کسی ادنےٰ یا متوسط خاندان میں جلوہ گستر ہوتا تو عرب کے شرافت پرست لوگ زبانِ طعن دراز کرتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مورثِ اعلیٰ حضرت ہاشمؓ تھے جو مکۂ مکرمہ میں بالخصوص اور تمام ملکِ عرب میں بالعموم سب سے زیادہ بااثر، ذی اقتدار، پُر شکوہ و اِحتشام، ذی عزت اور جری انسان تھے۔ شاہِ حبش سے میل ملاپ اور حجاج کی میزبانی اُن کی ظاہری الوالعزمی وہوش مندی کی ایک چھوٹی سی دلیل ہے۔ انہی حضرت ہاشمؓ کے اسمِ گرامی پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبتِ خاندانی ہاشمی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم تہامی ہیں

جو بلندئ نسب اور علوِ خاندان کے لیے ایک نمایاں وصف ہے اور محاسن ومدارجِ رسالت کے ساتھ کسی دوسرے کو حاصل نہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم حجازی ہیں

جن کی طفیل حجاز مذہبی مرکز اور مرجعِ خلائق بن گیا اور جس کی عظمت کا سبب صرف حضورؐ کی ذات ہے۔

حضور ﷺ تر ازی وقریشی ہیں

یعنی حضور ﷺ کے مورثِ اعلیٰ حضرت جد الانبیاء وسیدنا ابراہیم علیہ السلام تھے اور آپ کا ہی سلسلہ نسب اِس طرح حضور ﷺ تک پہنچتا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے. جن میں سے ایک کا نام قیدارؓ تھا اور اِن قیدارؓ کی اولاد میں عدنانؓ تھے جن کی اولاد تمام حجاز پر چھا گئی. اِس اولاد میں بھی خاندانِ نبوی کو ہمیشہ اور ہر زمانہ میں ایک امتیاز رہا. وہ شخص جس نے سب سے پہلے اِس خاندان کو قریش کے نام سے ملقب کیا. نضر بن کنانہ تھا. نضر بن کنانہ کے بعد فہر، قصی بن کلاب کو بڑا اقتدار نصیب ہوا اور اِسی قریش کے لقب کے سبب حضور ﷺ کو قریشی ذکر کیا جاتا ہے کیونکہ اِنہی کی اولاد سے چند پشتوں میں آپ کے جدِ امجد تھے.

حضور ﷺ مضری ہیں

جو اپنی عالی نسبی میں ممتاز ہیں.

حضور ﷺ اُمیّ ہیں

جنہوں نے اپنی سعید فطرت کے ماتحت قدرت کے مکتب میں تعلیم حاصل کی اور جن کی ابتدائی و انتہائی تعلیم کا کالج خدا کا دربار تھا. کسی استادِ علم وفن کے سامنے تعلیم حاصل کرنے کے لیے زانوئے ادب تہ کرنے سے ربّ العزت نے محفوظ رکھا کیونکہ جو خود تعریف کیا جانے والا ہو. اُس کے مقابلے میں سے کوئی اور بلندی (جہاں وہ جھکے) اُس کی توہین ہے. گو حضور ﷺ ظاہری استاد نہ رکھتے تھے اور ہر قسم کی تعلیم وتربیت سے محروم رہے. مگر اپنے غلاموں اور پیروؤں کو وہ علوم سکھائے کہ اُن پر مستقل ترقی کے دروازے کھل گئے. کائنات بھر کی خوابیدہ قوتیں بیدار ہو کر مصروفِ عمل ہو گئیں اور متلاشیانِ حق کو وہ عرفان عطا کیا کہ ماسوی اللہ کا خوف خود بخود دلوں سے دور ہو گیا. کیا شان ہے اُس اُمیّ ہونے کی جس کی ذات نے علم وکمال کے دریا بہا دیئے اور جہاں بھر کے اہلِ علوم دیوانے بنا دیئے.

حضور ﷺ عزیز ہیں

جن کو ہر حال میں غلبہ ہوا اور جن کی پیدائش ہی غلبہ کے لیے تھی. آپ کی کامل عقل وذکاوت، قوتِ حواس، قبولِ دعا، فصاحتِ زبان، اِعتدالِ حرکات، حُسنِ شمائل، خُلقِ عظیم، تدبر، سیاستِ عامہ وخاصہ، زیادتی علمِ الٰہی وہ خصائص ہیں جن کو شرع نے ثابت کیا ہے اور جن کے غلبہ میں بمقابلہ عوام اہل جہان کے کوئی شبہ نہیں. ایک صحابی وہب بن منبہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے سابق انبیاء علیہم السلام کی مُنزّل من اللہ

اکہتر (۷۱) کتابوں میں پڑھا ہے کہ نبی آخرالزمان محمد رسول اللہ ﷺ سب سے زیادہ افضل، عقل مند اور سب پر غلبہ ظاہری و باطنی رکھنے والے ہوں گے کیونکہ حضور کو جوامع الکلم، لواء الحمد، مقامِ محمود، دشمنوں پر دو ماہ کی راہ پر غلبہ اور تمام زمین مسجد برائے عبادتِ الٰہی، شفاعتِ کبریٰ وحوضِ کوثر سے سرفراز فرمایا گیا ہے۔

حضور ﷺ حریص ہیں

کیونکہ حضور ﷺ کو ہر اُس شخص پر ایمان لانے کی حرص ہے۔ جو خدا کی نافرمانی سے اپنے آپ کو عذابِ الٰہی کا مستحق بنائے اور آپ کو ہمیشہ وہ باتیں ناگوار معلوم ہوتیں جو اُمت کو دکھ دینے والی ہوں۔ آپ تکلیف دینے والوں اور دشمنوں کے لیے بھی یہ دعا فرمایا کرتے کہ الٰہی اِن کو ہدایت کر، تاکہ یہ مجھے پہچان کر اپنے آپ کو جہنم کے عذاب سے بچالیں اور آپ نے کبھی کسی کے لیے بددعا نہیں فرمائی۔

حضور ﷺ رؤف ہیں

جو اُمت کے لیے اِنتہائی شفقت فرماتے۔ کسی کو کوئی تکلیف ہوتی تو آپ اُس سے زیادہ اُس کی تکلیف کو خود محسوس فرماتے۔ یہاں تک کہ کسی بچے کا رونا، کسی غریب کی غربت، کسی مسافر کی تنگی، کسی قرض دار کی قرض داری آپ کو بے چین کر دیتی۔ اگر حضور ﷺ کسی بچے کے رونے کی آواز سنتے تو نماز کو مختصر فرما دیتے۔ رات کی نماز، وصال کا روزہ، تراویح، تہجد، ہر نماز کے ساتھ مسواک کرنا وغیرہ، اعمال کے متواتر کرنے سے لوگوں کو بچا دیا تاکہ فرض نہ ہو جائیں۔ آپ نے دعا فرمائی کہ مولا کریم میری گالی اور لعنت کو اگر میں کسی کے حق میں کروں تو اُس کو اُن کے لیے رحمت فرما دے۔ آپ اپنے ہر مخالف کو توبہ کے لیے ڈھیل دیا کرتے۔ ظالموں نے طرح طرح کی ایذائیں دیں۔ مجنون اور دیوانہ کہا۔ جسمِ اطہر پر نجاست پھینکی۔ آب و دانہ بند کر دیا۔ شعبِ ابو طالب میں محصور رکھا۔ راستے میں کانٹے بچھائے، گلے میں پھندے ڈالے، پتھر برسائے، دانت مبارک شہید کئے، گھر اور وطن سے نکالا، مگر حضور ﷺ کی جبینِ اقدس پر شکن تک نہ آیا اور ہر وقت ایسے لوگوں کے لیے رحمت ہی طلب کی اور اپنے رحمتِ مجسم ہونے کا ثبوت دیا۔

حضور ﷺ رحیم ہیں

جنہوں نے ہر دشمن پر رحم و کرم فرمایا اور کسی سے کسی ظلم کا کبھی بدلہ نہیں لیا۔ ہبار ابن الاسود جس نے حضور ﷺ کی لختِ جگر سیدہ زینبؓ کو نیزہ مار کر شہید کیا۔ حضرت حمزہؓ کا قاتل وحشی، آپ پر حملے کرنے والا دعثور، جادو کرنے والا لبید بن الاعصم، گوشت میں زہر دینے والی یہودیہ عورت، عبداللہ بن ابی منافق وغیرہ وغیرہ وہ لوگ ہیں۔ جن کے اعمال قابلِ بخشش نہ تھے مگر حضور ﷺ نے باوجود قدرت و

طاقت کے سب پر رحم فرمایا اور معاف کر دیا اور ساتھ ہی مخالفین کے لیے ہمیشہ دعا فرمائی کہ اللہ کریم ان کو شناخت کی آنکھیں عطا فرماتا کہ مجھے پہچان جائیں.

حضور ﷺ یتیم ہیں

یتیمی کی گود میں پرورش پاتے ہیں. یتیموں کی سرپرستی فرما کر انہیں دُرِ یتیم بناتے ہیں اور معاندین کے اِسی اعتراض کی جڑ پر کلہاڑی چلاتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا. اگر اسلام کی اشاعت کے لیے تلوار ضروری ہوتی تو وہ بجائے ایک یتیم کی تولیت و سرپرستی کے کسی سلطنت و سلطان کے ہاں ظہور فرماتا اور تیغوں کے سائے میں اپنی نشوو ارتقاء کا بنیادی پتھر رکھواتا. کاش کہ سطحی نظر رکھنے والے معترضین اُس یتیم کے دنیا میں اسلام پھیلانے اور لانے کی حقیقت کو سمجھتے.

حضور ﷺ غنی ہیں

اور ایسے جو دوسروں کو غنی فرما دیتے ہیں. جیسا کہ قرآنِ کریم میں ہے. کاش کہ وہ راضی ہوتے اِس پر جو دیا اُن کو اللہ تعالیٰ نے اور اللہ کے رسول ﷺ نے، پھر دوسرے مقام پر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو غنی کیا اور اللہ کے رسولِ کریم نے غنی کیا. گویا حضور ﷺ خود غنی اور مستغنی عن الخلق ہیں اور حضور ﷺ کو خزائنِ الٰہیہ کی کنجیاں دی گئیں ہیں. مولا کریم کے خزانہء جود و کرم سے جو کچھ کسی کو ملتا ہے اُس کی کنجیاں حضور ﷺ ہی کے دستِ مبارک میں ہیں. حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ سب سے بہتر سب سے بہادر اور سب سے سخی تھے. آپ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو اتنا سونا دیا کہ آپ اٹھا نہ سکے. نوے ہزار درہم بیک وقت آپ کے پاس آئے تو حضور ﷺ نے بوریئے پر رکھ کر سب تقسیم فرما دیئے اور کسی سائل کو محروم نہ فرمایا. حضور ﷺ کی نسبت عطاء و غناء کی روایت مشہور ہے کہ آپ نے کسی سوال کے جواب میں نہ نہیں فرمائی.

حضور ﷺ جوّاد ہیں

جو مولا کریم کی خاص عنایتوں اور خزانوں کے امانت دار تھے. ان پر خدا کی تمام نعمتیں ختم ہوئیں اور تکمیلِ دین کر دی گئی. خداوندِ عالم کے اس امین نے لازوال دولت کو تمام و کمال دنیا والوں تک پہنچایا اور باقی نعائمِ الٰہیہ سے بھی مالا مال کر کے حقِ سخاوت ادا فرمایا.

حضور ﷺ فتاح ہیں

جنہوں نے مفتوحوں کے ساتھ رواداری برتی. مغلوب قوموں پر جبر و ظلم نہیں کیا. اُن کے مذاہب

کو مٹانا اور اُن کے معابد کو گرانا، اُن کے زن وفرزند کو غلام بنانا اور اُن کے تاجداروں اور سرداروں کو ذلیل کرنا، اُن کے اموال وعیال کو زندہ آگ میں جلا دینا اور طرح طرح کے عذابوں میں مبتلا کر کے مارنا اپنا شعار اور وطیرہ عمل نہیں بنایا بلکہ مفتوحوں اور مغلوبوں کو انسان سمجھا اور اُن کے ساتھ انسانوں کا سا سلوک کیا کیونکہ شاہانہ زندگی کی خصوصیتیں ایک داعی الی اللہ اور نبیءِ برحق میں نہیں ہوتیں. وہ دنیا کی نفسیاتی حرص وآز، شان وشکوہ، نمود ونمائش، شوکت وجلال، عزت ونا موری، رزق وبرق، گرانبہا ملبوسات، لذیذ اغذیہ، رفیع الشان محلات، تخت وتاج، زہرہ جمال اور حور پیکر نازنینوں کے جھرمٹ، معاندین سے انتقام، سلب ونہب، خزانہ وزر وجواہر، ہوس ملک گیری اور جنگ وپیکار کے تسلسل کے لیے تہ تیغ کرنا لازم نہیں سمجھتا بلکہ اُس کا نقطۂ نگاہ بالکل جداگانہ ہوتا ہے. ایک بادشاہ فاتح میدان جنگ میں اگر سرِ پُر غرور رکھتا ہے تو ایک پیغمبرِ خدا، جبینِ نیاز، ایک بادشاہ میدان جنگ میں زبانِ خودستا ہوتا ہے. تو ایک داعیٔ حق زبانِ شکر سنج، ایک بادشاہ غیض وغضب کا آتشکدہ ہوتا ہے. تو ایک رسول رحم و کرم کا سرچشمہ، ایک بادشاہ جاہ وجلال کا دیوتا ہوتا ہے تو ایک مفادِ توحید نیاز مند بندہ، یہی وجہ ہے کہ ارضِ عالم پر جس قدر جلیل القدر فاتح رونما ہوئے ہیں. اُن کے مقابلے میں اُس رحم دل فاتح کی شان ہی الگ ہے. اُس کا مظفر ومنصور چہرہ جدھر کو پھرتا ہے. ظلِ الٰہی وتعلیمِ ربانی اُس کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں. وہ لڑائی میں کبھی پہل نہیں کرتا اور اجسام کی بجائے قلوب وارواح کو تسخیر فرماتا ہے.

حضور ﷺ عالم ہیں

جن کا علم علمِ الٰہی کا جزو ہے. جو فرماتے ہیں علم الٰہی کے ماتحت ہی فرماتے ہیں. اُنہوں نے علوم و معارف کے پردے چاک کئے اور وہ کچھ اہلِ جہان کو بتایا جو راہنماؤں میں حضور ﷺ سے پہلے کسی نے نہ بتایا اور نہ بعد میں کوئی بتا سکے گا حضور ﷺ اپنی تعلیم کا آپ ہی نمونہ اور آپ ہی مثال ہیں کیونکہ راہنماؤں میں ماکان وما یکون نہ کوئی پیدا ہوا اور نہ ہوگا.

حضور ﷺ طیّب ہیں

پاکیزہ پیدا ہوئے اور پاکیزہ رہے. آپ اپنی صفائی قلب، پاکیزگیِ ضمیر اور بلندیٔ روح اور طہارتِ جسم کے لحاظ سے وہ ہیں جن پر عالمِ انسانیت کو ناز ہے. مگر حضور ﷺ کو اس پر فخر نہیں بلکہ ہر مداح کو اپنی مدح میں مبالغہ سے منع فرماتے ہیں اور ایسے پاکباز ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دوست فرما کر گناہ سے پہلے معافی کی خبر دی تا کہ ہر حال میں آپ کا طیّب ہونا منکشف ہو جائے.

حضور ﷺ طاہر و مطہّر ہیں

یہ وہ طہارت ظاہری و باطنی ہے. جس کو کتاب اللہ نے واضح طور پر بیان فرما دیا ہے. آپ ایک عظیم الشان مصلح کی حیثیت میں خود ایسے فطری پاکیزہ ہیں کہ ہر وہ عمل یا شے جو حضور ﷺ کے سامنے آئے یا ساتھ لگے اُس کو بھی طہارت یافتہ بنا دیتے ہیں. آنجناب رسالت مآب ﷺ کی طہارت کا یہ شاندار مظاہرہ اعمالِ ظواہرہ سے گزر کر باطن تک پہنچ کر رہا. حضور ﷺ نے نہ صرف قتل و غارت، سلب و نہب، ڈکیتی اور چوری، دختر کشی و مادر نہادی، قمار بازی و شراب خوری، زناء و عنا، خیانت و حماقت، بددیانتی و سود خوری، بے حیائی و بد باطنی، طعن و تشنیع، استہزاء و مذاق، شرک و کفر، نسلی مفاخر و امتیازات کا کُلّی خاتمہ کیا بلکہ غیبت و بد گوئی، بہتان و اتہام، حسد و کینہ، بغض و عداوت، ریا و نمود، رسم و رواج، غضب و غرور اور فتنہ و فساد سے بھی بھٹکتی ہوئی مخلوق کو پاک و صاف کر دیا. نفاق و شقاق مٹائے اور قلوب و نفوس انوارِ الٰہی سے مجلّا فرما دیئے.

حضور ﷺ خطیب ہیں

اور خطیب الانبیاء ہیں. جملہ انواعِ کلام اور اسالیبِ بیان حضورؐ پر ختم ہوئے. آپ کا کلام ہر لحاظ سے تمام اہلِ قال کا پیشوا اور آپ کے اشارات من کل الوجوہ اہلِ حال و علم کے لیے حجتِ قاطع ہیں. آپ ہر آنے والے سائل سے اُس کی اپنی زبان میں گفتگو فرماتے اور شافی جواب سناتے. اِس بیان کا مجموعہ اِس قدر ہے. جس کا حصر نہیں ہوسکتا. باوجود اُمّی ہونے کے یہ کمال بجائے خود آپؐ کی نبوتِ تامہ پر ایک برہانِ قوی اور دلیلِ محکم ہے. اہلِ دنیا کی عقلیں حیران اور زبانیں اُس کے احاطہ سے عاجز ہیں.

حضور ﷺ فصیح ہیں

آپ اُن پُرفسون و معجزانہ کلمات کا بے انتہا ذخیرہ رکھتے ہیں کہ بڑے بڑے دانش مند انتہا معلوم کرنے میں دیوانے ہوگئے ہیں. بہت سے اِسی فصاحت و بلاغت کے بھنور میں ایمان لائے اور بہت سے حق و ناحق کی وادیوں میں بھٹک کر رہ گئے. کسی نے کہا کہ جادو ہے اور کوئی خدا کی زبان سمجھ کر قربان ہوگیا آخر اِس فصاحت کو سجدے ہوئے اور منکرین ذلیل ہو کر مٹ گئے.

حضور ﷺ سیّد ہیں

جو تمام انسانوں سے مکرم اور تمام انبیاء علیہم السلام سے افضل ہیں اور سیادت ہی کے لیے مبعوث فرمائے گئے ہیں.

حضور ﷺ متقی ہیں

جن کی پیدائش میں ہی کمالِ خلقت اور جمالِ صورت، قوتِ عقل، صحتِ فہم، فصاحتِ زبان، طاقتِ حواس، اعتدالِ حرکات، شرفِ نسب، عزتِ قومی، بزرگی وطن وغیرہ رکھے گئے اور تمام اخلاقِ عالیہ، آدابِ شرعیہ دینیہ، علم وحلم، صبر وشکر، عدل وزُہد، تواضع وعفو، سخاوت وشجاعت، حیا ومروّت، خاموشی وسکون، وقار وعظمت، عفت ورحمت، حُسنِ ادب ومعاشرت اِن کا مجموعہ ہیں. حضور ﷺ وہ اعلیٰ کردار اور مزاج پاکیزہ رکھتے جن کے دوست دشمن مداح رہے. حضور ﷺ کے خُلقِ عظیم کے پھول ایّامِ بہار کے کبھی پابند نہیں ہوئے. وہ ناخزاں دیدہ ہونے کی حیثیت سے ہر فصل میں کھلے اور ہر موسم میں تروتازہ رہے. جھوٹ، غیبت، ترش روئی، بدعہدی، بدکلامی آپ کی فطرت میں ہی نہ تھے کیونکہ یہ رحمت اللعالمینی کی شان کے منافی ہیں. حضور ﷺ کا بچپن، جوانی بلکہ ساری مقدس زندگی معصوم اور گناہوں سے پاک ہے اور شان کی اصلیت یہ ہے کہ حضور ﷺ کا نور صُلبِ آدمؑ ونوحؑ وحضرت ابراہیمؑ کے ذریعہ آپ کے والدین میں ظہور پذیر ہوا درانحالیکہ پشت در پشت ارحام طاہرہ واَصلاب طیبہ میں آتا رہا. جن میں کوئی ایک بھی حرام کا ارتکاب کرنے والا نہیں تھا.

حضور ﷺ امام ہیں

امام الانبیاء، امام الاتقیا والاصفیا، امامِ وقت، امامِ زمانہ جن کے تمام اوصاف میں سے ایک وصف امام ہونے کا ذکر سابقہ کتب سماوی میں بھی آیا ہے چنانچہ اُمیُّوں کے حافظ، متوکل، نرم دل، بازاروں میں نہ چلانے والے، بدی کا انتقام نہ لینے والے، دینِ غیر مستقیم کو درست فرمانے والے، ہر خوبی کے مالک، تسکین کو لباس اور نیکی کو شعار بنانے والے، تقویٰ کے حامل، حکمت میں معقول، صدق ووفا کے عامل، عفو واحسان میں کامل، ہدایت کے امام، تورات شریف نے بیان فرمائے ہیں اور باقی کتب یا قرآنِ کریم میں جو بیان فرمایا گیا ہے وہ علاوہ ازیں امامتِ کائنات پر شاہد ودال ہے.

حضور ﷺ بارّؒ ہیں

جو باوجود بلند منصب واعلیٰ مرتبہ ہونے کے نیکی کا مجسمہ وتواضع پسند اور کبر ونخوت سے پیار نہ کرنے والے تھے. مسکینوں کی عیادت کرتے اور فقیروں کے ساتھ بیٹھتے. غلام کی دعوت قبول فرماتے اور صحابہ سے مل کر رہتے، گدھے پر سواری فرماتے، سادہ لباس زیب تن کرتے اور اگر جو کی روٹی اور باسی سالن کی طرف بھی بلائے جاتے تو انکار نہ فرماتے، گھر میں گھر والوں کی خدمت کرنا، کپڑوں میں پیوند لگانا اور جوئیں دیکھنا، جوتا گانٹھنا، بکری کا دودھ دُہنا، گھر میں جھاڑو دینا، اونٹ کا گھٹنا باندھنا اُس کو

چارہ ڈالنا، بعض اوقات خادمہ کو آٹا گوندہ دینا، آپ کی پاکیزہ عادات میں داخل تھے. حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ حضور ﷺ کے ساتھ بازار گیا اور آپ نے اپنا پاجامہ خریدا جب واپس ہونے لگے تو میں نے ازراہِ خدمت وہ پاجامہ اٹھا کر ساتھ چلنا چاہا تو حضور ﷺ نے مجھ سے پاجامہ لے لیا اور فرمایا کہ شے کا مالک اپنی شے کے اٹھانے کا زیادہ مستحق ہے.

حضور ﷺ شافٍ ہیں

یعنی دَافِعِ الْبَلَاءِ وَ الْوَبَاءِ وَالْقَحْطِ وَالْمَرَضِ وَ الْاَلَم ہیں. اپنی اُمت کے لیے بالخصوص اور تمام کائنات کے لیے بالعموم، تدبیر و تصرف، اعداد و اعانت، حاجت روائی و مشکل کشائی فرماتے ہیں اور حضور ﷺ کو یہ قدرت بہ عطائے رحمان و بوساطتِ ربّانی بہترین طور پر حاصل ہے. حضور ﷺ رحمتِ عالم ہیں. جن کی وجہ سے کفار و مشرکین پر عذاب نہیں آتا. قحط سالیاں پیدائش کے ساتھ ہی دور ہو گئیں. غلاموں میں سے جو کچھ کسی نے طلب کیا اُس کو ملا. کسی کو دنیا عطا فرمائی اور کسی کو جنت کی ضمانت کی. حضور ﷺ بتملیکِ الٰہی جنت کے مالک، کارخانۂ الٰہی کے مختار ہونے کی حیثیت سے ضمانتیں لیتے، بیع کرتے اور ذمے داری فرماتے ہیں اور اِس مضمون میں بے شمار آیات و احادیث ہیں جن کو اپنے اپنے مقامِ ضرورت پر کتاب ہذا میں بیان کیا جائے گا. ہاں بعض لوگ فی زمانہ حضور ﷺ کی اس شان کے منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کو کسی نوع کی قدرت نہیں اور نہ اللہ کریم جل مجدہٗ کے ہاں وہ کسی کی حمایت کر سکتے ہیں اور نہ کسی کے وکیل بن سکتے ہیں اِس کا جواب صرف یہ ہے کہ کور باطن اور بے بصر ہیں اگر چمگادڑ کی آنکھ دن کو نہ دیکھ سکے تو آفتاب کا کیا قصور ہے جو طلوع نہ ہو.

حضور ﷺ متوسّط ہیں

یعنی اعتدال پسند، کسی قول و فعل میں حد سے زیادتی بھی پسند نہیں فرمائی اور نہ کمی کو ترجیح دی، اکثر ہوتا ہے کہ انسان ایک خوبی کو انتہا تک پہنچاتا ہے تو دوسری سے عاری ہو جاتا ہے. مثلاً مروّت میں ترقی کی تو عقل و ہوش سے رہ گیا. عاجزی و انکساری اِسی پر ٹوٹی کہ شجاعت و جواں مردی سے علیحدہ ہو گیا، رحم میں بڑھا تو انصاف سے جاتا رہا لیکن حضور ﷺ وہ کامل الاخلاق محبوب ہیں جن کی اعتدالی کیفیت کی تعریف فرمائی گئی ہے اور ساتھ ہی افقِ اعلیٰ پر بھی بیان فرمایا گیا ہے. گویا یہی ایک ذاتِ قدسی ہے جس میں بیک وقت جملہ اخلاق کا اجتماع پایا جاتا ہے. اہلِ دنیا نے نہ یہ نمونہ دیکھا اور نہ آئندہ دیکھ سکنے کی توقع ہو سکتی ہے. آپ عبادت، ریاضت، شجاعت، رحمت، سخاوت اور حُسنِ معاملہ و ایثارِ خلق، غرضیکہ ہر صفت میں ایسے کامل و اکمل ہیں کہ آپ کی مثل رب العزت نے پیدا ہی نہیں فرمائی.

حضور ﷺ سابق ہیں

جن کی سبقت پر قرآنِ کریم گواہ ہے. تیسرے پارے میں ذکر ہوتا ہے کہ روزِ میثاق ایک مجلس ہوئی ہے اُس میں رب العزت تمام انبیاء علیہم السلام سے عہد لیتے ہیں کہ تمہاری نبوت و رسالت کے زمانہ میں اگر میرے رسول آ جائیں تو کیا تم اُن پر ایمان لاؤ گے اور اُن کی مدد فرماؤ گے. جمیع انبیاء عرض کرتے ہیں کہ ہم اقرار کرتے ہیں کہ ایسا ہی کریں گے چنانچہ اُس عہد کی پابندی میں تمام انبیاء کرام اُسی رسول ﷺ کی پیش گوئیاں فرماتے رہے کیونکہ آپ سردارِ انبیاء اور نبی آخر الزماں ﷺ ہیں چنانچہ اس وقت بھی جس قدر صحف سماوی و کتب الہامی موجود ہیں وہ تمام تر تحریفوں اور ترمیموں کے باوجود بھی حضور نبی کریم ﷺ رؤف ورحیم کی تشریف آوری کے تذکار میں بھری ہوئی نظر آتی ہیں. سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی دعا، نوید مسیحا، سلیمان علیہ السلام کی بشارت، موسیٰ علیہ السلام کی ہدایت، ہرمیاہ ویسعیاہ کی اشارت، ملاکی نبی کی وضاحت، یہ تمام تر حضور ﷺ کی اولیت وسابقیت پر روشن دلائل ہیں اور خود حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ کائنات اور انبیاء کا تو ذکر ہی بعید ہے میں اُس وقت بھی نبی ہی تھا. جب حضرت آدم علیہ السلام کو ابھی مٹی اور پانی سے پتلا بنانے کے لیے اکٹھا کیا جا رہا تھا.

حضور ﷺ مقتصد ہیں

یعنی میانہ رو، ہر کام میں افراط وتفریط سے پرہیز فرماتے اور درمیانی حیثیت کو اختیار فرما کر یہ ارشاد کرتے کہ یہی حالت بہتر ہے. حضرت عائشہ صدیقہ اُم المومنینؓ فرماتی ہیں کہ اگر آپ پر مختلف اشیاء اعلیٰ وادنیٰ پیش کی جائیں تو حضور ﷺ اوسط درجہ کو پسند فرماتے.

حضور ﷺ مہدی ہیں

اور صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت فرماتے ہیں. جس کے معنی اللہ کی طرف اِس کے حکم کے ماتحت بلانے والے کے بھی ہیں، معمورۂ عالم جب عصیان وطغیان کی تاریکیوں میں گھرا ہوا تھا. انسان انسانوں کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے اِس ظالمانہ ماحول میں ہدایت کا وہ نور چمکایا کہ دلوں کو جوڑ کر سب کو بھائی بھائی بنا دیا. نسل ورنگ کی تمیز مٹا کر مساوات کی حقیقت کھول دی، عورت نہایت ذلیل ترین حالت میں تھی. کوئی شخص لڑکی کا باپ بننا گوارا نہیں کرتا تھا عورت کو وہ بلندی مراتب عطا فرمائی کہ عزت و حرمت میں مردوں کے برابر بنا دیا. غلاموں پر عرصہ حیات تنگ تھا. اُن سے وحشیانہ سلوک ہوتے جن کا بیان بھی روح کو لرزا دیتا ہے مگر حضور ﷺ نے اُن کو صرف مساوات کی سطح پر ہی لا کر کھڑا نہیں فرمایا بلکہ تخت وتاج بھی ساتھ ہی بخش دیئے اور شرف وبزرگی کی مسندیں اُن کے لیے بھی ودیعت فرما دیں.

حضور ﷺ حق ہیں

مولا کریم نے فرمایا ہے کہ جھٹلانے والوں کی طرف حق آیا مگر اُنہوں نے اِس کو جھٹلایا. اِس سے حضور ﷺ کا صدق وامر ثابت ہے وہ حق ہے اور حق کے ساتھ حق لے کر آیا ہے تا کہ جھوٹوں پر اُس کو ظاہر فرمائے. لوگوں نے مخالفت کی مگر انجام کار حق کی فتح ہوئی. خلافتِ الٰہیہ کے مقام سے سارا عرب اس کا مطیع ہو گیا اور قیصر و کسریٰ کے تاج اس کے قدموں میں آ گرے. اس عظیم الشان کامیابی کے باوجود اس کی حقیقت میں فرق نہ آیا اور قیامِ حق کے سبب فخر و غرور اس پر اپنا عکس نہ ڈال سکے.

حضور ﷺ مبین ہیں

یعنی روشن رسول، جن کی صداقت پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے اور اپنی دلیل آپ ہیں.

حضور ﷺ اوّل و آخر ہیں

مخلوق کے وجود سے پہلے خلقت میں سبقت فرمانے والے اور بعثت میں سب سے آخر ظاہر فرمائے گئے چنانچہ صحیح حدیث میں ارشاد ہوتا ہے کہ میں تمام انبیاء سے پہلے ہوں اور بعثت میں سب سے آخر ہوں اور فرمایا کہ میں سب سے پہلے اُن لوگوں میں سے ہوں گا جن کے ساتھ زمین اٹھے گی اور اُن سب سے پہلے ہوں گا جو جنت میں داخل ہوں گے. اوّل شفاعت کرنے والا اور اوّل شفاعت قبول فرمایا گیا میں ہوں. مجھ پر یعنی میرے قدم پر ہی لوگ حشر کریں گے. الغرض حضور ﷺ تخلیقِ کائنات کا بیج اور تکمیلِ شش جہات کا باعث ہیں. ظہورِ نور السموٰت والارض کی ابتدا حضور ﷺ ہی سے ہوئی اور حضور ﷺ ہی اُس کا تتمہ ہیں. ربّ العزت کی مخلوق میں نہ حضور ﷺ سے اوّل کوئی ہے اور نہ مراتب میں بعد کو کوئی آخر ہو سکتا ہے. تمام مراتب و مدارج حضور ﷺ ہی سے شروع ہوئے اور حضور ﷺ ہی میں ختم و گم ہو کر رہ جائیں گے.

حضور ﷺ ظاہر و باطن ہیں

رازِ الٰہی کے کھولنے اور پانے والے کیونکہ حضور ﷺ کا وجود ہی ہستیٔ باری تعالیٰ کی ایک روشن دلیل ہے. جس نے حضور ﷺ کو ایمان کی آنکھ سے مطالعہ کیا اُس نے خدا کو پا لیا. یہی ظاہر و باطن ہیں جن پر ہر لحاظ سے خالق الکل جلوہ گر ہے.

حضور ﷺ رحمت ہیں

اور تمام مخلوق کے لیے رحمت ہیں. جن و انسان کے لیے رحمت ہیں، مومن و کافر کے لیے رحمت

ہیں، مومن کے لیے رحمت بسبب ہدایت کے، منافق کے لیے رحمت بسببِ امان از قتل کے اور کافر کے لیے رحمت بہ سببِ تاخیر عذاب کے ہیں. حضور ﷺ کی وجہ سے تمام مخلوق اُن عذابوں سے محفوظ ہو گئی ہے جو پہلی امتوں پر آتے رہے ہیں. جنہوں نے اپنے پیغمبروں (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کو جھٹلایا، حضور ﷺ نبیُ رحمت، نبیءِ توبہ، نبیُ ملاحم ہیں، آپ کا رحمت ہونا کسی خاص قوم یا خاص ملک کے لیے نہیں ہے، وہ رحمت کا بادل مشرق و مغرب اور شمال و جنوب پر یکساں برسا، جس طرح بادشاہ اُس کے چشمۂ کرم سے بہرہ یاب ہوئے اُسی طرح غریبوں نے بھی اُس کی رحمت کے موتیوں سے اپنی جھولیاں بھریں. جس طرح نشیب و فراز نے اُس سے نفع اٹھایا اُسی طرح حاضر و غائب مستفیض ہوئے اور شش جہات کی کوئی چیز اُس کی رحمت سے خالی نہ رہی.

حضور ﷺ مُحَلّل ہیں

یعنی اُن اشیاء و افعال کے مجاز ہیں جو کسی پر حلال نہ تھے. حضور ﷺ نے تمام بندشوں کے دروازے کھول دیئے ہیں.

حضور ﷺ مُحَرِّم ہیں

ہر وہ چیز جو فطرتاً اپنی تاثیر کے ماتحت انسان کے لیے مضر تھی. حضور ﷺ نے انسانوں کے فائدے کے لیے اس کے استعمال سے صرف منع ہی نہیں فرمایا بلکہ اس کے مرتکب پر وعید اور سزا بھی فرمائی ہے تاکہ رافت کے ماتحت یہ لوگ دینِ فطرت کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوں تو عظمت و ہیبت سے اُن کو اِس مضر شے یا فعل سے باز رکھا جائے.

حضور ﷺ آمرٌ وناہٍ ہیں

یعنی صاحبِ امر و نہی ہیں. حضور ﷺ سے زیادہ ہاں اور نہ فرمانے میں کوئی سچا نہیں، صاحبِ قصیدہ بردہ فرماتے ہیں کہ صاحبِ امر و نہی ہونے کے یہ معنی ہیں کہ حضور ﷺ حاکم ہیں. حضور ﷺ کے سوا عالم میں کوئی حاکم نہیں اور نہ وہ کسی کے محکوم ہیں بلکہ صاحبِ فرمان، مالکِ افتراض و والیٔ تحریم ہیں اور یہ وہ شان ہے جو بعد از خداوند جلّ وعلاشانہٗ، حضور ﷺ کے سوا کسی کو حاصل نہیں، آپ نے صحرا نشینوں، اُمیّوں، بے تہذیبوں اور اُجڈّوں میں پیدا ہو کر اخلاق، معاشرت، معیشت، سیاست وغیرہ معاملات کے علاوہ امر و نہی کے وہ قوانین وضع فرمائے کہ دنیا میں حیرت انگیز ترقی کے باوجود آج تک اُن میں کسی کو ترمیم کی گنجائش نظر نہیں آئی.

حضور ﷺ شکور ہیں

یعنی ہر لحظہ بارگاہِ ربّ العزت میں شکر گزار ہیں۔ ہر نعمت و مشقت پر مولا کریم کا شکر ادا فرماتے۔ ایک مرتبہ حضرت اُم المومنین عائشہ صدیقہؓ نے دیکھا کہ آپ رات کی نماز میں اِس قدر قیام فرماتے ہیں کہ آپ کے قدم مبارک سوج جاتے اور متورّم ہو کر اُن سے خون کی سیرین پھوٹ نکلتیں تو حضرت صدیقہؓ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ ﷺ کیا آپ کو اللہ کریم نے بے شمار فضائل و محاسن سے نہیں نوازا؟ اور آپ پر لاتعداد انعامات نہیں فرمائے؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ہاں اللہ کریم نے مجھ پر بے انداز نوازشات فرمائی ہیں جو کسی کو بھی حاصل نہیں تو حضرت صدیقہؓ عرض کرتی ہیں کہ پھر آپ عبادت میں اِس قدر تکلیف کیوں اٹھاتے ہیں اور اِس قدر مشقت کیوں فرماتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا کہ کیا تو چاہتی ہے کہ میں اُس کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟ یعنی جس مولا کریم نے مجھ پر یہ کرم نوازی کی ہے میرا بھی فرض ہے کہ میں اُس کا شکریہ ادا کروں۔

حضور ﷺ قریب و منیب ہیں

ربّ العزت کے حضور میں سب سے آگے، جنت میں سب سے آگے، پیدائش میں سب سے آگے اور شفاعت میں سب سے آگے ہیں۔ وہ زندگی کے ہر شعبے میں بنی نوع انسان کی مکمل راہنمائی فرماتے ہیں اور رجوع الی اللہ کا یہ عالم ہے کہ دین کے ساتھ دنیا کو بھی لے چلنا حضور ﷺ کی ایک ادنیٰ سی خصوصیت ہے۔ فطری طور پر ایک گمراہ، پابندِ ہوا و ہوس اور زمانہ ناشناس، تہذیب و تعلیم سے گری ہوئی قوم کے لیے دین و دنیا کا یکجا قوام کر کے انتہائی ترقی کے زینہ پر لے جانا حضور ﷺ کا معجزہ ہے۔ جن کی تبلیغ کی گہرائی میں ساری دنیا سما گئی۔

حضور ﷺ مبلّغ ہیں

جنہوں نے شریعتِ مطہرہ کے احکام کھول کھول کر خلقِ خدا کو پہنچائے۔ جنسی اور نسلی تعصبات کروڑوں انسانوں کو پامال جور و ستم بنائے ہوئے تھے۔ ہر قوم جو طاقت رکھتی تھی روئے زمین کی ہر چیز کو صرف اپنے ہی لیے سمجھتی تھی۔ باہمی رواداری اور اتحاد و یگانگت کا کوئی مستحکم رشتہ موجود نہ تھا۔ آخر اُس مبلغ اعظم و تاجدارِ اخوت و مساوات نے انسانیت کی شیرازہ بندی کے لیے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کا ایک اسلامی رشتہ قائم کیا اور منتشر دلوں کو باہم جوڑ کر بھائی بھائی بنا دیا۔ اِس کا سب سے زندہ اعجاز اور ابدی سبق، قرآنِ کریم ہے جو اُنہی الفاظ میں اب تک موجود ہے، جو بذریعہ وحی 23 برس کی مدت میں نازل ہوا تھا۔

حضور ﷺ طٰس، یٰس و حٰم ہیں

اُن رازوں کے رازدار جو ربّ العزت نے آپ کے لیے ودیعت فرمائے اور اُن اسماء سے موسوم ہیں جو حضور ﷺ کے باطنی حالات و کمالات، فضائل جلیلہ، خصائل و خصائصِ جمیلہ درجاتِ رفیعہ و مراتبِ منیعہ کے ماتحت مولا کریم نے رکھے۔ جن میں عوام کالانعام کی تو کیا حقیقت ہے انبیاء و مرسلین و ملائکہ مقربین علیہم الصلوٰۃ والتسلیم کا بھی حصہ نہیں ہے۔ اِن ارشادات کا علم خطاب فرمانے والا جانتا ہے یا خطاب کیا گیا۔

حضور ﷺ حسیب ہیں

جن کو کائنات کے ذرّے ذرّے کا اِس لیے عالم بنایا گیا کہ حضور ﷺ سب پر محاسبت فرما سکیں گے کیونکہ بغیر اِس محاسبہ کے کوئی بھی علوءِ مرتبت نہیں پا سکتا۔ حسیب ہونا ایک وہ بلند صفت ہے جو حضور ﷺ کے لیے خاص تھی کیونکہ حسیب وہ ہوتا ہے جس میں قوت و طاقت تو بے پناہ ہو مگر عقل کی تابع ہو۔ ہر مشکل کے وقت حتیٰ کہ سکراتِ موت میں بھی نفس مطمئن ہو اور اس کے اِس بلند پایہ اور بے پرواہ فعل کی تعریف کی جائے حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے بڑھ کر کسی کو صاحبِ حوصلہ و سخی اور ہر معاملہ میں حسیب اور خوش رہنے والا نہیں دیکھا۔

حضور ﷺ اولیٰ ہیں

جن کے احکام اُن کے تصرف کی قوت سے ملے ہوئے ہیں جن کا غلام یا صحابی بننا موجبِ سعادت دنیا و عقبےٰ ہے۔ تورات میں ذکر کیا گیا ہے کہ ایک اولیٰ شخص، اولیٰ اُمت کے لیے، اولیٰ ہونے کی حیثیت میں ظاہر ہوگا۔ وہ اپنی اُمت کی اصلاح ہدایت و تعلیم سے کرے گا اور رہتی دنیا تک نوعِ انسان کے ساتھ رہے گا۔ وہ خوبیاں جو حضور ﷺ کی اوّلیت پر گواہ ہیں وہ ہیں جن میں کسب و عمل کو دخل نہیں بلکہ ربّ العزت کی عنایت و موہبت سے ہیں۔ فضیلت، نبوت، رسالت، خلت، محبت، برگزیدگی، اسرار، دیدار قرب، شفاعت، مقامِ محمود، معراجِ جسمانی، امامت الانبیاء، قیامت کو انبیاء و امم سابقہ پر گواہ ہونا، اولادِ آدم کی سرداری، صاحبِ عرش کے نزدیک حمد، لواء الحمد کا پانا، رحمت اللعالمین ہونا، ہدایت، امانت، رضا، کوثر، گذشتہ و مابعد امور سے قبل از وقوع معافی، انشراحِ صدر، رفعت، ذکرِ سکینہ کا اُترنا، فاتح ہونا، تائیدِ ملائکہ، کتاب و حکمت، سبع مثانی، قرآنِ عظیم، پاکیزگیٔ رحمت، اللہ تعالیٰ اور ملائکہ کا درود شریف پڑھنا، آپ کے اسمِ پاک، پیشانی، عمر اور مسکن پاک کی قسمیں کھائی جانا، قبولیتِ دعا کا وعدہ، شجر و حجر کا کلام، انگشتانِ مبارک سے پانی کا اجرا، تھوڑی چیز میں برکت، شق القمر، ردّ الشمس، اشیاء

کا مدد دینا، علمِ غیب، سایہ کا نہ ہونا، سنگریزوں کا تسبیح پڑھنا، دردوں بیماریوں کا اچھا کر دینا، لوگوں کے شر سے بچانا، وغیرہ جن کا کوئی عقل احاطہ نہیں کر سکتی اور اُن کے علم پر سوائے اُس کے عطا فرمانے والے خدائے وحدہٗ کے اور کوئی آگاہ نہیں.

حضور ﷺ رحمۃ اللعالمین ہیں

تمام جہان اور تمام جہانیوں کے لیے خواہ وہ اوّل ہیں یا آخر، حاضر ہیں یا غائب، زندہ ہیں یا مردہ، حضور ﷺ کے اِس اسم پاک کی برکت سے یہ اُمت ''اُمتِ مرحومہ'' کہلانے کے مستحق ہوگئی ہے کیونکہ حضور ﷺ کی طفیل آپس میں صبر و رحمت کی وصیّت کرتے ہیں. حضور ﷺ نے اِس خطاب کے ماتحت کائنات کے ایک ایک ذرے کو ابدی طور پر اپنی وسیع رحمت کے دائرے میں گھیر لیا ہے کیونکہ حضور ﷺ بجائے خود ایک صفت ہیں رحیم کی، اور صفت اُس وقت تک فناء نہیں ہوتی جب تک موصوف فناء نہ ہو جائے۔ چونکہ رب العزت جل شانہٗ کے فناء کئے بغیر یہ ممکن ہی نہیں. لہٰذا اُس کی صفتِ رحمت اللعالمینی یعنی حضور ﷺ بھی ابدی اور ہر شئے کو گھیرے ہوئے ہیں.

چنانچہ بیان کیا گیا ہے کہ جبریل علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ آپ کو بھی اُس رحمت سے کچھ حصہ ملا ہے. فرمانے لگے ہاں ملا ہے اور وہ یہ ہے کہ میں اپنے انجام سے ڈرا کرتا تھا مگر اب بے خوف ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسی رحمت کے پیش نظر قرآن پاک میں میری تعریف کی ہے اور مجھے مولا کریم نے اپنے حضور ﷺ میں باعزت متبوع اور امین فرمایا ہے اور جو میرے ساتھ دشمنی رکھنے والی مخلوق ہے اُن کو اپنا دشمن بیان کیا ہے اور اصحابِ یمین کی سلامتی اسی رحمت کے طفیل ہے.

حضور ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ رب العزت نے میری اُمت کے لیے میری وجہ سے دو امانتیں اتاری ہیں، ایک یہ کہ جب تک کہ میں اُن میں ہوں اُن پر عذاب نہ آئے گا. دوسرے جب تک وہ استغفار کرتے رہیں گے عذاب سے محفوظ ہوں گے. گویا حضور ﷺ ابدی طور پر بحیثیت رحمت اللعالمین ہونے کے اُمت کے ساتھ ہیں. اِس لیے اُمت عذاب سے مامون ہے.

مندرجہ بالا اسماء شافیہ کے علاوہ قرآنِ کریم میں حضور ﷺ کے اور بہت سے اسماء مبارکہ ہیں جن کو یہاں ذکر نہیں کیا گیا. وہ تفصیلی تذکار میں انشاء اللہ مذکور ہوں گے اور یہ خصوصیاتِ عالیہ وہ تھیں جو غلاموں کی آگاہی کے لیے اپنے محبوب کی اظہارِ شان کی غرض سے ربّ العزت جل مجدہٗ نے ارشادات و احکام میں ظاہر و باہر فرما دیں اس کے سوا جو کچھ اُس مالکِ دو جہان نے مراتب عالیہ و مدارج رفیعہ دارِ آخرت میں آپ کے واسطے زیادہ فرمائے ہیں وہ یہ ہیں جن کے تصور سے عقلیں گم ہو جاتی ہیں اور ادراک اُن کی خبر ہی سے حیران ہوئے جاتے ہیں.

خدا کرے کہ جن حقائق کو حضور ﷺ کے اسماء شافیہ کے ماتحت فقیر نے مختصراً درج کیا ہے عوام الناس کے قلوب اُن سے قُربِ نبوت کے انوار حاصل کریں اور اپنی باطنی بینائی سے معرفتِ رسالت کو پا سکیں اور اُس ابدی سخی کو اپنا ملجا و ماویٰ ٹھہرائیں. جس کے کسی سائل کو ناکامی نہیں ہوئی اور جس کا کوئی بھکاری نامراد نہیں رہا اور جس کے دربار میں دشمن بھی رسوا و ذلیل نہیں ہوئے. جو مفسدین کے اعمال بھی اُن کے منہ پر نہیں لاتا اور جس نے دشمنوں کو بھی ہمیشہ اپنی رحمت کی کملی میں پناہ دی ہے. وہی مجرموں اور عاصیوں کا سہارا اور وہی ناداروں و خطاکاروں کا آسرا ہے.

جو اُس کے جلوؤں سے ہو منوّر، اُس آئینے میں نہ بال آئے
مٹے خیالِ گناہ دل سے، جو دل میں اُس کا خیال آئے!

اَللّٰھُمَّ بِحَقِّ جَمَالِ مُحَمَّدٍ اَرِنِیْ وَجْہَ مُحَمَّدٍ حَالًا وَّ مَالًا ط

☆☆☆☆

ظاہری جمالِ نبوی ﷺ

گو باطنی جمالِ نبوتِ محمدیہ علیہ الصّلوت والتسلیمات کا مختصر سا نقشہ حدیث شریف کی منشا کے ماتحت جو اوپر ذکر کیا گیا ہے وہ عاشقانِ حضور ﷺ کے لیے تسلی و تشفی کو کم نہیں. مگر ظاہری صورت و سیرت کے دلدادہ حضرات کے محرومی کے خیال سے جی چاہتا ہے کہ حضور ﷺ کی مبارک ترین ظاہری صورت و سیرت کو بھی ذکر کر ہی دیا جائے تا کہ متلاشی اِس کو اُس میدان میں معرفتِ حضور ﷺ کا ذریعہ بنا سکیں.
فقیر نے اِس سے قبل ایک کتاب اِسی موضوع پر موسومہ بہ حلیہ مبارک محبوب خدا ﷺ منظوم پنجابی زبان میں لکھی تھی. پھر ایک کتاب موسومہ بہ سیاحِ لامکان میں اِسی موضوع پر ایک باب صحیح احادیث و روایات کے ماتحت موسوم بہ ''نورِ مجسم کا بے مثل فی الصفات ہونا'' لکھا. اب فقیر اِس موضوع پر تحقیق کے مختلف پہلوؤں کو کام میں لا کر (جن میں اصح روایات کے علاوہ مولانا عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی کے ایک فاضلانہ مضمون کا اقتباس بھی درج ہے) قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرتا ہے. مولا کریم عقیدۂ حقّہ، اہل سنت و الجماعت کے ماتحت لفظی لغزشوں سے بچائے اور بروزِ قیامت آنحضرت ﷺ کے گستاخوں اور بے ادبوں میں نہ اٹھائے. آمین

قلّتِ روایت

قارئین کرام یہ پڑھ کر متعجب ہوں گے کہ سیرتِ وحدت کے اُس عظیم ترین ذخیرے میں جو اس وقت دنیا کے سامنے ہے حلیۃ النبی ﷺ سے متعلق بہت کم روایات ملتی ہیں. جس کا سبب یہ نہیں کہ صدرِ اوّل کے مصنفین کو حلیہ نبوی ﷺ کے مدوّن کرنے کا اہتمام نہ تھا بلکہ اصحابِ سیر ومحدثین نے اِس مسئلہ میں بڑی جدوجہد کی ہے اور ایک ایک لفظ جمع کیا ہے مگروہ کیا کرتے جو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم سے ہی انہیں زیادہ روائتیں نہیں پہنچیں کیونکہ جمیع صحابہ کرام میں چند گنتی کے حضرات ہی حلیہ مبارک بیان فرمانے والے نظر آتے ہیں جن میں سے سیدنا امام الاتقیا حضرت امیر المومنین علی المرتضیٰ اور ہند بن ابی ہالہ رضی اللہ عنہما خاص طور پر قابل ذکر ہیں. جنہوں نے اِس باب میں کسی قدر تفصیل سے کام لیا ہے.

باقی رہی یہ بات کہ اکثر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے ایسا کیوں کیا؟ اس کے بہت سے سبب ہوسکتے ہیں جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ فرطِ تادّب و تعظیم سے وہ آنحضرت ﷺ کی طرف نظر بھر کے دیکھ ہی نہیں سکتے تھے. حضرت عمرو بن العاصؓ نے اپنی وفات کے وقت یہ حقیقت واضح فرمائی تھی. جس کو اُن کے صاحبزادے حضرت عبداللہؓ ایک گفتگو کے سلسلہ کا اشارہ فرماتے ہوئے کہتے ہیں کہ میرے والد حضرت عمرو بن العاصؓ نے فرمایا کہ اگر کوئی مجھ سے رسول اللہ ﷺ کا حلیہ مبارک پوچھے تو میں بیان نہیں کرسکتا کیونکہ انتہائی تعظیم کی وجہ سے میں آپ کو نظر بھر کے دیکھ ہی نہیں سکتا تھا.

قدمبارک

نہ بہت لمبا تھا نہ بالکل ٹھگنا (یعنی نہ بہت چھوٹا)، بلکہ میانہ قدوں سے کچھ نکلتا ہوا، لیکن لمبے قد والوں کے ہجوم میں بھی حضور ﷺ نمایاں نظر آتے تھے. سارا جسمِ اطہر بہت بھرا ہوا مگر بھدا نہ تھا، بلکہ گداز، سڈول، مضبوط، معتدل، موزوں اور گٹھا ہوا تھا. جسمِ اطہر پر بال نہ تھے صرف ایک خوبصورت ترین خط سیاہ بالوں کا کوڑی سے ناف تک زیبِ بدنِ مقدّس تھا. ہاں! کلائیوں، پنڈلیوں، کندھوں اور سینۂ منوّر کی بلندیوں پر روئیں پھیلے ہوئے تھے. سینہ کشادہ اور پیٹ مبارک کی سطح میں پورا تناسب اور کندھوں کے ابھار پُر گوشت اور پھیلاؤ نہایت موزونیت رکھتا تھا. دست و پائے مبارک خوبصورت، لمبے لمبے، چھُوٹے ہوئے تھے. پنڈلیوں میں بہت خفیف خم تھا اور پاؤں کے تلوے گداز بھرے ہوئے تھے کفِ دست مبارک فراخ پُر گوشت، اُنگلیاں دبیز اور تلوے صاف ستھرے، درمیان میں اتنا خلا کہ نیچے سے پانی بے روک بہہ جاتا. پائے ہائے مبارک میں انگوٹھے کے بعد کی انگشت باقی انگلیوں سے بڑی، مگر چھنگلیا سب سے بلند اور نمایاں تھی. ایڑیاں پتلی پتلی، ملائم اور خوبصورت تھیں.

چہرۂ انور

رنگ سرخ و سفید، روئے مبارک نہایت خوبصورت اور پُر نمک تھا. پُر گوشت اور بالکل گول نہ تھا بلکہ کسی قدر بیضاوی تھا. رخسار، ستواں اور بالوں سے صاف تھے، طبع مبارک پر کوئی بات گراں گزرتی تو سرخ ہو جاتے تھے.

ریش مقدس خوب گھنی اور بھاری تھی. کنپٹیوں سے حلق تک پھیلی ہوئی تھی. اطراف سے بڑھے ہوئے بال تراش دیا کرتے تھے، پوری ڈاڑھی سیاہ تھی، عہدِ پیری میں بھی صرف ٹھوڑی سے اوپر چند ہی بال سفید دکھائی دیتے تھے، سر بڑا تھا، بال بہت گھنے، خوب کالے، کانوں کی لو تک لمبے رہتے تھے۔ جب زیادہ بڑھ جاتے تھے اور کندھوں تک آجاتے تھے تو تراش کر کم کر دیئے جاتے تھے۔ بال نہ بہت پیچیدہ تھے نہ گھونگریالے، نہ بالکل سیدھے اور کھڑے تھے ہلکی ہلکی لہریں سی اُن پر پڑی معلوم ہوتی تھیں. آخر عمر تک تھوڑے سے بال کنپٹیوں پر اور سر مبارک میں سفید ہوئے تھے. تیل لگا لیتے تو دکھائی نہ دیتے ورنہ نظر آتے تھے.

چشم ہائے مبارک اور پیشانی

آنکھیں بڑی بڑی سُرمگیں تھیں، پُتلی خوب سیاہ، سفیدی میں لال ڈورے پڑے ہوئے، آنکھوں کے شگاف کشادہ، دونوں طرف کے گوشے سرخ، پلکیں کالی، لمبی لمبی، پیشانی چمکیلی کشادہ، بھویں خمیدہ، پتلی، نہایت لطافت سے ہلکی ہو کر باہم جڑ گئی تھیں. دونوں کے بیچ میں ایک رگ تھی جو غصہ کے وقت پھول جاتی تھی، پسینہ بہت نکلتا تھا اور ماتھے پر موتی کے دانوں کی طرح چمکتا تھا. ناک ستوں اور ایسی تھی کہ پہلی نظر میں بلند اور کھڑی معلوم ہوتی تھی مگر دراصل نہایت ہی خوبصورت اور چہرے کے مناسب تھی.

دہانہ لطافت کے ساتھ کشادہ، دندان مبارک خوب سفید، سچے موتی کی طرح تاباں، اوپر نیچے چڑھے نہ تھے، ترتیب سے دو صفیں قائم تھیں. سامنے کے دانتوں میں خفیف شگاف تھے.

وصفِ جمالِ پاک

صحابہ کرام جمالِ نبوی ﷺ سے از حد متاثر تھے. ذیل میں بعض اقوال دیئے جاتے ہیں حضرت براء بن عازبؓ کہتے ہیں:

”رسول اللہ ﷺ تمام آدمیوں سے زیادہ حسین تھے. میں نے آپ کو ایک مرتبہ سرخ جوڑا زیب تن کئے دیکھا اور نہیں کہہ سکتا کہ آپ سے زیادہ کبھی کسی زلفوں والے کو خوبصورت دیکھا ہے چوڑا سینہ

اور شانوں تک بال لٹکے ہوئے تھے۔'' [صحیحین]

براء بن عازبؓ سے پوچھا گیا کہ '' کیا رسول اللہ ﷺ کا چہرہ تلوار کی طرح لمبا اور چمکیلا تھا؟''
کہنے لگے: ''نہیں بلکہ چاند کی طرح منور اور خوبصورت۔''

کعب بن مالکؓ کہتے ہیں: ''جب آپ کسی بات پر خوش ہوتے تھے تو چہرہ مبارک اِس طرح روشن ہو جاتا تھا گویا چاند کا ٹکڑا ہے۔'' [صحیحین]

جسمِ اطہر کی خوشبو

حضرت انسؓ نے بیان کیا میں نے آپ سے پہلے اور آپ کے بعد کبھی کسی کو آپ کا سا خوبصورت نہیں دیکھا۔ رنگ چمکیلا گورا تھا، پیشانی پر پسینہ ایسا نظر آتا تھا گویا موتی بکھرے ہیں، چلتے تھے تو جھومتے تھے۔ میں نے کبھی کوئی دیباج یا ریشم آپ کی ہتھیلیوں سے زیادہ نرم نہیں دیکھا، نہ کبھی کسی مشک یا عنبر میں آپ کی خوشبو سے بہتر خوشبو پائی۔ [صحیحین]

حضور ﷺ کا پسینہ معطر

حضرت انسؓ سے ہی مروی ہے کہ ''ایک دن آپ ﷺ ہمارے گھر تشریف لائے اور سو گئے۔ میری ماں اٹھیں اور آپ کا پسینہ سونت کر شیشی میں لینے لگیں آپ کی آنکھ کھل گئی فرمایا ''اُمِ سُلَیم ! یہ کیا ہے؟''

عرض کیا: ''میں آپ کا پسینہ لے رہی ہوں۔ اپنے عطر میں ملاؤں گی کیوں کہ یہ عطر سے بھی زیادہ خوشبودار ہے۔'' [صحیحین]

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں: ''آپ ﷺ کے دانت بڑے ہی چمکیلے تھے۔ منہ کھولتے تو دانتوں سے ایک نور سا نکلتا معلوم ہوتا تھا۔'' [دارمی]

جری بھی حُسین بھی

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ ''میں نے آپ سے زیادہ کسی کو جری اور حُسین نہیں دیکھا۔'' [مسند احمد]

حضرت جابر بن سمرہؓ سے روایت ہے۔ ''آپ ﷺ جس راستہ سے گزر جاتے تھے بعد میں آنے والے لوگوں کو خوشبو سے پتہ لگ جاتا تھا کہ آپ ﷺ ادھر سے تشریف لے گئے ہیں۔'' [صحیحین]

حضور ﷺ کی ہتھیلی

اُنہی نے بیان کیا: ''ایک دن نماز کے بعد میں آپ کے ساتھ مسجد سے نکلا. دولڑکے اور بھی آ گئے، آپ نے اُن کے رخسار چھوئے، پھر میرے رخسار پر ہاتھ رکھا، آپ کے ہاتھ کی ٹھنڈک اور خوشبو میں نے ایسی محسوس کی گویا ابھی ابھی عطر کے قرابے سے نکلا ہے.'' [مسلم]

اُنہی نے کہا کہ ''اگر تم حضور ﷺ کو دیکھتے تو سمجھتے کہ آنکھوں میں سرمہ لگا ہے حالانکہ سرمہ لگا نہ ہوتا تھا.'' [ترمذی]

چودھویں کا چاند

اُنہی کی روایت ہے: ''ایک مرتبہ چودھویں رات میں آپ ﷺ سرخ جوڑا پہنے تشریف فرما تھے میں کبھی چاند کو اور کبھی آپ ﷺ کے چہرے کو دیکھتا تھا مگر آپ مجھے چاند سے بھی زیادہ خوبصورت دکھائی دیتے تھے.'' [ترمذی و دارمی]

حضرت ربیع بنت معوذ ؓ سے پوچھا گیا کہ ''آنحضرت ﷺ کیسے تھے؟'' کہنے لگیں: ''اگر تم حضور ﷺ کو دیکھتے تو سمجھتے اٹھتا ہوا سورج دیکھ رہے ہیں.'' [دارمی]

حضرت ابو ہریرہ ؓ کہتے ہیں: ''میں نے رسول اللہ ﷺ سے زیادہ کسی کو خوبصورت نہیں دیکھا- ایسا معلوم ہوتا تھا گویا آفتاب رخِ انور پر چل رہا ہے.'' [ترمذی]

مکمل سراپا

اُمِ معبد نے آپ کا سراپا خوب بیان کیا ہے. یہ وہی خاتون ہیں جس کے خیمے میں آپ ﷺ نے سفر ہجرت کے دوران میں دم لیا تھا. وہ آپ کے نامِ نامی سے واقف تھی اِس لیے اپنے شوہر سے آپ ﷺ کا حلیہ اِس طرح بیان کرنے لگی.

''میں نے ایک شخص کو دیکھا جو صاف ستھرا تھا. حُسن اُس پر جلوہ گر تھا، چہرہ روشن تھا، جسم خوبصورت تھا، نہ توندا سے بدنما بنا رہا تھا، نہ شانوں پر ننھا سا سر ہی اُسے حقیر ظاہر کر رہا تھا، وہ نہایت ہی خوبصورت اور حُسین تھا. آنکھیں بڑی بڑی اور سیاہ، پلکوں میں کجی، آواز میں اثر، گردن میں درازی، داڑھی گھنی، بھویں لمبی پتلی جُڑی ہوئی، جب چپ ہوتا تو باوقار ظاہر ہوتا، جب بولتا تو شاندار بن جاتا، دور سے دیکھو تو سب سے حُسین اور بھاری بھرکم، نزدیک سے دیکھو تو سب سے زیادہ دل فریب اور شیریں، میٹھی بات چیت، نپے تُلے بول

بولنے والا، نہ بالکل کم سخن نہ بہت باتونی، گفتگو ایسی جیسے ہار میں موتی پروئے ہوئے، میانہ قد، نہ بہت لمبا نہ ایسا ٹھگنا کہ نگاہ میں حقیر ہو جائے، دو شاخوں کے بیچ میں ایک شاخ، مگر وہ باقی دونوں سے زیادہ تروتازہ اور نظر فریب، اُس کے رفیق اُس کے روبرو حاضر، اگر بولتا تو غور سے سنتے، حکم دیتا تو تعمیل کے لیے دوڑ پڑتے، بہت سنجیدہ اور ہنس مکھ، ترش رو اور سخت گیر نہیں۔" [خصائص الکبریٰ]

حضرت علیؓ کا بیان

حضرت علیؓ فرماتے ہیں: "آپ ﷺ سب سے نیک دل، سب سے زیادہ راست گو، سب سے زیادہ نرم مزاج، سب سے زیادہ خوش خلق تھے. پہلی نظر میں ہر کوئی آپ ﷺ کی ہیبت سے مرعوب ہو جاتا تھا لیکن کچھ دیر حاضری کے بعد محبت کرنے لگتا تھا. میں نے آپ ﷺ سے پہلے اور بعد کسی کو آپ ﷺ سے زیادہ خوبصورت نہیں دیکھا۔" [ترمذی]

نیز فرمایا: "آپ کی گردن چاندی کی بنی ہوئی معلوم ہوتی تھی، پیشانی پر پسینہ موتی کی طرح چمکتا تھا، مشک خالص سے زیادہ خوشبودار تھا، میں نے کوئی آدمی آپ ﷺ کا سا نہیں دیکھا۔" [ابن سعد]

سیمیں گردن

ہند بن ابی ہالہؓ کہتے ہیں: "رسول اللہ ﷺ بہت شاندار تھے چہرہ اِس طرح چمکتا دمکتا تھا جیسے چودھویں کا چاند، گردن ایسی صاف اور خوبصورت تھی گویا چاندی سے گھڑ کر بنائی گئی ہے۔" [شمائل ترمذی]۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ فرماتے تھے۔ "آپ ﷺ کا چہرہ ایسا تھا گویا چاند کا طباق ہے۔" [خصائص]

بدرِ منیر

حضرت عائشہؓ کا قول ہے: "آپ ﷺ سب سے زیادہ حسین چہرے والے تھے۔ سب سے زیادہ روشن رنگ والے تھے. جب کبھی کسی نے آپ ﷺ کا حلیہ بیان کرنا چاہا تو رخِ انور کو بدرِ منیر سے ضرور تشبیہ دی. چہرے پر پسینہ کی بوندیں سچے موتیوں کی طرح چمکتی تھیں اور پسینہ مشک خالص سے زیادہ اچھی مہک رکھتا تھا۔" [خصائص]

نیز بیان کرتی ہیں: "ایک مرتبہ کسی نے سیاہ شملہ ہدیہ دیا. آپ ﷺ نے اُسے باندھا اور مجھ سے فرمانے لگے عائشہ! یہ مجھ پر کیسا معلوم ہوتا ہے میں نے عرض کیا بہت ہی بھلا لگتا ہے اِس کی سیاہی

آپ ﷺ کے چہرے کی سفیدی میں اور آپ کی سفیدی اِس کی سیاہی میں پیوست ہوئی جاتی ہے۔" [کنز العمال]

حیاو نزاکتِ طبع

ابو سعید خُدری ؓ کہا کرتے تھے کہ: "رسول اللہ ﷺ پردے میں بیٹھنے والی کنواریوں سے بھی زیادہ شرمیلے تھے جب کوئی بات طبع مبارک پر گراں گذرتی تو ہم آپ کے چہرے سے معلوم کرلیا کرتے تھے۔" [صحیحین]

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں: "ایک دن میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ چٹائی پر لیٹے ہیں اور چٹائی کے نشان پہلو پر نمایاں ہیں میں نشانوں پر ہاتھ پھیرنے لگا اور عرض کیا۔

یارسول اللہ! آپ ﷺ پر میرے ماں باپ قربان آپ نے ہمیں کیوں خبر نہ دی کہ سونے کے لیے کچھ بچھا دیتے۔"

آپ ﷺ نے جواب دیا: "مجھے دنیا سے کوئی سروکار نہیں۔ میری اور دنیا کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی سوار کسی درخت کے سایہ میں دم لے لیتا ہے اور پھر آگے روانہ ہو جاتا ہے۔" [مسند طیالسی واحمد]

پیشانی پر نور کے دانے

نیز حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔ "ایک دن میں بیٹھی سوت کات رہی تھی اور نبی کریم ﷺ اپنی نعل گانٹھ رہے تھے۔ میں نے دیکھا آپ ﷺ کی پیشانی پر پسینہ آ رہا ہے اور اُس کی بوندیں چمک رہی ہیں۔ اس منظر نے مجھے مبہوت کر دیا۔ آپ ﷺ کی نظر اٹھی تو مجھے مبہوت دیکھ کر فرمانے لگے "کیا ہے؟"

میں نے عرض کیا: "آپ ﷺ کی پیشانی پر پسینہ کی بوندیں نور کے دانے معلوم ہوتے ہیں اگر ابو کبیر الہذلی اِس حال میں آپ کو دیکھ لیتے تو جان جاتے کہ اُس کے اِن اشعار کا اعلیٰ مصداق آپ ہی ہیں۔" (ترجمہ اشعار)

نہ اُس کی ماں میں کوئی عیب تھا، نہ دائی میں اور وہ خود ہر بیماری سے دور ہے۔

جب اُس کے چہرے کو دیکھو تو اِس طرح چمکتا ہے۔ جس طرح ابر میں بجلی چمکتی ہے۔

یہ سن کر آپ ﷺ نے نعل اور سوئی ہاتھ سے رکھ دی۔ اٹھ کر میرے پاس تشریف لائے۔ میری پیشانی کو بوسہ دیا اور فرمانے لگے۔ عائشہؓ! خدا تجھے جزائے خیر دے۔ مجھے یاد نہیں، میں کبھی اتنا خوش ہوا ہوں، جتنا اِس بات سے خوش ہوا ہوں۔ [خصائص]

ماہِ تمام

حضرت عمرؓ اپنی مجلس میں زبیر بن ابی سلمیٰ کا یہ شعر اکثر پڑھا کرتے تھے جو اُس نے ہروم بن سلطان کی تعریف میں کہا تھا۔ ترجمہ شعر:- (اگر تو انسان کے سوا کچھ اور ہوتا تو اندھیری رات کا روشن کرنے والا بدرِ منیر ہوتا)۔

پھر حاضرین سے کہتے۔ صرف نبی ﷺ ہی ایسے تھے اور کوئی دوسرا آدمی ایسا نہ تھا۔ [کنز العمال]

حضور ﷺ کو بھی اپنے حسن کا پورا احساس تھا اور اِس نعمت پر ہمیشہ اللہ کا شکر ادا کیا کرتے تھے۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ جب آپ آئینہ دیکھتے تو فرماتے:۔

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَحْسَنَ خَلْقِیْ وَ خُلُقِیْ))

(خدا کا ہزار ہزار شکر جس نے میری صورت و سیرت دونوں اچھی بنا دی ہیں)۔

سیرتِ خیر الخلق صلی اللہ علیہ وسلم

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴾

''اور نہیں بھیجا ہم نے تجھ کو مگر رحمت واسطے جہانوں کے''

دنیا کی تمام شخصیتوں میں شاید تاجدارِ کائنات مختارِ شش جہات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کسی شخصیت کو یہ امتیاز حاصل نہیں ہوا کہ اُس کی زندگی پر اتنی کثرت سے کتابیں لکھی گئی ہوں جتنی قرنِ اوّل سے لے کر آج تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ پر لکھی جا چکی ہیں اور متفرق طور پر تقریروں، تحریروں اور مواعظ وخطب میں جس قدر اُس پاک زندگی کا ذکر کیا گیا ہے، اُس کو اگر یکجا جمع کیا جائے تو بلاشک یہ دفتر اِس سارے ذخیرہ پر سبقت لے جائے گا، جو انسانی کوششوں نے دنیا کی تمام تاریخی شخصیتوں کے حالات پر فراہم کیا ہے. لیکن اِس کثرت کے ساتھ آپ کا ذکرِ پاک زبانوں پر آنے کے باوجود یہ ایک عجیب حقیقت ہے کہ سیرت وسوانح کا کوئی بڑے سے بڑا دفتر بھی رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور آپ کے خصائص وشمائل کا اتنا صحیح اور جامع نقشہ نہیں کھینچ سکا، جتنا خود رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے خالقِ جل شانہٗ نے اپنے ایک لفظ رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ میں کھینچ دیا ہے. بظاہر یہ ایک بہت بڑا دعویٰ معلوم ہوتا ہے کیوں کہ دفتروں اور کتابوں کے بڑے بڑے مجلّدات کی پہنائیوں کے مقابلہ میں ایک لفظ کی اِتنی وسعت اور جامعیت عقل میں سمانا بہت مشکل ہے. حقیقت یہ ہے کہ جب ہم لفظِ رحمت کے معنوں پر غور کرتے ہیں اور اُس کے بعد نبیٔ رحمت کی حیاتِ طیبہ پر نظر ڈالتے ہیں تو اِس تقابل سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری زندگی ایک لفظِ رحمت کی تفسیر تھی اور ''رحمت'' کا حقیقی مفہوم اگر کہیں بتمام وکمال ادا ہوا ہے تو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی پاک زندگی میں ادا ہوا ہے.

رحمتِ مجسّم

لغتِ عرب میں رحمت کے معنی ہیں: ''وہ رِقت جو احسان کی مقتضی ہو'' اور یہ لفظ خالص رِقت کے معنوں میں بھی مستعمل ہوتا ہے اور کبھی خالص ''احسان'' کے معنوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے. گویا

رحمت کا حقیقی مفہوم رِقّت اور اِحسان سے مرکب ہے اور کمال درجہ کی رحمت وہی ہے جس میں غایت درجہ کی رِقّت اور غایت درجہ کا اِحسان دونوں شامل ہوں لہٰذا ضروری ہے کہ یہاں پر رقت اور اِحسان کا مطلب بھی سمجھ لیا جائے۔ لفظِ رِقّت لغت عرب میں جفوۃ اور قسوۃ کے مقابلے پر بولا جاتا ہے۔ کسی کی حاجت مندی اور تکلیف پر دل کا پسیجنا ''رِقّت'' اور سخت ہو جانا ''قسوۃ'' کہلائے گا۔ پس جب کسی شخص کا دل کسی مصیبت زدہ کو دیکھ کر دُکھے تو اِس دُکھن کو رقت سے تعبیر کیا جائے گا۔ عام اس سے کہ وہ مصیبت ظاہر ہو یا مخفی، محسوس ہو یا غیر محسوس اور مصیبت زدہ کو خود اپنی مصیبت زدگی کا احساس ہو، یا نہ ہو، وہ مصیبت بالفعل اُس پر آ چکی ہو یا آیندہ آنے والی ہو۔ بہر حال اپنے ہم جنس کی جس حالت کو انسان مصیبت سمجھے اور اُس پر کُڑھے، دُکھے، رنجیدہ ہو تو اُس کے اِس قلبی فعل پر رِقّت کا اطلاق ہوتا ہے اور غایت درجہ کی رقت وہی ہوگی جو ہر قسم کی مصیبت کے مقابلے میں پیدا ہو۔ دوسری جانب لفظِ اِحسان کے معنی میں اِنعام علی الغیر یعنی دوسرے شخص کو اُس کے استحقاق سے زیادہ عطا کرنا اور اپنے اِستحقاق سے کم لینا، مگر انتہائی درجہ کا اِحسان یہ ہے کہ انسان دوسرے کو فائدہ پہنچانے کے لیے اپنی زندگی وقف کر دے اور اُس کے مقابلے میں خود کوئی اجر نہ لے۔ پس لفظِ رحمت کے معنی یہ ہوئے کہ ایک شخص کا دل دوسرے شخص کی ہر مصیبت کو دیکھ کر دُکھے اور اُس دل کی دُکھن کے باعث نہ کسی اجر کی طمع سے وہ اُس پر احسان کرے۔

مگر لفظِ رحمت مصدر ہے اور اِس کو نبی کریم ﷺ کی صفت قرار دینا، کمال درجہ کے مبالغہ کو ظاہر کرنا ہے۔ اگر محض معمولی درجہ میں آ کر آنحضرت ﷺ کی توصیف کرنا مقصود ہوتو آپ کو رحیم کہا جا سکتا تھا۔ یا ذورحمتہ کے لفظ سے آپ کی توصیف کی جا سکتی تھی لیکن اللہ جل وعلا شانہٗ نے اِن الفاظ کی بجائے آپ کو خود رحمت قرار دیا اور عرب کا قاعدہ ہے کہ جب مصدر سے وہ کسی کی توصیف کرتے ہیں تو یہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے کہ وہ شخص اُس صفت کا مُجسّم مظہر بن گیا ہے۔ یہ ہے اِس لفظ کا مفہوم جس سے رسولِ اکرم ﷺ کے بھیجنے والی ذات نے آپ کی مدح فرمائی ہے۔ اب اس تعریف کی صداقت آزمانے کے لیے جب ہم حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس رحمتِ مجسم کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس میں رحمت کا رنگ غالب نہ ہو اور یہ سب کو معلوم ہے کہ آپ کی شخصیت ایک نہایت جامع شخصیت تھی۔ ایک بے کس واعظ سے لے کر ایک ملک کے فرماں روا تک، ایک مظلوم جماعت کے امام سے لے کر ایک فاتح سپہ سالار تک، ایک تنگ دست مہاجر سے لے کر تمام ملک عرب کے مالک ومختار تک، آپ کی زندگی نے مختلف دور دیکھے تھے لیکن آپ جس حال میں اور جہاں بھی رہے، رحمت کی صفت آپ کی صفات میں نمایاں رہی۔ سب سے زیادہ نازک وقت انسان کے لیے وہ ہوتا ہے جب کہ اُس کو اپنے دشمنوں پر غلبہ حاصل ہو اور ایسے موقع پر ''مفتوح دشمن'' کے

ساتھ جو سلوک دنیا میں ہوا کرتا ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں مگر نبی رحمت ﷺ کو جب کبھی غلبہ حاصل ہوا، آپ ﷺ نے رحمت ہی سے کام لیا۔

اگر مجھ سے سوال کیا جائے کہ انسان نے گذشتہ تیرہ سو سال سے تہذیب وتمدن کی دنیا میں جو عظیم الشان ترقی کی ہے اُس کا اصلی راز کیا ہے؟ تو میں بے تکلف کہوں گا کہ یہ سب سرورِ کائنات مختارِ شش جہات محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی کا فیض ہے۔

محسنِ اعظم

ظہورِ اسلام سے قبل دنیا تہذیب و شائستگی سے خالی ہی نہیں تھی بلکہ خود جنابِ رسالت مآب ﷺ کی بعثت ایک ایسے موقع پر ہوئی جب انسان کا تمدنی نشو وارتقا ایک خاص مقام پر پہنچ کر رُک گیا تھا۔ افراد واقوام کی زندگی میں بارہا ایسی ساعتیں آئی ہیں جب اُن کے لیے کوئی راہِ عمل باقی نہیں رہی لیکن وہ وقت بڑا ہی نازک تھا جب کوئی ایک قوم یا ایک نسل نہیں بلکہ ساری دنیا ایک ناقابلِ بیان ابتلا میں گرفتار تھی اور جب مذہب، اخلاق، سلطنت، جماعت، معاشرت غرض یہ کہ زندگی کے ہر ادارے میں ایک فتنہ وفساد برپا تھا۔ عقل سربزانو تھی کہ اِس مصیبت سے کیوں کر نجات ملے، نہ ماضی ہی سے کوئی پیامِ تسکین ملتا تھا اور نہ مستقبل میں کوئی اُمید کی صورت نظر آتی تھی۔

اربابِ نظر سے یہ پوشیدہ نہیں کہ ساتویں صدی مسیحی میں انسان ایک نہایت خوف ناک انحطاط کا شکار ہو چکا تھا۔ نہ کبھی دنیا کی حالت اِس قدر پست ہوئی اور نہ کبھی انسان نے ایسی عاجزانہ زندگی گزاری نصف سے زیادہ دنیا جہالت میں اُلجھی ہوئی اور اُن اقوام کا مسکن تھی جو نیم وحشیانہ زندگی بسر کر رہی تھیں۔ امنِ عالم کا شیرازہ پراگندہ ہو چکا تھا اور ہر طرف انتشار وتصادم رونما تھا۔ خداوندِ عالم کی بے بس مخلوق اربابِ سلطنت کی حرص وآز پر بھینٹ چڑھ چکی تھی۔ نہ کوئی قانون کی گرفت تھی، نہ فرائض کی ذمہ داری۔ انسان کی یہ انتہائی پستی اور اُس کی زندگی کے یہ وہ عاجزانہ لمحات تھے جن میں خدائے قدوس جل وعلاشانہٗ کے آخری نبی ﷺ نے اہلِ جہان کے سامنے رشد وہدایت کی سچی راہ پیش کی اور فرمایا کہ خدا ایک ہے، اُس کا کوئی شریک نہیں، وہ رب العالمین ہے، کائنات کا خالق ہے، ﴿ فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ اور انسان کا معبودِ حقیقی ہے جس کے حکم کے بغیر ایک ذرہ بھی متحرک نہیں ہوتا۔ وہی سمیع وعلیم اور قادر وقیوم ہے جس کی جانب ہم سب کو لوٹنا ہے۔ گویا محمد عربی ﷺ نے انسان کو صحیح حقیقت سے آشنا کر دیا اور دنیا کے جسم مردہ میں زندگی کی ازسرِ نو لہر دوڑ گئی۔ انسان اور انسانیت کی آزادی کا وقت قریب آ گیا، معبودانِ باطل رخصت ہو گئے، تعصب وجہالت کی زنجیریں کٹ گئیں، ضلالت وگمراہی ختم ہو گئی اور دنیا ہدایت وصداقت کے آفتاب سے چمک اٹھی۔

لیکن اِس رسالت کا مقصود صرف دعوت و تبلیغ نہیں تھا بلکہ آنحضرت ﷺ نسلِ انسانی کے مصلح، قائد اور راہ نما بھی تھے. تاریخ شاہد ہے کہ جس عزم اور یقین کے ساتھ حضور ﷺ نے دنیا کی راہ نمائی فرمائی اُس کی کوئی نظیر نہیں ملتی. حضور اکرم ﷺ نے ایک حیرت انگیز کامیابی کے ساتھ فریضۂ رسالت ادا فرمایا اور لوگوں کی توجہ اُن تاریخی شواہد کی طرف منعطف کرائی، جو اقوام و اُمم کی زندگی کا راز ہیں اور فرمایا: قوموں کی عاقبت پر غور کرو. کس قدر وہ ہوشیار قومیں تھیں جو انجام کار عتابِ الٰہی کا شکار ہوئیں. آپ نے سب سے پہلے ذہنِ انسانی کو تجربے اور مشاہدے کی دعوت دی اور اللہ کریم کی زمین پر سفر کرنے اور ظالموں کا انجام دیکھنے پر متوجہ کیا. اپنے قلوب اور اپنی زندگیوں کا محاسبہ کرنا سکھایا اور یہ بھی بتلایا کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کو عبث پیدا نہیں فرمایا. دنیا آیاتِ ربانی کی مظہر اور سُننِ الٰہیہ کی ترجمان ہے.

حضور ﷺ گویا سب سے بڑے محرک تھے جنہوں نے فکر و تدبر کی دنیا میں ایک انقلابِ عظیم پیدا کر دیا. اب تک لوگ یہ سمجھے ہوئے تھے کہ دین اور دنیا، مادیت اور روحانیت، روح اور جسم متضاد چیزیں ہیں، عقل اور عقیدے میں کوئی مفاہمت پیدا نہیں ہو سکتی. جذبات اور تخیلات کا ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہونا ناممکن ہے، مگر خیر الخلق رسول اللہ ﷺ نے ایک ایک کر کے اُن تمام بے معنی تخیلات کا تار و پود بکھیر دیا اور لوگوں کے اندر مذہب کا وہ صحیح جذبہ پیدا فرما دیا جس میں تمام اجزائے حیات ایک دوسرے سے مربوط ہو جاتے ہیں اور انسانی زندگی کائنات کا ایک واحد و مفید جزو بن کر ترقی کے انتہائی مدارج طے کر لیتی ہے. یہی تعلیم تھی نبیٔ رحمت اور نبی اُمی ﷺ کی جس کے اثر سے عرب کے بدّو اور بادیہ نشین جہالت و ضلالت سے نکل کر ہدایت کے راستہ پر گامزن ہو گئے اور یہ ایک پہلی ایسی اُمت پیدا ہوئی، جس نے دنیا میں ایک خدا کی عبادت پر تلقین کی اور جس نے تمام اُن وسائل کو جو انسان کی جہالت سے خدا اور اُس کے بندوں میں حائل ہو گئے تھے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا.

اُمتِ محمدیہ اِس راز سے بھی آگاہ ہو کر دنیا کی مقتدا بن گئی کہ مذہب انسان کے احساسات و جذبات اور غور و فکر کی نفی نہیں فرماتا بلکہ وہ اُس کی ذہنی ترقی اور ذوقِ جمال کا سب سے بڑا دوست ہے. اُس کے نزدیک عبادت کا مقصود محض ضبطِ نفس اور تزکیۂ ذات ہے، فنا و رہبانیت نہیں اِس لیے کہ زندگی ایک عطیۂ الٰہی ہے، شر نہیں. وہ عاقبت کے خیال سے دنیا کی علیٰحدگی نہیں سکھاتا، نہ لذائذِ دنیا کے ترک کی دعوت دیتا ہے اِس لیے کہ دنیا محض کارگاہِ عمل ہی نہیں بلکہ مزرعۂ آخرت بھی ہے. وہ زندگی کو ایک سلسلۂ فرائض سے تعبیر کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ انسان کا کام ترک و تعطل نہیں بلکہ غلبہ و تسخیر ہے. انسان کائنات کا حکمران اور نائبِ حق ہے اور ذاتِ خداوندی اُس کا مقصدِ وحید اور مقصودِ آخری ہے. حکومت محض خداوندِ عالم کے لیے ہے جو ''دولت'' کو انسان کا مشترکہ سرمایہ، لیکن ''ملکیت'' کو اُس کے کسبِ حلال

کا نتیجہ سمجھتی ہے. جس نے رنگ وخون کا کوئی امتیاز گوارا نہیں کیا اور عزّ وشرف کی بنیاد تقویٰ پر رکھی. اُس کی مرضی یہ ہے کہ اُس کی زمین پر صرف اُس کے نیک بندے حکمران رہیں اور دنیا میں حق وصداقت کی قوتیں کامیاب ہوں. بنی نوع انسان اور تہذیب وتمدن کی یہ وہ خدمت ہے جو اسلام نے انجام دی اور یہی ایک خصوصیت پیغمبرِ اسلام ﷺ کو باقی انبیاء و مصلحین اور راہ نمایانِ عالم کی صف میں ممتاز کرتی ہے. اللہ اکبر کس قدر بلند ہے وہ شخصیت، کس قدر مقدّس ہے وہ ذات، جس سے زندگی کا آخری نظام تکمیل کو پہنچا اور دنیا شاہدِ مقصود سے ہمکنار ہوئی.

حضور ﷺ صفِ انبیاء میں

حضرت کلیم اللہ مظہرِ جلال تھے اور جناب مسیح علیہ السلام پرتوِ جمال اور اِن ہی دو حضرات پر موقوف نہیں تمام انبیاء ورسل اِن دو میں سے کسی ایک شان کے حامل تھے. گو دوسری شان سے بھی بالکل خالی نہ تھے لیکن ہماری سرکارِ مکہ میں دونوں شانیں بہ تمام وکمال جلوہ گر تھیں اور کمال بھی وہ کہ جو کسی کو حاصل نہ ہو. اِس لیے یہ مبالغہ نہیں کہ سرکار سید المرسلین ﷺ کو مظہرِ جلال یا پرتوِ جمال کہنے کی بجائے ''جامعِ کمالات'' کہا جائے. عموماً ہر نبی ومرسل میں ایک نہ ایک شان ایسی پائی جاتی ہے جو اُنہیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے اور اُنکی ایک ایسی غیر منفک صفت ہے، جو اُنکی دیگر صفات پر غرضِ لازم کی طرح اُن کے نام کے ساتھ ساتھ ذہن میں متصوّر ہو جاتی ہے مثلاً حضرت ایوب علیہ السلام کا صبر وشکر، حضرت یوسف علیہ السلام کا حُسن و جمال، حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت وفرماں روائی اور حضرت عیسٰی علیہ السلام کی شانِ درویشی وغیرہ لیکن تاجدارِ کائنات محمد رسول اللہ ﷺ میں مشکل سے کوئی مابہ الامتیاز شئے بتائی جا سکے گی جو آپ کے اور دیگر صفاتِ حمیدہ پر اِس درجہ غالب ہو جو اُنہیں روشن اور نمایاں نہ ہونے دیتی ہو. کیوں کہ آپ ہر شان کے حامل اور ہر ایک صفت میں کامل ہیں اور ہر ایک وصف آپ میں اس درجۂ کمال کے ساتھ موجود ہے کہ انتہائی باریک بیں اور غوّاص نگاہیں بھی کسی خاص صفت کے بارے میں اپنا کوئی فیصلہ دینے میں عاجز ہیں جس شعبۂ کمال کو غائر نظر سے دیکھا جائے. وہی تمام صفات سے اکمل نظر آئے گا لیکن جونہی دیکھنے والا اپنی نظر ہٹا کر دوسری صفتِ کمالیہ پر ڈالے گا اُسے کہنا پڑے گا کہ میرا پہلا فیصلہ غلط تھا. دراصل یہ ہے وہ صفت جس کو ممیّز قرار دیا جا سکتا ہے لیکن اگر پھر اسی مرکز پر اپنی محققانہ نظر جمائے جہاں سے ہٹا کر دوسرے نقطے کی طرف گیا تھا تو پھر دوبارہ اپنے فیصلے کی تردید کرنی پڑے گی. گویا متجسس اور غوّاص نگاہیں ہر وصف کی بابت ترجیحی فیصلہ دینے میں متحیّر وششدر رہ کر پکار اُٹھیں گی:

ہر چند وصفت میکنم، در حُسنِ زاں بالاتری

یہی سبب ہے کہ جب ایک مؤرخ حضور ﷺ کو اپنی مؤرخانہ نگاہ سے دیکھتا ہے تو آپ اُس کو

اپنے سے بالاتر بے مثل مؤرخ نظر آتے ہیں. ایک فلسفی اگر اپنے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے تو آپ سے بڑھ کر اُسے کوئی فلسفی نظر نہیں آتا. اگر ایک فرماں روا اور سیاست دان جب آپ کے حُسنِ تدبیر و تدبّر اور شانِ حکمرانی پر غور کرتا ہے تو آپ اُسے عدیم المثال سیاست دان اور بے نظیر حکمران معلوم ہوتے ہیں. ایک درویشِ عارف جب آپ پر نگاہِ تحقیق ڈالتا ہے تو عرفانِ درویشی میں آپ کی نظیر ناممکن سمجھتا ہے. ایک دلدادۂ فصاحت جب آپ کی فصاحت و بلاغت پر غور کرتا ہے تو اس فن میں بھی آپ کو اپنی مثال آپ ہی تصور کرتا ہے. غرض یہ کہ جس نے جس نگاہ سے آپ کو ٹٹولا، آپ اُس کو اسی وصف میں کامل و اکمل نظر آئے. پس ماننا پڑے گا کہ ایسی ہستی ہی ساری دنیا کی صحیح رہبر اور تمام عالم کے لیے اسوۂ زندگی اور نمونۂ عمل بن سکتی ہے یا بالفاظِ دیگر حضور تاجدارِ مدینہ ﷺ کے سوا اور کسی میں بھی ساری کائنات کے لیے نمونۂ عمل بننے کی صلاحیت نہیں. اگر کوئی شخص ایک عادل مؤرّخ اور ایک محقق مصنف کی حیثیت سے تمام دیگر انبیأ و مرسلین اور مختارِ کائنات محمد رسول ﷺ کی عملی زندگی پر غور کرے تو اُسے اقرار کرنا پڑے گا کہ بجز رسولِ عربی ﷺ اور کسی میں ایسی عملی جامعیت موجود نہیں کہ وہ سارے عالم کے لیے اور ہر طبقہ کے انسانوں کے لیے نمونۂ عمل بن سکے. آپ کا شاہد، مبشّر، نذیر، داعی الی اللہ، سراجِ منیر، خاتم النبین ہونا، خلقِ عظیم پر تشریف لانا اور آپ کے ہاتھوں پر اللہ کی نعمت کا اتمام اور آپ کے ذریعے تکمیلِ دین ہونا یہ سب کچھ اسی دعویٰ کی دلیل ہیں کہ آپ تمام عالم کے لیے رحمت اور ساری کائنات کے لیے آخری نبی مبعوث فرمائے گئے ہیں.

ارتقائے انسانی میں حضور ﷺ کا حصہ

اِس میں ہرگز کلام نہیں کہ دنیا کی دورِ جدید کی متمدّن اقوام نے متمدّن ہو کر بھی اُن کمالات کا اظہار نہیں کیا، جو اُن کی طبعی ارتقا کے متوازی ہونے چاہیے تھے. مثلاً رومی اور یونانی تمدن میں انسانی عظمت و بزرگی کا معیار اُس کے دل و دماغ کے کمالات نہ تھے بلکہ مصنّفین کے قائم کردہ اصولوں کے مطابق اُن کے نسبی اور جدّی تعلقات سے اُن کی حیثیت قائم کی جاتی تھی. گو رومی اور ہندی تمدن کے درمیان بظاہر کوئی تعلق نظر نہیں آتا مگر جائے حیرت ہے کہ مدتِ دراز تک برہمنیت کی نام لیوا جماعتیں اِنہی روایات کی خوگر رہیں اور انفرادی اخلاق کی جگہ نسبی تعلقات ہندو قوم کے افراد کا نشانِ امتیاز بنے اور اب تک بنے ہوئے ہیں. یہی کیفیت ایک عرصہ تک سامی طبقہ بنی نوع انسان پر وارد رہی اور اسرائیلی دنیا جس نے سب سے پہلے توحیدِ الٰہی کا سبق سیکھا. اپنی اجتماعی زندگی کے اولین دور میں اُس اسوۂ دل پذیر کی جزئیات سے بے بہرہ ہوگئی اور اِس قدر بے بہرہ ہوئی کہ یہودی دنیا کے درمیان ایک دائمی حدِ فاصل مقرر کر دی. خطۂ حجاز کے شورہ پشت قبائل کی شورہ پشتی نے عدم مساوات کے باب میں

جن جن ستم طرازیوں کا اظہار کیا اُن کے بھیانک تذکار سے کتبِ تاریخ لبریز ہیں۔ پھر کیا یہ تعلیمِ اخوت و مساوات، جنابِ سرورِ کائنات ﷺ کا ایک ادنیٰ معجزہ نہیں کہ حضور ﷺ نے نہایت تھوڑی مدت میں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ چشم زدن میں اُن پُر معاندت قبائل کی ازلی رقابت کو ابدی اخوت میں تبدیل فرما کر ہمیشہ کے لیے ایسا بھائی بھائی بنا دیا جس کی مثال نہیں ملتی۔

ترغیبِ علم

جس شدّ و مد سے شارعِ اسلام ﷺ نے اُمّیِ محض ہونے کے باوجود تحریکِ تبلیغ و کسبِ علم و فن کا اظہار فرمایا۔ وہ بلاشبہ کسی اور ہادی کے حصے میں نہیں آیا۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ ہندوازم اور بدھ مت میں علم کو اپنانے پر زیادہ توجہ دی گئی مگر اِن ہر دو مذاہب کے مقتداؤں نے تحصیلِ علوم ایک مخصوص فرقے کا اجارہ قرار دے کر عامتہ الناس کے دل و دماغ کی خشکی کو دور کرنے کی کوئی راہ نہیں نکالی، حتیٰ کہ شودروں کو انسانیت سے گرا ہوا سمجھ کر اُن کی سماعت میں مقدس کتابوں کا پڑھنا پڑھانا ممنوع قرار دے دیا اور ایسے لوگوں سے چھو جانے والا بھی عذابِ الیم کا مستحق گردانا گیا۔ اِس کو چھوڑیے! کیوں کہ برہمن اور شودر نسبی اعتبار سے دو جداگانہ گروہ تھے، مگر حاملانِ انجیل کے لیے وہ کون سی مصیبت تھی جو اُن کے راہبوں اور قسیّسوں اور عام اہلِ جہان کے درمیان ایک سنگین دیوار قائم کرنے کا موجب ہوئی۔ خود عیسائی مؤرخ مسٹر گبن کا بیان ہے کہ دنیا کو جہالت میں مبتلا رکھنے اور رفتارِ تمدن کو غایت درجہ سست کرنے میں جس قدر شوخی یورپ کے دورِ کلیسیت میں اہلِ کلیسہ نے دکھائی وہ دنیا کے کسی اور دور میں کسی اور جماعت سے ظاہر نہیں ہوئی۔ اِن لوگوں نے نہ صرف شمعِ علم کو عوام کی نظروں سے اوجھل کیا بلکہ علم کی ضرورت پر وعظ کہنے والوں کو دار پر کھنچوا دیا، آگ میں جلوایا، زبانیں نکلوا دیں اور اُنکے جسموں کے ٹکڑے ٹکڑے کروا دیئے تاکہ کسی کو بھی تحصیل و تبلیغِ علم پر عامل ہونے کی جسارت نہ پیدا ہو۔

لیکن شارعِ اسلام، ہادیٔ برحق محمد رسول اللہ ﷺ نے تحصیلِ علم ہر ایک کے لیے نہ صرف دُنیوی فرض، بلکہ مذہبی فرض قرار دے کر ہر مرد اور عورت کو اِس کا حامل گردانا اور کسبِ علم کو زندگی کے اوّلین لمحات سے لے کر دمِ واپسیں تک لازمی قرار دیا۔ ایک عالمِ باعمل کی دوات کی سیاہی کو ایک شہید کے خون کے برابر فرمایا اور علم کے حصول کے لیے ہر ایک اجنبی سرزمین، حتیٰ کہ چین تک تگ و دو کرنے کی تاکید فرمائی اور سب سے پہلے خود سرکارِ دو عالم ﷺ نے جس درس گاہ کا افتتاح فرمایا، وہ مدینہ منورہ کا ایک مکتب تھا جس میں سب سے اول حضرت مصعب بن عمیرؓ معلم قرار پائے۔ پھر ۲ ہجری میں اسیرانِ بدر کا فدیہ ہی آپ نے یہ قرار دیا کہ ایک ایک خواندہ قیدی دس دس مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھائے اور آزادی کی ہوا کھائے۔

حقوقِ نسواں

آج کسی قوم کی ترقی وبلندی کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے یہ معیار قائم ہوگیا ہے کہ اُس پر عورتوں کی حیثیت کو پرکھا جائے اور اُس قوم کے آئین میں عورت کی غلامی کی اور تعلیم وتجارت کی حالت کیا ہے؟

اِس مسئلہ میں ہر قوم کے آئین کا جوں جوں گہری نظر سے مطالعہ کرتے جایئے توں توں وہ ناکارہ اور پسماندہ نظر آئے گی، اِس لیے کہ اسلام نے عالمِ نسوانی اور اُس کی حالتِ غلامی میں جو انقلاب پیدا کیا ہے اُس کی مثال کہیں بھی نہیں ملتی. ابتدأ ظہورِ عالم میں انسان عام جانوروں کی طرح غول بن کر رہتے تھے. رشتۂ جنسیّت کے سوا کوئی رشتہ نہ تھا. حیوانوں کی طرح تقاضائے فطرت کو پورا کر لیتے تھے اور جو اولاد ہوتی تھی سب کی مشترکہ ملکیت قرار پاتی تھی، نہ کوئی شوہر تھا، نہ بیوی. عورت اور مرد اپنی اپنی غذا وخوراک خود پیدا کرتے اور کھاتے. کسی کا کسی پر بوجھ نہ تھا. سب سے پہلا انقلاب یہ ہوا کہ انسانوں نے زمین کو ملکیت قرار دینا شروع کیا اور یہیں سے انفرادیت کی شاخ پھوٹی اور اِسی سے علیٰحدگی جائداد کے ساتھ علیٰحدگی سکونت کا جذبہ پیدا ہوا. انسانی ضروریات میں عورت بھی نہایت اہم چیز تھی اِس لیے مردوں نے عورتیں مخصوص کرنی شروع کردیں اور عورتوں کی ملکیت کے ساتھ مکانوں کی ضرورت اور قبائل کی تقسیم بھی پیدا ہوگئی. عورتوں کی محنت اور کمائی کا سلسلہ بند ہوا، کیوں کہ اب وہ امورِ خانہ داری کا رجحان رکھنے لگی تھیں. عورتوں کی کفالت نے ایک مخصوص چیز یہ پیدا کردی کہ وہ پوری طرح غلام نظر آنے لگیں اور مردوں کی نگاہ میں ایک تفریح کا آلہ یا بچے پیدا کرنے کی مشین بن کر رہ گئیں اور رفتہ رفتہ رفیقِ حیات سمجھنے کی بجائے مرد اپنی عورت پر ایک جابر حاکم بن گیا. دنیا والوں نے بہت ترقی کی مگر عورت کو جو ڈگری مل چکی تھی اُس میں کوئی ردوبدل نہ ہوا. رومیوں کی تہذیب شُہرۂ آفاق مانی گئی مگر عورت ایک پالتو بلی سے زیادہ اس میں بھی کوئی استحقاق نہ پاسکی. یونان میں انتہائی علمِ فلسفہ کی ترقی کے باوجود عورت جائدادِ منقولہ سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی اور علوم وفنون سے وہ محروم رکھی جاتی تھی. ایران میں بھی یہی حال تھا. ہندوستان میں ایک ہندو عورت کی حیثیت قطعاً ایک بے جان بُت اور منوشاستر کی رو سے سانپ اور بچھو سے بدتر تھی. بیوہ ہوجانے پر نکاحِ ثانی کا حق سلب، جائداد ووراثت سے محروم اور صرف شوہر کی خدمت کے لیے مخصوص تھی. کثیر الازدواجی اُن کی قسمت کا ایک اندوہ ناک باب بن چکی تھی اور لوگ مویشیوں کی طرح عورتوں کو گھروں میں بھر رکھتے تھے اور عیسائیت کی مہذب دنیا میں تو عورت اب تک ایسے جنجال میں جکڑی ہوئی ہے کہ اُس کو اپنا نام رکھنے کے بھی قابل نہیں سمجھا گیا. بچپن میں باپ کے نام سے اور شادی ہونے پر شوہر کے نام سے منسوب رہی. ترکہ اور وراثت تو درکنار اپنی ذاتی کمائی میں بھی اُس کا کوئی حق اور حصہ نہیں.

عرب میں عورت مرنے والے خاوند کی اولاد میں وراثت کے طور پر تقسیم ہو جاتی تھی. بیویوں کی کوئی مقررہ تعداد نہ تھی. نہ اُن کا کوئی حق تھا. وحشیانہ سلوک کی وہ حق دار اور بعض اوقات خاوند یا مالک کی مرضی پر واجب القتل قرار دی جاتی تھیں. دنیا میں سب سے پہلے حضور ﷺ نے عورت کے حقوق قائم کیے اور فرمایا: تمہارے لیے یہ جائز نہیں کہ تم عورتوں کو میراث سمجھ کر اُن پر جبراً قبضہ رکھو. ہاں! اگر اُن سے کسی بدکاری کا اظہار ہو تو ایسا کر سکتے ہو. عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤ اور اگر تمہیں کسی وجہ سے تمہاری بیوی ناپسند ہو، تو عجب نہیں کہ جس کو تم ناپسند رکھ رہے ہو، اُسی سے اللہ تمہیں خیر و برکت دے. عورتوں کو اذیت نہ دو اور نہ ستاؤ. گو مردوں کو عورتوں پر فوقیت حاصل ہے مگر حقوق کے اعتبار سے دونوں برابر ہیں. وہ تمہارا لباس ہیں اور تم اُن کا لباس ہو. مرد عورتوں کے نگرانِ کار ہیں کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے بعض کو بعض پر فضیلت دے رکھی ہے اور وہ اُن پر اپنا مال خرچ کرتے ہیں. گویا بانیٔ اسلام نے پہلی مرتبہ مرد و عورت کے حقوق برابر قرار دے کر عورت کی مالی حالت مستحکم کی، اِس لیے کہ عورت کی تحقیر اور پستی کی وجہ اُس کی مالی بے چارگی بھی تھی. اسلام نے ہی یہ احسان فرمایا کہ عورت کو وراثت میں شریک کیا اور وہ اپنے باپ، بھائی، خاوند، بیٹے کے مال و جائداد میں اپنے حصے کی وارث قرار دی گئی. اُس کو اپنی جائداد کا مالک بنا دیا گیا. اُس کو بیع و شریٰ، خرید و فروخت اور معاہدہ و انتظام کی پوری اجازت عطا فرما دی گئی. اپنے حق مہر پر اُس کو اختیار دیا گیا. عبادت میں بھی عورت کو مرد کے برابر فرمایا اور عورت کی روحانی حیثیت بھی قائم کر دی. گویا عورت اب گھر کی ملکہ اور بنیادی حیثیت سے مرد کے برابر ہو گئی. وہ "ذلیل لونڈی" اور "پالتو بلی" کے درجے سے نکل کر حقیقی معنوں میں "رفیقۂ حیات" بن گئی، جو اسلام سے پیشتر عملیات، مالیات، اقتصادیات اور عبادت میں قطعی کوئی حصہ نہ رکھتی تھی لیکن اسلام نے عورت کے لیے ترقی و مساوات کے تمام دروازے کھول دیے اور اُس کے راحت و آرام کو معیارِ شرافت قرار دے کر صاف طور پر فرما دیا کہ شریف وہی ہے جس کا سلوک اپنی عورت کے ساتھ بہتر اور شریفانہ ہو.

عورت کے مدارج

سرکارِ دو عالم محمد رسول اللہ ﷺ نے جب بے زبان اور غریب طبقۂ نسواں کی مظلومیت ملاحظہ فرمائی تو قوم کو پیغام دیا کہ مرد اور عورت ایک ہی اصل اور ایک ہی جوہر سے ہیں. اِس لیے مردوں کو چاہیے کہ عورت کو کمزور سمجھ کر اُس پر حکمرانی کی نہ ٹھانے اور اُس پروردگارِ عالم سے ڈرے، جس نے دونوں کو ایک جان سے پیدا فرمایا ہے. مولا کریم نے تمام تر روحانی مدارج اور فلاحِ اُخروی میں عورتوں کو مردوں کے پہلو بہ پہلو رکھا ہے اور کسی قسم کی تفریق نہیں فرمائی. قربِ خداوندی کا انعام دونوں کے واسطے یکساں طور پر ہے. نجاتِ اُخروی اور فلاحِ عقبیٰ کا مرد ہی اجارہ دار نہیں بلکہ دونوں میں سے وہ

زیادہ مستحق ہے جو زیادہ نیک کام کرے اور زیادہ متقی ہو. فطری جسمانی کمزوریاں اور تخلیقی خامیاں عورت کی ذِلت کا تمغہ نہیں بلکہ اُس کی نزاکت کا روشن پہلو ہیں، جن کا پایا جانا فاطرِ فطرت نے اُس کے لیے ضروری سمجھا. اگر یہ اُس میں نہ ہوتیں تو وہ ''چراغ خانہ'' نہ بن سکتی. قدرت نے اسلام میں جو مدارج اُس کی کمزوریوں کے باوجود اُس کو مرحمت فرما دیئے ہیں، وہ ایک اجمال ہے جس کی تفصیل نہایت ضروری معلوم ہوتی ہے، تاکہ بخوبی واضح ہو جائے کہ عورت کی مختلف سہ گانہ حیثیتوں میں علیحدہ علیحدہ بانیِ اسلام نے اُس کا کیا درجہ اور حق قائم فرمایا ہے.

لڑکی کی حیثیت میں

اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا. جس کو مولا کریم نے لڑکیاں عطا فرمائی ہوں، وہ اُن کی باحُسنِ وجوہ پرورش کرے. وہ لڑکیاں اُس کے اور دوزخ کے درمیان آڑ بن جائیں گی. پھر ایک اور حدیثِ قدسی ہے کہ جس نے دو لڑکیاں پالیں، وہ شخص اور میں جنت میں دو ملی ہوئی انگلیوں کی طرح ایک دوسرے کے قریب ہوں گے. پھر ارشاد ہوتا ہے کہ میں تمہیں بتاؤں کہ بہترین نیکی کیا ہے؟ کہ تیری لڑکی جو تیرے پاس آئی ہو اور تیرے سوا اُس کا کوئی دستگیر نہ ہو تو تُو اُس کی دستگیری کر. حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا. جس کو خداوندِ عالم نے لڑکی عطا فرمائی اور اُس نے اُس کو نہ زندہ دفن کیا اور نہ ہی اُس کو ذلیل سمجھا اور نہ اُس پر لڑکے کو ترجیح دی، وہ بہشت میں داخل ہوگا، اور ایک یہ بھی روایت ہے کہ کوئی بال بچے دار شخص جب کوئی چیز بازار سے لائے تو واجب ہے کہ اُس کی تقسیم کی ابتداء لڑکی سے کرے، کیوں کہ جو لڑکی کو خوش رکھتا ہے وہ گویا حق تعالیٰ سے ڈر کر روتا ہے اور آتشِ دوزخ اُس پر حرام ہو جاتی ہے.

حضور ﷺ کی خدمت میں حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا جب بھی حاضر ہوتیں تو حضور ﷺ محبت سے کھڑے ہو جاتے اور حضرت سیدہ کا ہاتھ پکڑ کر چومتے اور اپنی جگہ بٹھاتے. کیا اِس سے بڑی عزت کسی مذہب میں لڑکی کے لیے ممکن ہے؟ اِس کے علاوہ سب سے زیادہ حق رسانی یہ ہے کہ لڑکی اسلام میں ''محروم الارث'' (وراثت) نہیں. قرآنِ کریم میں آتا ہے کہ اللہ کریم تمہیں تمہاری اولاد کے بارے میں وصیت فرماتا ہے کہ ایک بیٹے کے لیے دو بیٹیوں کا حصہ ہے اگر بیٹیاں دو سے زیادہ ہوں تو اُن کے واسطے دو تہائی اور ایک ہو تو نصف. کیا ادیانِ عالم اور اقوامِ دنیا میں کہیں بھی یہ تقسیم ملتی ہے؟ یہ وہ حیثیت ہے کہ جس پر کسی بناوٹی نقد و نظر کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی.

بحیثیت ماں کے

سوسائٹی میں عورت کی ایک اہم حیثیت ماں کی ہے. جتنی اہمیت اور جتنا احترام حضور ﷺ نے ماں کے متعلق فرمایا ہے وہ ایک نہایت بلند ڈگری ہے. قرآنِ کریم میں ہے کہ والدین کے ساتھ بھلائی کا سلوک کر. اگر اُن دونوں میں سے ایک یا دونوں ہی تیرے پاس بڑھاپے میں پہنچیں تو اُن کے سامنے اُف بھی نہ کرنا اور اُن کے ساتھ سختی سے نہ بول بلکہ نرمی سے اُن کے ساتھ بات کر اور عاجزی کا بازو اُن کے لیے جھکا دے اور اُن کے لیے دعا کر کہ اے رب اِن پر رحم فرما جیسے رحم سے بچپن میں اِنہوں نے مجھے پالا.

پھر حضور ﷺ نے کن مؤثر الفاظ میں جاہل لوگوں کو سمجھایا ہے کہ دیکھو جنت تمہاری ماں کے قدموں کے نیچے ہے. ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص نے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ حضور ﷺ! میں نے اپنی ضعیفہ ماں کو سات حج بیت اللہ شریف کے اپنے کندھوں پر بٹھا کر کرائے ہیں. کیا میری طرف سے ماں کا حق الخدمت ادا ہو گیا ہے؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا ابھی تو تم اتنا معاوضہ بھی ادا نہیں کر سکے جتنا تمہاری ماں نے تمہیں گیلے بستر سے اٹھا کر سوکھے کی جانب لٹایا تھا اور خود گیلے کی جانب لیٹ گئی تھی. اسی طرح ایک اور روایت ہے کہ ایک شخص نے حاضر حضور ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ میں نے عرب کا فلاں ریگستانی علاقہ اپنی ضعیفہ ماں کو کندھوں پر اٹھا کر عبور کرایا ہے اور میرے پاؤں گرم ریت سے آبلے پڑ کر زخمی ہو گئے ہیں. کیا میں نے اپنی ماں کا کوئی حق ادا کیا ہے؟ فرمایا ہاں! ممکن ہے کہ مولا کریم تیری اِس محنت کو تیری ماں کے کسی درد کے اُس چھوٹے سے جھٹکے کے عوض میں قبول فرما لے، جو تیری پیدائش کے وقت تیری ماں کو لگے. ایک صحابی ابی الطفیلؓ بیان فرماتے ہیں کہ میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر تھا کہ ایک عورت آئی. حضور علیہ السلام نے اُس کے لیے اپنی چادر مبارک بچھا دی اور وہ اُس پر بیٹھ گئی. آپ سے باتیں کرتی رہی. پھر جب وہ اٹھ کر چلی گئی تو ہمارے عرض کرنے پر کہ یا رسول اللہ ﷺ یہ بی بی کون تھیں؟ معلوم ہوا کہ آپ کی رضاعی والدہ تھیں. اِسی طرح کی ایک اور مثال حضور ﷺ کی زندگی میں ملتی ہے. حضور علیہ السلام نے لوگوں کو نصیحت فرمائی کہ جب مصر کو فتح کرو تو مصر کے رہنے والوں سے اچھے سلوک کا برتاؤ کرنا. اِس لیے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی والدہ حاجرہؓ اُسی سرزمین کی تھیں. حضور ﷺ کی یہ ایک پیش گوئی تھی، جو پوری ہوئی اور مصر والوں نے اپنے ساتھ فاتحین کا وہ سلوک دیکھا تھا جو لاجواب تھا. آخر اُن سے نہ رہا گیا اور سوال کیا کہ اس قدر مہربانی کی کیا وجہ ہے؟ تو اُن کو جواب دیا گیا جو اوپر مذکور ہوا ہے تو ایک پادری بول اٹھا کہ پیغمبر کے سوا اور کوئی ہستی عورت کا ایسا احترام نہیں کر سکتی.

قرآن کریم نے ماں باپ میں سے ہر ایک کو ترکہ میں سے چھٹا حصہ، اگر اُس کے اولاد ہو۔ اور اگر اولاد نہ ہو اور وارث ہوں ماں باپ، تو ماں کو تیسرا حصہ۔ اور اگر اُس کے بھائی ہوں تو ماں کو چھٹا حصہ بعد وصیت یا بعد ادائیگی قرض کے، معین فرمایا ہے۔

بحیثیت بیوی

عورت کی ایک اور اہم حیثیت بطورِ بیوی کے ہے اور اِسی حیثیت میں عورت کی مظلومیت بھی آشکارا ہے۔ اِس لیے پہلا حکمِ خداوندی جو اِس باب میں نازل ہوا یہ تھا کہ بیوی موجبِ تسکین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمہاری جنس سے تمہارے واسطے تمہاری بیویاں بنا دیں تا کہ تم اُن سے تسکین پاؤ اور اُسی نے تمہارے درمیان الفت اور محبت پیدا فرمائی۔ اُن کے ساتھ بھلائی کا سلوک کرو اور اُن کو وہی کھانے کو دو، جو تم خود کھاؤ اور اُن کو وہی پہناؤ جو خود پہنو اور اُن سے درشتی سے پیش نہ آؤ۔ تمہارے ترکہ میں سے وہ چوتھائی حصہ کی حق دار ہیں، اگر اُن سے تمہارے ہاں اولاد نہ ہو اور اگر ہو تو آٹھویں حصہ کی مالک ہوں گی۔

گویا حضور ﷺ ہی کی رحمت سے عورت کو یہ حق ملا ہے کہ وہ خود مختارانہ طور پر کسی جائداد کی قابض و مالک ہو سکتی ہیں، ورنہ حضور ﷺ کی تشریف آوری تک وہ ایک ذلیل ترین چیز تھی۔

رحمتِ رسول ﷺ میں کمزوروں کا حصہ

جہاں آپ ﷺ نے عورت کے ساتھ حسنِ سلوک کو سب سے بڑی نیکیوں میں ایک نیکی قرار دیا اور بار بار مردوں کو تاکید فرمائی کہ اُن کی دل جوئی تمہارا فرض ہے۔ بیوی کو اپنی آبرو کا لباس سمجھو۔ لڑکیوں کی تربیت کو موجب رحمت قرار دیا اور والدہ کی حالت میں وہ قابلِ احترام ٹھہرایا کہ جس کے پاؤں کے نیچے جنت ہو، وہاں حضور ﷺ کی رحمۃ اللعالمینی نے عام غربا کو بھی اپنی رحمت سے محروم نہیں فرمایا۔ اِس لیے کہ وہ غریبوں کے محب، مسکینوں کے ساتھی، یتیموں کے والی، غلاموں کے مولیٰ، بے کسوں کے مددگار، کمزوروں کے سہارے، بے آسروں کے آسرے، دردمندوں کی دوا اور ساری کائنات کے لیے مجسم رحمتِ رحمٰن تھے۔

حضور ﷺ ہمیشہ غربا و مساکین سے اِس طرح پیش آتے تھے کہ وہ لوگ اپنی غربت اور مسکنت کو موجبِ رحمت سمجھنے لگے تھے اور امراء کو حسرت ہوتی تھی کہ ہم کیوں غریب نہ ہوئے اور آپ نے اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ فرما کر طبقہ غربا کو قابلِ فخر بنا دیا۔

حضور ﷺ کی دعا ہوا کرتی تھی کہ اے میرے خدا مجھے مسکین زندہ رکھ، مسکین اٹھا اور مساکین

ہی کے ساتھ میرا حشر کر! ایک مرتبہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے آپ کو یہ دعا فرماتے ہوئے سنا تو عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اس کی کیا وجہ ہے جو حضور ﷺ ایسی دعا فرماتے ہیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا اے عائشہؓ! یہ دولت مندوں سے پہلے جنت میں جائیں گے. نیز ایک اور موقع پر حضور ﷺ نے حضرت ام المومنین صدیقہؓ کو یوں نصیحت فرمائی: اے عائشہؓ کسی مسکین کو اپنے دروازے سے نامراد نہ پھیر! غریبوں سے پیار کر اور اُن کو اپنے سے نزدیک کر! تا کہ خداوندِ عالم تمہیں اپنے نزدیک فرمائے.

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: بیوہ عورت اور مسکین کے ساتھ سلوک کرنے والا ایسا ہے جیسا مجاہد فی سبیل اللہ. جیسا تمام رات نوافل پڑھنے والا اور دن کو روزہ رکھنے والا. حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ غربا مہاجرین کے ساتھ مل کر بیٹھے تو فرمایا کہ فقراء مہاجرین کو بشارت ہو کہ وہ امراء سے چالیس سال پہلے جنت میں داخل ہوں گے اور حضور ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ میں نے جنت کے دروازے پر کھڑے ہو کر دیکھا، اُس میں زیادہ غربا و مساکین تھے اور مالدار دروازہ پر روک دیئے گئے تھے.

حضرت جریرؓ سے مروی ہے کہ ہم خدمتِ اقدسِ رسول اللہ ﷺ میں حاضر تھے کہ آپ کی خدمت میں ایک قبیلہ کے لوگ حاضر ہوئے جو سب کے سب اتنے غریب تھے کہ اُن کے جسموں پر نہ کپڑا تھا نہ پاؤں میں جوتا، ننگے بدن، ننگے سر اور ننگے پاؤں، حضور ﷺ اُن کی حالت دیکھ کر سخت مضطرب ہوئے، عالمِ کرب و اضطراب میں آپ کبھی اندر تشریف لے جاتے اور کبھی باہر تشریف لاتے، چنانچہ اسی بے قراری میں حضرت بلالؓ کو اذان کا حکم دیا اور نماز کے بعد خطبہ میں اُن لوگوں کی امداد و دستگیری کی طرف حاضرین کو متوجہ فرمایا، جب کہیں اُن کی امداد کے بعد حضور ﷺ کا اضطراب رفع ہوا.

حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ یتیم کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ یتیم کا مال موجب ہلاکت ہے. اور فرمایا سات باتیں موجبِ ہلاکت ہیں ان سے بچو. حاضرین دربار نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ وہ کیا ہیں، تو فرمایا (1) خدا کے ساتھ شرک کرنا (2) جادو کرنا (3) اُس شخص کا قتل کرنا جو حرام کیا گیا ہو (4) سود کھانا (5) یتیم کا مال کھانا (6) جنگ سے بھاگنا (7) پاک دامن عورت پر تہمت لگانا. حضرت سہلؓ روایت فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ نے انگشتِ شہادت اور وسطیٰ کو ملا کر فرمایا کہ میں اور یتیم کی پرورش کرنے والا جنت میں اِن دو انگلیوں کی طرح قریب قریب ہوں گے.

حضور ﷺ یتامیٰ و مساکین کے علاوہ غلاموں پر خاص شفقت فرماتے اور اُن کو آزاد کرنے میں نہایت سبقت فرماتے. اُن سے حُسنِ سلوک کی بار بار تاکید فرمائی جاتی. نہایت محبت سے خود حضور ﷺ نے تینتالیس غلاموں اور گیارہ لونڈیوں کو آزاد فرمایا. حضرت ابو ذرؓ بیان فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے غلام کو ایک مرتبہ ماں کی گالی دی تو حضور ﷺ نے سن کر فرمایا: اے ابو ذر! کیا تم نے اِس کو ماں سے

غیرتِ دلائی ہے؟ تم میں ابھی جہالت کا اثر باقی ہے، یاد رکھو تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں. اُن کو خدا نے تمہارے قبضہ میں دے رکھا ہے، پس جس شخص کا بھائی اُس کے قبضہ میں ہو اُس کو چاہیے کہ جو خود کھائے اُس کو بھی کھلائے. اور اپنے غلاموں سے وہ کام نہ لو جو اُن پر شاق گزرے. اگر کوئی سخت کام اُن سے لو تو خود بھی اُن کی امداد کرو. حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو شخص اپنے غلام کو بقدر اپنے حصے کے آزاد کرے، اُسے لازم ہے کہ اُس کو اپنے مال سے پوری آزادی دلا دے، اور اگر وسعت نہ ہو تو کسی عادل سے اُس کی قیمت لگوائے. مزدوری غلام سے کروائی جائے لیکن جبر نہ کیا جائے جو شخص کسی مسلمان غلام کو آزاد کرے اللہ تعالیٰ اُس آزاد کردہ کے ہر عضو کے عوض میں اُس کا ایک ایک عضو دوزخ سے آزاد فرمائے گا.

حضور اکرم ﷺ نے اپنے غلام زیدؓ بن حارثہ کو آزاد فرما دیا تھا لیکن وہ حضور ﷺ کی خدمت سے علیحدہ ہونا اور آغوشِ پدری میں جانا گوارا نہ کرتے تھے اور خدمتِ حضور ہی میں حاضر رہتے. اُن کے بیٹے اسامہؓ سے آپ کو اِس قدر محبت تھی کہ آپ فرمایا کرتے اگر اسامہؓ لڑکی ہوتی تو میں اس کو زیور پہناتا اور حضور ﷺ خود اپنے دستِ مبارک سے اُس کی ناک صاف کیا کرتے. ابو مسعود صحابیؓ ایک بار اپنے غلام پر برافروختہ ہو کر زدوکوب پر اتر آئے تو اتفاقِ حُسنہ سے سرکارِ دو عالم ﷺ اُدھر تشریف لے آئے فرمایا: مسعود! تم کو جس قدر اس غلام پر اختیار ہے اللہ تعالیٰ اُس سے زیادہ تم پر اختیار رکھتا ہے. ابو مسعود نے مڑ کر دیکھا تو حضور ﷺ تھے. دست بستہ عرض کی کہ یا رسول اللہ ﷺ میں نے اِس کو آزاد کیا فرمایا: اگر تم اِس کو آزاد نہ کرتے تو دوزخ کی آگ تم کو چھو لیتی. ایک دفعہ حضور ﷺ نے دیکھا کہ ایک سوار آ رہا ہے اور اُس کے پیچھے غلام بھاگ رہا ہے. آپ نے فرمایا: اِس کو بھی سوار کر لو اور اپنے پیچھے بٹھا لو. یہ بھی تمہارا بھائی ہے اور اس کی روح بھی تمہاری روح کی طرح ہے. آپ نے ابوالہیثم کو ایک غلام مرحمت فرمایا اور تاکید فرمائی کہ اس سے نیک سلوک کرنا. ابوالہیثم غلام کو گھر لے گئے اور بیوی کو صورتِ حالات سے آگاہ کیا. بیوی نے کہا اِس کا مطلب یہ ہے کہ اِس کو آزاد کر دو، چنانچہ غلام آزاد کر دیا گیا.

غرضیکہ حضور اکرم ﷺ کو غلاموں کا اِس قدر خیال تھا کہ آخر وقت میں بھی آپ نے غلاموں کے متعلق حسنِ سلوک کی وصیت فرمائی اور فرمایا کہ اپنے غلاموں کے معاملہ میں خدائے قدوس سے ڈرتے رہا کرو گویا اِس مسئلہ میں اتنی تاکید تھی کہ حضور ﷺ کے ارشاد سے آئندہ کوئی غلام بنایا جانا جائز نہ سمجھا جائے. آپ نے ہمیشہ مظلوموں کی دستگیری فرمائی اور ظالموں کو ظلم سے باز رکھا اور مظلوموں کی آہ سے ڈرایا کیونکہ اُن کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی حجاب نہیں. اُن کی آہ بلا روک ٹوک درگاہِ الٰہی میں پہنچتی ہے. حضرت براءؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ہمیں سات چیزوں کا حکم دیا. (1) جنازہ کے ہمراہ جانا (2) مریض کی عیادت کرنا (3) دعوت قبول کرنا (4) مظلوم کی امداد کرنا (5) قسم کا پورا کرنا (6) سلام کا

جواب دینا (7) چھینکنے والے کو جواب دینا.

حضرت معاذؓ کو حضور ﷺ نے یمن کی طرف روانہ فرمایا تو ارشاد فرمایا کہ مظلوموں کی فریاد سے ڈرنا اور ان کی مدد کرنا.

بوڑھوں کا اکرام

انسان کی پچھلی عمر اور ضعیفی کو ارذل عمر کہا گیا ہے. جس میں آدمی ہر طرح معذور ہو جاتا ہے اور اُس کی عمر کا یہ حصہ اتنا احتیاج آمیز ہوتا ہے کہ انسان بعض اوقات مصائب وتکالیف سے تنگ آ کر خود موت کی تمنا کرنے لگتا ہے. پیری جب مسلّط ہوتی ہے اور تمام طاقتیں جواب دے چکتی ہیں تو اولاد تک کو اُن کا وجود ناگوار اور اُن کی زندگی بوجھل معلوم ہونے لگتی ہے اور اُن کا گھر میں رہنا بھی دوبھر نظر آتا ہے. ایسی حالت میں انسان کا وقار قائم رکھنے اور اُس کا شرف پہچاننے کے واسطے سرکارِ دو عالم نبی مکرم محمد رسول اللہ ﷺ نے پیغام سنایا کہ مولا کریم نے بوڑھے مسلمان کے اکرام کو اپنا جلال بتایا ہے. ایسی حالت میں اُس کی خدمت، اُس کی دل جوئی اولاد پر فرض کر دی گئی ہے جیسا کہ قرآنِ پاک میں ارشاد ہوتا ہے کہ ''اگر تیرے ماں باپ سے کوئی یا دونوں تیرے پاس بڑھاپے کو پہنچیں تو وہ خواہ تیری طبیعت کے خلاف کتنا ہی عمل کریں اُن سے ''اُف'' بھی نہ کہنا اور نہ اُن کو نا اُمید کرنا اور اُن سے ہر بات نرمی سے کر اور اُن کے لیے دعا مانگ کہ الٰہی اِن پر رحم فرما! جیسے اِنہوں نے مجھے کمزوری میں پرورش کیا اور رحم فرمایا.'' حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ تم کو روزی اور مدد تمہارے بوڑھوں اور کمزوروں کی بدولت دی جاتی ہے گویا بوڑھوں کی خدمت خدائے پاک کے رحم کا وسیلہ ہے اور والدین کی دعا ایک وہ مؤثر شئے ہے جو ہر آن رحمتِ الٰہی کے زیر سایہ کر دیتی ہے.

سرکارِ کائنات محمد رسول اللہ ﷺ بچوں پر بھی نہایت شفقت فرماتے تھے. آپ کو جو بچے راستہ میں چلتے ہوئے بھی ملتے اور آپ سوار ہوتے تو اُن میں سے بھی کسی کو اپنے ساتھ سوار فرما لیتے.

حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ ایک دیہاتی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا کہ آپ تو بچوں سے بہت پیار کرتے ہیں اور اُن کو بوسہ دیتے ہیں ہم تو ایسا نہیں کرتے. حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تیرے دل سے رحمت سلب کر لی ہے.

حضرت انسؓ جب بچوں کے پاس سے گزرتے تو اُن پر سلام کہتے اور فرماتے کہ حضور ﷺ ایسا ہی کرتے تھے.

بعض اوقات سرکارِ دو عالم ﷺ بچوں کے مزاج کا اِس قدر خیال فرماتے کہ اگر یادِ الٰہی میں بچے پاس آ کر شوخی کرتے یا آپ کے اوپر چڑھ جاتے تو بھی آپ اُن کی دل شکنی گوارا نہ فرماتے. چنانچہ

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ایسے کئی ایک واقعات مشہور ہیں کہ سجدے میں گئے ہوئے حضرت کی پشت مبارک پر صاحبزادے بیٹھ گئے اور جب تک وہ خود نہیں اترے آپ ﷺ نے سجدہ سے سر مبارک نہیں اُٹھایا. اسی طرح حضرت ابو قتادہ انصاریؓ سے امامہ بنتِ زینبؓ بنتِ رسول اللہ ﷺ کی نسبت روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نماز پڑھ رہے تھے اور امامہ بنت زینبؓ یعنی اپنی نواسی کو کندھوں پر اٹھائے ہوئے تھے. یہ بچی ابو العاص بن ربیعہ بن عبد الشمس کی بیٹی تھی چنانچہ جب نماز پڑھتے ہوئے حضور ﷺ سجدے میں جاتے تو اُس کو اتار لیتے اور جب کھڑے ہوتے تو پھر اٹھا کر کھڑے ہوتے. حضرت انسؓ سے مروی ہے. حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں نماز شروع کرتا ہوں اور ارادہ کرتا ہوں کہ قرأت لمبی کروں کہ دفعتاً صف میں سے کسی بچے کے رونے کی آواز آنے لگتی ہے تو میں قرأت کو مختصر کر دیتا ہوں تا کہ بچے اور بچے والی کو تکلیف نہ ہو.

حدیثوں میں آتا ہے کہ حضور ﷺ جب موسم کا کوئی نیا میوہ آتا تو تقسیم فرماتے وقت حاضرین میں سے پہلے بچوں کو دیتے.

بچوں کی اصلاح اور بچوں کو سدھارنے کے لیے سرکارِ دو عالم ﷺ نے بدنی سزا کو ممنوع قرار دیا ہے. اور خاص کر منہ پر مارنے سے قطعی طور پر روکا ہے اور اولاد کی درستیٔ اخلاق کے لیے دعا کو بہترین ذریعہ قرار دیا ہے. ایسے ہی اولاد کے قتل کرنے کے مذموم کام کو سختی سے روکا جو اہلِ عرب کی اکثر عادت تھی کہ وہ لڑکیوں کو قتل کر دیتے تھے اور ایسے فعل سے بچنے کو موجبِ تسکین فرمایا چنانچہ پیدا ہونے سے قبل اولاد کے لیے کثرت سے دعا مانگنے کا حکم دیا کہ اولاد آنکھوں کا سکھ، دل کا چین اور کلیجہ کی ٹھنڈک ثابت ہو.

بیماروں سے سلوک

بیمار خواہ کیسے ہی مرض میں مبتلا ہو نہایت بے کس، مجبور اور قابلِ رحم حالت میں ہوتا ہے. سرکارِ دو عالم ﷺ نے اِس طبقہ کی بڑی ہمدردی کی ہے اور بیماری جیسی مایوسی کی حالت میں بھی انسان کی وہ ڈھارس بندھائی کہ وہ اِس مصیبت کو بھی رحمتِ الٰہی سمجھ کر شکر کرنے لگا.

سرکارِ جہاں پناہ ﷺ نے بیماروں کی بیمار پرسی کی حد سے زیادہ ترغیب دلائی ہے تا کہ آدمی کو آدمی سے انتہائی الفت و ہمدردی ہو اور بیمار مسافرت میں بھی ہوتے ہوئے کسمپرسی کی حالت میں تکلیف نہ اٹھائے. خود سرکارِ دو عالم ﷺ چھوٹے سے چھوٹے آدمی کی عیادت کو بھی تشریف لے جاتے تھے چنانچہ مشہور روایت ہے کہ ایک مسجد کا جاروب کش بیمار ہو گیا تو آپ بار بار اُس کی بیمار پرسی کو تشریف لے گئے اور جب وہ فوت ہوا تو رات زیادہ جا چکی تھی. لوگوں نے آپ کو تکلیف نہ دینے کی غرض سے

بلا اطلاع کیے اُس کو دفن کر دیا. آپ کو صبح اطلاع ہوئی تو آپ نے اظہارِ ناراضگی فرمایا اور قدم رنجہ فرما کر اُس کی قبر تک تشریف لے گئے اور نماز جنازہ پڑھی.

حضور ﷺ کی عادت مبارک تھی کہ ایسے بیماروں کو جو زیادہ تکلیف اور خطرناک حالت میں ہوں، اپنے کاشانۂ رحمت کے قریب لے آتے تا کہ ہر لحظہ اُن کی خبر گیری اور دل جوئی ہو سکے. چنانچہ حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب غزوۂ احزاب میں زخمی ہوئے تو حضور ﷺ نے بدیں سبب ہی اُن کا خیمہ مسجد میں نصب کرا دیا.

حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ جب کسی مریض کی عیادت کو تشریف لے جاتے تو اُس کے پاس یہ دعا فرماتے. اے مولا کریم! لوگوں کا خوف دور کر، اُن کو شفا عطا فرما، کیوں کہ شفا عطا فرمانے والا تو ہی ہے اور شفا دراصل تیری ہی شفا ہے، جو کسی بیماری کو نہیں چھوڑتی. حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ خدمتِ والا میں حاضری دی. اُس وقت سرکار ﷺ کی طبیعت علیل تھی اور بڑی شدت کا بخار تھا. میں نے عرض کیا کہ حضور ﷺ کو نہایت تیز بخار ہے، شاید اِس لیے کہ حضور ﷺ کو دوہرا اجر ملے گا. فرمایا ہاں، اور بے شک کسی مسلمان کو کوئی تکلیف نہیں پہنچتی مگر خداوندِ عالم اِس سے اُس کے بدلہ میں اُس کے گناہ اِس طرح گرا دیتا ہے جیسے خشک درخت کے پتے جھڑتے ہیں.

حیوانات پر رحمت

کائنات بھر کے رسول علیہ السلام کی بعثت سے قبل جو مظالم اِس بے زبان طبقہ پر ہوتے تھے، اُس کو دیکھ کر آپ کی رقیق القلبی اور رحمۃ اللعالمینی متحمل نہیں ہو سکتی تھی. اِس لیے حضور ﷺ نے حیوانات پر نرمی کرنے اور اُن پر رحم کھانے کے متعلق بار بار انسانوں کو تاکید فرمائی اور حیوانِ ناطق کو اُن کے مکروہ و مذموم اعمال پر شدت سے منع فرمایا، کیوں کہ اُن بے تہذیب انسانوں کا رویہ نہایت سنگ دلانہ تھا. زندہ جانوروں کے بدن کا ٹکڑا کاٹ لینا، دُم اور بال قطع کرنا، جس سے جانور کو ایذا پہنچے. اپنے جانوروں کا آپس میں شرط اور بازی پر لڑانا، چند دل خوش کن مشغلے تھے. بعض اوقات جانوروں کو ایک جگہ باندھ کر نشانہ بازی کی مشق کرنا، اپنی تفریح سمجھی جاتی تھی. سرکارِ دو عالم ﷺ نے اِن تمام بے رحمیوں کو روکا اور بندوں کو ہدایت فرمائی کہ اِن پر رحم کرنا چاہیے.

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے بیان فرمایا کہ جنت میرے اِس قدر قریب ہو گئی تھی، اگر میں چاہتا تو اُس کے خوشوں میں سے ایک خوشہ توڑ کر تمہارے پاس لے آتا اور دوزخ بھی میرے قریب ہو گئی تھی، یہاں تک کہ میں نے کہا، اے میرے پروردگار! کیا میں اُن لوگوں

میں رکھا جاؤں گا؟ کہ اچانک ایک عورت پر نظر پڑی، جس کو ایک بلی پنجے مار رہی تھی تو میں نے اُس کا حال پوچھا تو لوگوں نے کہا کہ اِس عورت نے بلی کو باندھے رکھا تھا، یہاں تک کہ وہ بھوک اور پیاس سے مرگئی اور اِس عورت نے نہ ہی اُس کو کھلایا اور نہ پلایا اور نہ ہی اِس نے اُس کو چھوڑا تا کہ وہ خود کہیں سے کھا پی لیتی۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ایک بدکار عورت صرف اس بات پر بخش دی گئی کہ اُس کا گزر جب ایک مرتبہ ایک کُتے پر ہوا جو مٹی چاٹ رہا تھا اور قریب تھا کہ اُس کو پیاس ہلاک کر دیتی تو اُس عورت نے اپنا موزہ اتارا اور اُس کو اپنے دوپٹے سے باندھ کر کنوئیں میں لٹکا کر پانی نکالا اور اُس کتے کو پلایا۔ اس کارِ خیر کی وجہ سے وہ نجات پا گئی۔

حضرت ابنِ عمرؓ کا گزر ایک ایسی جماعت پر ہوا جو مرغی کو رسی سے ایک جگہ باندھ کر نشانہ لگا رہے تھے۔ آپ کو دیکھ کر سب منتشر ہو گئے۔ ابن عمرؓ نے اُن سے پوچھا یہ فعل کون کر رہا تھا؟ تم یاد رکھو کہ ایسا کرنے والے پر اور جانوروں کے مثلہ کرنے والے پر نبی کریم ﷺ نے لعنت فرمائی ہے۔

ایک مرتبہ ایک اونٹ پر راستہ میں آپ کی نظر پڑی، جس کے پیٹ اور پیٹھ میں بھوکا رہنے کی وجہ سے کوئی فرق نہ رہا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا، اِن بے زبانوں کے متعلق خداوندِ عالم سے ڈرو۔ ایسے ہی ایک بار ایک گدھے کو دیکھا، جس کا چہرہ داغا ہوا تھا تو آپ نے فرمایا، چہرہ داغنے والے پر خدا کی لعنت ہے۔

ایک حمالی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، جس نے اپنی چادر میں جانوروں کے کچھ بچے چھپا رکھے تھے۔ آپ نے اُس سے دریافت فرمایا تو اُس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ جھاڑی سے آواز آ رہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر دیکھا تو یہ چھوٹے بچے تھے۔ میں نے اِن کو اٹھا لیا۔ اِن کی ماں نے جب دیکھا تو سر پر منڈلانے لگی۔ حضور ﷺ نے فرمایا، واپس جاؤ اور اِن کو وہیں رکھ آؤ۔

ایک بار حضور ﷺ جنگل کو تشریف لے گئے تو دیکھا کہ ایک شکاری نے ایک ہرنی پکڑ رکھی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہ اپنے بچوں کو دودھ پلانے کے لیے جانا چاہتی ہے اور التجا کرتی ہے کہ اِس کو اجازت ہو تو یہ بچوں کو دودھ پلا کر واپس آ جائے۔ شکاری نے عرض کیا کہ حضور ﷺ یہ جنگل کے جانور ہاتھ سے نکل کر واپس کب آتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا، میں ضمانت میں تمہارے پاس بیٹھتا ہوں۔ اِسے جانے دو، یہ واپس آ جائے گی۔ چنانچہ شکاری نے اُس کو چھوڑ دیا۔ وہ بھاگی ہوئی گئی اور جاتے ہی اپنے دو بچوں کو لے کر واپس آ گئی کہ اللہ کریم کے رسولِ پاک ﷺ میری ضمانت میں ہیں۔ آپ ﷺ کو انتظار کی تکلیف نہ ہو۔ اِس واقعہ سے شکاری مشرف باسلام ہو گیا اور ہرنی کو بچوں سمیت رہا کر دیا۔

غرض یہ کہ سرکارِ دو جہاں مختارِ کون و مکاں ﷺ کی حیاتِ طیبہ ایک وہ بے مثال زندگی ہے، جس میں بے شمار ایسے حقائق پوشیدہ ہیں۔ یتیموں پر شفقت، بیواؤں کی اعانت، بیماروں اور تنگ دستوں کی

دست گیری، جانوروں پر رحم کے واقعات اس کثرت سے ملتے ہیں کہ سیرتِ نبوی علیہ السلام کا مطالعہ کرنے والا اِن سے ناواقف نہیں۔

نزولِ وحی کی ابتدا میں جب آپ کچھ ہراساں تھے تو آپ کی رفیقۂ حیات حضرت اُم المؤمنین خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کو اِن الفاظ کے ساتھ تسکین دلائی کہ خداوندِ عالم جل شانہٗ آپ ﷺ کو کبھی ہلاک نہیں فرمائیں گے، کیوں کہ آپ صلۂ رحم فرماتے ہیں، مقروضوں کا بار اٹھاتے ہیں، غریبوں کی اعانت کرتے ہیں، مہمانوں کی تواضع میں حصہ لیتے ہیں، حق کی حمایت کرتے اور مصیبت میں لوگوں کے کام آتے ہیں۔ پھر حضرت اُم المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہما جن سے زیادہ آپ کے پوشیدہ احوال کا جاننے والا اور کوئی دوسرا نہیں۔ آپ ﷺ کے اخلاق کے متعلق ارشاد فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ نے تمام عمر کسی کو اذیت نہیں پہنچائی۔ آپ ﷺ نے ذاتی معاملے میں کسی سے انتقام نہیں لیا، کسی کو برا نہیں کہا اور کسی سے ترش روئی کے ساتھ پیش نہیں آئے، کسی حاجت مند کو مایوس نہیں فرمایا اور عام معاملات تو درکنار سیاسی معاملات تک میں آپ کی شانِ رحمت کا یہی رنگ تھا۔ آپ ﷺ نے اپنے ابنائے نوع کے لیے ایک ایسی تعلیم چھوڑی ہے جو دنیا و آخرت میں اُن کو حقیقی مصیبت سے بچنے کے لیے بہترین وسیلہ ہے۔ جس پر عمل کر کے ہر انسان اپنا، اپنے اہل و عیال کا، اپنی قوم اور اپنے ابنائے جنس کا بلکہ تمام جاندار و بے جان مخلوقات کا اور سب سے بالاتر یہ کہ اپنے معبودِ حقیقی کا ٹھیک حق ادا کر سکتا ہے۔

پس جب تک یہ تعلیم دنیا میں قائم ہے، جب تک اِس کے پیرو دنیا میں زندہ ہیں، جب تک اِس کی جانب اہلِ جہاں کو دعوت دی جا رہی ہے اور جب تک اِس دعوت کے اصولوں سے دنیا بالواسطہ و بلاواسطہ فائدہ اٹھا رہی ہے، اُس وقت تک قرآنِ کریم کا یہ دعویٰ صداقت پر مبنی مانا جائے گا۔

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾

میثاقِ ازلی

﴿ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ ﴾

''اور جب اللہ تعالیٰ جل وعلا شانہٗ نے تمام پیغمبروں سے عہد لیا کہ جو میں تم کو کتاب اور حکمت دوں. پھر تشریف لائیں تمہارے پاس وہ رسول کہ تمہاری کتابوں کی تصدیق فرمائیں تو تم ضرور بالضرور اُن پر ایمان لانا اور ضرور بالضرور اُن کی مدد کرنا فرمایا کیوں تم نے اقرار کیا اور بھاری ذمہ لیا؟ سب نے عرض کی کہ ہم نے اقرار کیا فرمایا تو ایک دوسرے پر گواہ رہو اور میں آپ تمہارے ساتھ گواہوں میں ہوں. پھر جو کوئی بھی اِس کے بعد روگردانی کریگا تو وہ فاسقوں میں شمار ہوگا.''

[۳:۸۱-۸۲]

فضائے نُور میں ایک بزمِ نورانی کا انعقاد ہوا. خالق الکل جل شانہٗ خود میرِ مجلس بنے، سرِ عرشِ علیٰ نور والے کے نور کی وہ فراوانی ہوئی کہ انوارِ ربانی تمام عالمِ ارواح کو محیط ہو گئے. اُس وقت نہ دنیا تھی اور نہ موجوداتِ عالم کا کوئی منظر موجود تھا. یہ مجلس آرائی، حسِ ادراک سے ارفع اور قسامِ ازل کی جلوہ فرمائی، خیال وگمان سے بالاتر ہو رہی تھی. ایسی خفیہ مجلس جس میں تمام مخلوق نوری و ناری کی شمولیت ممنوع قرار دی گئی اور قدوسیوں اور ملائکہ کو بھی شریکِ مجلس نہیں فرمایا گیا. اِس لیے کہ یہ رازداروں اور اُن ارواحِ نورانی انبیاءِ علیہم السلام کی جلسہ گاہ تھی، جن پر قیامت سے پرے تک کی وہ ذمہ داریاں ڈالی جانے والی تھیں جن میں معرفتِ الٰہی کے اسرار کا بار تھا اور جن میں کفر وایمان کے تمام مسائل کے علاوہ ایک اُس بے پناہ نورِ رسالت کے اقرار کا تذکرہ تھا جو باعثِ تخلیقِ کون ومکان اور رسولِ خدا جن و

انسان تھا.

جمیع انبیاء علیہم السلام باادب، حضورِ حق میں کھڑے ہیں، فضائے عرشِ رحمانی نورِ رب سے منور ہورہی ہے اور وہ مجلسِ میثاقِ سلطانِ رسالت ہے، جس میں کائنات بھر کے رسولِ مکرّم محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ لاثانی کا اعلان ہونے والا ہے. یکا یک خلوتِ عرش بریں سے ایک صدا آتی ہے.

اے گروہ مرسلین!

اے جماعت انبیائے صادقین!

اے انس وجان کے ہادیو!

آج تم سے ایک مستحکم میثاق لیا جائیگا اور تم کو ایک محکم عہد کرنا ہوگا

لہٰذا اِس کے لیے ہمارے حضور میں سجدہ ریز ہوجاؤ اور میرے ارشاد پر کان لگاؤ کہ

ہم تم کو کتاب وحکمت کے اسرار مرحمت فرمائیں گے

اور صحائفِ نبوت ورسالت دیں گے اور تم اپنے اپنے وقت میں کام کرو گے

مگر یاد رکھو اگر تم میں سے کسی کے وقت میں

میرا وہ رسول خاص جس کے ظہور کے لیے یہ مجلس آراستہ کی گئی ہے

تشریف لے آئے

اور تمہارے اوصافِ رسالت ونبوت کی تصدیق کرے

اور تمہارے علم وحکمت کا مُصدّق ہو

تو اس میرے محبوب رسول پر بصدق دل ایمان لاؤ

اور بصد اخلاص اُس کی نصرت وامداد کا وعدہ کرو

یہ فرمان خلاّقِ دوعالم کا عنوان تھا. پھر غیب سے انبیاء کو ارشاد ہوا کہ

کیا تم نے اقرار کرلیا. کیا یہ میثاقِ ازلی قبول ہے؟

سب نے بیک آواز عرض کی

ہاں! یہ عہد خداوندی ہمیں منظور وقبول ہے اور ہم ایسا ہی کریں گے

ارشاد باری ہوا

تم اس کے لیے ایک دوسرے پر گواہ رہو اور

ہم بھی تم سب پر یا تم سب کے ساتھ گواہ ہیں

حضرت آدمؑ سے لیکر حضرت عیسیٰؑ تک تمام انبیاء کرام نے عہد فرمایا اور سرکارِ دوعالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاکر معاہدہ میں حکمِ ربانی کی تکمیل کردی. پھر جب حضورِ باری تعالیٰ میں معصوم ارواح کا یہ میثاق محکم ہوچکا تو آخر میں پھر حکم ہوا کہ

اے انبیاء آگاہ رہو کہ اِس اقرار کے بعد اگر کوئی معاہدہ شکنی کرے یا پھر جائے تو وہ حضورِ حق میں فاسق سمجھا جائے گا۔

معاہدے تین قسم کے قرآن پاک میں مذکور ہوئے ہیں. پہلا معاہدہ مولا کریم نے اپنی ربوبیت کا لیا. جس کا ذکر قرآنِ پاک میں بالفاظ ﴿ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰی ﴾ سے مذکور ہے. دوسرا اظہار دین کا جو خاص علمائے کرام سے لیا گیا. جو آیت میں یوں ارشاد ہوا ہے. ﴿ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ط ﴾. تیسرا عہد سرکارِ کائنات، مختارِ شش جہات، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور اُن کی خدمت واطاعت کرنے کا جو بلا واسطہ سارے انبیاء ومرسلین علیہم السلام سے اور بالواسطہ اُن کی اُمتوں سے لیا گیا. جس کو تین تاکیدوں سے مضبوط فرمایا. اول یہ کہ تمام انبیاء ومرسلین کو ایک دوسرے پر گواہ بنایا. دوسرے یہ کہ اپنی گواہی بھی اُن کے ساتھ قائم فرمائی سوم یہ کہ اِس عہد کی مخالفت پر سزا مقرر فرما کر متنبہ فرمایا اور اِس میثاق کی تیسری تاکید میں اِس طرح اظہارِ حقیقت کیا ﴿ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴾ یعنی رسالت ونبوت جاتی رہے اور فسق کی سزا ہو جائے. فسق لغوی معنوں کے لحاظ سے تقویٰ و پرہیزگاری سے نکل جانے کو کہتے ہیں اور بعض جگہ مفسرین نے فسق کے معنی اسلام سے نکل جانا بھی مراد لیے ہیں، جو کفر ہے. مگر یہاں پر پہلے معنی ہی مراد ہوں گے کیونکہ انبیاء کرام علیہم السلام شرک و کفر سے معصوم ہیں. یہ بھی دھیان رہے کہ اِس سزا کے مقرر فرمانے سے صرف میثاق کا اہتمام مقصود ہے. ورنہ انبیاء ومرسلین علیہم السلام کو شرک وکفر سے کیا واسطہ. ہاں بعض مفسرین نے یہ معنی بھی لیے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اِس عہد و میثاقِ خداوندی کے بعد نبی آخر الزمان سید الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے سے منہ پھیرنا کفر ہے اور جو منہ موڑے گا کافر ہو جائے گا پھر اِس معاہدہ میں ایک لفظ اِصْرِیْ آیا ہے. جس کے معنی بوجھل اور بھاری ہونے کے ہیں اور اِس کو بھاری اس لیے فرمایا کہ جب کوئی شخص دنیا میں آ کر اپنی کوشش سے کوئی کام کرے اور اُس پر کوئی جماعت تبع تیار بھی کر لے، پھر وہ محنت کا ثمرہ اٹھانے سے قبل کسی دوسرے کی اطاعت میں وہ جماعت دینا ضروری سمجھے تو اُس کے دل پر ایک بوجھ ہوتا ہے. چنانچہ یہی صورت انبیاء علیہم السلام کو بیان فرمائی کہ جب میں اپنی کتاب یا صحیفہ اور اپنا علم وحکمت عطا فرما کر تمہیں سرفرازی بخشوں پھر اِس حال میں کہ تم تبلیغ کرو اور تمہاری نبوت کا آفتاب نصف النہار پر چمک رہا ہو اور وہ سب سے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم ساری کائناتِ ارضی وسماوی و مافیہا کا ہادی، عرش وفرش کا مختار نبی، احمد مجتبیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے پاس تشریف لے آئیں تو تم اُن پر ایمان لاؤ. اور اُن کا کلمہ پڑھو اور اپنی تمام طاقت اپنی جماعت اپنی شریعت اپنی کتاب اپنی تبلیغ سب کچھ چھوڑ کر اُن کی اعانت واطاعت میں لگ جانا. کیا تم قرار کرتے ہو اور اِس بھاری ذمہ کو اٹھاتے ہو؟ سب نے عرض کیا کہ اے مولا کریم ہم کو اِس کا اقرار ہے اور ہم اِس کی پابندی کا عہد کرتے ہیں کہ

ہم آپ کے اِس بھاری معاہدہ پر مستقیم رہیں گے.

اِس سے معلوم ہوا کہ سرورِ کائنات، فخرِ موجودات، مختارِ شش جہات، محمد رسول اللہ ﷺ تمام کائنات کے رسول اور تمام رسولوں کے بھی رسول ہیں اور حضور تمام انبیاء کے نبی اور تمام نبی آپ کے اُمتی ہیں اور اسی لیے آپ کی اُمت تمام اُمتوں سے افضل ہے. ہم نے کسی دوسرے باب میں آپ کی بیمثل بشریت پر بحث کی ہے مگر یہاں پر بھی یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ حضور ﷺ کی اپنی بیمثل ذات کا تو مقام ہی الگ ہے. حقیقت یہ ہے کہ حضورؐ کو جو کچھ بھی ملا ہے وہ سب کچھ بیمثل ملا ہے چنانچہ حضورؐ کی ذات بیمثل، صفات بیمثل، رسالت بیمثل، کتاب بیمثل، معراج بیمثل، جماعت بیمثل، ازواج بیمثل، اولاد بیمثل، اُمت بیمثل، اگر ہمچو مثلی کے خبط میں یا ورنہ ہو تو قرآنِ کریم کا مطالعہ کیجئے.

1- آپؐ کی ذات وصفات کی بیمثلی پر سارا قرآن شاہد ہے اور یہ یثاق جس میں مولا کریم بھی حضور کی فضیلت و بلندیِ مدارج پر گواہ ہیں ایک روشن دلیل ہے.

2- رسالتِ تامہ ومستقلہ کی بیمثلی بدیں وجہ مسلّم ہے کہ تمام انبیاء ومرسلین اِس معاہدہ کی رُو سے آپ کے اُمتیّ اور زیرِ نگیں ہیں اگر آپؐ کی رسالت کو یوں تسلیم نہ فرماتے کسی کو نبوت ورسالت نہ ملتی اور نہ کوئی اِس درجہ کا مستحق سمجھا جاتا.

3- کتاب کی بیمثلی پر کتاب کا اپنا دعویٰ شاہد ہے ﴿ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ ﴾ اگر اس کی مثل ہوتی تو آج تک لاکھوں ہمچو مثلی منہ چڑانے کو میدان میں نکل آتے. غیر عربوں کی حیثیت کا تو کہنا ہی کیا ہے. یہ وہ بیمثل کلام ہے جس کے سامنے عرب کے فصحاء نے سجدے کئے اور پکار اٹھے کہ مَا هٰذَا كَلَامُ الْبَشَرِ.

4- معراج کے متعلق ارشاد ہوا ﴿ سُبْحٰنَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ ﴾ اور ﴿ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَ مَا طَغٰی ﴾ یعنی معراج دی اور قربِ خاص سے ایسا نوازا اور دیدار سے اِس طرح سرفراز فرمایا جس کی مثال کسی نبی کے قرب میں نہیں ملتی اور ﴿ فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰی ﴾ نے تو مکالمہ بالمشافہ کو سب کچھ اور سب سے صیغۂ راز میں رکھ کر ثابت کر دیا کہ محبوب ومحبّ کی گفتگو کسی دوسرے کو سننے کا حق ہی نہیں بیمثل ذات کے رازوں کو اُس کے بیمثل محبوب ہی پا سکتے ہیں.

5- اُمت کی بیمثلی پر کیا مزید ارشاد ہے ﴿ كُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ﴾ یعنی اے میرے محبوب کے اُمتیو! ہمارا تمہارا معاملہ تو الگ ہے، ہم نے تو تم کو بہترین اُمت لوگوں کے لیے بنایا ہے.

6- حضور ﷺ کی ازواجِ مطہرات اور مومنوں کی مائیں بھی اپنی حقیقت وحیثیت اور شان وآن میں بیمثل ہیں جن کے لیے حکم ہوتا ہے ﴿ یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ

النِّسَآءِ ﴾ کیا کوئی گستاخ بتا سکتا ہے کہ دنیا کی کوئی عورت اِس شان کی حصہ دار ہے اور کیا قرآن پاک نے حضور علیہ السلام کی طفیل ان تمام درجات میں حضور ﷺ کی ازواجِ مطہرات اور حضور کی تمام متعلقات کو ہر ماسوا اللہ سے بیمثل نہیں رکھا؟

الغرض اِس معاہدہ کی غرض و غایت ہی یہی تھی کہ محبوب ﷺ کی ساری کائنات کے افضلوں پر افضلیت ثابت کی جائے اور جہان بھر کے راہنماؤں کا رہنما بنایا جائے کیونکہ حضورؐ ہی کی طفیل تمام راہنما بنے اور حضورؐ ہی کی تصدیق سے سب کی سچائی پر اظہارِ سچائی ہوا حضورؐ پر ایمان لانا فرض فرمادیا گیا کیونکہ سب کتابوں میں حضورؐ کی پیشگوئیاں درج تھیں، اور حضورؐ ہی کی تشریف آوری اور رسالت نہ کسی زمانہ کی مقید تھی اور نہ کسی جگہ ومقام سے متعلق، نہ کسی قوم سے وابستہ، آپ ساری خلقت کے رسول تھے اور عرش و فرش پر ہر جگہ اُن کا سِکہ جاری تھا۔ یہی وجہ ہے کہ معاہدہ میں حضورؐ کی تشریف آوری کا وقت مذکور نہیں ہوا بعض معترضین نے یہاں لفظِ رسول پر ایک نئ جدت نکالی ہے کہ یہ سارے پیغمبروں کا عہد ہے جس میں خود حضورؐ بھی داخل ہیں یعنی ہر ایک سے کہا گیا ہے کہ اگر تم کسی ایک دوسرے کا زمانہ پاؤ تو ایمان لانا۔ مگر یہ جدّت ایسی ہے کہ اس قول کی بناء پر آیت میں بہت سی تاویلیں کرنی پڑیں گی. جو بعید از مطلب ہیں. حقیقت یہ ہے کہ از روئے علم خود بخود پتہ چل جاتا ہے کہ ﴿ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ ﴾ میں لفظ رسول پر تنوین عظمت کی ہے. جس سے مراد صرف سرکارِ انبیاء محمد رسول اللہ ﷺ ہی ہو سکتے ہیں کیونکہ عظیم الشان نبی اور ساری کائنات کے مطلق رسول حضورؐ ہی ہیں. اِسی لیے کوئی ہم زمانہ پیغمبر دوسرے پیغمبر پر ایمان نہیں لایا.

اِسی طرح بعض نے ایک اور پیچ لگائی ہے اور کہتے ہیں کہ مولا کریم کو پتہ تھا حضور ﷺ یعنی میرے محبوبِ خاص سب سے آخر میں تشریف لے جانے والے ہیں اور کسی نبی کے زمانہ میں بھی نہیں جائیں گے تو پھر اِس عہد کے معنے کیا ہوئے؟ مگر وہ حکمت الٰہی کو نہیں سمجھ سکے. اس لیے یہ نئی بات پیدا کرنے میں جرات سے کام لینے لگے. حقیقت یہ ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کا مُصَدِّق وہی ہو سکتا ہے جو سب سے بعد میں تشریف لائے. خیال رہے کہ اگلا نبی پچھلوں کی بشارت دے گا اور پچھلا نبی پہلوں کی تصدیق کرے گا. چنانچہ آدم علیہ السلام سب کے مبشّر ہیں کسی نبی کے مُصدق نہیں، اور حضور ﷺ سب کے مُصدق ہیں مبشر کسی کے نہیں. کیونکہ حضور کے بعد نبوت ختم ہے اور درمیان کے پیغمبر اگلوں کے مُصدق اور پچھلوں کے لیے مُبشّر ہوئے ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام کا یہ ارشاد ﴿مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ ؕ ﴾ اِس بات پر دلیل ہے اور سب کا مُصدق ہونا حضور علیہ السلام ہی کی صفت ہے. یہاں سے مسیح علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے کی بھی وجہ معلوم ہوگئی، کہ مسیح علیہ السلام مبشر ہو کر تشریف لائے اور مصدق ہونے کی حیثیت پانے کو چرخِ چہارم پر اٹھائے گئے تا کہ وہ ایک مستقل رسول ﷺ اور مستقل کتاب کے مالک اور مبشر رسول ہونے کی حیثیت سے دوبارہ نزول فرما کر رسول ﷺ پر ایمان لائیں

اور اپنی کتاب و شریعت کو چھوڑ کر اعانت کا عہد پورا کریں تا کہ اُن کی مصدق ہونے کی حیثیت بھی ظاہر ہو جائے اور مولا کریم کے میثاقِ ازلی کی تعمیل میں عدم تکمیل کا شبہ نہ رہے۔ اگر مسیح علیہ السلام کو اِس غرض و غائیت کے لیے نہ اٹھایا جاتا تو نعوذُ باللہِ میثاقِ ازلی پر لغو ہونے کا سوال پیدا ہو جاتا۔

کیونکہ اگر کوئی مستقل شریعت و کتاب کا مالک نبی موجود نہ ہوتا اور حضور ﷺ کی تصدیق نہ کرتا۔ تو اِس عہد کی کوئی محکم حیثیت نہ رہتی۔ مسیح علیہ السلام کے زندہ اٹھائے جانے اور دوبارہ نزول فرمانے کا یہی مقصد سمجھ میں آتا ہے اور یونہی قانونِ قدرت کی تکمیل ہوتی نظر آتی ہے۔

نیز مسیح علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے اور دوبارہ تشریف لاکر حضور ﷺ پر ایمان لانے میں ایک نہایت لطیف اشارہ قرآن کریم نے یہ بھی فرمایا ہے کہ مسیح علیہ السلام قیامت کے نشانوں میں سے ایک نشان ہیں۔ گویا قیامت کے اور مسیح کے درمیان اور کوئی پیغمبر حائل نہیں، جو آنحضرت ﷺ کے بعد آسکے۔ ورنہ مسیح کا نزول اگر نہ ہونا ہوتا تو حقیقت یہ ہے کہ حضور ﷺ خود قیامت کے نشانوں میں سے ایک نشان ہوتے، کیونکہ مسیح علیہ السلام کی نبوت کے زمانے اور قیامت کے وقت کے درمیان حضور ﷺ ہی موجود ہیں اور مسیح اِسی صورت میں قیامت کے نشانوں سے نشان ہوسکتے ہیں۔ جب وہ حضور ﷺ کے زمانے میں تشریف لائیں اور آنحضرت ﷺ پر ایمان لاکر آپ کے لیے اعانت و نصرت کے میثاق کی تعمیل فرمائیں۔ اس بحث سے سیدنا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی تفسیر کی بھی تائید ہو جاتی ہے جو آپ نے فرمایا ہے کہ دنیا میں کوئی نبی نہیں آیا مگر اللہ تعالیٰ نے اُن سے حضور ﷺ پر ایمان لانے کا عہد لیا۔ پھر اُن پیغمبروں نے اپنی قوم سے عہد لیا کہ اگر تم اُن کا زمانہ پاؤ تو اُن پر ایمان لانا اور اُن کی خدمت کرنا۔ اب یہاں یہ ایک سوال باقی رہ جاتا ہے کہ مسیح علیہ السلام کا تشریف لانا جو مذکور ہوا ہے اِس سے بعض لوگوں نے یہ مغالطہ کھایا کہ مسیح تو صلیب دیا جاچکا ہے (حالانکہ یہ عقیدہ عیسائیوں کا ہے) تو اب جس مسیح کے دنیا میں حضور ﷺ کے بعد تشریف لانے کا اشارہ ہے وہ کوئی مسیح دوسرا ہوگا جو اِس خدمت کو انجام دے گا۔ جو اِس معاہدہ کی رو سے اُس کے ذمہ ہوسکتی ہے یعنی سرکارِ انبیاء محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا اور مدد کرنا مگر وہ یہ نہیں سمجھ سکے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی نسبت جہاں بھی قرآنِ کریم اور احادیث شریف میں مذکور ہے اِس سے مراد مسیح ابن مریم ہی لیے گئے ہیں کیونکہ اُن کے علاوہ کسی دوسرے مسیح کا کوئی ذکر نہیں اور جہاں کہیں کتاب اللہ اور احادیثِ رسول اللہ ﷺ میں ذکر آیا ہے اِس کے ساتھ دو لفظ استعمال ہوتے ہیں ایک ''مسیح ابنِ مریم'' اور دوسرا ''مسیح موعود''۔ یہ دونوں لفظ ایک ہی ذات کے لیے بولے گئے ہیں یعنی مسیح ابنِ مریم ہی مسیح موعود ہیں کیونکہ جس مسیح کے دوبارہ آنے کا وعدہ دیا گیا ہے وہ مسیح ابنِ مریم ہی ہے اور ''موعود'' ہمیشہ اُسی ذات کے لیے کہا جاتا ہے جو دوبارہ مذکور ہونے سے قبل متعارف ہو، یعنی جس سے ذکر کیا جائے وہ ذکر سے پہلے بھی اُس سے تعارف رکھتا ہو اور اِس مسئلہ میں اگر کوئی ''متعارف مسیح'' ہوسکتا ہے تو وہ مسیح ابنِ مریم ہی ہے اور اُسی کا ذکر کیا گیا ہے۔

قرآنِ کریم میں اِسی کی وضاحت کی گئی ہے اور اِسی کو مختلف مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔ پھر مسیحِ موعود کوئی دوسرا کیوں کر ہو سکتا ہے جس سے جہان والے واقف ہی نہیں؟ اور نہ اُس میں مسیح علیہ السلام کے نشانات پائے جائیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جو مسیحِ موعود کے نام پر غیر متعارف ہستی دنیا میں دعوی کرے۔ جس کا ذکر پہلے قرآن و حدیث میں نہ ہو اور اُس میں صفاتِ مسیح علیہ السلام کے نشانات بھی نہ پائے جاتے ہوں تو وہ کاذب ہے۔ بعض نے یہ آڑ لے کر مسیح کا لبادہ اوڑھنے کی کوشش کی ہے کہ وہ اتنا عرصہ ہوا نہیں آیا، اگر آنا ہوتا تو آ نہ جاتا، لہٰذا جس کا وعدہ کیا گیا ہے وہ ہم ہی ہیں، تو اِس تاخیر کا مطلب یہ ہوگا کہ اُس کی تاخیر سے اُس کی خصوصیت اور انتظار ہی ختم ہو جائے گا۔ اِس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک مسافر کہیں جانے کے لیے سفر کا ارادہ کر کے ریلوے سٹیشن پر پہنچے اور اُس کو پتہ چلے کہ جہاں وہ جانا چاہتا ہے وہاں کی گاڑی میں دیر ہے تو وہ انتظار کرنے کی بجائے یہ کہہ کر کہ سٹیشن پر کون انتظار کرے کسی دوسری جانب کی گاڑی پر جو تیار ہے چڑھ جائے، تو کون عقلمند ایسے جلد باز مسافر کو عقلمند سمجھے گا اور کون یہ اندازہ لگائے گا کہ اُس کی یہ غلط روی اُس کو اُس کی منزلِ مقصود پر پہنچا سکے گی۔ ایسی بے سمجھی کی بھی حد ہو گئی ہے کہ اللہ کی مرضی کے خلاف مسیح علیہ السلام کے پانے میں اتنی جلد بازی سے کام لینا کہ اگر مسیح کو اللہ تعالٰی کے علم میں دنیا پر تشریف لانے میں دیر ہے تو اِس عرصہ میں جو بھی مدعیء کاذب سامنے آ جائے اُسے ہی مسیحِ موعود مان لیا جائے۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ۔ کیا خداوندِ عالم کا نظامِ کائنات (نَعُوْذُ بِاللّٰہِ) اتنا ہی بودا ہے کہ وہ مسیح کی ضرورت کا وقت اپنے علم کے باعث نہیں سمجھ سکتا۔

"بریں عقل و دانش بباید گریست۔"

یہاں مسیح علیہ السلام کی تشریف آوری پر بحث کرنا مقصود نہیں ورنہ بتا دیا جاتا کہ اِس حقیقت میں اہلِ ایمان کیونکر تحقیق رکھتے ہیں۔ غرض یہ ہے کہ یہ میثاق اظہارِ رسالت رسول اللہ اور شانِ رسول اللہ اور جاہ و جلالِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تھا تا کہ آپ کا شرف و مجدِ تخلیقِ دو عالم سے پہلے انبیاء و مرسلین مان لیں اور اِسی کا ذکر حضرت کی پہلی انجمن میں مولا کریم اپنے کریم محبوب کی شان بیان فرما کر وجودِ عالم میں آنے والوں کو شناسائی کرا دیں۔ اِسی بنا پر خود سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ہم اُس وقت بھی نبی تھے۔ جب آدم علیہ السلام روح اور جسم کے درمیان تھے، یا آب و گل کی جسدی منازل طے کر رہے تھے اور ایک دوسری حدیث میں فرمایا کہ ہم اللہ کریم کے نزدیک تمام اولین و آخرین سے افضل ہیں۔

مُبَشِّرات

حق وصداقت میں کچھ ایسی مقناطیسی طاقت ودیعت ہوتی ہے کہ وہ اپنی تاثیر کے لحاظ سے قلوب وارواح کو خود بخود اپنی طرف کھینچ لیتی ہے، بشرطیکہ قلوب وارواح پر فطری حجابات نہ ہوں اور کسی خاص جذبے یا عقیدے نے اُن پر تقلیدِ آبائی اور تعصب کے سبب سے علوم اور حقائق تک راہنمائی کے دروازے بند نہ کر دیئے ہوں. کیونکہ فطرتِ صحیحہ کو جو چیز مسخ کرتی ہے اور قلب کے آئینۂ جہان نما کو زنگ آلود کر دیتی ہے وہ صرف تعصب ہے جیسا کہ امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہر ایک قلب باعتبار اپنی فطرت کے حقائقِ اشیاء کے دریافت کر لینے کی صلاحیت واستعداد رکھتا ہے کیونکہ وہ ایک امر ربی ہے اور تمام جواہر عالم پر اپنی اس شرافت وخاصیت کی وجہ سے فوقیت رکھتا ہے اور اُس کی اِس صلاحیت واستعداد کی طرف یہ آیہ مبارکہ اشارہ بھی کرتی ہے ﴿ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَۃَ ...... الآخر ﴾ یعنی یہ استعداد آسمان میں ہے، نہ زمین میں اور نہ پہاڑوں میں، مگر اِس کا کیا علاج کہ تعصّب کو فطرتِ صحیحہ کے لیے حجاب اور علوم وادراک کی راہ میں رکاوٹ بنا کر کسی دوسرے مذہب یا انسان کی کسی خوبی کے اعتراف اور کسی حقیقت کے تسلیم کرنے کی مطلق گنجائش ہی نہ سمجھی جائے.

چونکہ تعصب اور تنگ دلی کا اندھا جوش کسی حقیقت اور سچائی تک پہنچنے نہیں دیتا، بنا بریں اگر غیر مذاہب والوں سے اسلامی تعلیمات اور بانیٔ اسلام کی ذات وصفات کے متعلق اچھی رائے کا اظہار کرنا اور اُن کی خوبیوں کا معترف ہونا ثابت ہو جائے تو یہ حضور ﷺ کی صداقت کا وہ روشن اور مہتم بالشان ثبوت ہے جو متلاشیانِ حق وصداقت کے لیے مشعلِ راہ کا کام دے سکتا ہے. درحقیقت سچائی وہی ہوتی ہے جس کا اعتراف دشمن بھی کرے.

مسلمان علماء اور فقراء میں ایک گروہ ایسا بھی موجود ہے. جو ہندو مذہب اور اُس کی مقدس کتابوں کے متعلق اگر یقینِ کامل نہیں تو ظنِ غالب ضرور رکھتا ہے کہ اُن میں بھی کچھ نہ کچھ اصلیّت ہے اور وہ بھی خدا کے اِس کارخانۂ نشرواشاعت سے واسطہ رکھتے ہیں، جہاں سے خداوندِ عالم نے اپنے رسولوں، نبیوں، رشیوں اور اوتاروں کو دنیا میں ہدایت کے لیے بھیجا ہے. ہاں یہ ضرور ہے کہ جس طرح یہود ونصاریٰ نے خداوندِ عالم کو بھلا دیا تھا اور اُس کے نبیوں کو خدا یا خدا کا بیٹا ماننا شروع کر دیا اسی طرح

ہندوؤں نے بھی کچھ وقت گذرنے کے بعد خدا کے بھیجے ہوئے اولیاء اور ہادیوں کو جہالت سے خدا ماننا لازم سمجھ لیا اور رفتہ رفتہ اُن کے یہ عقائد اُن کو بت پرستی کی چوکھٹ پر لے گئے۔ مگر صوفیائے کرام نے اِس خیال سے کہ تورات، زبور، انجیل میں تو آپ ﷺ کا ذکر تو ہے ہی، کیا عجب کہ ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں اُن کے رشیوں کے احوال میں بھی اُس جلیل القدر رسول کا تذکرہ پایا جائے چنانچہ اِس نظریہ سے جب اہلِ تصوف نے غور و خوض کیا تو وہ اِس فیصلہ پر پہنچنے کے لیے مجبور ہو گئے کہ:

☆- ہندوؤں میں کوئی پیغمبر ضرور کتاب لیکر آیا لیکن بعد کو تصویر کشی سے متجاوز ہو کر یہ قوم بت پرستی میں مبتلا ہو گئی۔ یہ ارشاد حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ جو ایک بڑے صوفی اور صوفیوں کی ایک جماعت کے راہنما گزرے ہیں۔

☆- اپنے ارشادات میں ایک دوسری جگہ آپ تحریر فرماتے ہیں کہ ہندوؤں کی کتابوں میں بھی حضورِ انور ﷺ کا تذکرہ موجود ہے اور نہایت بسط و تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔

پھر اس تحقیق کے میدان میں حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں رحمۃ اللہ علیہ اکیلے ہی نہیں ہیں بلکہ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ ولی اللہ دہلویؒ، مولانا عبدالرحمٰن چشتیؒ عالم سنسکرت مؤلف مراۃ المخلوقات، مولانا محمد حسنؒ مؤلف تصدیق الہنود و کشف الاستار وغیرہ، مولوی طالب حسینؒ نومسلم فرخ آبادی، مولانا سیف اللہ گورکھپوریؒ اور مولوی عبدالعزیزؒ مؤلف بشارتِ احمد یہ سب متفق ہیں۔

بلکہ مؤلفِ کشف الاستار مولوی محمد حسن صاحب نے بنارس اور اجودھیا میں ایک زمانہ تک ہندوؤں میں رہ کر تحصیلِ علومِ وید کی اور بڑے بڑے فاضل اور پاک نفس برہمنوں اور خدا رسیدہ سادھوؤں کی صحبت حاصل کر کے اُنہوں نے دیکھا کہ اکثر جنگلوں اور پہاڑوں میں تارک الدنیا جوگی کسی بڑی ہستی اور کسی تعریف کی گئی ذات کی یاد میں بھجن گاتے اور اُس کی جے مناتے ہیں چنانچہ جب انہوں نے اُتر کھنڈی کا پاٹ کیا تو اُنہیں یہ مضمون ملا۔

☆- کلنکی پر اُن میں جس مرسل اور اوتار کا ذکر ہے وہ مخلوق سے نہیں ڈرے گا نہایت شجاع اور عرفان والا ہوگا۔ [مہادیو جی]

☆- اُن (مہامت) کی وضع کو دیکھ کر لوگ حیران ہوں گے کہ نئی طرح کا اُن کا احوال دیکھیں گے اور جو پوجا وہ کریں گے اُن کی قوم کے لوگ وہ نہ کریں گے۔ وہ اپنی قوم سے کہیں گے کہ مجھ کو اُس قادر ایک ذات کا جس کا کوئی شریک نہیں، حکم ہے کہ اِس طرح کی بے معنی پوجا مت کرو اور میں سوائے اللہ کی ایک ذات پاک کے اور کسی طرف رجوع نہیں کرتا اور تم میری تابعداری کرو اور اُن کی قوم اِس وجہ سے ساری کی ساری اُن سے جدا ہو جائے گی۔ [مہادیو جی]

پھر مولوی محمد حسن اپنی تصنیف کشف الاستار میں یوں بھی کہتے ہیں کہ اتھرین وید میں اللہ کا

لفظ پایا جاتا ہے اور حضور ﷺ کا اسم پاک اَحْمَدُ اور محمد ﷺ موجود ہے. جس کا اشارہ رکھ کھنڈ میں اِس طرح ہے سری تورم سرسمو دائی، وکالی کمائی احمدُ نار دوہائی اور یجروید میں یوں پڑھا گیا ہے. الانک نج الوجان محمدُ، الانک کرمان جان تیجان، نند مائی جان جان، نماہی جیو سان کجان. ہم نے اکثر سادھوؤں اور فقیروں سے پوچھا کہ منزل فقر میں جب راستے طے کرتے ہو تو کیا کسی منزل میں پیغمبرِ عرب ﷺ کی راہنمائی اور روشنی سے مدد ملتی ہے؟ تو اُنہوں نے کہا کہ چلتے چلتے ایک مقام ایسا آتا ہے جہاں ہندوں اور غیر ہندو کا فرق باقی نہیں رہتا اور حقیقت منکشف ہو جاتی ہے. وہاں سے آگے ایک قدم بھی بغیر اقرار اور وسیلہ محمد عربی ﷺ کے نہیں جا سکتے. چنانچہ سوامی سدھ گر صاحب نے رامائن کے آخری بالکنڈ حصہ سے یہ کچھ بھجن ایک خاص لہجہ میں پڑھے اور سنائے.

راخ سینت بھو پریت دکھائے آپن مت سب کا سمجھائے
نکم اگم سوئی پتج او پارا پتی ابا اونمت مجھارا
تب لگ سلازم چھے کوئی بنا محمد پار نہ ہوئی
ماہر سلازم نمان نہینہ ہوئے تلسی بچن ست مت کوئے

☆- وہ بادشاہی قاعدے سکھائے گا خوف اور محبت سے کام لے گا، اپنا دین سب کو بتائے گا.

☆- سمندر کے پھیلاؤ کی طرح اُن کا جلال ہوگا، جس طرح کمہار آوے میں آگ لگاتا ہے جو تمام جگہ پہنچ جاتی ہے، اُسی طرح اُن کا دین ہر جگہ پہنچ جائے گا.

☆- جب تک اُن کی پیروی نہ کی جائے خدا تک پہنچنا ناممکن ہے. بِنا محمد ﷺ کوئی پار نہیں لگ سکتا.

☆- اُن کے بعد خدائی پیغام نہ آئے گا، تلسی داس سچ سچ کہتا ہے.

راجہ بھوج ایک بڑے مشہور حکمران ہوئے ہیں. جو پلیا کے باشندے تھے. جس کو عام لوگ بھوج پور بھی کہتے ہیں. وہاں ایک عمارت رصد خانہ کے نام سے مشہور ہے مگر ''جنتر منتر'' اُس کا عرفِ عام ہے وہ بہت پرانی عمارت ہے اور فلکیات کے زائچے اور نجوم کے حسابات اُس پر نقش ہیں لوگ کہتے ہیں کہ اِسی جگہ راجہ بھوج کے شاہی محلات تھے. راجہ بھوج ''شق القمر'' کے معجزہ سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گئے تھے. اُن کا اسلامی نام شیخ عبد اللہ تھا. اُن کے ایمان لانے سے اُن کے گھر والے اور سب دوسرے لوگ مخالف ہو گئے اور وہ ترکِ وطن کر کے دھاروار (گجرات) چلے گئے اور باقی زندگی اُنہوں نے سلطنت کو خیر باد کہہ کر یادِ الٰہی میں گزار دی.

انہیں تصدیق کنندوں میں سے ایک بزرگ بابا رتن تھے. جو خود حضور علیہ السلام کی خدمت میں

حاضر ہو کر ایمان لائے اور حضور ﷺ نے اپنے دست مبارک سے چھ کھجوریں اُن کو کھلائیں اور اُن کے لیے طویل العمر ہونے کی دعا فرمائی اور ایک اپنا پیراہن مبارک بھی عطا فرمایا چنانچہ اُس دعا کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت حاجی بابا رتن رضی اللہ عنہ کی عمر چھ سو بتیس سال کی ہوئی. آپ کا مزار بھٹنڈہ سٹیشن کے قریب ریاست پٹیالہ میں ہے.

مولانا سیف اللہ گورکھپوری جن کو سنسکرت اور بھاشا میں بڑا کمال حاصل تھا اپنی تحقیقات میں اور مولوی عبدالعزیز صاحب اپنی تصنیف بشاراتِ احمدیہ میں لکھتے ہیں کہ کنڈا کے مصنف نے اپنی کتاب کپل پرگرن میں یہ ''بشارتِ محمدیہ'' بارھویں ادھیا کی چھٹی درشست کونٹ میں یوں لکھی ہے:

ادوت پن انتم مھی ندھم، ارن سینکبارتم، بلونت سورتم، پرتھوی، مدھی سرب اونماسن گرام، پرسن پرپرسوتم دیوتا، واھنکراھت چھاك کوردوم سن گرم ،تہ یسجمد سولین کوزددہ تب یئم کڑلیو چھبم. پرتھوی مدھم، بت کاگرس، گیرلیوپگریت نری بھوکھمبم ایتارم. پرتھوی مدھی پال ھرھارم گرگ گرہ اوت پن نتم پرتھوی کرنیتس ھری. پری پتر چرند بکم نارائن وکش دپال ردنگ یدب نری چرس کرتے کھتم پرم پراکت پرایتم.

ترجمہ: ''یعنی نجات دینے والا آخری اوتار پیدا ہوگا، اندھیرا دور کرنے والی زمین میں، دشمن کا مارنے والا، زور والا بڑا بہادر، زمین کی ناف میں وہ سرب نما ہوگا. پرسن پرپرسوتم دیوتا (اِس لفظ کے معنی ہیں تعریف کیا گیا. جو اِسم پاک محمد ﷺ کا ترجمہ ہے) بذریعہ جہاد کے دین پھیلائے گا کوڑا مارنے والے کو لڑائی کے ساتھ وہ پچھّم کی جانب ملے گا. اُس کے ملنے کی تین شرطیں ہوں گی. پیداوار، اور زمین کی تقسیم کرو، ہمارا عقیدہ قبول کرو. وہ بڑی عزت والا ہوگا. بڑا راجہ لوہے کی چلانے والی زمین پر بیوقوفی کا مٹانے والا پیدا ہوگا، زمین کے اچھے لوگوں کے گھر والوں میں جو بے عیب ہوں گے. اُن کا پیارا بیٹا، جس کی روح رہی مدت تک خدا کے قدم پاک میں. وہ آنے والا جب (خدا) قدم چھوڑے گا آجائے گا، پرائے گھر کی سرحد میں.''

اور اِسی مضمون کی بشارت کتاب سمرت وسماء اسکنت میں بھی جو 38 سمرتیوں پر مشتمل ہے ملتی ہے. جو ہم یہاں نقل کرتے ہیں:

''مھابھوی برنہ ھرنك پھری پوترین ساربستی. چرنہ سرسری

گھم شبرم نئی دہ پرتھی دم. ایتی سارم برھارنم سودیہ پری پورنم اوتارنہ."

ترجمہ: "زمین پر سورج کی طرح بڑے خاندان میں خدا کی طرف سے اوتار ہوگا اور اُس ملک کا پتہ یہ ہے کہ وہاں ایک دست آورپتی ہوگی. اُس ملک کے لوگ اُن کے وسیلہ سے پاک ہوں گے. گناہوں سے نجات حاصل کریں گے. وہ بڑا دریا دنیا اُن کا دامن پکڑ کر پار اترے گی اور اُس سرزمین میں خدا کا پیارا خدا کے قدموں کو چھوڑ کر اترے گا وہاں کے پہاڑوں پر گھاس نہ ہوگی یعنی اُس ملک کے پہاڑ خشک ہوں گے کچھ دیا کرو یا لڑو. ورنہ ہماری بات مانو. خدا کا نام ہی اُن کے پاس جائے گا. ایک دفعہ اترے گا گناہوں کو کاٹنے والا."

یہ وہ شہادتیں ہیں. جن کو پڑھ کر کوئی حق کا متلاشی انسان دھوکہ میں نہیں رہ سکتا. ہاں مسٹر پٹیل نائب وزیر اعظم بھارت کی طرح کسی غلطی پر اڑ جانا ایک دوسری بات ہے. اُن کو جب فیصلہ ہندوستان کتاب کے انگریز مصنف نے اُن کے ایک بڑے تیرتھ کی بیہودہ رسومات پر توجہ دلائی اور کہا کہ یہ آرین تہذیب کا قطعی مسخ شدہ اور انسانیت سوز منظر ہے، آپ اِس کو کس طرح تسلیم کرتے ہیں؟ تو مسٹر پٹیل نے یہ کہہ کر اپنے آپ کو بچایا کہ یہ میرے مذہب کا معاملہ ہے اِس میں ہم کو یہیں رہنے دیجیے. ہمیں طعن کرنا مقصود نہیں، حقیقت پر متوجہ کرنا مقصود ہے.

پھر بھوتک اوتر پران کے مصنف بیاس جی جو ایک مشہور ہندو رشی ہیں، کہتے ہیں:

"آئندہ زمانے میں مہامت پیدا ہوں گے. اُن کا نشان یہ ہوگا کہ اُن پر بدلی سایہ کرے گی اور اُن کے جسم کا سایہ نہ ہوگا. وہ دنیا کے لیے کچھ تلاش نہ کریں گے اُن کی تلاش دین کے لیے ہوگی. جو کچھ پیدا کریں گے اللہ کی راہ میں خرچ کر دیں گے تمام عمر کم کھائیں گے. عرب کے سردار اُن کے دشمن ہوں گے اور وہ اللہ کے دوست ہوں گے. وہ قادر و توانا اُن کو تمیں ادھیان پران بھیجے گا."

☆۔ کلنکی پران میں دس اوتاروں کا ذکر لکھا ہے. جن میں ایک اوتار کا نام کلنکی ہے. اُن کے متعلق یوں وضاحت ہے کہ کلنکی اوتار ظاہر ہوں گے. (1) جن کے باپ کا نام وشنو لیس یعنی عبداللہ ہوگا. (2) اُن کی ماں کا نام سومتی یعنی امن امان والی بھروسہ کی گئی یا آمنہ ہوگا. (3) وہ غار میں تپسیا کریں گے. (4) تمام نیک اور پاک لوگوں کی تصدیق کریں گے. (5) پرش رام یعنی روح الامین سے تعلیم پائیں گے. (6) اپنے وطن سے ہجرت کریں گے.

☆۔ رگوید میں آپ کا نام احمد (ﷺ) اور اتھروید میں محمد (ﷺ) لکھا ہے اور لکھا ہے

لا الہ ھرلی پاپن، الا اللہ پرم پدم، جنم بیکنٹھ براپت ہوئی، تو جپے نام محمد (ﷺ) یعنی لا الہ الا اللہ کہنے سے پاپ مٹتے اور پرم پدم ملتے ہیں جنم بیکنٹھ ہونا چاہو یعنی ہمیشہ کی بہشت چاہتے ہو تو نام محمد ﷺ کا وظیفہ کرو۔

☆- اتھروید میں آیا ہے۔ برھمانن الامرالرسول محمد رہ کم برشی یعنی پیدا کرنے والا اللہ ہے رسول محمد (ﷺ) زور آور، کون ہے اُس کی برابر کا۔

☆- سام وید میں یوں لکھا ہے کہ ممود ارتناو بھاوا گاؤ رانتی بتستا بشنونامك بھکھائیو سدا بید شاسترے شرتیا یعنی جس بزرگ کے نام کا پہلا حرف میم اور آخری حرف دال ہوگا اور اُس کے پیرو گؤ بھکھن (ذبیحہ گاہ) کرتے ہوں گے۔ وہی وید شاستر کی رو سے برارشی ہے۔

☆- اتھروید کانڈ 19 میں ہے۔ باھجہ محمد (ﷺ) بھگت اجائیں۔ یعنی محمد ﷺ کے بغیر بندگی ضائع ہے۔

☆- گوسائیں تلسی داس لکھتے ہیں:

کاشی پربت یادھن تیرتھ سبھی ناکام بیکنٹھ باس نہ پائی بناں محمد ﷺ نام

☆- جنم ساکھی کلاں صفحہ 141 میں ہے۔

پاک پڑھیو کلمہ ربّ دا محمدؐ نال ملائے او معشوق خدائیدا ہویا تُل الائے

☆- پوتھی راہ سنگھ رام چھٹی کانڈ منترص 111 پر گوسائیں تلسی داس جی فرماتے ہیں کہ:

یہاں نہ کچھ بات میں راکھوں بید پران ست مت بھاکھوں
برکھس دس سندام ہوئی پتہ کی بات نہ پائے کوئی
دیس عرب پھر کتھا سہائی سوتھل بھوئیں گت سنو کھک رائی
سنبھو سمت تاکر ہوئے سندام اویس تھتھ سبھوئی
سمت بکرم کی دو وانگا مہا کوک تس چھیتر سانگا
راج پنٹ بھو پریت دکھاوے ابن مت سب کو سمجھاوے
تب لگ جے سندام چہ کوئی بنا محمد ﷺ پار نہ ہوئی!

ترجمہ: ”طرفداری نہیں جو وید میں لکھا ہے صاف کہوں گا۔ دس ہزار برس میں رسالت تمام ہوگی۔ پھر کوئی نہ پاسکے گا۔ عرب میں ایک خوشنما ستارا اور بابرکت زمین ہوگی۔ معجزے ظاہر ہوں گے اور نبی اللہ

کو قاسم کہا جائے گا۔ سمت بکر ماجیت کی سمندروں کی تعداد کے برابر والی صدی میں پیدا ہوگا اور الوالعزمانہ قاعدے پر اپنا مذہب سب کو سکھائے گا اور اُس کے دین کے جاری رہنے تک بغیر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی پار نہ ہوگا۔"

☆- بابا گورونانک لکھتے ہیں:

توریت زبور انجیل ترے سن ڈٹھے وید رہے قرآن کتاب کُل جگ میں پروار

یعنی توریت، انجیل، زبور کو ہم نے بغور دیکھا ہے اور ویدوں کو بھی، مگر دنیا کے لیے جو کتاب ہدایتِ کامل کا موجب ہو سکتی ہے۔ وہ قرآن ہے۔

☆- پھر لکھا دربار صاحب صفحہ 523 میں:

جگ میں مورکھ بندہ کیا بوجھے اندھے کو دیپک کیا سوجھے

بن احمد کچھوے بھید نہ پائیو مورکھ اندھا گنوار کہلائیو

الف احد سے احمد صلی اللہ علیہ وسلم بھیو ایسا بھید کچھو نہ لئیو!

احمد بھیو احد کے رنگا جیسی جوت چاند سنگا

☆- جنم ساکھی بھائی بالا صفحہ ۲۰۶ میں آتا ہے کہ:

اول آدم مہیش ہوئے دوجا برہما ہوئے تیجا آدم مہادیو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہے سب کوئے!

☆- سیدنا عیسٰی علیہ السلام کی بشارتوں سے بعض اس طرح پائی گئی ہیں مثلاً انجیل یوحنا باب 14 آیت 16 میں ہے۔ آپ نے فرمایا:

"اور میں باپ سے درخواست کروں گا کہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے جو ابد تک تمہارے ساتھ رہے یعنی سچائی کی وہ روح جس کو دنیا حاصل نہیں کر سکی۔"

پھر باب 14 آیت 30 میں فرمایا:

"اور اب میں نے تم سے اُس کے ہونے سے پہلے کہہ دیا ہے تا کہ جب ہو جائے تو تم یقین کرو۔ اس سے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا کیونکہ وہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اُس کا کچھ نہیں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے فائدہ مند ہے اگر میں نہ جاؤں گا تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا لیکن اگر میں جاؤں گا تو وہ تمہارے پاس بھیج دوں گا۔ جب وہ سچائی کی روح تمہارے پاس آئے گی تو تم کو سچائی کی راہ دکھائے گی۔

☆- انجیل برنباس فصل 96 صفحہ 144 میں ہے۔

(مسیح) سے کاہن نے جواب میں کہا کہ موسیٰ کی کتاب میں لکھا ہے کہ ہمارا اللہ

عنقریب ہمارے پاس ایک مسیحا بھیجے گا۔ جو ہمیں اللہ کے ارادے کی خبر دینے آئے گا اور دنیا کے لیے راحت کا پیغام لائے گا۔ اِس لیے تو بتا کیا تو اللہ کا مسیحا ہے؟ تو یسوع نے جواب دیا کہ حق یہ ہے کہ اللہ نے ایسا ہی وعدہ کیا ہے مگر میں وہ نہیں ہوں۔ وہ مجھ سے پہلے پیدا کیا گیا اور مجھ سے بعد کو آئے گا۔

☆- پھر اسی انجیل برناباس فصل 97 صفحہ 146 میں ہے

(مسیح نے کہا) میری تعلیم نجس ہو جائے گی۔ قریب قریب تیس مومن بھی باقی نہ رہیں گے۔ اُس وقت اللہ دنیا پر اپنا رحم کرے گا اور اُس رسول کو بھیجے گا جس کے لیے سب چیزیں پیدا کی گئی ہیں۔ جو اُس پر ایمان لائے گا وہ مبارک ہوگا۔ (پھر فرمایا) باوجود اِس کے کہ میں اُس کی جوتی کا تسمہ کھولنے کا بھی مستحق نہیں ہوں۔ میں نے خدا کی طرف سے نعمت اور رحمت کے طور پر یہ رُتبہ پایا ہے کہ اُس کو دیکھوں اُس وقت کاہن نے کہا مسیحا کا نام کیا رکھا جائے گا۔ تو یسوعؑ نے جواب دیا کہ مسیحا کا نام عجیب ہے۔ اِس لیے کہ اللہ نے جس وقت اُس کی ذات کو پیدا کیا تو اُسے آسمانی روشنی میں رکھا۔ اللہ نے کہا اے محمد ﷺ تو صبر کر میں تیرے ہی لیے جنت اور دنیا اور مخلوقات کی بڑی بھیڑ جو تجھے بخشوں گا پیدا کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں اور جس وقت میں تجھے دنیا میں بھیجوں گا۔ تجھے اپنا رسول بناؤں گا میرا کلام سچا ہوگا۔ زمین و آسمان کمزور ہو جائیں گے مگر تیرا ایمان کمزور نہ ہوگا اور اُس کا نام مبارک محمد ﷺ ہوگا۔

☆- زبور باب 16 آیت 35 میں ہے:

"میں تم کو پانی سے بپتسمہ دیتا ہوں لیکن وہ میرے بعد آتا ہے۔ مجھ سے قوی تر ہے۔ وہ تمہیں روح القدوس اور آگ سے بپتسمہ دے گا" اِیسے ہی انجیل متی باب 3 میں ہے۔

☆- کعب احبارؓ اپنے والد کی وفات اور تورات کے دو ورقوں کا قصہ بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اِن دو ورقوں میں لکھا تھا۔ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ لَا نَبِیَّ بَعْدَہٗ۔

☆- حضرت ابو سعید خدریؓ کا بیان ہے کہ میں نے ابو مالک بن سنان کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں ایک روز قبیلہ بنی عبدالاشہل میں گیا تو یوشع یہودی سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ ایک نبی کے پیدا ہونے کا زمانہ قریب آ گیا ہے۔ جن کو احمد ﷺ کہا جائے گا۔ جو حرم میں پیدا ہوں گے۔ پھر ابو مالک بن سنان کہتے ہیں کہ وہاں سے میں بنو قریظہ میں پہنچا تو ایک جماعت دیکھی جو نبی کریم ﷺ کا ذکر کر رہی تھی۔ اُن میں سے زبیر بن باطا نے کہا کہ کوکبِ احمر طلوع ہو چکا ہے اور یہ ستارا جبھی طلوع ہوتا ہے۔ جب کوئی نبی پیدا ہونا ہو اور اب اَحْمد ﷺ کے سوا کسی کی پیدائش باقی نہیں رہی اور یہ شہر اُن کی ہجرت گاہ ہے۔

☆- خصائصِ کبریٰ میں امام سیوطیؒ نے امام شعبیؒ کی نسبت دے کر لکھا ہے کہ صحیفۂ ابراہیم علیہ السلام میں لکھا ہوا تھا۔ انه كائن من ولد شعوب و شعوب حتىٰ ياتى النبى الامى الذى يكون خاتم الانبياء یعنی آپ کی اولاد میں قبائل در قبائل ہوتے رہیں گے۔ یہاں تک کہ نبی امی آ جائیں اور وہ ''خاتم الانبیاء'' ہونگے۔

☆- سیدنا آدم علیہ السلام نے اپنے بیٹے شیث علیہ السلام کو وصیت فرمائی کہ تم میرے بعد خلیفہ ہو گے۔ تقویٰ اور عروۃ الوثقیٰ کو لازم پکڑنا اور خدا کے ذکر کے ساتھ محمد ﷺ کا ذکر بھی لازم پکڑنا کیونکہ وہ عرش پر اور ہر جگہ میں نے لکھا دیکھا اور وہی میری عفو کا باعث ہوا۔

☆- امام التفسیر ابن جریر طبریؒ آیتِ کریمہ ﴿ وَاَخَذَ الْاَلْوَاحَ ﴾ کے ماتحت ایک طویل حدیث نقل فرماتے ہیں۔ جس سے تورات شریف میں ذکرِ محمدِ مصطفےٰ ﷺ ثابت ہوتا ہے۔ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہِ الوہیّت میں عرض کیا کہ اے میرے رب میں الواحِ توریت میں ایک ایسی اُمت کا تذکرہ پاتا ہوں۔ جو پیدائش میں سب سے آخری ہے اور جنت میں داخل ہونے کو سب سے مقدّم ہے۔ اے میرے ربّ! اُن کو میری اُمت بنا دے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ وہ محمد ﷺ کی امت ہے۔

ختمِ نبوّت

﴿ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنۡ رِّجَالِكُمۡ وَلٰكِنۡ رَّسُوۡلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ
وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمًا ﴾

''محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) تم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں
بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور سلسلہ انبیاء کے ختم کرنے والے ہیں
اور اللہ تعالیٰ اپنی ہر مشیت کا جاننے والا ہے۔'' [۳۳:۴۰]

یہ آیت 5 ہجری میں نازل ہوئی جیسا کہ روح المعانی و تاریخ الخمیس صفحہ 564 جلد اوّل میں ہے۔

عقیدہ

چونکہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد یہ تھا کہ انسان کو فوز و فلاح کا بہترین طریقۂ نجات، زندگی کا ارفع و اعلیٰ نصب العین اور روحانی مدارج طے کرنے کا یقینی ذریعہ عطا کر دیا جائے۔ لہٰذا بفحوائے نصِ قرآنی اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید کی شکل میں انسان کو کامل ہدایت عطا فرما دی اور جس مقصد کے لیے انبیاء کا سلسلہ جاری کیا گیا تھا وہ لامحالہ ختم ہو گیا اور منطق کا مسلمہ اصول ہے اِذَا فَاتَ الشَّرۡطُ فَاتَ الۡمَشۡرُوۡطُ ''یعنی جب شرط فوت ہو جائے تو مشروط بھی فوت ہو جاتا ہے''۔ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے وہ کامل ہدایت عطا فرمائی جا چکی ہے۔ اِس لیے آپ منطقی طور پر اِس سلسلہ کے خاتم ہیں۔ بنابریں ساڑھے تیرہ سو سال سے جمہور مسلمان متقدین و متاخرین کا یہ عقیدہ ہے اور جمیع علماءِ ربّانی و فضلاء حقانیٔ اسلام کا اِس مسئلہ پر اجماع رہا ہے کہ آنحضرت سرورِ کائنات، مفخرِ موجودات، مختارِ شش جہات، رحمت اللعٰلمین، خاتم النبیین، محبوبِ خدا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات قدسی صفات پر سلسلۂ نبوت ختم ہو چکا ہے اور قرآن حکیم، احادیث نبی کریم علیہ التحیات والتسلیم کی تصریحات و تعلیمات کی جامعیت و مانعیت اِس حقیقت پر شاہد ہے کہ مولا کریم جل مجدہٗ نے انسان کو اس کی علمی اور عملی قوتوں میں مترقیانہ صلاحیت و قابلیت کی تکمیل کر کے ایسا کامل و مکمل دستورِ حیات بخش دیا ہے، جس کی ہدایتِ

تامہ کی روشنی میں آئندہ ہر زمانے کا انسان دینی و دنیوی کامیابیاں اور ظاہری و باطنی کامرانیاں حاصل کرسکتا ہے۔ لہٰذا نہ اب کسی نبی خواہ وہ تشریعی ہو یا غیر تشریعی کے آنے کی ضرورت ہے اور نہ کسی پیغمبر ظلّی و بروزی کے ظہور کی حاجت اور یہی اسلام کا وہ بنیادی اصول ہے۔ جس پر مسلمانوں نے ہر زمانہ میں یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ اگر توحید الٰہی کا عقیدہ اسلام میں بمنزلہ بنیاد ہے تو ختم نبوت کا عقیدہ بمنزلہ عمارت ہے اور ظاہر ہے کہ اگر آنحضرت ﷺ کے بعد بھی انبیاء کا سلسلہ جاری رہنا تسلیم کرلیا جاتا تو پھر اسلام کا قصرِ رفیع کبھی کا منہدم ہو گیا ہوتا۔

اگر مسلمانوں نے ہمیشہ اس امر پر زور دیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ آئندہ آنے والے انبیاء سے مسلمانوں کو کوئی عداوت ہے۔ بلکہ وہ اِس لیے اِس عقیدہ پر مُصر ہیں کہ اگر آنحضرت ﷺ کے بعد بھی کسی نبی کی ضرورت باقی ہے تو حضور ﷺ کی وہ خصوصیت جو آپ کو جمیع انبیاء علیہم السلام سے ممتاز کرتی ہے، نعوذ باللہ باطل ہو جائے گی اور جو شخص یہ عقیدہ رکھے گا وہ یکسر دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائے گا اور اِس کو اسلام سے قطعاً کوئی علاقہ نہ رہے گا کیونکہ یہی ایک عقیدہ نوعِ انسانی کی ثقاہت کی تاریخ میں سب سے پہلا اور سب سے پاک ترین عقیدہ ہے۔

چونکہ حضور ﷺ کے بعد اِس عقیدے کے خلاف مدعیانِ کاذب کے ظہور کا امکان تھا، اِس لیے مخبر صادق ﷺ نے پہلے ہی پیشگوئی فرمادی کہ میرے بعد میری اُمت میں تیس جھوٹے نبی مدعی نبوت پیدا ہوں گے، جو سب کے سب اپنے دعووں میں کاذب ہوں گے کیونکہ میں ''خاتم النبین'' ہوں. میرے بعد کوئی نبی پیدا نہیں ہوگا۔

چنانچہ اِس پیشگوئی کے ماتحت آنحضرت ﷺ کے بعد مختلف ممالک اور مختلف زمانوں میں کئی لوگوں نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ مسیلمہ کذاب، اسود عنسی، سجاح بنتِ حارث، مختار ثقفی، میمون قداح، طلیحہ بن خویلد، ابن مقنع، سلیمان قرمطی، بابک خرمی اور عیسیٰ بن مہرویہ. مشہور دجال و کذاب گذرے ہیں جنہوں نے عرب و ایران میں کافی بربادی پھیلائی اور ہزارہا بندگانِ خدا کا خون گرایا۔ اِن کے بعد قریباً ایک ہزار سال تک اسلامی دُنیا میں کامل امن و امان رہ کر پنجاب کی سیر حاصل سرزمین سے پھر ایک فتنہ نے سر اٹھایا اور ایک مدعی نبوت نے از سرِ نو لوگوں پر بداعتقادی کا دروازہ کھولا جس کی مفصل تشریح آئندہ صفحات میں نظر آئے گی. اگرچہ اِس مدعی پنجابی نے بہت سی ارتقائی منازل طے کرنے کے بعد نبوت کا دعویٰ کیا، جو اِس کی بطالت کی بجائے خود ایک بین دلیل ہے، تاہم اِن منازل کے تذکرے کی وجہ سے اُس کے دعوے کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔

لفظِ نبوّت کی تحقیق

نبیٌ، نبوٌ، نبأٌ یہ تین لفظ ہیں، جن سے نبوّت کا لفظ ماخوذ ہے. ازروئے لغت نبی بروزن فعیل کا مفہوم ہے. اطلاع دینے والا یا اطلاع پہنچانے والا. پس اطلاع دینا بھی نبوت اور اطلاع پہنچانا بھی نبوت ہی ہوگا، جس پر قرآنِ کریم کے الفاظ شاہد ہیں. پہلے پارہ میں پروردگار کی طرف سے ایک مکالمہ کا اشارہ ہے. جس میں سوال کیا گیا ہے. اَنۡبِئُوۡنِی ''یعنی مجھے بتاؤ'' پھر اسی طرح سورہ آلِ عمران میں فرمایا ذٰلِكَ مِنۡ اَنۡبَآءِ الۡغَیۡبِ ''یہ غیبی اطلاعات ہیں'' اور سورہ التحریم میں کہا ﴿مَنۡ اَنۡبَاَكَ هٰذَا ؕ﴾ ''تمہیں یہ بات کس نے بتائی''؟ گویا کوئی عظیم الشان بات بتا دینا یا پہنچا دینا اِس کا نام لغت میں نبوت ہے. یہی وجہ ہے کہ علماءِ کرام نے تسلیم کیا ہے کہ لفظ نبوت شرعاً منقول ہے. [شرح موافق صفحہ 663] لغوی معنوں میں جو وسعت ہے. وہ شرعی معنوں میں نہیں.

ہر ذی علم کو پتہ ہے کہ سُود لغت میں فائدے کو کہتے ہیں. فلاں بات سُود مند ہے، فلاں چیز سے سود حاصل کرو، فلاں کام میں سود نہیں. لیکن شرع میں یہی لفظ سُود، اپنے مخصوص معنوں میں بھی مستعمل ہے. ایسے ہی لفظِ نبوت میں بھی لغتہً گو وسعت ہے لیکن شرعاً یہ وسعت محدود ہو جائے گی. صلوٰۃ لغتہً اظہارِ نیاز مندی کو کہتے ہیں اور کائنات کا ہر ذرّہ اس لحاظ سے نیاز مند ہے. پرند چرند، درند بلکہ کائنات کا ہر ذرّہ اور ہر شے اپنے اپنے رنگ میں بزبانِ حال نیاز مند ہے لیکن یہی لفظ جب يُقِيۡمُوۡنَ الصَّلٰوةَ یا اَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ میں آئیگا تو اِس کے معنوں میں وہ وسعت نہیں رہے گی جو لغت میں ہے بلکہ یہ محدود ہو جائے گی اور اِس کے معنی محض اظہارِ نیاز مندی کے نہ ہوں گے بلکہ یہاں مخصوص طریق عبادت مقصود ہوگا. یعنی لغوی وسعت بسا اوقات شریعت میں قائم نہیں رہتی بلکہ محدود ہو جاتی ہے. اِس سے ثابت ہوا کہ اگر کوئی شخص نبوت کے لغوی معنوں کی وسعت کو سامنے رکھ کر نبوت کا دعویٰ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نبی ہوں. تو ہر اطلاع دینے والا خواہ کوئی ہو اور ہر اطلاع پہنچانے والا خواہ کیسا ہو. اِس درجہ کا مستحق ہوگا اور وہ دعوائے نبوت کر سکے گا. پھر اِس وسعتِ لغت کے ماتحت زید ہی کے دعویٰ کی تخصیص کیا ہوگی. لہٰذا یہ ماننا پڑے گا کہ شریعتِ اسلامیہ میں اِس لفظ نبوت کے معنی محدود اور مخصوص ہیں. غیر محدود اور غیر مخصوص سمجھنے میں وہ استحالہ پیش آئے گا. جس کا کوئی جواب نہ ہوگا مثلاً

1- اگر نبوت کا معیار لغوی معنی کو قرار دیا جائے تو پھر ''اطلاع دہندگی'' اور ''اطلاع یابندگی'' کے لحاظ سے ہر شخص نبی قرار دیا جائے گا اور یہ شدید غلطی ہے.

2- اگر لغوی معنوں میں یہ تخصیص کی جائے کہ اطلاع یابندگی من جانب اللہ ہو تو نبوت ہوگی تو یہ بھی غلط ہے کیونکہ اِس صورت میں ہر مسلمان نبی ہوگا. اِس لیے کہ اگر ایک نے

دوسرے سے کہا کہ قرآن حکیم میں حکم آیا ہے نماز پڑھو تو اس مفروضہ کی بنا پر زید اور بکر دونوں نبی ہیں. ایک نے نماز کی اطلاع اللہ کی طرف سے دی اور دوسرے نے پائی.

3- اگر رویائے صادقہ کو نبوت کا معیار قرار دیا جائے تو یہ بھی اِس دعویٰ میں صحیح نہ ہوگا کیونکہ سچے خواب کفار کو بھی آسکتے ہیں. حضرت یوسف علیہ السلام کے قیدی ساتھیوں نے جیل میں سچا خواب دیکھا تھا اور اُسی زمانہ میں غیر مسلم بادشاہ شاہِ مصر نے سچا خواب دیکھا جس کی تعبیر خود حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمائی تو خواب یا عالمِ کشف میں یا عالمِ مثال میں کسی بات کا کسی کے لیے دیکھ لینا اور اُس کا سچا ہو جانا نبوت کی دلیل نہیں ہوسکتا اور یہ سب انسانی اصطلاحات ہیں.

4- بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ نبی وہ ہے. جس کی پاکیزگی اور طہارت کا اعلان خداوندِ عالم کی طرف سے ہو جائے. لیکن یہ معیار بھی صحیح نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں حضرت مریم رضی اللہ عنہا کی پاکیزگی بیان فرمائی ہے حالانکہ وہ نبیہ نہ تھیں اور وہ کیا، دنیا بھر میں کوئی عورت اِس درجہ پر فائز نہیں ہوئی.

5- اگر صرف مکالمہ و مخاطبہ کو معیارِ نبوت مانا جائے. تو اس سے بھی انکار کرنا پڑے گا کیونکہ مکالمہ ابلیس سے بھی ہوا. مخاطب فرعون کو بھی کیا گیا. خطاب یافتہ زمین و آسمان اور کائنات کا ذرّہ ذرّہ بھی ہے. آسمان کا پانی روکنے اور زمین کو پانی چوسنے کا حکم اِس پر گواہ ہے لیکن زمانہ جانتا ہے کہ یہ سب محض مکالمہ و مخاطبہ کی بدولت نبی نہیں بن گئے.

6- اگر یہ کہا جائے کہ نبوت الہام و وحی کے نزول کا نام ہے تو کیا نبوت کا مدار الہام و وحی پر ہوسکتا ہے؟ قرآن ارشاد فرماتا ہے کہ یہ بھی غلط ہے. اگر یہ صحیح مان لیا جائے تو اِس مفروضہ کی بناء پر شہد کی مکھی، کیڑے مکوڑے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ، حضرت عیسیٰ کے حواری سب نبی سمجھے جانے کے مستحق ہوں گے. بلکہ ہر شخص کیونکہ ﴿فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا﴾ ربّ العزت کا ارشادِ محکم موجود ہے.

7- اگر تبلیغ آیات اللہ کو دلیل نبوت مانا جائے تو بھی کام نہیں چلے گا کیونکہ اِس صورت میں ﴿بَلِّغُوا عَنِّي وَلَوْ آيَةً﴾ کے مطابق ہر مبلغ نبی ہو جائے گا اور بہت سے تبلیغی مشنوں کا کام کرنے والے افراد اس کی ذیل میں آجائیں گے.

معلوم ہوا کہ یہ جس قدر معیارِ نبوت لوگوں نے اپنے دعاوی میں مقرر کیے ہیں اور جن پر وہ اپنی نبوت کی بنیادیں استوار کرتے ہیں، سب کے سب لغو اور غلط ہیں. آیئے اب دیکھیں کہ قرآنِ مجید نے نبوت کا معیار کس چیز کو قرار دیا ہے؟

معیارِ نبوّت ورسالت

قرآنِ کریم میں تفکر وتدبّر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ:

نبی وہ شخص ہے جو نجاتِ انسانی کے لیے خدا تعالیٰ کے ''تجویز فرمودہ، نصب العین'' یا پروگرام سے براہِ راست مطلع ہو کر اُس کو نسلِ انسانی کے سامنے کتاب کی شکل میں پیش کرے اور خود اُس پر عمل کر کے لوگوں کو دکھا دے تا کہ اُن میں بھی اُس پر عامل ہونے کی ترغیب پیدا ہو. اِس نصب العین کو عرفِ عام میں کتاب یا شریعت یا ہدایت کہتے ہیں. ہر نبی اپنے ساتھ ''ہدایت'' لاتا ہے کیونکہ یہ بات عقلاً محال ہے کہ نبی (پیغمبر) آئے اور کوئی پیغام نہ لائے.

گویا خداوندِ عالم نے ضروریاتِ زندگی میں انسان کی رہنمائی کے لیے پہلے اُس کو وجدان کی ہدایت سے نوازا، جس کی رہنمائی ایک محدود دائرے تک تھی. پھر عقل کی راہنمائی کا دور شروع ہوا جو ایک خاص حد تک پہنچ کر ختم ہو گیا. پھر ہدایتِ نبوت کی ضرورت سمجھی گئی. یعنی نسلِ انسانی کی نجات اور فلاح و سعادتِ دارین، جس خدائی نصب العین کی پابندی پر موقوف ہے، اُس کا کسی ایسے انسان کے ذریعہ سے پیش کرنا جس کی امانت اور دیانت پر نامزدگی سے قبل عوام الناس کو پورا پورا اعتماد ہو. گویا ہدایت ِنبوت ایسے شخص کی وساطت سے نسلِ انسانی کے سامنے ایک ایسے پروگرام کے ماتحت رکھ دینے کا نام ہے. جس پر نسلِ انسانی کی نجات کا دارومدار ہو. اِس لیے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ نبوت تنہا مکالمہ ومخاطبہ، تنہا وحی اور الہام، تنہا رویائے صادقہ کا نام نہیں بلکہ نسلِ انسانی کی سعادت وفلاح جس نصب العین پر موقوف ہے، وہی مرتبہ ومقامِ نبوت ہے، جس کے نزول کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء کا سلسلہ قائم کیا اور اُس کا عطا فرمانا کمال احسان اور مہربانی سے اپنے آپ پر لازم قرار دے لیا، حالانکہ کوئی طاقت خدا کو کسی کام کرنے کے لیے مجبور نہیں کر سکتی اور وہ جو کچھ کرتا ہے اپنی مرضی اور اختیار سے ظہور فرماتا ہے اور ﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ میں اِسی کمالِ احسان کی جانب اشارہ ہے اور جہاں سے نبوت کا وہبی ہونا بھی مترشح ہوتا ہے.

یہ امر بھی قابلِ یاد ہے کہ قانونِ ارتقاء کے ماتحت نصب العین کے اس حصہ میں جس کو ''شریعت'' کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے اختلاف ہوتا رہا ہے لیکن اصلی حقیقت میں کوئی اختلاف نہیں ہوا. جو نبی خداوندِ عالم کی طرف سے دنیا میں تشریف لائے سب نے ایک ہی حقیقت کو پیش فرمایا. ﴿اُعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ وَلَا تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ شَيْئًا﴾ یعنی احکامِ شریعت میں ہر ماحول کے مطابق تبدیلی ہوتی رہی لیکن نصب العین ہر زمانہ میں ایک ہی رہا.

متحقق ہوا کہ نبوت ''ایک ایسے نصب العین، ایک کتاب، ایک دستور العمل، عقائد واعمال کے مجموعہ جس کے حسن وقبح میں تمیز کرنے سے انسانی عقل عاجز ہے'' کا نام ہے۔ اس کو آپ زبور کہیں، کتاب کہیں، آیاتِ بیّنات کہیں، نُور کہیں، شفا کہیں، فرقان کہیں، قرآن کہیں، ذکر کہیں، رسول کہیں۔ بہر حال یہ سب کچھ اُسی نصب العین الٰہی کی جس کے تجویز کرنے میں کسی انسان یا کسی فرشتے کا ذرہ برابر مشورہ شامل نہیں، تعبیر ہیں اور ﴿عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ ہی کا صرف اپنا ''تجویز فرمودہ نصب العین'' ہے۔

ضرورتِ بقاءِ نصب العین

چونکہ ضرورت تھی بقائے سنتِ ایزدی کی، ضرورت تھی بقاء نصب العین کی، ضرورت تھی تحفظ دین کی، اِس لیے خداوندِ عالم الغیب نے جس کا علم ماضی کی طرح مستقبل پر بھی مکمل طور پر حاوی ہے، اِس سلسلے کو ختم کرنے کے لیے تاکہ کسی شخص کے دعوائے نبوت کے بعد اُس کی تصدیق کی ضرورت کا امکان ہی نہ رہے اور آئندہ کے لیے لوگوں کو اِس امر کا انتظار ہی نہ رہے کہ دنیا میں کوئی اور بھی نصب العین پیش ہونے والا ہے۔ چنانچہ تحدی (للکار) کے ساتھ فرما دیا کہ ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِىْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ﴾ اب کوئی یوم کو خواہ متعارف معنوں میں لے یا غیر متعارف معنوں میں، بہر حال خدا کا یوم، یوم القرآن ہے۔ نبی کا یوم، یوم نبوّت ہے اور نزولِ قرآن کا سارا وقت یوم ہے، جس میں یہ نُورِ ہدایت سرکارِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وساطت سے پیش ہوتا رہا۔

یہاں یہ بیان کر دینا بعید از فہم نہ ہوگا کہ ہر چیز جو شروع ہوئی ہے اُس کی تکمیل اور اختتام بھی ضروری ہے۔ جس کے بعد اُس کی غرض میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔ مثلاً ایک وقت ہوتا ہے جب طالب علم کی تعلیم کی ابتداء ہوتی ہے، پھر وہ وقت بھی آتا ہے جب اُس کی انتہا ہو جاتی ہے اور وہ تعلیم کی تکمیل کے بعد کسی مزید تعلیم کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ اِسی طرح بچہ پیدا ہوتا ہے تو اُس کا لباس بہت چھوٹا اور معمولی بالشت بھر کا ہوتا ہے، لیکن اپنی جسمانی نشو و ارتقاء کے ماتحت ہر لمحہ اُس کا ناپ اور سائز بدلتا رہتا ہے، مگر ایک وقت ایسا بھی آ جاتا ہے۔ جس میں اُس کے جسم کا بڑھاؤ ختم ہو جاتا ہے اور وہ، وہ لباس پہن لیتا ہے۔ جس کے بعد اُس کے لباس میں کوئی بڑھاؤ قطعاً متصور نہیں ہوتا۔

ایسے ہی یہ مسئلہ نصب العین ہدایتِ انسانی کا ہے، جو آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر مسیح تک مختلف احکامِ شرع کے ساتھ بدلتا چلا آیا اور بعد کو اُس کی ایسی تکمیل کو لازم سمجھا گیا کہ جس کے ذریعہ ہدایتِ اخروی اور نجاتِ ابدی کا مکمل نظام انسان کو عطا کر کے اِس نعمتِ عظمیٰ کو تمام کر دیا جائے۔

پس آیت ﴿ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ ﴾ اِس ضرورت پر قطعی الدلالت ہے، جس کے لحاظ سے قرآنِ کریم ''خاتم الکتب'' اور حضور ﷺ ''خاتم النبین''، یعنی نبیوں کے آخری نبی یا نبوت کے ختم کرنے والے نبی ہیں اور آپ پر ہر قسم کی نبوت کا خاتمہ ہوگیا. اب کسی نبی کے آنے کی ضرورت نہیں کیونکہ جب مکمل اور بہترین نصب العین پیش ہو چکا ہو اور وہ کسی وقت کے لیے موقّت بھی نہ ہو، (کیونکہ اگر موقت ہوتا تو اِس کی ہمیشگی پر حفاظت کے دعوے نہ کیے جاتے). پھر اس کی موجودگی میں کسی دوسرے نصب العین کی ضرورت بھی نہ ہو تو دوسرا کوئی نبی کس کام کے لیے آئے گا. فافہم

خاتم النبین کا مفہوم اور ایک مرزائی کی زٹل

فقیر نے گذشتہ بحث میں یہ عرض کر دیا ہے کہ تمام متقدمین و متاخرین اہلِ اسلام اِس عقیدہ میں کہ آنحضرت ﷺ خاتم النبین (نبیوں کے ختم کر دینے والے نبی ہیں) متفق ہیں، سوائے اُن لوگوں نے جنھوں نے اپنی نفس پرستیوں اور خود غرضیوں کے ماتحت اِس عقیدہ سے منکر ہو کر میدان نبوت میں رینگنے کی جرات کی ہے یا اُن کے بعض حواریوں نے اُن کی تائید میں بے جا سمندِ قلم کو چلانے کی سعی سے کام لیا ہے اور اُن لوگوں میں سے ایک پنجابی مدعیٔ نبوت کا خادم کوئی خادم بی۔اے بھی ہے. جس نے لفظِ ''خاتم النبین'' کے صحیح مفہوم بتانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا کر اپنی علمی قابلیت کا ثبوت دیا ہے کہ ایک اَن پڑھ انسان بھی اُن کی اِس شوخی کی تردید کیے بغیر نہیں رہ سکتا. طرزِ بیان وہ ہے جس کے اندر سے جہالت یوں ظاہر ہوتی ہے، جیسے اُن کے دو ورقی ٹریکٹ کا عنوان. چنانچہ اُن خادمِ مرزا صاحب نے خاتم النبین کا مفہوم سمجھانے میں جو اصول قائم کیے ہیں اور مرزا صاحب کو نبی بنانے میں جن الفاظ پر پسینہ پسینہ ہوئے ہیں وہ اُنہیں کے الفاظ میں درج ذیل ہیں. قارئین کرام خود پڑھ لیں اور اُن کی منکرانہ سعی کو سمجھنے کی کوشش فرمائیں، کہتے ہیں:

''ہر عقلمند انسان بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ خاتم النبین کا خطاب جو ہمارے سید و مولے حضرت محمد ﷺ کو دربارِ خداوندی سے عطا ہوا وہ قرآنِ مجید میں مذکور ہے اور ظاہر ہے کہ یہ ترکیب اردو، فارسی یا پنجابی زبان کی نہیں بلکہ عربی زبان کی ہے. اِس لیے اِس کے معنی اہل عرب کے محاورہ اور اسلوب بیان کے مطابق کرنے ہوں گے نہ کہ پنجابی، اردو، فارسی کے لحاظ سے. اگر ''خاتم النبین'' پنجابی، اردو یا فارسی کی ترکیب ہوتی تو ہمیں اِس کا ترجمہ نبیوں کا بند کرنے والا ماننے میں کوئی عذر نہ ہوتا، لیکن ہمارا دعویٰ ہے کہ عربی زبان میں لفظ خاتم جمع کی طرف مضاف ہونے کی صورت میں ہرگز ہرگز ''آخری'' کے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ ''افضل'' کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے. ہماری طرف سے بارہا چیلنج دیا جا چکا

ہے کہ کوئی مولوی خواہ وہ مرتضیٰ احمد خان ہو یا کوئی اور، ہمیں قرآن، حدیث یا محاورات اور اسلوب بیانِ اہل عرب سے ایک ہی مثال اس امر کی پیش کر دیں کہ لفظ ''خاتم'' کی فتح کے ساتھ کسی صیغہ جمع مثلاً فقہا، علماء، اولیاء، محدثین یا مجددین وغیرہ کی طرف مضاف مستعمل ہوا ہو اور اس کے معنی آخری یا بند کرنے والے کے ہوں، یعنی کبھی کسی موقعہ پر خاتم الانبیاء یا خاتم المحدثین آیا ہو اور اُس جگہ اُس سے مراد یہ ہو کہ موسوم اولیاءِ محدثین کو بند کرنے والا ہے۔ اب اِس کے بعد کوئی ولی یا محدث پیدا نہ ہوگا۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ قیامت تک اِس قسم کی ایک مثال بھی پیش نہیں کی جا سکتی۔ اگر صاحبِ تاج العروس، قاموس، لسان العرب، منتہی الادب وغیرہ نے اپنی کتابوں میں خاتم النبین کے معنی آخری نبی یا نبیوں کا ختم کرنے والا لکھے ہیں۔ تو اُنہوں نے محض اپنے عقیدہ کا اظہار کیا ہے جو حجت نہیں۔ عربی زبان میں اِن معنوں کی تائید میں ایک بھی دلیل نہیں''۔

یہ ہے خادمِ مرزا صاحب کا تمام تر زورِ ایمان اور یہ ہے ایمان والوں کو کھلا چیلنج جس میں قیامت تک کے لیے شرط لگائی گئی ہے اور یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ نہ ہم سے زیادہ کوئی عالم دنیا میں موجود ہے اور نہ ہی کوئی جواب دے سکے گا۔ خادم صاحب کے مقامِ انسانیت کی بھی حد ہو گئی لیکن مزہ جب تھا کہ مومنین کو چیلنج کرنے سے پہلے اپنی چارپائی کے نیچے ڈنگوری پھیر لیتے کہ کہیں گھر سے ہی تردید نہ ہو جائے اور بمصداق ''این گناہیست کہ آں مرزا شما نیز کند'' میں ہی نہ رگڑے جائیں۔ یہ تو صحیح ہے کہ لفظ خاتم النبین کلامِ عربی کا لفظ ہے، اردو یا پنجابی نہیں اور اِس کے معنی بھی عربی زبان سے ہی سمجھنے چاہئیں مگر خود تو آپ نے عربیّت چھوڑ پنجابیّت اور اردویّت سے بھی علیحدگی اختیار کر کے محض انگریزیّت اور بی ایت سے کام لیا ہے۔ یہ جو آپ کا دعویٰ ہے کہ لفظ ''خاتم'' جمع کی طرف مضاف ہونے سے ہرگز ہرگز ''آخری'' کے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا، بلکہ ہمیشہ ''افضل'' کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے، ہم اسے سچائی سے بالکل دور پاتے ہیں، اِس لیے کہ آپ کے مرزا جی اِس لفظِ خاتم کو جمع کی طرف مضاف ہونے کی صورت میں آخری اور ختم کرنے کے معنی میں استعمال کر رہے ہیں۔ جبھی تو کہا ہے کہ پہلے اپنی ہی تعلیم کا عبور کر کے پھر معترض بنتے۔ ذرا ملاحظہ ہو اپنے مرزا جی کی تریاق القلوب صفحہ 152، لکھتے ہیں کہ:

> ''جیسا کہ میں ابھی لکھ چکا ہوں، میرے ساتھ ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی جس کا نام جنت تھا اور پہلے وہ لڑکی پیٹ سے باہر نکلی تھی اور بعد اِس کے میں نکلا تھا اور میرے بعد میرے والدین کے گھر میں اور کوئی لڑکی یا لڑکا نہیں ہوا اور میں اُن کے لیے خاتم الاولاد تھا''۔

اِس عبارت میں لفظِ خاتم جمع اولاد کی طرف مضاف ہے اور پھر بھی ''آخر'' کے معنوں میں ہے نہ ''افضل'' کے معنوں میں۔ اِس لیے کہ پہلا جملہ: ''میرے بعد میرے والدین کے گھر میں اور کوئی لڑکی یا لڑکا

نہیں ہوا"، بالکلیہ "افضل" کے معنوں کی تکذیب کرتا ہے اور اِس پر مزید برآں کہ میں اُن کے لیے خاتم الاولاد تھا. آپ کے خودساختہ دعوے کی مٹی ہی خراب کرگیا ہے.

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پہلے خاتم النبین کے مفہوم میں مرزا جی کے ہی اقوال سے استدلال کرلیا جائے تا کہ معترض صاحب جھنجلاہٹ کی بجائے دوسرے دلائل کو ٹھنڈے دماغ سے سوچ سکیں اور اُن کو پتہ لگ جائے کہ متقدمین نے جو معنی خاتم النبین کے آخری نبی یا نبیوں کا ختم کرنے والے کیے ہیں. وہ محض اپنے عقیدہ کے لحاظ سے نہیں کیے بلکہ اُس کے معنی ہو ہی یہی سکتے ہیں اور اگر انہوں نے عقیدہ کے ماتحت یہ معنی کیے ہیں. تو آپ کے مرزا صاحب نے کس عقیدہ کا اظہار کیا ہے؟ جن کے لیے آپ یوں بلا وجہ ایمان کی لٹیا ڈبو رہے ہیں اور مسئلہءِ ختم نبوت سے منکر ہوئے جاتے ہیں. آیئے ذرا لگے ہاتھوں اور حوالہ جات بھی مرزا صاحب کی تحریرات سے ملاحظہ کر لیجیے تا کہ کسی دوسرے پر خوش عقیدتی کا شبہ ہی نہ رہے.

1- اور ہمارے رسول ﷺ کے بعد نبی کیونکر آ سکتا ہے درآنحالیکہ آپ کی وفات کے بعد وحی منقطع ہوگئی اور اللہ تعالیٰ نے آپ پر نبیوں کا خاتمہ فرما دیا. [حمامتہ البشریٰ صفحہ 34]

2- خاتم الانبیاء ﷺ کے بعد نبی کیسا. [انجام آتھم صفحہ 28]

3- یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ نبی کریم خاتم الانبیاء ہوں اور پھر کوئی دوسرا نبی آ جائے.

(ایام الصلح صفحہ 47)

4- ہست او خیر الرسل، خیر الانام ہر نبوت را بَرُو شد اختتام

5- مجھے کب جائز ہے کہ میں نبوت کا دعویٰ کر کے اسلام سے خارج ہو جاؤں اور کافروں کی جماعت سے جا ملوں. [حمامۃ البشریٰ صفحہ 79]

(اِس اقتباس سے یہ بات بھی مرزا صاحب کی زبانی ثابت ہوگئی کہ جو مسلمان حضور ﷺ کے بعد نبوت کا دعویٰ کرے وہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے)

6- کیا ایسا بدبخت مفتری جو خود رسالت اور نبوت کا دعویٰ کرتا ہے، قرآن شریف پر ایمان رکھ سکتا ہے، یہ کہہ سکتا ہے کہ میں بھی آنحضرت ﷺ کے بعد نبی اور رسول ہوں؟

[انجام آتھم صفحہ 27]

7- اور قرآن شریف جس کا لفظ لفظ قطعی ہے اپنی آیت ﴿ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ﴾ سے بھی اِس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ فی الحقیقت ہمارے نبی ﷺ پر نبوت ختم ہو چکی ہے. [کتاب البریہ صفحہ 148 حاشیہ]

(اِس عبارت میں خاتم النبین کی تفسیر اِس جملہ سے کی جاتی ہے (نبوت ختم ہو چکی) ذرا

غور تو کیجئے کہ یہ لغویوں کی غلطی تھی اور خوش عقیدتی یا آپ کے پیرومرشد بھی اُن کی طرح اسی بات کے مستحق ہوں گے)۔

8- قرآن کریم، بعد "خاتم النبین" کسی رسول کا آنا جائز نہیں رکھتا۔ خواہ وہ نیا ہو یا پرانا۔
[ازالۃ اوھام صفحہ 761]

9- اللہ کی شان نہیں کہ خاتم النبین کے بعد نبی بھیجے اور نہ ہی شایاں کہ سلسلۂ نبوت کو دوبارہ از سرِ نو شروع کر دے، بعد اس کے کہ اُسے قطع کر چکا ہو۔ [آئینہ کمالات صفحہ 31]

10- اور اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ نبیوں کو ختم کر دیا۔ [آئینہ کمالات صفحہ 31]

11- کما کان سید المصطفی علی مقام الختم من النبوۃ و اِنّہٗ خاتم الانبیاء "مرزا جی خود اِس کا ترجمہ لکھتے ہیں: "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نبوت کے سلسلہ کو ختم کرنے والے تھے اور وہ خاتم الانبیاء ہیں۔" [خطبہ الھامیہ صفحہ 35]

اِس عبارت میں مرزا جی خاتم الانبیاء کا ترجمہ خود "نبوت اور نبیوں کو ختم کرنے والے" کر رہے ہیں۔ "افضل" وغیرہ کا دخل نہیں۔

12- وتعین ان ھذا الوقت ھو وقت اخر الخلفالامۃ نبیناخیر الوریٰ "اور مقرر ہو گیا کہ یہ وقت وہی وقت ہے۔ جس میں خاتم الخلفاء کا مبعوث ہونا ضروری تھا۔"
[خطبہ الھامیہ صفحہ 72]

قارئین کرام نے مندرجہ بالا حوالے مرزا صاحب کی اپنی تصانیفات سے ہی پڑھ لیے ہیں۔ جن کے خادم کا خودساختہ قاعدہ" کہ: "خاتم کا ترجمہ جمع کی طرف مضاف ہونے سے آخری اور بند کرنے والا نہیں آتا" اُن کے پیشوا ہی کی تحریروں سے باطل ہو گیا ہے اور ضرورت ہی نہیں رہی کہ اِس بے سروپا اعتراض پر کلامِ عرب سے کچھ پیش کیا جائے اور اگر یہ مرزا صاحب کے اقوال، معترض کے نزدیک سچے ہیں تو پھر معترض جھوٹا ہے اور اگر معترض اپنے دعویٰ میں سچا ہے، تو مرزا صاحب کے متعلق وہ خود ہی حکمِ شریعت صادر کرے۔ ہم کہیں گے تو برائی ہو گی۔ ہم نے تو معترض کے چیلنج کا جواب بوضاحت دے دیا ہے تاکہ اُن کو قیامت تک کا انتظار نہ رہے۔ شعر

سمجھ کر پاؤں رکھنا میکدہ میں خادمِ مرزا
یہاں پگڑی اُچھلتی ہے اِسے میخانہ کہتے ہیں

یہ تو تھی خادم مرزا کی کہانی اُن کے اپنے پیشوائے قادیانی کی زبانی۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عقیدۂ حقہ حضرات اہلسنت والجماعت متقدمین ومتاخرین کے وہ دلائل پیش کر دیے جائیں۔ جن کی

بناء پروہ آنحضرت سرورِ کائنات، مفخرِ موجودات، مختارِ شش جہات محمد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ''خاتم النبین''، تسلیم کرتے ہیں.

یہ بحث چار عنوانات پر ہوگی تا کہ قارئین کتاب ہذا پوری طرح اُس شانِ نبوتِ تامہ کو سمجھ سکیں.

(1) قرآن کریم (2) حدیث شریف (3) اجماع اُمت (4) عقل سلیم

وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللهِ

اگر چہ قرآن کریم میں ختم نبوت پر متعدد نصوص موجود ہیں لیکن اِس مختصر مضمون میں صرف مندرجہ بالا تین نصوص پر ہی اکتفا کر کے اب احادیثِ صحیحہ پیش کی جاتی ہیں. جن سے مسئلہ ختم نبوت اور واضح ہو جائے.

احادیث

حدیث نمبر 1: ((لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يُبْعَثَ دَجَّالُوْنَ كَذَّابُوْنَ كُلُّهُمْ يَزْعَمُ اَنَّهٗ نَبِيٌّ وَ اَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ)) ''قیامت اُس وقت تک قائم نہیں ہو سکتی جب تک بہت سے دجّال اور کذّاب نہ اٹھائے جائیں. جن میں سے ہر ایک یہ گمان کرتا ہوگا کہ وہ نبی ہے حالانکہ میں تو خاتم النبین ہوں. میرے بعد کوئی نبی پیدا نہیں ہوگا.'' [ابوداؤد و ترمذی]

اِس حدیث میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فیصلہ کن بات فرما دی ہے، جس کے بعد کوئی مسلمان جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر ایمان ہوگا، خاتم النبین کے حقیقی اور صحیح مفہوم میں شک نہیں کر سکتا. حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس کے معنی خود کر دیئے ہیں کہ میں سلسلۂ انبیاء کا ختم کرنے والا ہوں. میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا.

لا نبی بعدی میں لائے نافیہ جنس کی نفی کرتا ہے. یعنی کسی قسم کا بھی نبی پیدا نہیں ہوگا. ہر قسم کی نبوت کا خاتمہ ہو گیا ہے. چنانچہ خود مرزا قادیانی نے بھی ایام الصلح کے صفحہ 124 پر لکھا ہے. کہ لا نبی بعدی میں لائے نافیہ جنس کی نفی کرتا ہے. کسی قسم کا بھی نبی خواہ نیا ہو یا پرانا آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد دنیا میں نہیں آ سکتا. سمجھ میں نہیں آتا کہ اِس کے بعد کون سی وحی ایسی نازل ہوگئی تھی، جس کی رو سے لا نبی بعدی میں وہی لائے نافیہ جنس کی نفی نہیں کرتا.

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بو العجبی است

حدیث نمبر 2: ((اِنَّ مَثَلِيْ وَمَثَلُ الْاَنْبِيَاءِ مِنْ قَبْلِيْ كَمَثَلِ رَجُلٍ بَنٰى بَيْتًا وَاَجْمَلَهٗ اِلَّا مَوْضِعَ لَبِنَةٍ مِّنْ زَاوِيَةٍ فَجَعَلَ النَّاسُ يَطُوْفُوْنَ وَ يَعْجَبُوْنَ لَهٗ وَ يَقُوْلُوْنَ هَلَّا وُضِعَتْ هٰذِهِ اللَّبِنَةُ

قَالَ فَاَنَا اللَّبِنَةُ وَاَنَا خَاتَمُ النَّبِيّنَ)) ''میری مثال اور مجھ سے پہلے انبیاء علیہم السلام کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص نے کوئی گھر بنایا ہو اور اُس کو آراستہ پیراستہ کیا ہو مگر ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی ہو. لوگ اُس کے پاس چکر لگاتے ہوں اور خوش ہوتے ہوں اور کہتے ہوں کہ یہ ایک اینٹ بھی کیوں نہ رکھ دی گئی (کہ عمارت مکمل ہو جاتی) فرمایا آنحضرت ﷺ نے کہ میں ہی وہ آخری اینٹ ہوں اور میں ہی خاتم النبین ہوں.'' [رواہ بخاری و مسلم وغیرھا]

اِس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ خاتم النبین کے معنی آخر الانبیاء کے ہیں اور یہ ''قصرِ نبوت'' مکمل ہو چکا ہے. اب کسی اینٹ کی گنجائش نہیں. قربان جائیے آنحضرت ﷺ کے آپ نے کیسی خوبصورتی کے ساتھ اِس حقیقت کا اعلان فرما دیا ہے کہ میں آخری نبی ہوں. آپ فرماتے ہیں کہ سلسلہ بعثتِ انبیاء کو ایک عمارت تصور کرلو. عمارت اینٹوں سے پایہ تکمیل کو پہنچتی ہے. معمار ایک عرصہ تک اِس عمارت کو اینٹوں سے بناتا رہا، یہاں تک کہ وہ عمارت پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی اور صرف ایک اینٹ کی کسر باقی رہ گئی. آخر ایک دن اُس نے وہ آخری اینٹ بھی لگا دی. کیا اب کوئی شخص خواہ وہ کتنا ہی بڑا کاریگر کیوں نہ ہو. اِس عمارت میں کسی اینٹ کا اضافہ کرسکتا ہے؟. اِسی طرح اِس ''قصرِ نبوت'' کی تکمیل کے بعد نہ تشریعی نبوت کی اینٹ کی گنجائش ہے نہ غیر تشریعی یا ظلی و بروزی یا لغوی ومجازی کی. ہاں! خلقِ خدا کو گمراہ کرنے کا ٹھیکیدار بن جانا ایک دوسری بات ہے. نبوت تو درکنار لوگوں نے خدائی کے دعوؤں تک سے دریغ نہیں کیا.

حدیث نمبر 3: ((وَخُتِمَ بِیَ النَّبِیُّوْنَ)) [رواہ مسلم، باب الفضائل]. امام مسلم نے اِس حدیث کو آنحضرت ﷺ کے فضائل کے باب میں درج کیا ہے. اِس حدیث میں چھ فضیلتوں کا ذکر ہے جن میں سے چھٹی فضیلت یہ ہے کہ میرے ساتھ تمام انبیاء علیہم السلام کو ختم کیا گیا. اِس حدیث میں اِس تحریف کی بھی جڑ کاٹ دی گئی. جو لفظ خاتم میں کی جاتی ہے. خَاتَمُ النَّبِیّنَ کی جگہ ختم خُتِمَ بِیَ النَّبِیُّوْنَ فرمایا گیا، جس کا مطلب یہ ہے کہ اِس میں کسی قسم کے نبی کا استثناء موجود نہیں.

حدیث نمبر 4: بروایت ابن ماجہ باب فتنۃ الدجال. ((اَنَا اٰخِرُ الْاَنْبِیَاءِ وَاَنْتُمْ اٰخِرُ الْاُمَمِ)). ''یعنی میں سب نبیوں کے آخر میں آنے والا ہوں اور تم سب اُمتوں کے آخر میں آنے والی اُمت ہو.'' گویا آپ کے بعد کوئی شخص اِس اُمت کے لیے نبی بنا کر نہیں بھیجا جائے گا. اِن احادیثِ صحیحہ کی موجودگی میں نہ کوئی مسلمان نبوت کا دعویٰ خود کرسکتا ہے. نہ کسی مدعیءِ کاذب کے دعویٰ پر ایمان لاسکتا ہے مگر داد دیجیے اُن بھٹکے ہوؤں کے ایمان کی جو اپنا ایمان کسی کاذب مدعیءِ نبوت کے سپرد کر کے عوام کے لیے بھی بہکاوٹ کی صدہا راہیں نکالتے رہتے ہیں اور ایک مدعی کی بطالت کو ثابت کرنے کے لیے ہزاروں جھوٹ بولتے اور لاکھوں تاویلات کو کام میں لاتے ہیں. ایمان رہے یا نہ رہے اِن احادیث کو

پڑھ کر بھی کوشش جاری رہتی ہے کہ کوئی ضعیف حدیث یا کوئی گرا ہوا متقدمین کا قول ہی مل جائے تو ہم بھی اپنے دعوے میں پیش کر سکیں چنانچہ مسئلہ ختم نبوت کے مخالف ایک حدیث صحیح پیش کیا کرتے ہیں جس کا مفہوم حقیقی تو وہی ہے جو جمیع اہل اسلام نے خاتم النبین کا سمجھا ہے مگر وہ ہیں کہ ''اگر مگر'' پر قیاس آرائی کرتے ہوئے اپنے راہنما کے لیے پورا ایڑی چوٹی کا زور لگا کر یہ ثابت کرنے کی سعی کرتے ہیں کہ اس حدیث کے ''اگر'' سے کچھ نفع اٹھانے کی صورت پیدا کر لیں، مگر:

وائے آرزو کہ خاک شدہ

ہزاروں ٹکریں مارتے ہیں مگر کامیابی نہیں ہوتی. فقیر یہاں وہ حدیث شریف نقل کر کے مخالفین کے لیے مفصل بحث کر دیتا ہے تا کہ وہ ''اگر مگر'' کی بھول بھلیوں سے نکل کر ابدی صراط مستقیم پا سکیں.

وَبِاللهِ التَّوْفِيْق

حدیث شریف یوں ہے ((لَوْعَاشَ اِبْرَاهِيْمَ لَكَانَ صِدِّيْقاً نَّبِيًّا)) ابن ماجہ جلد اوّل، صفحہ 237 مطبوعہ مصر. یہ حدیث اپنی صحت کے لحاظ بشہادت شہاب علی البیضاوی جلد 7 صفحہ 175 میں یوں بیان کی گئی ہے کہ اما صحة الحديث فلا شبهة فيها لا نه رواه ابن ماجه وغيره كما ذكره ابن حجر یعنی اس حدیث کی صحت میں کوئی شبہ نہیں جیسا کہ ابن حجر نے ذکر کیا ہے اور اس حدیث کو ابن ماجہ کے علاوہ اور محدثین نے بھی ذکر کیا ہے.

اس کی تشریح یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے سیدنا ابراہیمؑ 8 ہجری المقدس میں پیدا ہوئے اور ربیع الاول 10 کو بروز منگل وفات پا گئے. اُن کی وفات پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر ابراہیم زندہ رہتے تو ضرور صدیق نبی ہوتے. مرزائی اس اگر میں مرزائے قادیانی کی نبوت کو ثابت کرنے کے لیے یہ استدلال کرتے ہیں کہ دیکھو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نئے نبی کا آنا ممکن اور ثابت ہو گیا. یعنی اگر ابراہیمؓ زندہ رہتے تو نبی ہوتے. اس سے معلوم ہوا کہ اجرائے نبوت لازم ہے چونکہ ابراہیمؓ فوت ہو گئے. اس لیے نبی نہ ہوئے تو معلوم ہوا کہ اُن کا نبی نہ ہونا اُن کی موت کا سبب تھا ورنہ نبوت جاری ہے اور حضور نے آیت خاتم النبین سے نبوت کو بہ کلی مسدود نہیں سمجھا اور اسی طرح کی ایک اور حدیث بھی جس کے الفاظ یہ ہیں پیش کیا کرتے ہیں. ((لَوْكَانَ بَعْدِيْ نَبِيًّا لَكَانَ عُمَرُ)) یعنی اگر میرے بعد کسی نبی کا ہونا ممکن ہوتا تو بلاشبہ حضرت عمرؓ نبی ہوتے. یہاں بھی وہی ''اگر'' نظر آ رہا ہے. جس کے معنے نہ سمجھتے ہوئے خواہ مخواہ کھینچ کر مرزا صاحب کی نبوت نکالنے اور منوانے کی سعی کی جا رہی ہے. اِن دلدادگانِ پیشوا سے پوچھا جائے کہ جہاں حرف ''اگر'' آئے گا، اِس مطلب کا آئندہ اجرا ہی مقصود ہو گا؟. یا یہ اگر کسی اور مطلب کے لیے بھی آتا ہے. یہاں تو بات سیدھی اور صاف تھی کہ چونکہ

آنحضرت ﷺ کے بعد نبوت ختم تھی لہٰذا حضرت عمرؓ کا نبی ہوسکنا محال ہوا اور صاحبزادے ابراہیمؓ کی وفات اِس لیے ہوئی کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آنا تھا۔ اگر زندہ رہتے تو نبی ہوتے اور نبوت تھی ختم لہٰذا فوت کر لیے گئے کیونکہ اگر زندہ رہ کر نبی ہوتے تو یہ حضور خاتم النبیین ﷺ کی کسرِ شان تھی کہ باقی انبیاء کی اولاد زندہ رہ کر نبوت پائے اور حضور کی اولاد محروم النبوت ہو۔ چنانچہ اسی مفہوم کی تائید میں بخاری شریف میں حضرت عبداللہ بن اوفیٰؓ کے یہ الفاظ موجود ہیں کہ حضرت ابراہیمؓ اِس لیے زندہ نہ رہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں ((ولکن لا نبی بعده)) ایسے ہی حضرت انسؓ فرماتے ہیں۔ ((ولو بقی لکان نبیا)) اگر حضرت ابراہیمؓ زندہ رہتے تو ضرور نبی ہوتے۔ ((ولکن لم یکن یبقی)) ''لیکن ممکن نہیں تھا کہ زندہ رہیں'' ((لان نبیکم اخر الانبیا)) اِس لیے کہ تمہارے نبی ﷺ آخری نبی ہیں۔ یعنی آخری نبی کے بعد اور نبی نہیں آسکتا۔ کیا صحابہ کرامؓ کی تشریح سے بھی یہ مطلب ذہن نشین نہیں ہوگا کہ حضرت صاحبزادہ سیدنا ابراہیمؓ کی موت کس بنا پر ہوئی؟۔ اور اگر اِس کا مفہوم یہی فرض کر لیا جائے جو مرزا صاحب کے مرید کہتے ہیں۔ تو کیا حضرت عمرؓ کی نبوّت تو موت سے ختم نہیں ہوئی، اُنہوں نے تمہارے اِس غلط استدلال کے ماتحت کا دعویٰ کیوں نہ کیا؟ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ختمِ نبوت کے صحیح مفہوم کو خوب سمجھتے تھے اور ''اگر'' حرف ''لَوْ'' آپ کے نزدیک انہی مطالب کا حامل ہے تو ذرا دو مثالوں پر غور فرمانے کے بعد جاری رہنے کے معنوں کی ہٹ دھرمی کیجیے۔

1- قرآنِ مجید وحدتِ خدا کے اثبات پر دلیل پیش کرتا ہے۔ ﴿لَوْ كَانَ فِيْهِمَا اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا﴾ یعنی اگر کائنات میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور خدا بھی ہوتا تو نظامِ عالم بگڑ جاتا اور اِس میں فساد آ جاتا۔ کیا یہاں دوسرے خدا کا ہونا صرف لو کے ماتحت ممکن ہے جس طرح اِس سے پہلے استدال کیا جا چکا ہے یا یہاں پر لو اُس حقیقت کا ترجمان ہوگا کہ اللہ کے سوا کسی اور خدا کا ہونا محال ہے اور اگر یہاں بھی اُسی جدّتِ علمی سے کام لیا جائے گا تو وہ علم ظاہر کرنے سے پہلے ایمان کی فکر کرنی پڑے گی۔ ورنہ یہ ماننا پڑے گا کہ لو عاش ابراھیم میں بھی اُن کا زندہ رہنا محال تھا۔ اب کہیں یہ نہ کہہ دیں کہ دوسرے خدا کے لیے گنجائش تو ہے مگر یہ ایک الگ بات ہے کہ اتفاق سے دوسرا خدا نہیں اور اگر سوچا جائے تو آیت میں حرف لو موجود ہے لہٰذا دوسرا خدا ہو سکتا ہے۔ (نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذَالِكَ)

2- حضور ﷺ فرماتے ہیں: ((لَوْ كَانَ مُوْسٰى حَيًّا لَمَا وَسِعَهٗ اِلَّا اِتِّبَاعِيْ)) ''یعنی اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو انہیں لامحالہ میری اطاعت کرنی پڑتی''۔ کیا یہاں سے موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کا اجرا ثابت ہوگا؟ گو وہ حضور ﷺ سے ملاقات نہیں فرما

سکتے. مختصر بات صرف یہ ہے کہ جیسے ''لو'' دو خداؤں کی نفی ظاہر فرماتا ہے ویسے ہی حیاتِ موسیٰؑ کی نفی کرتا ہے، اور ایسے ہی آنحضرت ﷺ کے صغیر سن بیٹے ابراہیم علیہ السلام کی نبوت کی نفی پر دال ہے. اور لو عاش کا صحیح ترجمہ وہی ہو سکتا ہے. جو احادیث کے مطابق اور تشریح صحابہ کرامؓ کے موافق ہو.

3- ابن ماجہ میں ایک حدیث ہے. کہ ((انا آخرا لانبیاء)) یعنی میں آخری نبی ہوں. گویا بتادیا کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں.

4- صحیح مسلم میں ہے ((فانی آخر الانبیاء)) اِس میں قطعاً شبہ نہیں. کہ تحقیق میں آخری نبی ہوں. اِس سے صاف طور پر واضح فرمادیا کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں.

5- کنز العمال میں ہے. ((انا خاتم الا نبیاء)) یعنی میں تمام نبیوں کا ختم کرنے والا ہوں.

6- مسلم و بخاری میں ہے. ((لم یبقی من النبوۃ الا المبشرات الصّالحات)) یعنی نبوت کا کوئی جزو باقی نہیں رہا مگر مبشرات الصالحات باقی ہیں. صحابہؓ عرض کرتے ہیں یا رسول اللہ مبشرات کیا ہیں؟ فرمایا: ((الرویا الصالحہ)) ''سچے خواب''، مطلب یہ کہ نبوت ختم ہوگئی ہے.

7- ترمذی شریف میں ہے. حضور ﷺ نے فرمایا ((یا اباذر اول الانبیا ادم و اخرهم محمد و اوّل نبی من انبیاء بنی اسرائیل موسےٰ واخرهم عیسےٰ)) یعنی اے ابوذر سب سے پہلے نبی آدم ہیں اور سب سے آخری نبی محمد ﷺ ہیں اور بنی اسرائیل کے سب سے پہلے نبی موسےٰؑ اور آخری نبی عیسیٰؑ ہیں.

کیا مسلمان کے لیے یہ وضاحت ناکافی ہے اگر بنی اسرائیل کے انبیاء علیہم السلام میں عیسی علیہ السلام کے بعد کوئی نبی نہیں آیا تو آنحضور ﷺ کے بعد اِس اُمت میں اِس حدیث کے ماتحت کیوں کر کوئی نبی آسکتا ہے.

8- مسند امام احمد حنبل میں ہے. ((عن عائشة ان النبی صلی اللهعلیه وسلم قال لا یبقی بعدی من النبوة شیىء الا المبشرات قالـوا یا رسول الله صلی علیه وسلم وما المبشرات قال الرویا الصالحه)) حضرت ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: میرے بعد نبوت میں سے کوئی چیز سوائے مبشرات کے باقی نہیں رہی. اِس پر صحابہؓ کی طرف سے گذارش کی گئی کہ مبشرات کیا ہیں؟ تو حضور ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ نیک اور سچی خوابیں.

کیا صاف الفاظ ہیں کہ نبوت میں سے بجز سچی خوابوں کے اور کچھ باقی نہیں رہا، لہٰذا کوئی شخص نبی نہیں بن سکتا. ہاں کسی کو سچے خواب ضرور آ سکتے ہیں کیونکہ مبشرات کا دروازہ بند نہیں ہوا. یہ تھی حدیث شریف کی روشنی میں تشریحِ ختم نبوّت -اب مفسّرین و متقدّ مین کے اقوال و اعتقادات بھی سن لیجئے:

1- ابو جعفر ابن جریر طبری اپنی تفسیر میں حضرت قتادہؓ سے خاتم النبین ﷺ کے معنے یوں بیان فرماتے ہیں: ((من قتادة رضی الله عنه ولکن رسول الله و خاتم النبین الیٰ اخرهم)) کہ آنحضرت ﷺ اللہ کے رسول اور خاتم النبین بمعنے آخر النبین ہیں.

2- امام سیوطیؒ نے درِ منثور میں بحوالہ عبداللہ ابن حمید حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے ((عن الحسن فی قوله وخاتم النبین قال ختم الله النبین محمد صلی الله علیه وسلم و کان اخر من بعث)) کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کو آنحضرت ﷺ پر ختم کر دیا اور آپ اُن تمام رسولوں میں سے جو اللہ کریم نے مبعوث فرمائے آخری نبی ہیں.

3- علامہ زمخشریؒ نے اپنی تفسیر کشاف میں جو کچھ لکھا ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ کے بعد کوئی شخص نبی نہیں بنایا جائے گا نبوت آپ کی ذات پر ختم ہو گئی ہے.

[کشاف جلد دوئم صفحہ 215]

4- امام رازیؒ نے بھی یہی معنے کئے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے بعد قیامت تک کوئی نبی مبعوث نہ ہوگا. [تفسیر کبیر جلد 6 صفحہ 617]

5- علامہ آلوسی بغدادیؒ اپنی تفسیر روح المعانی میں کہتے ہیں. کہ آنحضرت ﷺ خاتم النبین ہیں. اِس لیے حضورؐ خاتم المرسلین بھی ہیں. آپ کے بعد قیامت تک اب وصف نبوت و رسالت کسی جن و انس میں پیدا نہیں ہو سکتا ختمِ نبوت کی تصریح قرآن کریم میں موجود ہے اور اُس پر ایمان رکھنا از بس ضروری ہے. اور اِس کا منکر کافر ہے. [روح المعانی جلد ہفتم صفحہ 60]

6- علامہ زرقانیؒ شرح مواہب اللدنیہ جلد 5 صفحہ 267 میں بیان کرتے ہیں. کہ آنحضرت ﷺ کی خصوصیات میں سے یہ بھی ہے کہ آپ سب انبیاء و رسل کے ختم کرنے والے ہیں.

مقامِ غور ہے کہ دنیائے اسلام کے بزرگ ترین مفسرین نے خاتم النبین کے معنے یہی کئے ہیں کہ آپ کے بعد قیامت تک کوئی نبی پیدا نہیں ہوگا پھر کس قدر جائے تعجب ہے کہ اِس قدر تصریحات کے باجود نہایت بیباکی کے ساتھ نبوت کا دعویٰ کرنا اور اپنے نہ ماننے والوں کو کافر گردانا. پھر اپنی خود

ساختہ تفسیر و تقسیم کے دامن ظل و بروز میں پناہ لینا، حقیقت سے دوری نہیں تو اور کیا ہے؟ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات ہی کے زمانہ میں اور بعد میں مسیلمہ کذاب کا اتنا ہی قصور نہ تھا کہ اُس نے نبوت کا دعویٰ کیا؟ حالانکہ وہ آپ کی رسالت وقرآن کریم کا منکر نہ تھا اور صحابہ کرامؓ نے اُس سے وہی سلوک کیا جو کفار کے ساتھ کیا جاتا تھا. دیکھو تاریخ طبری جلد 3 صفحہ 244 میں مرقوم ہے. کہ مسیلمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت، قرآنِ مجید اور جمیع اسلامی احکام پر ایمان رکھتا تھا لیکن ختمِ نبوت کے بس یہی مسئلہ کے انکار پر اور مدعی نبوت ہونے کی وجہ سے تمام صحابہؓ اور عامتہ المسلمین نے اُس کو کافر سمجھا اور کسی ایک نے بھی یہ نہ کہا کہ یہ لوگ اہل قبلہ ہیں، کلمہ گو ہیں نماز پڑھتے ہیں، اِن کو کافر نہ کہنا چاہئے. جس طرح چودہویں صدی کے بعض مسلمان کہہ دیتے ہیں. حقیقت یہ ہے کہ وہ نبوت کی شان اور حقیقت سے واقف نہیں رہے. نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین وتنقیص ہوتی ہے تو ہوتی رہے، مگر اپنے تعلقات، بھائی بندی اور خطاب روشن خیالی میں فرق نہ آنے پائے. حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت گوارا ہے، مگر ایک بے رہرو بھٹکے ہوئے دوست کی گوارا نہیں. اِس تعلقِ سفلی نے اُن کے دلوں پر بیجا محبت دنیا واہل دنیا کی مہر کردی ہے جو چند احباب کی خوشنودی کے لیے حق سے ہٹ کر گذارہ کرتے ہیں. ایسے لوگ اگر بہت زیادہ تحقیقِ علمی نہیں رکھتے تو اُن کو اپنے مایۂ ناز شاعر علامہ اقبالؔ ہی سے پوچھنا چاہئے تھا کہ ختم نبوت کے مسئلہ کو آپ نے کیا سمجھا ہے. چونکہ انگریزی خوان طبقہ اقبالؔ مرحوم سے ایک خاص عقیدت رکھتا ہے اور قادیانیوں کی تبلیغ کا شکار بھی یہی زیادہ ہوا ہے. لہذا علامہ اقبالؔ مرحوم کے عقیدۂ ختم نبوت کے متعلق جو خیالات اُن کی اپنی تصنیف رموزِ بیخودی میں بیان ہوئے ہیں. اُن سے مسلمانوں کو روشناس کرادینا غیر مفید نہ ہوگا. دیکھئے رموزِ بیخودی صفحہ 118 پر علامہ مرحوم یوں اظہار عقیدت فرماتے ہیں.

پس خدا برما شریعت ختم کرد بر رسولِ ما رسالت ختم کرد

رونقِ از ما محفلِ ایام را اُو رُسل را ختم و ما اقوام را

خلمتِ ساقی گری برما گذاشت داد ما را آخرین جامے که داشت

"لا نبی بعدی" زاحسانِ خدا ست پردۂ ناموسِ دینِ مصطفے است

قوم را سرمایۂ قوت ازو حفظ سِرّ وحدتِ ملت ازو

حق تعالےٰ نقشِ هر دعوےٰ شکست تا ابد اسلام را شیرازه بست

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ جل وعلیٰ مجدہ، نے ہم مسلمانوں پر اپنی پسندیدہ شریعت اور ہمارے رسولِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ورسالت کو ختم کردیا. دنیا کی رونق قیامت تک اب ہمارے ہی دم سے وابستہ ہے. حضور صلی اللہ علیہ وسلم رسولوں کے ختم کرنیوالے ہیں اور ہم قوموں کے. مالک الملک نے (ساقی گری) توحید کا

جام، اہلِ جہان کو پلانے کا کام ہمارے سپرد کر دیا اور یہ آخری جام (قرآن پاک) بھی ہمیں ہی عنایت فرما دیا. یہ ختمِ نبوت بہت بڑا احسانِ الٰہی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم النبین ہونا ہی آپ کے مذہب کے لیے باعث امتیاز ہے. یعنی آپ کے آخرالانبیاء ہونے ہی کے سبب سے ملّتِ اسلامیہ کو قوت و طاقت حاصل ہوئی اور ہوتی رہے گی، کیونکہ اِسی نکتہ میں ملّت کی وحدت کا راز مضمر ہے. نہ اب کوئی نیا نبی آ سکتا ہے، اور نہ کوئی جداگانہ نئی اُمت پیدا ہو سکتی ہے. گویا آپ کے بعد کسی شخص کو نبی تسلیم کرنا آپ کی صریح توہین و تحقیر ہی نہیں، بلکہ اسلام سے خارج ہو جانا بھی ہے."

نتیجہ

پیغمبری کی حقیقت معلوم ہو جانے کے بعد یہ ماننا پڑے گا کہ پیغمبر روز بروز پیدا نہیں ہوتے اور نہ آتے ہیں. یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر قوم کے لیے ہر وقت ایک پیغمبر موجود ہو. پیغمبر کی زندگی درا صل اُس کی تعلیم و ہدایت کی زندگی ہے، یعنی جب تک اُس کی تعلیم اور ہدایت زندہ ہے، اُس وقت تک گویا وہ خود زندہ ہے. پچھلے پیغمبر اِس لیے مرے ہوئے اعتقاد کیے گئے کہ جو کچھ تعلیم اُنہوں نے فرمائی تھی اہلِ دنیا نے اُسے بدل ڈالا اور جو کتابیں اُن پر نازل ہوئیں یا بالفاظ دیگر وہ لائے اُن میں سے ایک بھی آج اپنی اصلی صورت میں موجود نہیں، اور نہ ہی اُن کے پیرو یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہمارے پاس ہمارے رسول کی لائی ہوئی کتاب اصلی حالت میں موجود ہے. بلکہ اُنہوں نے اپنے انبیاء علیہم السلام کی سیرتوں کو بھی بھلا دیا. یہ الزام نہیں امرِ واقعی ہے کہ سابقہ پیغمبروں میں سے ایک پیغمبر کے بھی صحیح حالاتِ زندگی آج نہیں ملتے اور سوانحِ حیات کا ملنا تو در کنار اتنا بھی پتہ نہیں چلتا کہ وہ کہاں اور کس زمانہ میں پیدا ہوئے، اور انہوں نے کیا کام کئے یا کیسے زندگی گذاری؟ اور یہی اُن کی امتوں کی معنوی موت ہے. مگر سید الکونین، تاجدارِ کائنات، مختارِ شش جہات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں اور "حیات النبی" ہوتے ہوئے اِس طرح بھی زندہ ہیں کہ حضور علیہ السلام کی تعلیم و ہدایت زندہ ہے اور جو کتاب اُنہوں نے زمانہ کے سامنے پیش کی تھی وہ اپنے مکمل متن اور پورے الفاظ کے ساتھ موجود ہے. جس میں ایک حرف، ایک لفظ، ایک نقطہ، ایک زبر، ایک زیر اور ایک ضمہ کا فرق نہیں. آپ کی پاکیزہ زندگی کے حالات آپ کے ارشادات اور آپ کے اعمال و افعال سب کے سب بلا کم و کاست محفوظ اور موجود ہیں. آج 1375ء تیرہ سو پچھتر سال سے زیادہ مدّت گذر جانے کے بعد بھی تاریخ میں اُن کا نقشہ ایسا صاف نظر آتا ہے کہ گویا ہم خود سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو براءالعین دیکھ رہے ہیں. دنیا میں آنے والے اشخاص و افراد میں سے کسی شخص و فرد کی زندگی اتنی محفوظ نہیں جتنی تاریخ میں حضور کی حیاتِ طیبہ محفوظ ہے. دُور نہ جائیں آج بھی جو لوگ بہ ارادہ زیارتِ مدینہ طیبہ حاضر ہوتے ہیں وہ دیکھ سکتے ہیں کہ "مسجد قباء" کے صحن کے عین وسط میں ایک برآمدہ چبوترہ نما بنا ہوا ہے. بظاہر جس کی کوئی حقیقت معلوم نہیں ہوتی اور نہ ہی اُس کا ہونا مسجد کی کسی ضرورت کا حامل نظر آتا ہے

مگر دریافت کرنے پر معلوم ہو جائے گا کہ یہ وہ مقام ہے. جہاں ہجرت کے موقعہ پر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی خود بخود "مامور من اللہ" ہونے کی حیثیت میں بیٹھی تھی اور حضورؐ اِس مقام پر اُتر پڑے تھے. سبحان اللہ! جس اولوالعزم رسولؐ کی اونٹنی کے پاؤں کا نشان چودہ سو سال تک اُس کی اُمت نے گم اور آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا. اُس کی باقی حیات مقدسہ کیونکر غیر محفوظ چھوڑ دی جا سکتی تھی. یوں سمجھیے کہ ہم اپنی زندگی کے معاملہ میں ہر وقت آنحضرتؐ کی زندگی سے ایسا سبق لے سکتے ہیں جس کی ہم کو ضرورت پڑے. یہی اِس امر کی پختہ دلیل ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں اور آپ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد بھی کسی دوسرے نبی کی ضرورت نہیں.

محققین نے لکھا ہے کہ ایک پیغمبر کے بعد دوسرا پیغمبر آنے کی صرف تین وجہیں ہو سکتی ہیں.

1- یا تو پہلے نبی کی تعلیم و ہدایت نابود ہو چکی اور مر گئی ہو اور اُس کو پھر زندہ کرنے کی ضرورت ہو.

2- یا پہلے نبی کی تعلیم مکمل نہ ہو اور اُس میں ترمیم یا اضافہ کی ضرورت ہو.

3- یا پہلا نبی کسی خاص قوم یا طبقہ کے لیے آیا ہو اور اب ایک دوسری قوم کے لیے دوسرے نبی کی ضرورت ہو.

اور یہ تینوں وجوہات ہی اب باقی نہیں ہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و ہدایت زندہ ہے جیسے کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، لہٰذا پہلی وجہ دور ہو گئی کیونکہ نبی کی تعلیم و ہدایت کا زندہ ہونا گویا خود نبی کا زندہ ہونا ہوتا ہے اور جب ایک نبی اپنے عہدہ اور منصب پر موجود ہو تو دوسرا نبی کیسے آ سکتا ہے؟

دوسرا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے دنیا کو اسلام کی مکمل تعلیم دی جا چکی ہے. اب نہ اُس میں کسی کمی بیشی کی ضرورت ہے اور نہ ہی کوئی ایسا نقص باقی رہ گیا ہے. جس کی تکمیل کے لیے کسی نئے نبی کے آنے کی حاجت ہو. لہٰذا دوسری وجہ بھی دور ہو گئی.

تیسرا سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ کسی خاص قوم کے لیے نہیں بلکہ ساری کائنات کے لیے رسول مبعوث ہوئے ہیں اور تمام اہلِ جہان کے لیے آپ کی تعلیم و ہدایت کافی ہے، اِس لیے اب کسی بھی قوم کے لیے نبی آنے کی ضرورت نہیں. اِس سے تیسری وجہ بھی جاتی رہی اور اِسی بنا پر قرآنِ کریم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین فرماتا ہے. یعنی سلسلۂ نبوت کو ختم کر دینے والے. اِس لیے اب دنیا کو کسی نبی و رسول کی حاجت باقی نہیں بلکہ صرف ایسے لوگوں کی ضرورت ہے، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر خود چلیں اور آپ کی تعلیمات کو سمجھ کر خود عمل کریں اور اہلِ دنیا سے کرائیں، فقط.

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم

﴿ قُلْ یٰۤاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا ﴾

''اے محبوب آپ فرمادیں کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف اللہ تعالیٰ کا رسول بھیجا گیا ہوں'' [الاعراف ۷:۱۵۸]

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا ﴾

''یعنی ہم نے آپ کو سب لوگوں کے واسطے خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بھیجا ہے'' [سورۃ سبا ۳۴:۲۸]

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴾

''یعنی ہم نے آپ کو کل جہانوں اور جہان والوں کے لیے رحمت کر کے بھیجا ہے'' [سورۃ انبیاء ۲۱:۱۰۷]

قرآنِ کریم کی اِن ہر سہ آیات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت نبی کریم رؤف ورحیم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت محض ملکِ عرب کے لیے ہی نہ تھی بلکہ آپ کل دنیا کے لیے مبعوث ہو کر تشریف لائے تھے چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دیگر انبیاء اسرائیلیہ کی بعثت صرف اُنہی کی قوم تک محدود تھی. اِس لیے وہ اکثر خدا تعالیٰ کو بھی اسرائیل کا خدا کہہ کر پکارتے تھے لیکن سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا خدا صرف قریش یا عربوں کا خدا نہیں بلکہ کُل جہانوں کا خدا تھا اور ہے اِس لیے اُس کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی کُل دُنیا کی طرف مامور ہو کر تشریف لائے. حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تئیں صرف قریش کے خدا کا رسول نہیں فرمایا بلکہ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْض کا رسول ہونے کا دعویٰ کیا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل کسی سے باوجود خدا کا رسول و نبی ہونے کے بھی وقوع پذیر نہیں ہوا، یعنی معرضِ اِدعا و تکلم میں نہیں آیا.

اب قابلِ غور یہ چیز ہے کہ تمام نبی ایک ایک گروہ، ایک ایک جماعت یا قبیلہ، ایک ایک علاقہ کی طرف مبعوث ہوتے رہے اور اکثر اُن میں سے قوموں کی جہالت و تعدّی کی وجہ سے اپنے اپنے اُس مختصر ماحول میں بھی اپنے تبلیغی مشن کو انجام تک نہ پہنچا سکے. قرآنِ کریم کے ارشاد کے پیشِ نظر یا تو عذاب لا کر اور قوم کو اُس میں مبتلا کر کے تشریف لے گئے یا خود ذبح ہو گئے. برخلاف اِس کے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

اُس مشن کی تکمیل کے لیے جس کی ابتداء آدم علیہ السلام سے اور انتہا مسیح علیہ السلام پر ہوئی، تمام کائنات کے رسول ہوکر تشریف لائے، چونکہ حضور ﷺ کی تشریف آوری سے قبل جداگانہ طور پر جداگانہ رسالت و نبوت کے ماتحت جدا جدا دنیا کے ہر گروہ کو پیغامِ الٰہی مل چکا تھا اس لیے اب اُس سارے قانون کو مجموعی طور پر کل دنیا کے سامنے ترمیم و تنسیخ کے ساتھ اِس طرح پیش کرنے کی ضرورت تھی جس کے بعد تغیر و تبدل فطرتاً ناممکن ہو اور وہ قانونِ الٰہی ایسا جامع مانع ہو کہ قیامت تک اُس میں انسانی زندگی کا کوئی پہلو، انسانیت کی کوئی منزل اور انسان کی ضرورتِ دین و دنیا کا کوئی مسئلہ بیان میں آنے سے رہ نہ گیا ہو اور جہاں انسان و انسانیت کے لوازم کی تکمیل کر دی گئی تھی وہاں قانون بھی اتنا ہی کامل ہونا چاہیے تھا کیونکہ ایک بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو اُس کے کپڑے کا ناپ اُس کے چھوٹے سے قد کے مطابق ہوتا ہے. اُس کی چارپائی، اُس کے برتن، اُس کی ضروریات کا سامان سب کچھ اُس کے ناپ کا ہوتا ہے، اور جوں جوں وہ بڑھتا ہے، ساتھ ساتھ اُس کی ہر چیز کا سائز بھی بڑھتا چلا جاتا ہے. حتیٰ کہ ایک وقت ایسا بھی آجاتا ہے جبکہ اُس کا بڑھاؤ ختم ہو جاتا ہے اور اُس کی ہر شے کا سائز ایک معیّن رہ جاتا ہے. اُس کے بعد نہ اُس کے لباس میں کمی ہوتی ہے نہ بیشی اور وہی ناپ اُس کو ہمیشہ کام دیتا رہتا ہے. بعینہٖ یہی حال دنیا میں اُس قانونِ فطرت کا ہے جو بندوں کے لیے سب سے بعد میں بھیجا گیا. پہلے ایک وقت میں ایک انسان پیدا فرمایا گیا تھا اور اُس کے لیے اور اُس کی اولاد کے لیے بہت چھوٹا سا قانون تھا، کیونکہ اُس کی وسعت ہی اتنی تھی. مثلاً اگر آدم علیہ السلام پر قرآنِ کریم کے حکم کے ماتحت یہ فرض کر دیا جاتا کہ ایک ہی ماں باپ کی پیدا شدہ ذرّیت کا نکاح آپس میں حرام اور بہن بھائی کا رشتہ ممنوع ہے. تو آدم علیہ السلام کہاں سے بچوں کا ماموں لاتے، اور کس جگہ سے اُن کا چچا پیدا کرتے؟ جن کے لڑکے اور لڑکیاں اُن کی اولاد کے لیے حلال ہوتے.

لہٰذا فطرتِ انسانیہ کے لیے جو ابتدائے عالم سے چھوٹے پیمانے پر نافذ ہونا شروع ہوا تھا، انسان کی بہتات کے ساتھ ساتھ اُس کی وسعت ہوتی گئی اور ہر زمانہ میں اُس کی وسعت اور فضا کے مطابق قوانین کا نفوذ ہوتا رہا. لہٰذا وہ وقت آ گیا کہ یہ طالبِ علم ابتدائی تعلیم سے گذر کر مختلف استادوں کے سامنے زانوائے ادب کرتا ہوا ایک سب سے بڑے استاد (ہیڈ ماسٹر) کی ضرورت کو محسوس کرنے لگا اور اُس کی ابتدائی تعلیم نے ایک انتہائی ڈگری کا تقاضا کرنا چاہا، جس کے بعد اُس کی تعلیم ایسی کامل ہو جائے کہ پھر اُس کو کسی استاد، کسی کتاب اور کسی تعلیم کی ضرورت نہ رہے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور زمانے نے دیکھا کہ بالآخر وہ دنیا کا استادِ کامل اور اُس کالج کا مدرس، اُس آخری قانون کے ساتھ دنیا پر ظہور فرما ہوا، جس کی تعلیم نے ابنِ آدم کو ہر تعلیم سے اور جس کی کتاب نے انسان کو ہر کتاب سے بے نیاز کر دیا.

چونکہ ہر زمانہ میں انبیاء علیہم السلام ایسے وقت پر مبعوث ہوتے رہے تھے جب دنیا معصیت کاریوں، بدکرداریوں کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں خدائے قدوس اور اُس کی پاک تعلیمِ ہدایت کو بھول چکی ہوتی تھی. لہٰذا اُس آخری نبی، آخری اُستاد، آخری رسول، آخری ہادی ﷺ کی بعثت پر بھی دیکھنا ہے کہ اس دنیا کا کیا حال تھا اور حضور ﷺ نے کیوں کر تمام دنیا کی راہنمائی کا بیڑہ اٹھایا اور کیونکر اہل زمانہ کو اپنی صداقت منوائی، تاکہ معترض یہ نہ کہے کہ سابقہ انبیاء و مرسلین کی بوئی ہوئی کھیتی کو کاٹا گیا ہے یا اُن کی بنائی ہوئی زمین میں بیج ڈال لیا گیا.

حضور ﷺ کی بعثت پر دنیا کا رنگ

یہ تھا کہ دو انسانوں کے درمیان تبادلۂ خیال کے وسائل قطعاً مفقود، قوموں اور ملکوں کے درمیان تعلقات کے ذرائع بالکل مسدود، انسان کی معلومات محدود اور خیالات نہایت تنگ تھے. وہم و توحش کا غلبہ تھا. جہالت کی تاریکی میں نہ مطابع، نہ اشاعت خانے، نہ مدرسے، نہ کالج، نہ اخبارات، نہ رسالے، نہ کتابیں، نہ اُن کی اشاعت تھی. بت پرستی، انسان پرستی، سورج پرستی، آتش پرستی، حیوان پرستی غرضیکہ بے شمار پرستشوں کا ابنِ آدم پر قبضہ تھا اور نام نہاد مذہبی پیشواؤں کی زبان ہی مذہب کا سارا ڈھانچہ تھی. اُس زمانے کے ایک عالم کی معلومات بعض حیثیات سے موجودہ زمانے کے ایک عامی کی نسبت بھی کم تھیں. اُس وقت کا ایک نہایت روشن خیال آدمی آج کل کے ایک تاریک خیال سے بھی زیادہ تاریک خیال تھا. جو معلومات آج ہوش سنبھالتے ہی ایک بچے کو حاصل ہو جاتی ہیں اُن کے لیے اُس زمانہ میں سینکڑوں میل کی مسافتیں طے کرنا پڑتی تھیں. جن باتوں کو آج دنیا خرافات سے تعبیر کرتی ہے، وہ اُس زمانہ کے حقائق تھے. جن افعال و اعمال کو آج بے ڈھب اور وحشیانہ سمجھا جاتا ہے، وہ اُس زمانہ کے معمولات تھے اور انسان کی عجائب پرستی اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ وہ کسی چیز میں اُس وقت تک کوئی صداقت، کوئی تقدیس، کوئی پاکیزگی تسلیم ہی نہ کرسکتا تھا جب تک وہ فوق الفطرت نہ ہو، خلافِ عادت نہ ہو، غیر معمولی نہ ہو اور انسان خود کو اِس قدر رذلیل سمجھتا تھا کہ اُس کا خدارسیدہ ہونا اور کسی خدارسیدہ ہستی کا انسان ہونا اُس تصور کی رسائی سے بہت دور تھا.

پھر ان حالات میں جبکہ زمین کا ہر کونہ ظلمت و جہالت میں ڈوبا ہوا ہو، کون ہوسکتا تھا کہ مشعلِ ہدایت روشن کر سکے اور اگر کسی نے کی اور کامیاب ہوگیا، تو اُس کے متعلق کیا کہا جائے گا. اِس زمین پر تو ہدایت کا نہ کوئی ذریعہ رہا تھا نہ روشنی، اور اگر روشنی حاصل کرنے کی کوشش بھی کی جاتی تو اپنا چراغ جلانے کے لیے توراۃ و انجیل، ویدوں اور ژند کی جانب رجوع کیا جاتا جو مشعلیں خود ہی بجھ چکی ہوئی تھیں. اب تو صرف آسمان ہی سے روشنی کے نمودار ہونے کی توقع ہوسکتی تھی، جو ہوئی، اور اللہ کریم نے

ایک پیکرِ نور کو نورِ ہدایت دیکر دنیا بھر کی ہدایت پر مامور فرمایا. جس نے انسان کو شدید ضلالت و گمراہی میں دیکھ کر آیاتِ الٰہی سنائیں. اُن کو اخلاقِ ذمیمہ سے پاک کیا. اُنہیں قرآنی اوامر و نواہی سمجھائے اور آئین و عمل کی تعلیم دے کر نیابتِ الٰہی کا اہل بنا دیا.

یہی وجہ ہے کہ اُس کی لائی ہوئی کتاب قانون اور اُس کے تعلیم و ہدایت یافتہ غلام، اِس کو ساری کائنات کا رسول اور سرورِ عالم ﷺ کہتے ہیں، جس کے عام معنی سید جہان، سرورِ کائنات اور سرورِ زمانہ ہوسکتے ہیں اور ہندی زبان میں اُس کو ''جگت گورو'' کے جامع الفاظ میں ذکر کیا جاسکتا ہے.

گو بظاہر یہ بہت بڑا خطاب ہے، جس کو حضور ﷺ کے متعلق سننے والا محوِ حیرت ہو جاتا ہے مگر اُس کو یہ پتہ نہیں کہ جس عالی قدر، بلند پایہ، اولوالعزم و برگزیدہ ہستی کو یہ خطاب دیا گیا ہے اُس کی عملی حیثیت اور اُس کا کارنامہ حیات واقعی ایسا ہے؟ جس کو ''سرورِ کائنات'' یا ''سرورِ عالم'' کہنا مبالغہ نہیں بلکہ عین حقیقت ہے، اور یہ خطاب اُس کے تابعداروں کی خوش اعتقادی کا نتیجہ نہیں بلکہ اُس کے مبعوث فرمانے والے خدائے واحد نے اُس کو خود عطا فرما رکھا ہے. قبل اِس کے کہ اِس خطاب کی حقیقتِ اعلیٰ پر کچھ کہا جائے، قرآن کریم کی اُن آیات کی مختصر تشریح کر دینا ضروری ہے، جن میں اُس پیکرِ نور ﷺ کو اِس خطاب سے مخاطب فرمایا گیا اور نوازا گیا ہے.

آیت اول: ﴿ وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴾ ''یعنی ہم نے تجھ کو کل عالموں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے''. جس کا مطلب یہ ہوگا کہ حضورؐ جب تمام جہانوں اور جہانیوں کے لیے رحمت ہیں تو آپ کی دعوت بھی تمام کائنات کے لیے ہی ہوگی. کسی ایک مخصوص طبقہ، یا علاقہ، یا گروہ، یا قوم، یا جماعت کے لیے نہیں ہوسکتی. جس قدر آپ کے درجات کی وسعت ہے، اُسی قدر دعوت و تبلیغ کے لیے بھی وسیع میدان لازم آئے گا. لہٰذا جن ہو یا انس، مومن ہو یا کافر، حاضر ہو یا غائب، زندہ ہو یا مردہ، ماقبل ہو یا مابعد، آپ کی رحمت مطلقہ، تامہ، عامہ، کاملہ، شاملہ، جامعہ، محیط بجمیع مقیدات، رحمتِ غیبیہ، شہادتِ علمیہ، عینیہ، وجودیہ، شہودیہ، سابقہ، لاحقہ وغیرِ ذالک، تمام جہانوں کے لیے، عالمِ ارواح ہوں یا عالمِ اجسام، ذوی العقول ہوں یا غیر ذوی العقول سب کے لیے حضور ﷺ کی ذات رحمت ہے اور جب تمام عالموں کے لیے رحمت ہونا لازم ہوا تو لامحالہ آپ کی ذات سب سے افضل اور آپ کی دعوت سب کے لیے ثابت ہوئی.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ حضور ﷺ کا رحمت ہونا عام ہے. ایمان والے کے لیے بھی اور اُس کے لیے بھی جو ایمان نہ لایا. مومن کے لیے آپ دنیا و آخرت دونوں میں رحمت ہیں اور جو ایمان نہ لایا. اُس کے لیے آپ صرف دنیا میں رحمت ہیں کہ آپ کی بدولت اُس کے حق میں تاخیرِ عذاب ہوئی اور خسف و مسخ اور استیصال کے عذاب بھی اٹھا دیئے گئے.

یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کسی عجمی کو اس طرح نہیں دھتکارا جس طرح یسوع ؑ نے کنعان کی ایک عورت کو یہ کہہ کر دھتکار دیا تھا کہ میں تو اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کی طرف بھیجا گیا ہوں اور نہ ہی آنحضرت ﷺ نے مسیح علیہ السلام کی طرح غیر اسرائیلیوں کو ''کتے'' کہکر پکارا [متی 15 باب 26] بلکہ آپ نے اپنے دعوائے رحمۃ اللعالمینی کے ماتحت ہر اسود واحمر، ہر سرخ وسفید، ہر ادنی واعلیٰ، ہر عربی و عجمی، ہر اپنے پرائے کے ساتھ وہی رأفت و رحمت فرمائی جو حضور ﷺ کا حصہ اور حضور ﷺ ہی کے شایانِ شان تھی. جو بھی حاضرِ دربار ہوا، اُس نے دامنِ مراد بھرا اور کوئی خاسر و نامراد نہیں گیا. گویا: شعر

نرفت ''لا'' بزبانِ مبارکش ہرگز
مگر در ''اشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ''

آیت دوئم: ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا ﴾ ''یعنی ہم نے تجھ کو اے محبوب سب لوگوں کے واسطے خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بھیجا ہے''. اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کی رسالت عامہ ہے اور تمام انسان گورے ہوں یا کالے، عربی ہوں یا عجمی، پہلے ہوں یا پچھلے سب اُس کے احاطہ میں ہیں اور آپ سب کے رسول ﷺ اور وہ سب آپ کے امتی ہیں چنانچہ بخاری و مسلم کی حدیث ہے کہ سیدِ عالم ﷺ نے فرمایا کہ مجھے پانچ چیزیں ایسی عطا فرمائی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دی گئیں. (۱) ایک ماہ کی مسافت کے رعب سے میری مدد کی گئی (۲) تمام زمین میرے لیے مسجد اور پاک بنا دی گئی کہ جہاں میرے اُمتی کو نماز کا وقت آئے نماز پڑھ لے. (۳) میرے واسطے غنیمتیں حلال کی گئیں جو مجھ سے پہلے کسی کے لیے حلال نہ تھیں. (۴) مجھے مرتبۂ شفاعت عطا فرمایا گیا اور (۵) باقی انبیاء خاص خاص اپنی قوموں کی طرف مبعوث فرمائے گئے تھے مگر میں تمام انسانوں کی طرف بھیجا گیا ہوں. اِن کے علاوہ احادیث میں آپ کے بے شمار فضائلِ مخصوصہ کا بیان ہے، جن میں سے ایک آپ کی رسالتِ عامہ ہے، جو تمام جن وانس کو شامل ہے. الغرض حضور ﷺ تمام مخلوقات کے لیے رسول ہیں اور یہ مرتبہ آپ ہی کی ذات کے لیے خاص ہے.

سورۂ فرقان کی پہلی آیت سے بھی اسی مفہوم کی وضاحت ہوتی ہے کہ آپ تمام خلق کی طرف رسول مبعوث ہوئے ہیں، قطع نظر اس سے، کہ وہ مخلوق انسان ہوں یا جن، ملائکہ ہوں یا دوسری مخلوقات، سب آپ کے اُمتی ہیں کیونکہ عالم، ''ماسویٰ اللہ'' کو کہتے ہیں اور ماسویٰ اللہ میں سب مخلوق شامل ہے. بعض مفسرین نے ملائکہ کو اِس دعوتِ نبوت سے مستثنیٰ کیا ہے. جو بالکل بے دلیل اور بعید از قیاس و تاویل ہے.

علاوہ ازیں مسلم شریف کی ایک حدیث میں ہے ((اُرْسِلْتُ اِلَى الْخَلْقِ كَآفَّةً)) یعنی

میری رسالت تمام خلقت کے لیے ہے اور علامہ علی قاریؒ نے مرقات میں اور امام قسطلانیؒ نے مواہب لدنیہ میں اِسی عقیدہ کو بڑی شرح وبسط کے ساتھ لکھا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کیونکہ خود حضور ﷺ ابتدا سے ہی اپنی بعثت کو عالمگیر خیال فرماتے تھے اور جب مکہ میں رہنے والے بعض بیرونی لوگ آپ پر ایمان لائے تو آپ نے اُن کو اُن ملکوں کے سابقین کہہ کر پکارا جن ممالک کے وہ رہنے والے تھے. اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو اُن ممالک سے متاخرین کی امید اور بڑی بڑی فصلیں کاٹنے کی توقع تھی. چنانچہ آپ نے حضرت بلالؓ کا نام حبشہ کا پہلا آدمی رکھا اور حضرت صہیبؓ کا ''سابق الروم'' یعنی رومیوں میں سے ایمان پر پہلا آنے والا چونکہ یہ لوگ حضور ﷺ پر شروع شروع ہی میں ایمان لائے تھے. اس لیے جو القابات آپ نے اُن کو دیئے اُن سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ آپ اپنے تئیں صرف عرب ہی کا نبی نہیں سمجھتے تھے بلکہ آپ کو علم اور یقین تھا کہ آپ ساری دنیا و مافیھا کے لیے مبعوث فرمائے گئے ہیں اور آپ کا یہ مقدس دین نہ صرف عرب ہی قبول کریں گے بلکہ اِس کی اشاعت دور دراز دیگر ممالک میں بھی ضرور ہوگی.

اس سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ اسلام اور دیگر مذاہب میں من حیث التبلیغ زمین وآسمان کا فرق ہے. اسلام کل دنیا کی طرف آنے کا مدعی ہے اور دیگر مذاہب قبیلوں، اور جماعتوں اور گوتوں و پرنوں کی حدود کے پابند ہیں. بالخصوص عیسائیت تو اعلان کرتی ہے کہ اپنے بچوں کی روٹی کتوں کے آگے ڈالنا مناسب ہی نہیں اور جب اسرائیل کے بچوں کے ہاں جگہ نہیں ملتی اور اسرائیلی بچے مسیح کی لائی ہوئی روٹی لینے سے انکار کرتے ہیں تو مجبوراً وہی روٹی غیر اسرائیلی کتوں کے آگے ڈالنی پڑتی ہے. لیکن قابلِ غور یہ بات ہے کہ آنحضرت نبی کریم ﷺ نے مسیح علیہ السلام کی طرح دنیا کے بسنے والوں میں سے، نہ کسی کو کتا فرمایا اور نہ بِلا، بلکہ روئے زمین کی تمام اقوام کو اپنے ''بچے'' ہی سمجھا اور اپنی رسالت کو تمام جہانوں کے لیے ہی رحمت ظاہر فرمایا.

آیت سوئم: ﴿ قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ﴾ ''یعنی اے محبوب آپ فرمادیں کہ اے انسانوں میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں'' اور حضور ﷺ نے آیت شریفہ کے ماتحت نرا دعویٰ ہی نہیں کیا بلکہ عملاً ثابت کر دیا کہ حضور ﷺ کی رسالت تمام لوگوں کے لیے تھی، جو حضور ﷺ کی بعثت کے وقت میں بصورت کائنات ارضی وسماوی موجود تھے. چنانچہ آپ کی یہ حقیقت آپ کی تبلیغی جدوجہد سے روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے. مثلاً ابتداءِ تبلیغ میں جن مشکلات کا سامنا حضور ﷺ کو کرنا پڑا اور جس شقاوت وقساوت، جس درندگی و بہیمیت، جس فرعونیت ونمرودیت سے آپ دوچار ہوئے اُس کی نظیر دنیا بھر کی تاریخ میں نہیں ملتی. کسی کو تو ایک فرعون ایک نمرود سے واسطہ پڑا ہوگا لیکن یہاں تو مکہ وطائف کا ہر رئیس اور جنگل میں دو چار نخلستان رکھنے والا ہر جاگیر دار بجائے خود فرعون اور نمرود تھا. دوسرے انبیاء کے مقابلے میں ایک ''سردار آدمی'' کی ''ہاں!'' یا ''نہ!'' پر، قوم کی قوم کا

فیصلہ تھا، لیکن مکہ میں یہ حالت تھی کہ لوگ اسلام قبول کرنا چاہتے تھے مگر نہیں کر سکتے تھے اور یہ حالات اِس قدر پیچیدہ اور اِس قدر الجھے ہوئے اور اتنے نازک تھے کہ اُن سے عہدہ برآ ہونا قریباً قریباً ناممکن تھا۔ یہاں کی مخالفت میں صرف مذہبی رنگ ہی دخیل نہ تھا بلکہ سیاست، اقتصاد، تاریخ، خاندانی روایات، رقابت اور سیادت۔ صد ہزار موانع اور رکاوٹیں تھیں۔ ایک پتھر راستہ سے ہٹایا جاتا تو دوسرا اُس سے زیادہ وزنی آگے آجاتا۔ یہ کیفیت ایک جگہ مکہ اور طائف کی تھی۔ تبلیغ کے میدان میں جو جو مصائب آپ اور آپ کے غلاموں پر آئے، اُس خونچکاں داستان کا یہاں بیان کرنا مقصود نہیں بلکہ یہ دکھانا مقصود ہے کہ اُن مظالم کے دور میں عرب سے باہر اسلام کا پھیلنا۔ اِس آیت کریمہ کی منہ بولتی تفسیر ہے۔

جوں ہی قریش کے ساتھ جنگوں سے آپ کو فرصت ملی اُسی وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرب وجوار کے لوگوں کو دعوت دینی شروع کر دی۔ اگرچہ آپ کا بہت سا وقت اپنے بیشمار دشمنوں کے حملوں کی مدافعت میں صرف ہوا، تاہم ساتھ ساتھ مختلف قوموں میں اسلام کی منادی کرنے کے لیے واعظ تیار کرتے رہے۔ بہت سے ایسے صحابہؓ تھے جن کو اسی غرض کے لیے حضور ﷺ نے قرآنِ کریم حفظ کرایا تھا تاکہ دوسروں کو سنا کر تبلیغ کر سکیں اور جو صحابہؓ رجیع اور بیر معونہ پر شہید ہوئے تھے، وہ سب مبلغ اور حافظِ قرآن تھے۔ حضور ﷺ نے حضرت زید بن ثابتؓ کو ہوشیار دیکھ کر یہ خواہش ظاہر فرمائی کہ بیرونِ ممالک کی تبلیغ کے پیش نظر وہ عبرانی وسریانی زبانیں بھی سیکھ لے۔ ان تمام باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ حضور ﷺ اشاعت کو صرف عرب تک ہی محدود رکھنا نہیں چاہتے تھے بلکہ غیر ممالک میں بھی اپنے واعظ اور سفیر بھیج کر یہ ثابت فرما دیا کہ اسلام ساری دنیا کا مذہب ہے اور ساری دنیا میں پھیل کر رہے گا چنانچہ اسلام مشرق ومغرب، شمال وجنوب ہر سمت میں پہنچا۔ جس کے روشن نقوش آج بھی ظاہر وباہر ہیں۔

ایک محققانہ نظریہ

اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے۔ وہ آخری ہادی کے مبعوث فرمانے والے خدائے واحد کے ارشادات تھے۔ اب تحقیق کے طور پر چند باتیں اور ذہن نشین کیجیے، یعنی محققانہ طور پر غور فرمائیے کہ اگر کوئی ہستی تمام کائنات کی راہنما اور پھر قیامت تک کے لیے ایک ہی راہنما ہونے کی دعویدار ہو، تو کیا اُس کا یہ دعویٰ محض اُس کے ارشاد کے ماتحت تسلیم کر لینے کی ضرورت ہوگی یا اُس کو اُس دعویٰ کا مدعی ہونے اور تسلیم کرنے کے لیے کچھ عقلی ونقلی دلائل درکار ہوں گے؟ اگر مؤخر الذکر قول صحیح ہے تو غور کیجیے کہ وہ دلائل کیا ہیں، جن کے ماتحت ایسی مدعی ہستی کی تصدیق ہو سکتی ہے۔

1- کسی شخصیت کو تمام جہان کا ہادی وراہنما قیامت تک ماننے کے لیے سب سے پہلی شرط یہ ہونی چاہیے کہ اُس کا تمام تبلیغی عمل کسی خاص قوم یا نسل یا طبقہ کی بھلائی کے لیے مختص

نہ ہو بلکہ دنیا بھر کے انسانوں کی بھلائی کے لیے یکساں نظر آئے۔

2- اُس دنیا بھر کے لیے (مدعی راہنما یا لیڈر) نے وہ اصول پیش کیے ہوں۔ جو تمام جہان والوں کی راہنمائی کرتے ہوں اور اُن میں انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کے اہم مسائل کا حل بھی ہر وقت موجود ہو۔

3- ایسی مدعی ہستی کی راہنمائی کسی خاص وقت یا زمانہ کے لیے مخصوص نہ ہو بلکہ اُس کے وضع کردہ اصول ہر زمانہ اور ہر حال میں یکساں مفید، یکساں صحیح اور یکساں قابلِ قبول و پذیرائی ہوں۔

4- مدعی نے صرف چند اصول پیش کر دینے پر اکتفانہ کیا ہو بلکہ اپنے پیش کردہ اصولوں کو اپنی زندگی میں عملاً جاری کر کے دکھلا دیا ہو اور اُن کی بنا پر ایک جیتی جاگتی سوسائٹی بھی پیدا کر دی ہو۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ دنیا میں جس قدر راہنما ہوئے ہیں کیا اُن میں سے کسی میں یہ چاروں شرطیں پائی گئی ہیں؟ اِس کسوٹی پر عین حقیقت کے ماتحت بلا مبالغہ صرف ایک ہی ہستی ثابت ہو سکے گی، جس کو صرف مسلمان ہی ''سرورِ عالم ﷺ'' کہتے ہیں اور اِس سے یقیناً انکار بھی نہ ہو سکے گا کہ حضور ﷺ سے قبل کسی راہنما کے لیے اِس خطاب کا ذکر تک بھی کتبِ مذاہب میں نہیں آیا کیونکہ اُن تمام بزرگوں کی تبلیغ و دعوت کا دائرہ بالکل محدود تھا اور اُن میں سے خود بھی کسی کو خیال تک نہیں ہو سکتا تھا کہ اُس کی حیثیت دنیا بھر کے ہادی و راہنما کی ہے یا ہو سکتی ہے۔

رہی یہ بات کہ کیا مسلمان خوش عقیدتی کے ماتحت تو اِس کو تسلیم نہیں کرتا؟ اِس کا جواب نہایت کورا اور نفی میں ہوگا کیونکہ ایک محبِّ وطن یا ایک قوم پرست لیڈر کی آپ اس حیثیت سے جتنی چاہیں قدر کر لیں کہ اُس نے اپنے لوگوں کی بڑی خدمت کی لیکن اگر آپ اُس کے ہم وطن یا ہم قوم نہیں ہیں تو وہ بہر حال آپ کا لیڈر نہیں ہو سکتا۔ جس شخص کی محبت، خیر خواہی اور کارگزاری سب کچھ اُس کے اپنے وطن یا قوم تک محدود ہو، اُس کو کسی دوسرے وطن یا کسی دوسری قوم کا فرد کسی صورت میں بھی اپنا راہنما اور خیر خواہ ماننے کے لیے تیار نہیں۔ مثلاً ایک مصلح قوم و رہبر کی کارگزاری ساری کی ساری سپین یا چین تک ہی موقوف ہو تو ایک ہندوستانی کو اِس سے کیا واسطہ کہ وہ اُس کو اپنا لیڈر تسلیم کرے، بلکہ اگر وہ اپنی قوم کو دوسروں سے افضل ٹھہراتا ہو اور دوسروں کو گرا کر اپنی قوم کو بڑھانا چاہتا ہو جیسا کہ فی زمانہ ہندوستان میں ہندو کانگرسی لیڈروں کا شیوہ ہے۔ تو دوسری اقوام یقیناً اُن سے نفرت کرنے پر مجبور ہوں گی تمام اقوام کے انسان ایک شخص کو اپنا راہنما صرف اُسی صورت میں مان سکتے ہیں، جب اُس کی نگاہ میں تمام اقوام اور تمام افراد یکساں ہوں اور وہ سب کا ایسا یکساں ہمدرد و بہی خواہ ہو کہ اپنی خیر خواہی میں کسی طرح بھی ایک کو دوسرے

پر ترجیح نہ دے.

اب آپ اِس پہلی شرط پر دنیا بھر کے راہنماؤں کی زندگیوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک نظر محبوبِ خدا محمد رسول ﷺ کی حیاتِ طیبہ پر بھی ڈالیں تو ایک ہی نظر میں آپ محسوس کرنے لگیں گے کہ یہ کسی قوم پرست یا محبِ وطن کی زندگی نہیں ہے، بلکہ ایک محبِ انسانیت اور ایک عالمگیر ہمدردانہ نظریہ رکھنے والے کامل ترین انسان کی زندگی ہے، جن کی نگاہ میں تمام انسان یکساں حیثیت رکھتے تھے. کسی خاندان، کسی نسل، کسی طبقہ، کسی قوم، کسی ملک کے خاص مفاد سے اُنہیں کوئی دلچسپی نہ تھی. امیر اور غریب اونچ اور نیچ، کالے اور گورے، عرب اور غیر عرب، مشرقی اور مغربی، سامی اور آرین. سب کو وہ اس حیثیت سے دیکھتے تھے کہ یہ سب ایک ہی انسانی نسل کے افراد اور ایک ہی باپ کی اولاد ہیں. اُن کی زبان سے تمام عمر کوئی ایک لفظ یا ایک فقرہ بھی ایسا نہیں نکلا اور نہ زندگی بھر میں کوئی کام انہوں نے ایسا کیا جس سے یہ شبہ کیا جاسکتا ہو کہ اُنہیں ایک طبقۂ انسانی کے مقابلہ میں کسی دوسرے طبقۂ انسانی کے ہر مفاد سے زیادہ تعلق ہے. یہی وجہ ہے کہ اُن کی حیاتِ مقدّس ہی میں حبشی، ایرانی، رومی، مصری، عربی، ابراہیمی، اسرائیلی، اِسی طرح اُن کے محبّ اور رفیق کار بنے اور دنیا کے ہر گوشے میں ہر نسل اور قوم نے اُسی طرح اُن کو اپنا راہنما تسلیم کیا، جس طرح اُن کی اپنی قوم اُن پر ایمان لائی. کیا یہ حضور کی کامل ترین انسانیت اور رحمۃ اللعالمینی ہی کا کرشمہ نہیں کہ آج آپ ایک ہندوستانی کو اُس ہستی کے صرف نام پاک کی عظمت و عزت پر قربان ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، جس کا آج سے صدیوں پہلے عرب میں ظہور ہوا تھا.

اب دوسری اہم شرط کو لیجیے جس میں ایسے اصولوں کا تذکرہ ہے جو تمام دنیا کے انسانوں کی راہنمائی کرتے ہوں اور جن میں انسانی زندگی کے تمام اہم مسائل کا حل موجود ہو.

چونکہ لیڈر کے معنی ہی راہنما کے ہیں اور لیڈر کی ضرورت ہوتی ہی اِس لیے ہے کہ وہ فلاح اور بہتری کا راستہ بتلائے. لہٰذا دنیا بھر کا لیڈر وہی ہوسکتا ہے جو ساری دنیا کے انسانوں کو ایسا طریق اور گر بتائے جس میں سب کی فلاح ہو، چنانچہ تاجدارِ کائنات محمد رسول ﷺ ہی کی ایک وہ ذاتِ ستودہ صفات ہے، جنہوں نے مخصوص قوموں اور مخصوص ملکوں کے وقتی اور مقامی مسائل سے بحث کرنے میں اپنا قیمتی وقت ضائع نہیں فرمایا بلکہ اپنی پوری قوت دنیا میں انسانیت کے اس سب سے بڑے مسئلے کو حل کرنے پر صرف کردی، جس سے تمام انسانوں کے سارے چھوٹے چھوٹے مسائل خود ہی حل ہو جاتے ہیں.

وہ بڑا مسئلہ کیا ہے

صرف یہ کہ کائنات کا نظام فی الواقع جس اصول پر قائم ہے، انسان کی زندگی کا نظام بھی اُس کے مطابق ہو کیونکہ انسان اِس کائنات کا ایک جزو ہے اور جزو کی حرکت کا کُل کے خلاف ہونا ہی خرابی کا باعث

ہے. اگر آپ اِس بات کو مفصل طور پر سمجھنا چاہتے ہیں تو اِس کی آسان صورت یہ ہے کہ اپنی نگاہ کو ذرا کوشش کر کے زمان اور مکان کی قیود سے آزاد کر لیجیے اور پورے کرۂ ارضی پر اِس طرح نگاہ ڈالیے کہ ابتداء سے آج تک اور آئندہ غیر محدود زمانہ تک بسنے والے تمام انسان بیک وقت آپ کے تصور میں آپ کے سامنے آ جائیں. پھر دیکھئے کہ انسان کی زندگی میں خرابی کی جتنی صورتیں پیدا ہوئی ہیں یا ہونی ممکن ہیں. اُن سب کی بنیادی چیز کیا ہے یا کیا ہو سکتی ہے؟ اِس سوال پر آپ جتنا غور کریں گے اور جتنی چھان بین سے کام لیں گے، حاصل یہی نکلے گا کہ انسان کی خدا سے بغاوت تمام خرابیوں کی جڑ ہے. اِس لیے کہ خدا سے باغی ہو کر انسان لازمی طور پر دو صورتوں میں سے کوئی ایک ہی صورت اختیار کرتا ہے. یا تو وہ اپنے آپ کو خود مختار اور غیر ذمہ دار سمجھ کر من مانی کاروائیاں کرنے لگتا ہے اور یہ چیز اُس کو ظالم بنا دیتی ہے، یا پھر وہ خدا کے سوا دوسروں کے حکم کے آگے سر جھکانے لگتا ہے اور اِس سے دنیا میں فساد کی بیشمار صورتیں پیدا ہوتی ہیں. اِس کا سیدھا اور صاف جواب یہ ہے کہ ایسا کرنا چونکہ حقیقت کے خلاف ہے اِس لیے اِس کا نتیجہ برا نکلتا ہے. یہ ساری کائنات فی الواقع خدائے قدوس کی سلطنت ہے. زمین، سورج، چاند، روشنی، ہوا، پانی سب خداوند عالم کی مِلک ہیں اور انسان اِس سلطنت میں پیدائشی بندے کی حیثیت رکھتا ہے. یہ پوری سلطنت جس نظام پر قائم ہے اور جس نظام پر چل رہی ہے اگر انسان اُس کا ایک جزو ہونے کے باوجود اس سے مختلف رویہ اختیار کرے تو وہ لامحالہ تباہ کن نتائج پیدا کرے گا. انسان کا یہ سمجھنا کہ مجھ سے اوپر کوئی مقتدرِ اعلیٰ نہیں ہے، جس کے سامنے مجھے جواب دہ ہونا ہے واقعہ کے خلاف ہے. اِس لیے جب وہ مختار بنکر غیر ذمہ دارانہ طریقہ پر کام کرتا ہے اور اپنا قانونِ زندگی آپ گھڑ لیتا ہے تو اِس کا نتیجہ برا نکلتا ہے. پھر اسی طرح اُس کا خدائے واحد کے سوا کسی اور کو صاحبِ اختیار و اقتدار تسلیم کر لینا اور اُس سے خوف یا لالچ رکھنا اور اُس کی آقائی و مولائی کے آگے جھک جانا بھی حقیقت کے خلاف ہے کیونکہ فی الحقیقت اس پوری کائنات میں خداوند جل مجدہ کے سوا کوئی بھی یہ حیثیت نہیں رکھتا کہ اُس کو معبود، مسجود اور موجود مانا جائے. لہٰذا اِس کا نتیجہ برا ہی نکلتا ہے کیونکہ صحیح نتیجہ برآمد ہونے کی صورت اِس کے سوا اور کوئی نہیں ہے کہ زمین اور آسمان میں جو حقیقی حکومت ہے انسان اُسی کے سامنے سر جھکا دے. اپنی خودی و خودسری کو اُس کے آگے ڈال دے. اپنی اطاعت اور بندگی کو اُس کے لیے خاص کر دے اور اپنی زندگی کا ضابطہ و قانون خود بنانے یا دوسروں سے قبول کرنے کی بجائے اُسی مالک الملک سے قبول کرے.

تیسری لازمی شرط میں یہ مذکور ہوا تھا کہ ایسے مدعی کی راہنمائی کسی خاص زمانے کے لیے نہ ہو بلکہ ہر زمانے اور ہر حال میں یکساں مفید اور یکساں قابلِ پیروی ہو اور اگر وہ ایسی نہ ہو یا کسی مابعد وقت میں آ کر اس میں اختلاف پیدا ہو جائے اور کسی وقت میں وہ عوام کے استفادہ کے قابل نہ پائی جائے تو وہ اپنے دعوے کی آپ تردید کرے گا کیونکہ جس راہنما کی راہنمائی ایک زمانہ میں کارآمد اور دوسرے

زمانہ میں بیکار ثابت ہو، وہ دنیا بھر کا راہنما کہلانے کا مستحق نہیں. دنیا بھر کا راہنما اور لیڈر تو وہی ہو سکتا ہے کہ جب تک دنیا قائم رہے اُس کی راہنمائی کے پیش کردہ قوانین بھی ابدی طور پر کارآمد رہیں، اور یہی وہ بنیادی چیز ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک زندگی کے سوا دوسری کوئی زندگی پیش نہیں کر رہی، کیونکہ وہ حیاتِ مقدسہ مشرق و مغرب کی قید سے آزاد ہے اور روئے زمین میں جہاں جہاں انسان آباد ہیں، اُن کی بگڑی کو بنانے کے لیے صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ایک زندگی اسوۂ حسنہ کا کام دے سکتی ہے اور آج سے ڈیڑھ ہزار برس پہلے آپ کی راہنمائی جتنی اور جس طرح کارگر تھی اتنی ہی آج بھی ہے اور اتنی ہی ہزار ہا برس بعد بھی ہوگی.

اب صرف ایک چوتھی لازمی شرط قابلِ غور باقی رہ گئی ہے. جس کا مطلب یہ ہے کہ مدعی صرف اصول پیش کرنے پر ہی اکتفا نہ کرے بلکہ وہ زندگی میں عملاً جاری کر کے بھی دکھائے اور اُن کی نبیاد پر ایک جیتی جاگتی سوسائٹی پیدا کر دے کیونکہ محض اصول پیش کرنے والا زیادہ سے زیادہ ایک مُفکّر کہا جاسکتا ہے. لیڈر یا راہنما نہیں ہو سکتا. لیڈر یا راہنما ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے اصولوں کو عملی جامہ پہنا کر دکھائے اور یہ ایک قابلِ انکار حقیقت ہے کہ رب العزت کے آخری نبی حضرت سید الانبیاء محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف خیالی نقشہ ہی پیش نہیں فرمایا بلکہ اُس نقشے پر ایک زندہ سوسائٹی بھی پیدا کر کے دکھا دی اور 23 سال کی مختصر مدت میں لاکھوں انسانوں کو خدائے واحد کی حکومت کے آگے سر اطاعت و عبادت جھکانے پر آمادہ کر لیا. اُن سے خود پرستی، جاہ پرستی، صنم پرستی، شاہ پرستی غرضیکہ ساری پرستاریاں چھڑوا کر اور غیر کی بندگی سے بچا کر خالص خداوندِ عالم کی بندگی پر ایک نیا نظامِ اخلاق، نیا نظامِ تمدن، نیا نظامِ معیشت اور نیا نظامِ حکومت بتایا اور تمام دنیا کے سامنے یہ عملی مظاہرہ کر کے دکھا دیا کہ جو اصول وہ پیش فرما رہے ہیں. اُس میں کیسی زندگی بنتی ہے اور دوسرے اصولوں کی زندگی کے مقابلہ میں وہ کتنی پاکیزہ اور کتنی صالح زندگی ہے.

یہی وہ عظیم الشان اور رفیع البیان کارنامہ ہے. جس کی بناء پر مسلمان دل و جان سے اپنے مختار و محبوب نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سردارِ زمان، سیدِ کون و مکاں اور سرورِ عالم تسلیم کرتے ہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ کام کسی خاص ملک اور قوم کے لیے نہ تھا بلکہ تمام انسانوں کے لیے تھا. یہ انسانیت کی مشترک میراث ہے. جس پر کسی کا حق کسی دوسرے سے کم یا زیادہ نہیں. جو چاہے خلوصِ دل سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کرے اور اِس میراث سے فائدہ اٹھائے. نہیں سمجھا جا سکتا کہ اِس مابہ الامتیاز تحقیق کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے خلاف کسی متعصب کو تعصب رکھنے کی آخر کیا وجہ ہو سکتی ہے، جن کی راہنمائی، متعصب کے خیالات، اصولِ حیات، قوانین عمل اور اس کے عصرِ جدید کی روح میں بھی پیوست ہو چکی ہے.

کیا وہ نہیں دیکھتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے دنیا کے تصورات کا رخ، وہمیّت و رہبانیت کی طرف

سے پھیر کر عقلیت، حقیقت پسندی اور متقیانہ دنیاداری کی طرف کر دیا ہے۔

حضور ﷺ ہی نے "حسی معجزے" مانگنے والی دنیا میں "عقلی معجزوں" کو سمجھنے اور انہی کو معیارِ صداقت ماننے کا مذاق پیدا کیا۔

حضور ﷺ ہی نے خرق عادات میں خدا کی خدائی کے آثار ڈھونڈھنے والوں کی آنکھیں کھولیں اور انہیں آثارِ فطرت میں آیاتِ الٰہی دیکھنے کا خوگر بنایا۔

حضور ﷺ ہی نے خیالی گھوڑے دوڑانے والوں کو تعقل و تفکر اور مشاہدہ و تحقیق کے راستہ پر لگایا۔

حضور ﷺ ہی نے عقل اور حس اور وجدان کے امتیازی حدود انسان کو بتائے۔ مادیت اور روحانیت میں مناسبت پیدا کی۔ دین اور علم و عمل کا باہم ایک ربط قائم کیا اور مذہب کی طاقت سے بھٹکی ہوئی مخلوق کو خدا کا دروازہ دکھایا۔

حضور ﷺ ہی نے شرک اور مخلوق پرستی کی بنیادوں کو اکھاڑا اور علم ما کان و ما یکون کی طاقت سے اعتقادِ توحید ایسی مضبوطی کے ساتھ قائم کیا کہ مشرکوں اور بت پرستوں کے مذہب بھی واحدانیت کا رنگ اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔

حضور ﷺ ہی نے اخلاق اور روحانیت کے بنیادی تصورات کو بدلا۔ جو لوگ اوتار، بھگوان، ابن اللہ کے سوا کسی کو ہادی اور راہنما تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے، اُن کو بتایا کہ انسان ہی مظہرِ خدا اور آسمانی بادشاہت کا نمائندہ اور اپنے خالق کا خلیفہ ہو سکتا ہے۔

حضور ﷺ ہی نے ارباب من دون اللہ کی حیثیت کو برباد کیا اور جو لوگ طاقتور انسانوں کے یہاں تک قائل ہو چکے تھے، اُن کو سمجھایا کہ انسان بجز انسان کے اور کچھ نہیں۔ نہ کوئی تقدس و حکمرانی کا پیدائشی حق لیکر آیا ہے اور نہ کسی پر محکومیت و غلامی اور ناپاکی کا داغ لگا ہوا ہے۔ تم میں سب سے قابلِ تکریم وہ شخص ہے جو اپنے پیدا کرنے والے کے حضور میں زیادہ متقی ہے۔ شعر

سُجھائی اُس نے ہی سب جہاں کو پستیٔ ماسوا پرستی

اُسی سے سیکھا کہ خود پرستی ہے درحقیقت خدا پرستی

بیمثل بشرّیت

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ﴾

''اے محبوب فرما دیجئے کہ میں تم جیسا بشر ہوں. مجھ پر وحی آتی ہے کہ تمہارا معبود خدائے واحد ہے.''

[الکہف ۱۸:۱۱۰]

خواجۂ کائنات، مختارِ شش جہات، مالکِ ثقلین، زبدۃ الکونین، احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی بجائے خود اُن معجزات سے ایک مجسم معجزہ ہے، جو معرفتِ الٰہی میں تصدیقِ قلب اور اقرارِ لسانی کے لیے عوام کو نورانی مشعل کا کام دیتے ہیں. جس ہستی کی ہر حرکتِ لب اور ہر جنبشِ ابرو، انگشت معجزات کی حامل ہو، جس کا سینہ انوارِ الٰہی کا گنجینہ، جس کا قول خدا کا قول، جس کی گفتگو خدا کی گفتگو، جس کا ہاتھ دستِ شفاء، جس کا لعابِ دہن ہر مرض کی دوا، جس کا بال بال رحمت و برہان، جس کی عمر پاک، جس کی پیشانی منور اور جس کی گلیوں کی خداوندِ عالم نے قسمیں کھائی ہوں اور جو پیدائشی معصوم و مصطفےٰ ہو، اُس کی حیاتِ طیبہ کا اور اُس کے اوصافِ انسانی کا ظاہری آنکھ سے مطالعہ کرنا اور اُس کی بشریت میں مماثلت کا زور بھرنا ایک کھلی گمراہی ہے. مسلمان جب تک صحیح عقیدت اور چشمِ حقیقت سے اس نورِ مجسم کو دیکھنے کی کوشش نہ کریں گے. اپنی ایمانی خصوصیت میں عہدہ برآ نہیں ہوں گے. حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات کا بار بار مطالعہ کرنا ہمارے لیے جب ہی مفید ہو سکتا ہے اور ہمارا جذبۂ تقلید و اتباع جب ہی بھڑک سکتا ہے جبکہ ہم صحیح عقیدت اور اُن اوصاف کے ماتحت ایمان رکھیں، جن کے ساتھ مولا کریم نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا ہے اور اُسی سے ہمارا اپنی رگوں میں اتباع کا ایک نہ مٹنے والا جوش محسوس کرنا ہمیں وہ انسان بنا سکتا ہے، جس کے دامن پر فرشتوں کو بھی نماز پڑھنے میں کوئی عذر نہ ہو.

بعض کوتاہ نظر جن کی ذہنیت میں عقل و عدل کا جوہر نہیں ہوتا، بے سوچے سمجھے، ہمچو مثلی اور ہمچو مائی کے نعرے لگانے لگ جاتے ہیں مگر یہ تعصب آفرین تقریرات اہلِ دانش کی نگاہ میں ذرّہ بھر بھی وقعت نہیں رکھتیں اور ان نعروں کی حیثیت ایک جُغدِ صحرائی کے نالہ سے زیادہ نہیں ہوتی، کیونکہ اکثریت کے

خیال پر شہرتِ دوام اور عزت واحترام منحصر ہوتا ہے. علیٰ وجہ الکمال یہ شرف ہمارے آقا و مولا اُمّی مدنی ﷺ پر جمہور اہلِ مذاہب کے فیصلہ کے مطابق صادق آتا ہے جس پر دلائل کی حاجت نہیں. بلاشبہ تہذیب اخلاقِ انسانی کے اوصاف جانچنے کا بہترین فیصلہ ہے. صدقِ مقال، طبعِ سلیم، تواضع، دیانت، شفقت ورحم، جودومروّت، عدل وانصاف وغیرہ اوصاف، اخلاق کا جزو ہیں.

سیاستِ مدن، زندگی کا ایک رفیع شعبہ ہے، جو اعلیٰ انسانوں میں بوجہ اتم موجود ہونا چاہیے. امیرانہ شکوہ، شاہانہ سطوت، ملکی تدبر، حاکمانہ غوروفکر، سپاہیانہ شجاعت، نظم وسلطنت وغیرہ سیاسیات کے شعبے ہیں. تدبیرِ منزل بھی ضروریات کا اہم ترین حصہ ہے. ارتباطِ باہمی، تعلقاتِ غیر اقوام، آدابِ مجلس، حقوق شناسی، تنظیمِ ملی، تبلیغِ دینی، قوتِ اصلاح، ترویجِ تعلیم وغیرہ اِسی شعبہ کی خصوصیات ہیں. اِسی طرح مال، جمال، کمال دوسری خصوصیات ہیں، جو انسان کو ایک عالمگیر ہردلعزیزی عطا کرتی ہیں. اِن میں سے جو خصوصیت جس انسان میں ہوگی، وہ برگزیدہ ومقبولِ خلایق ہوگا. مال جس میں ثروت و حکومت بھی شامل ہیں، ہر انسان کو صاحبِ اقتدار بنانے کے لیے کافی ہے. جمال وہ ایک سحرِ مبین ہے جس کو ملے دنیا اُس کی راہ میں آنکھیں نہیں بلکہ دل ہر وقت بچھانے کو حاضر ہے. کمال ایک جوہرِ ذاتی ہے جو ہر انسان کو معراجِ ترقی پر پہنچا دیتا ہے. علمی، روحانی، کسبی، وہبی، فنی، عملی کسی قسم کا کمال ہو، ہر صاحبِ کمال عزت وشہرت کا آفتاب بن کر چمکتا ہے.

اب اِس معیار پر اُس خلقِ مجسم رحمتِ عالم ﷺ کے وقائع زندگی کو جانچیے اور شرفِ نبوت و کمالِ رسالت کو قطعاً اِس بحث میں نہ لائیے. صرف قرآنی نقشہ کے مطابق سیدنا محمد عربی ﷺ (فداہ اُمی وابی) کے لیے قرآن پاک کے اِسی ارشاد کو کہ ''محبوب آپ فرمادیں میں بھی تمہاری مثل ایک بشر ہوں'' پیشِ نظر رکھیے، تو واقعات خود بتادیں گے اور حیاتِ طیبہ خود گواہی دے گی کہ یہ ذاتِ کامل بحیثیت انسان ہونے کے تمام انسانوں سے ایک بالاتر اور ایک اُس اَرفع واعلیٰ انسانیت کی مالک ہے جس کی حقیقتاً مثال نہیں ملتی.

کس کس وصف پر جداگانہ بحث کی جائے؟ من کل الوجوہ آپ میں وہ تمام انسانی اوصاف موجود تھے جن کے باعث دنیا کے تمام کامل انسان آپ کو انسانِ کامل ماننے اور کہنے پر مجبور ہوئے اور بحیثیت انسانِ کامل آپ بلاحیل وحجت اور بلاریب وشک ''بیمثل بشر'' اور ''افضل الناس'' کہے جانے کے مستحق ہیں.

اب دیکھیے قرآن کریم نے ﴿ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ﴾ فرما کر اِس کا کیا مفہوم سمجھایا ہے. وہ مفہوم نابینا مُلّانوں کے معنوں میں نہیں، جن کے نزدیک نعوذ باللہ حضور ﷺ اور بوٹا بیلا ایک ہی مٹی کے بنے ہوئے اور ایک ہی پانی کی پیدائش ہیں. نہ اُن کو کچھ خبر، نہ اُن کو کوئی پتہ، صرف ذرا سا نزولِ

وحی کے وقت فرق ہوتا تھا اور بس. یعنی مثلیّت میں مبائنت ہو جاتی تھی. ﴿لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰه﴾. ایک وہ روشن ضمیر دُور سے دُور کی دیکھنے والا، تمام عالم کے ذرّے ذرّے پر نظر ڈالنے والا، مشروح الصدر، غیب دان. مُدّعیِ فَتَجَلّٰی لِیْ کُلِّ شَیْیٍٔ اور ایک وہ کور باطن، سیاہ دل، لایعقل، نئی تہذیب کا راندہ ہوا گدھا. دونوں برابر سمجھے جا سکتے ہیں؟ وہ خاک بسر انتہائی بدنصیب ہے جو محبوبِ خدا، سید الانبیاء معصوم و مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے جیسا بشر سمجھتا ہے. جو کسی بھی صفت میں مخلوق سے نہیں ملتے اور نہ کوئی مخلوق کسی ایک صفت میں بھی اُن سے مطابقت کرتی ہے کیونکہ وہ بے شک وشبہ بیمثل ہیں.

قرآن کریم کا یہ قاعدہ ہے کہ وہ جس چیز کو بیان فرماتا ہے اُس کی ہر عملی سٹیج کو جداگانہ نام اور حیثیت دیتا ہے تا کہ ایک ہی صفت میں جو مدارج کا فرق ہے وہ واضح ہو جائے، ورنہ ہر درجہ میں ایک ہی حیثیت لازم آئے گی اور وہ فرق و مدارج میں فتور پیدا کرے گی. چنانچہ قرآنِ کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے اُسی انسان کے بلحاظ مدارج چھ سات نام رکھے ہیں، جو اپنے محلِ استعمال میں جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں اور اگر اُن کو ایک ہی معنی میں استعمال کیا جائے گا تو قرآنِ کریم کے طرزِ بیان پر ایک وہ نقص وارد ہو گا جو لطافتِ بیان کو قطعاً مٹا دے گا اور قرآنی مفہوم جو مختلف الفاظ میں مراد تھا یکسر بے معنی ہو کر رہ جائے گا. مثلاً آدم، انسان، ناس، انس، بشر، عبد یہ سب کس کے نام ہیں اور کس کے لیے وضع کئے گئے ہیں؟ پھر کیا ہر آدم عبد ہو سکتا ہے یا ہر بشر عبد کہلا سکتا ہے. یا ہر انسان بشر اور ہر ناس آدم یا ہر انس بشر کہے جانے کا مستحق ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں کیونکہ ان انسانی درجات میں لغوی اور اِصطلاحی لحاظ سے بہت بڑا فرق ہے. تو بتایئے عبد میں معراج کی بلندیوں اور بشر میں اخلاقی پستیاں کہاں پر مطابقت پائیں گی؟ آدم اول کی حیثیت ابوالبشر اور مسجودِ ملائکہ ہونا، ہر انس و ناس کے خطابِ عبادت میں کیونکر برابر سمجھا جا سکے گا اور کیا ''حفظِ مراتب نہ کنی زندیقی'' کا مقولہ یہاں پر صادق نہ آئے گا؟

کیا وہ وجود جس کا بول و براز پاک، جس کا ثقل خوشبو ناک، جس کا خون موجبِ نجات از ہلاکت، جس کا زور غیر اللہ سے بے باک، جس کے لعاب سے تشنہ سیراب، جس کا بول پینے سے شارب مستحقِ ثواب، اِس قابل ہے کہ اُس سے مماثلت کا دعویٰ کیا جائے؟ اور اپنی ناپاک جان کو اُس کے مدِ مقابل لایا جائے؟ خدا کے لیے اگر اِن اوصاف کا کوئی ماں جایا پُوت ہے تو ہمیں بھی بتایئے. اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو منہ نہ چڑایئے. چاند پر تھوکنے سے اپنا منہ ہی ملوث ہوتا ہے. صحابہ کرامؓ کا آپ کو اَشْجَعَ النَّاسُ، اجود الناس، اکرم الناس، ادبی الناس علی نفسہٖ کہنا، کیا عامتہ الناس سے مستثنیٰ کر دینے کا ارادہ ثابت نہیں کرتا اور کیا ((اَیُّکُمْ مِثْلِی)) کی تفصیل یہی نہیں ہے؟ رہی یہ بات کہ آپ کی دوسرے بشروں سے نوعِ بشریت میں معمولی سی مماثلت پائی جاتی ہے لیکن بہ فحوائے ﴿یُوْحٰی اِلَیَّ﴾ اِس میں بھی بہت بڑا فرق ہے، جس میں کسی کی بھی آپ کے ساتھ مماثلت نہیں. اور اِس درجہ میں

بھی آپ سب سے بیمثل ہیں کیونکہ وحیِ الٰہی کوئی ایسی چیز تو ہے نہیں جو اپنی کوشش سے کسی بادشاہ یا کسی امیر کو حاصل ہو، بلکہ یہ وہ ایک بیمثل عطیۂ ربّانی ہے جس کی وجہ سے وہ ہستی جس پر وحی ہو تمام جہان سے سرفراز و بے مثل ہو جاتی ہے. یہی وجہ ہے کہ آیت میں پہلے بغرضِ موانست ''مماثلت فی البشرّیت'' بیان فرمائی. پھر ﴿ یُوْحٰی اِلَیَّ ﴾ کا درجہ بیان کر کے بروئے وحدت، فی الحقیقت آپ کو ''بیمثل'' بنا دیا.

ذرا عقل و فکر سے کام لیکر نبوت کے گرد و پیش پر نظر ڈالیے تو بے شمار مثالیں ایسی ملیں گی جن کے سامنے برابری کے سارے دعویداروں کی حقیقتِ مثلیّت تارِ عنکبوت ہو کر رہ جائے گی. مثلاً اللہ کریم جل وعلا شانہ نے قرآن کی نسبت بھی تو فرمایا ہے. ﴿ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ ﴾ اور ﴿ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ﴾ گویا بے شک وشبہ قرآن کی جامعیت اور اُس کی فصاحت و بلاغت بیمثل ہے اگر چہ اُس کے حروف کی صورت وہی ہے. جو مخلوق کے لکھے ہوئے حروف کی ہے اور اُس کا کاغذی لباس ایسا ہی ہے جو دیگر کتب کا، تو کیا یہ مماثلت صحیح ہوگی؟ ہر گز نہیں. اسی طرح وجودِ مقدسِ نبوی ﷺ جس کو اُس بیمثل عطیۂ ربانی یعنی وحیِ الٰہی کا مظہر بنایا گیا ہے، بیمثل ہے، اگر چہ ظاہری صورتِ پاک اور صورتوں کے مشابہ پائی جائے. حالانکہ خصائص میں وہ بھی بیمثل ہے. یہی وجہ ہے کہ مولا کریم نے آپ کو قرآن سے تشبیہ دی ہے. جس طرح قرآن کو کتاب، نورِ ہدیٰ اور رسول فرمایا. اسی طرح آپ کو بھی کتاب، نورِ ہدیٰ اور رسول فرمایا ہے. پس مشابہت میں جب مشبّہ بہ بیمثل ہوگا، تو مشبّہ ضرور بیمثل ہوگا، کیونکہ وجہِ شبہ صرف بیمثل ہے. پھر ماننا اور کہنا پڑے گا کہ خدا کا قرآن بیمثل ہے تو خداوندِ کریم کے نبی کریم محمد مصطفی ﷺ بھی بیمثل ہیں.

یہاں پر یہ واضح کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ''کفر فی الرسالت'' پر اگر غور کیا جائے تو قرآنِ کریم نے اِس کی ایک ہی موٹی وجہ بیان فرمائی ہے جو ممانعت کا دعویٰ کرنے والوں نے رسولوں اور نبیوں کے حق میں سامنے رکھی اور وہ یہ ہے ﴿ مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ﴾ یعنی تم کچھ نہیں مگر ہم جیسے بشر، اور اُن کے لیے اُن کی اتنی ہی بات اُن کے کفر کا باعث بن گئی. فی زمانہ بھی خدا کے کافر تو بہت کم نظر آتے ہیں. یہ جتنے کافر پھر رہے ہیں یہ اُسی انکارِ نبوت اور مماثلت کے ماتحت رسول اللہ ﷺ ہی کے کافر ہیں کیونکہ وہ سرکارِ دو جہاں مختارِ کون و مکاں، ممتازِ انس و جاں محمد رسول اللہ ﷺ کی بیمثل حقیقت باطنی کو نہیں سمجھ سکے. اُن کو اگر ظاہری مشابہت ہی مماثلت پر مجبور کر رہی ہے تو فرعون، شداد، یزید، ہامان کی برابری سے کیوں انحراف ہے؟ ابھی کسی کو فرعون یا یزید کہہ کر دیکھیے. فوراً معلوم ہو جائے گا کہ آناً فاناً کتنی لاٹھیاں اٹھتی ہیں. پھر کیا شرم کا مقام نہیں کہ فرعون و نمرود اور شداد و یزید سے مماثلت ظاہری پر بھی نتھنے پھولنے لگیں حالانکہ وہ بادشاہ تھے اور نبوتِ تامہ کی بے ادبی ہر طرح گوارا رکھی جائے. شور بختی کی بھی حد ہو گئی ہے. اللہ کریم ہدایت عطا فرمائے.

ظاہریت اور جسمانیت پر ہی مماثلت کی نگاہ سہی مگر کیا وہ جسمِ اطہر اور تمام اُس کے وہ اعضائے شریفہ جن کے فضلاتِ خارجہ، بول و براز، خون و پیپ وغیرہ سب کچھ ہی پاک ہوں، کی برابری کا کوئی دعویدار میدان میں آ سکتا ہے؟ قیامت تک کا ایسا علم کس کو ہے کہ آسمان پر کوئی پرندہ پر نہیں مارے گا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان نہ فرما دیا ہو؟ کیا نہیں جانتے کہ انبیاء علیہم السلام بحسبِ تعلیم الٰہی ''عالم'' ہیں. پھر جن کو تعلیمِ الٰہی نہیں اور جن عوام کا دل علمِ الٰہی کے نُور سے منور نہیں، وہ اُن روشن ضمیر و روشن قلوب ہستیوں کے مدِ مقابل کیونکر آ سکتے ہیں؟ علمِ الٰہی کے عطیہ کو بھی برطرف رکھیے محض جسمی مماثلت جو اُن کے قلوبِ قاسیہ کو ہر لحظہ تڑپا رہی ہے اور یہ کہے چلے جاتے ہیں کہ کیوں صاحب! محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو شکل و صورت کے لحاظ سے ہم اگر بشر نہ کہیں تو کیا کہیں؟ اور وہ ہم جیسے نہیں تو وہ کس سے ملتے ہیں؟ کیا اُن کے ہاتھ، منہ، ناک اور کان ہم جیسے نہیں تھے؟ لے دے کے ہمیں ایک بشر خدا سے ملا تھا جس سے ہم کچھ نفع اٹھا سکتے مگر ان چودھویں صدی کے اہلسنت والجماعت نے اُس کو بھی نُور بنا دیا ہے.

خدا کی پناہ کس سادگی اور بیوقوفی سے عوام کو فریب دیا جا رہا ہے. کوئی اُس معترض ''مٹی میاں'' سے یہ نہیں پوچھتا کہ کس نے کہا اُن کے ہاتھ منہ انسانوں سے نہ ملتے تھے؟ مگر:

''شکوہ بیجا بھی کرے کوئی تو لازم ہے شعور''

اب اپنی اس لغو مطابقت سے آگے ذرا بڑھیے اور بتایئے کہ ڈاروِن کا بندر دعوائے انسانیت میں کتنا حق بجانب ہے؟ اعضاء ملتے ہی صحیح، مگر کسی ''ہمچو مثلی'' کی وہ انگلیاں تو دکھایئے جن سے پانی کے چشمے جاری ہو رہے ہوں؟ وہ ہاتھ دکھایئے جس کو ﴿مَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی﴾ کی حقیقت میں خدا کا ہاتھ ہونے کی شان حاصل ہو؟ وہ دہن دکھایئے جس کا لعاب کھارے کنوؤں کو میٹھا کر دے؟ وہ آنکھیں دکھایئے جو آگے پیچھے یکساں دیکھتی ہوں اور زمین و زماں خاک و افلاک پر ہر لحظہ اُن کی نگاہ ہو اور گھر بیٹھے شش جہات کا مطالعہ کریں؟ وہ پاؤں دکھایئے جو نعلین سمیت سرِ عرش چڑھ جائیں. پھر مانا جائے گا کہ تم میں کوئی برابری کا دعوے دار اپنے دعویٰ میں سچا ہے. ﴿فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا﴾ پھر اگر قیامت تک ایسا نہ کر سکو اور یقیناً نہ کر سکو گے تو بتایئے اُس بیمثل سے یہ بغض و عداوت کس بنا پر ہے؟ کیا اُس کے احسان کا بدلہ یہی ہے کہ وہ تمہیں بھی زمانہ بھر کی اُمتوں سے بیمثل بنانے کی فکر میں ہو اور تم اُس افضل المخلوقات بیمثل ہستی کو اپنے جیسا بنانے کی کوشش میں لگے رہو. یاد رکھو! محبوبِ خدا، نورِ الٰہ، محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو عروجِ افضلیت سے ہمچو خود بشریت میں تنزل دینے کے لیے جتنے کوشاں رہو گے اور اپنی مانند بنانے کا لچر عقیدہ رکھو گے تو ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے. مکتبِ قدس کا سند یافتہ اور دلِ وامرتِ سر کا حواس باختہ، برابر نہیں ہوا کرتے. عالم و بے عمل، اندھے اور آنکھ والے کی برابری کا گمان کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے؟ خداوندِ عالم جل مجدہ کو جو ناراضگی اس مسئلہ میں (انبیاء علیہم السلام کو مثلنا)

کہنے پر ہے اور جو وبال اِس عقیدہ کے رکھنے والوں پر اُس نے بھیجے ہیں. وہ قرآنِ پاک و حدیث شریف میں عیاں ہیں. یہ بات مولا کریم کو نہایت ناپسند رہی کہ جب کوئی مددگار اُن کی مدد اور بے نوروں کو نور بخشنے کے لیے اُن کی طرف آتا تھا تو عوام یہ کہہ کر اُس سے الگ ہو جاتے کہ تم ہم جیسے بشر ہی تو ہو اور اُن میں اور اپنے آپ میں فرق نہ جانتے.

دیکھئے یہ تو ظاہر ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کی آپس میں صورتِ ظاہری کی مطابقت ہے، مگر یہ ارشاد ﴿ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ﴾ کا فرق کس حقیقت کو پیش کر رہا ہے؟ اور یہ وہ ہستیاں ہیں کہ جو بلندئ مراتب کے لحاظ سے یا وحیٔ الٰہی کی حقیقت میں مماثلت کی مدعی ہو سکتی تھیں، مگر قرآن پاک نے اُن کی فضیلت کو بھی ایک دوسرے پر ثابت کر کے مماثلت ختم کر دی اور خصوصیّت سے ہمارے مولا و آقا محمد رسول اللہ ﷺ سے کسی کی مماثلت نہیں رہنے دی. بلکہ روزِ ازل کا معاہدہ جو خود مولائے کریم نے تمام انبیائے کرام علیہم السلام سے بحق حضور شافعِ یوم النشور ﷺ لیا ایک وہ حدِّ فاصل ہے. جس میں کسی کو بھی حضور ﷺ سے مماثلت نہیں رہتی. بدیں وجہ یہ ماننا پڑے گا کہ اگر کفار انبیاء علیہم السلام کو مِثْلُنَا فی الصورت سمجھتے تھے تو رب العزت جل وعلا شانہ کس بات سے ناراض ہوئے؟ معلوم ہوتا ہے کہ ناراضگی صرف اِس بات کی ہے کہ وہ اُن کو مِثْلُنَا فی الحقیقت سمجھتے تھے. جناب سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ سے ﴿ أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ﴾ بغرضِ موانست فی الصورت ہے نہ کہ بغرضِ مثلِ حقیقت. کیونکہ نبوّت ظہورِ احدّیت ہے اور بدیں جہت مظہر بھی خاص حقیقت میں ہونا چاہیے، یعنی مظہرِ بے مثل کو بے مثل ہونا لازم آئے گا.

حقیقت تو درحقیقت آپ کی بے مثل ہے مگر آپ تو ہیئت میں بھی اپنے ساتھ کسی کو نہیں ملنے دیتے، اور ﴿ إِنِّي لَسْتُ كَهَيْئَتِكُمْ ﴾ فرما کر اپنے آپ کو بے مثل قرار دے دیتے ہیں اور اگر آپ بیمثل ہو کر دنیا میں تشریف نہ لاتے، جیسے کہ تمام انبیاء علیہم السلام اپنے اپنے اوقات میں بیمثل ہوتے رہے، تو آپ سے ظاہر و باطن میں معارضہ ہوتا. کیونکہ حدیث شریف میں ہے کہ جو نبی آتا ہے وہ ظاہر و باطن میں عیوبِ بشری سے پاک ہوتا ہے اور حدیثِ علی کرم اللہ وجہہ ((لَمْ أَرَ مِثْلَهُ قَبْلَهُ وَلَا بَعْدَهُ)) آپ کی صورتِ بیمثلی پر دال ہے. گویا بشریت کے لغوی معنوں میں تو آپ بشریت کے حامل ہیں، لیکن آپ کی بشریت میں جو خواص ہیں وہ کسی ایک میں بھی نہیں. لہٰذا آپ کی بشریت بھی بے مثل بشریت ہے. بدیں سبب عام بشر اور سید الانبیاء محمد مصطفےٰ ﷺ میں مماثلت کیسی ہو سکتی ہے؟ یہ شرکت تو ایسی بھی نہیں جو جنسِ عالی یا کہ کسی عرضِ عام کے افراد کو انسان سے ہے. یہ تو ایسا ہوا کہ کوئی کہہ دے اللہ ہماری طرح موجود ہے. اللہ ہماری طرح سمیع و بصیر ہے کیونکہ کلمہ موجود و علیم ہر جگہ بولا جاتا ہے مگر جس طرح قائل کی موجودیت اور مولا کریم کی موجودیت میں کوئی نسبت ہی نہیں ایسے ہی عوام کی بشریت

اور محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت میں کوئی نسبت نہیں.

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایمان، عبادات، معاملات غرضیکہ کسی شئے میں بھی ہم جیسے نہیں. حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ ((اَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ)) کہ میں اللہ کا رسول ہوں. کوئی دوسرا ان الفاظ میں رسالت پر گواہی دے تو کافر ہو جائے. حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایمان، جنت و دوزخ اور ملائکہ وغیرہ پر دیکھے ہوئے ہے اور عوام کا سنی سنائی پر. اپنے جیسا ماننے والوں کے لیے ارکانِ اسلام پانچ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے چار کیونکہ آپ پر زکوۃ فرض نہیں. عام مسلمانوں پر نمازیں پانچ فرض ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر مع تہجد چھ، کیونکہ آپ پر تہجد بھی فرض تھی. عام اہلِ اسلام چار بیویوں کے پابند اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی تعداد کے پابند نہیں. ہر مسلمان کی بیوی اُس کے مرنے پر نکاح ثانی کر سکے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج پاک سب مسلمانوں کی مائیں، جو کسی کے نکاح میں نہ آسکیں. ہر مسلمان کی میراث پر تقسیم کا حکم موجود مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی متروکات نا قابلِ تقسیم. تو کوئی عقلمند یہ بتائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیمثل خالق کے بے مثل محبوب اور بے مثل عبد نہیں تو کیا ہیں؟ لیکن لفظِ بشر مغالطہ میں ڈالتا ہے. انبیاء علیہم السلام کا دعوائے بشریت اُن کا کمال ہوتا ہے. جیسے ایک حاکمِ وقت ایک کم حیثیت ہمنشیں سے یوں کہے کہ تم مجھ سے خوف نہ کھاؤ میں بھی تم جیسا انسان ہوں، یہ اللہ کا فضل ہے کہ اُس نے مجھے امتیازی حیثیت عطا کر رکھی ہے مگر اُس کے ایسا کہہ دینے سے یہ لازم نہیں آتا کہ سننے والا اُس کے مراتب کا فرق نہ جانے.

کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ خداوندِ عالم بھی مومن اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی مومن اور یہ مماثلت کا حامی بندہ بھی مومن. اِن تینوں مومنوں میں کوئی فرق ہے یا برابر ہیں؟ اگر یہاں بھی برابری کا دعویٰ قائم ہے تو ایمان کی فکر کر لیجئے. اِنہی عقل کے دشمنوں کے لیے علامہ اقبال مرحوم بشریت کے مسئلے کا کیا بہترین فیصلہ فرماتے ہیں. شعر

عبد دیگر عبدہٗ چیزے دگر — او سراپا انتظار ایں منتظر

نرا عبد ہونا اور ہے اور عبدہٗ ہونا اور ہے. عبدِ محض کسی کے انتظار میں ہے اور عبدہٗ وہ ہے جس کا خدائے قدوس منتظر ہے. گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عبدیت سے ربّ کی شان ظاہر ہوتی ہے اور رب کی عظمت سے ہماری عبدیت چمکتی ہے. کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

اے ہزاراں جبرائیل اندر بشر — بھرِ حق سوئے غریباں یک نظر!

الغرض افضلیت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم عقلاً ونقلاً پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے اور اسلام کی حد میں رہتے ہوئے اِس سے کسی صورت میں بھی انکار ممکن نہیں اور یہ دعویٰ سے کہا جاسکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی افضلیت صرف کمالات ہی میں واجب التسلیم نہیں بلکہ ہر لحاظ صفات اور معجزات میں بھی واجب الایمان ہے. مولا کریم

نے حضور ﷺ کو اُس زمانہ میں بھیجا جبکہ اہل عرب سارے سازوسامان سے درست تھے یعنی عرب کی شاعری اور خطبہ خوانی نہایت عروج کو پہنچی ہوئی تھی اور اُن کے لغت کو بھی کافی کچھ استحکام حاصل ہو چکا تھا. آپ نے تشریف لا کر اُن کے ادنیٰ واعلیٰ کو خدا کی واحدانیت اور اپنی رسالت کی تصدیق کی طرف متوجہ کیا اور دلیلیں قائم کر کے اپنا دعوائے بے مثلیت ثابت کر دیا تمام شکوک وشبہات دفع کر دیئے اور اُن کے لیے ناواقفی کے عذر کرنے کا کوئی موقع نہ چھوڑا. اب اُن کا اعراض کرنا چودھویں صدی کے بھکے ہوئے نام نہاد مسلمان کی طرح محض ہوا و ہوس اور ناحق طرفداری کی بنا پر رہ گیا تھا.

ابتداء میں جب آفتابِ رسالت کے طلوع ہونے کے آثار نمودار ہوئے تو تاریکیٔ کفر والحاد میں نورِ ہدایت کی جگمگاہٹ پیدا ہونے لگی. یہود ونصاریٰ کے عابد وراہب ہر گوشہ سے پکار اٹھے کہ نبی آخر الزمان ورسولِ خاتم پیغمبراں عنقریب ظاہر ہوا چاہتے ہیں. ستارہ پرست، کاہن ورمّال برملا کہنے لگے اب ہمارے جِنّ آسمان پر نہیں جاسکتے کیونکہ آخری نبی مبعوث ہونے والے ہیں. یہ ظہورِ نبوت کا وقت تھا جس کی قریبی ساعتوں کے باعث رحمتِ عالم ﷺ کے اشغالِ شبانہ روزی میں بھی تبدیلی آتی گئی. ذکر وفکر اور خلوت وتنہائی کی موانست بڑھتی گئی. تجارتی کاروبار اور امورِ خانہ داری کے لگاؤ میں کمی آنے لگی. غارِ حرا میں تشریف لیجاتے اور کئی کئی راتیں وہیں تنہا گزارتے. رویاءِ صادقہ نظر آنے لگے. اسی غار میں حقیقت کا انکشاف ہوا. جمعۃ المبارک کو ختمِ رسالت کے منصب کے اعلان کا حکم ہوا اور نورِ ہدایت کی روشن قندیل لیکر غارِ حرا سے قوم کی طرف تشریف فرما ہوئے. احکامِ رسالت قومی رواج کے خلاف تھے. اِس لیے پہلے پہلے خاص رازداروں کی جانب توجہ فرمائی. جن کو بارگاہِ رب العزت جل وعلا شانہ سے ﴿اَلسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ اُوْلٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ﴾ کی بشارت دی گئی اور آنکھوں والوں نے دیکھا کہ بنی اسرائیل کے آخری پیغمبر مسیح علیہ السلام کے ظہور سے تقریباً چھ سو برس بعد فخرِ بنو اسمٰعیل قیمِ ملتِ ابراہیم خلیل اللہ، خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ اپنی تمام فضیلتوں کے ساتھ دنیا کی راہنمائی کے لیے مبعوث ہو چکے ہیں اور آخر وہ وقت بھی آیا کہ اسلام کا مشن مکمل ہوا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا سے مولا کریم کے ہاں تشریف لے گئے. نُور والوں نے حضور ﷺ کی آخری آرام گاہ کا فیصلہ فرمایا اور یہ الفاظ ارشاد فرمائے. حضورِ اکرم ﷺ رحمۃ اللعالمین حیّ ہیں اور ابدالآباد تک حیّ رہیں گے. آپ کی امامت منقطع نہیں اور فیضانِ رسالت تاقیامت برابر جاری رہے گا. آپ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر بحکمِ قرآن شفاعت مانگنا مسلمان کی ابدی نجات کا باعث ہوگا کیونکہ حضور ﷺ ہر جگہ حاضر وناظر ہیں. آپ کا تمام جہانوں کے لیے رحمت ہونا ثابت کرتا ہے کہ رحمت سب جہانوں کو محیط ہے. لہٰذا حضور ﷺ کی شان ہے کہ آپ سب جہانوں کو محیط ہیں. جتنی کائنات کا ﴿خَالِقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ربّ ہے، اتنی

کے لیے حضور ﷺ رحمت ہیں اور آیت ﴿قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ...... الآ خر﴾ سے بھی حضور ﷺ کا حاضر و ناظر ہونا ثابت ہوتا ہے. شعر:

آنکھوں میں ہیں وہ مثلِ نظر، اور دل میں ہیں جیسے جسم میں جاں

ہیں مجھ میں ولیکن مجھ سے نہاں، کس شان کی جلوہ نمائی ہے

ہم کسی پر اعتراض تو نہیں کرتے لیکن اتنا پوچھے بغیر رہ بھی نہیں سکتے کہ اگر قلب میں وہی ایمان ہے، جو سرکارِ دو عالم ﷺ نے عطا فرمایا ہے تا کہ مالک الملک اور خالق الکل کی معرفت حاصل ہو تو ذرا بتائیے کہ کیا آپ کی بشریت میں مماثلت اور مماثلتِ بشریت کوئی اور بھی ہے. جس کی یہ شان ہو کہ اُس کے حضور میں قیامت تک ہر لحظہ مغفرت کے لیے ہر حاضر ہونے والا مولا کریم کو توبہ قبول کرنے والا مہربان پائے گا. پھر اس آیت میں نہ کسی مکان و زمان کی تخصیص اور نہ کہیں کا تعین، قیامت تک جو حاضر ہو اور جہاں سے پکارے سرکارِ دو عالم ﷺ اپنی بیمثل بشریت کے ساتھ اُس کی پکار کو سنیں. اُس کے درد کو محسوس فرمائیں اور اُس کی امداد کو پہنچیں. شعر:

واللہ وہ سُن لیں گے فریاد کو پہنچیں گے

ارے اتنا بھی تو ہو کوئی، جو آہ کرے دل سے

کاش کہ ظاہر پرستوں کا ٹولہ قرآنِ پاک کی روشنی میں محبوبِ خدا ﷺ کے نور کا مطالعہ کرتا.

رفعتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم

﴿ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ﴾

''ہم نے تیرے لیے تیرا ذکر بلند فرما رکھا ہے۔'' [الانشراح ۹۴:۴]

گذشتہ مباحث میں واضح ہو چکا ہے کہ سب انسان اپنے تمدن، تمصر، اجتماع، انتظام، اقتصاد، اعتدال، قویٰ، اصلاح، اخلاق اور تزکیۂ نفوس کے لیے قانونِ الٰہی کے محتاج ہیں اور یہ قانون انبیاً و مرسلین کے ذریعے سے مخلوقِ الٰہی کو پہنچتا چلا آیا ہے اور ہر زمانے میں ہر مخلوق اس سے فائدہ حاصل کرتی چلی آئی ہے لیکن گزشتہ زمانے میں جس قدر قوانینِ الٰہی اور شرائعِ الہامی پوری دنیا پر نازل ہوئے وہ ہر ایک قوم کے لیے جداگانہ اور علیحدہ علیحدہ تھے۔ اُن میں کوئی قانون ایسا نہ تھا جو تمام عالم کے لیے یکساں مفید ہو یا تمام اقوام اُس کو ماننے کے لیے مکلّف ہوں مگر اخیر زمانہ میں جب تمام ہادیوں اور نبیوں کا سلسلہ ختم ہو گیا اور قوانینِ الٰہی کے عاملوں یعنی انبیاء و مرسلین کی تسبیح کے تمام دانے منتظم طریقہ پر مسلسل پروئے گئے تو اُن سب کے امام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں مبعوث ہوئے اور ایک مکمل ضابطۂ حیات اور مسلّم قانونِ الٰہی تمام جہان والوں کے سامنے پیش فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ یہ قانون ساری دنیا کی تاریکی دور کرنے کے لیے نور اور تمام گمراہ انسانوں کے لیے مشعلِ ہدایت ہے۔ چنانچہ اس قانون کو جن لوگوں نے مانا اور جن ذی عقل انسانوں نے اِس کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا وہ مسلمان کہلائے اور جن بے راہرو لوگوں نے اُس سے سرتابی اور سرکشی کی اُن کو کافر و منکر کے لقب سے پکارا گیا۔ اور یہ کھلی ہوئی بات اور ایک واضح حقیقت ہے کہ جس ذاتِ گرامی کے آوردہ قانون سے گمراہ انسانوں کو دینی و دینوی فلاح و بہبود حاصل ہو وہ ذاتِ مقدس یقیناً اس قابل ہے کہ اُس پر اپنا تمام عزیز ترین سرمایہ اور محبوب ترین متاع قربان کرنے میں دریغ نہ کیا جائے اور یہی وہ بات ہے جس کے بغیر ایمان حاصل نہیں ہوتا کیونکہ نبی و رسول کو اُس کی اُس شانِ نبوت تک جاننا اور ماننا جس سے وہ متصف ہو لازم و واجب ہے اور اُس کے مرتبہ و حیثیت سے کم سمجھنا اُس کی توہین ہے۔ جو صریحاً کفر ہے۔

یہاں پر یہ مسئلہ بھی قابلِ یاد ہے کہ ہر ایک رسول و نبی کا مرتبہ ہر ایک کی شان اور ہر ایک کا درجہ

بالکل جدا جدا ہے اور ایک کا درجہ دوسرے میں مدغم نہیں ہوسکتا۔ کسی کو اُس کے مرتبۂ نبوت سے گھٹانا یا بڑھانا انبیاء کے ارشاد کی اتباع و تعمیل نہیں بلکہ کھلی ہوئی ضلالت ہے۔ ایمان یہی ہے کہ جس شان سے کوئی نبی و رسول مبعوث ہو اُس کو اُسی طرح اور اُن ہی صفات کا حامل مانا جائے جو اُس کے لیے اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہوں۔ اِسی لیے سرکارِ دو عالم نبی مکرم محمد رسول اللہ الاعظم ﷺ کا درجہ مندرجہ بالا آیت کے ماتحت تمام انبیاء و مرسلینؑ کے مدارج سے ارفع و اعلیٰ ہے۔ جمیع انبیاء و مرسلین کے اپنے اپنے مذاہب میں الگ الگ فرق و فضیلت ہے مگر حضور ﷺ سب سے افضل و اکمل ہیں اور آپ کے لائے ہوئے احکام کے سامنے بلا چون و چرا سر جھکا دینا، تسلیم کر لینا اور عمل کے لیے تیار ہو جانا ہی سببِ نجات اور ذریعۂ رہائی ہوسکتا ہے۔ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اقوال و اعمال سے یہ بات صریحاً ثابت ہوتی ہے کہ وہ اپنی گفتار، رفتار، کردار اور تمام اوضاع و اطوار میں بلا کسی قسم کے تردّد و توقّف کے آپ کی پیروی کرتے تھے۔ ہاں وہ امور جو مخصوصاتِ نبوت ہوتے تھے اور صحابہ کرامؓ کو اُن کی تخصیص کا علم ہوتا تھا، تو اُن کے اتباع میں کوشش نہ فرماتے۔ چنانچہ حضور ﷺ نے نماز کے لیے جب اپنی نعلین مبارک اتاریں تو صحابہؓ نے بھی اتار دیں۔ حضور ﷺ نے اپنی انگوٹھی اتاری تو اُنہوں نے بھی اپنی اپنی انگوٹھیاں اتار دیں۔ اِس لیے کہ صحابہؓ آنحضرت ﷺ کے طرزِ زندگی، نشست و برخاست، خورد و نوش اور صورت و سیرت میں بہت زیادہ تفتیش و تحقیق کا شغف رکھنے والے تھے، تاکہ حضور ﷺ کی پیروی کی پوری پوری سعادت حاصل کرسکیں۔ بعض صحابہ کرامؓ نے جب دنیا کو ترک کر دینے اور شب و روز عبادت کرنے کا تہیہ کر لیا تھا تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں کھاتا بھی ہوں اور پیتا بھی ہوں۔ سوتا بھی ہوں، جاگتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، پس جو شخص میری سنت سے پھر جائے وہ مجھ سے نہیں ہے۔ اِس حدیث سے معلوم ہوا کہ سنتِ نبوی کا اتباع بلا چون و چرا کرنا چاہیے۔ اپنی عقل سے اُس میں تصرف کسی طرح بھی جائز نہیں۔ اِسی لیے حضرت صدیق اکبرؓ کا قول ہے کہ ہمارے دین کی بنیاد منقول پر ہے اور حضرت حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اصول الدین میں فرمایا ہے کہ دین میں اپنی عقل سے تصرف نہ کرو اور یہ خیال نہ کرو کہ جو چیز بہتر اور مفید ہوگی وہ جس قدر زیادہ ہوگی اُسی قدر وہ زیادہ نافع بھی ہوگی کیونکہ تمہاری عقل اسرارِ الٰہی کا ادراک نہیں کرسکتی۔ اُن کی حقیقت کو صرف قوّتِ نبوی ہی پا سکتی ہے۔ لہٰذا تم اتباعِ نبوی کو لازم سمجھو کیونکہ خاص باتیں ہر شخص کے قیاس سے معلوم نہیں ہوسکتیں۔

الغرض سرورِ کائنات، مختارِ شش جہات محمد رسول اللہ ﷺ تمام انبیاءؑ کے سردار، سب رسولوں کے قافلہ سالار، سب میں اعلیٰ و افضل اور سب کے مقام سے بلند ہیں۔ وہ اس طرح کہ تمام انبیاءؑ کے تمام فضائل و کمالات خداوندِ عالم جل مجدہٗ کے عطا کردہ تھے اور وہ خداوندِ عالم کی کسی ایک صفت سے مستفید

تھے. گو سب انبیاء میں قلیل و کثیر تمام صفات کا ظہور تھا مگر اصلی منبع ءِ فیض کوئی ایک صفتِ خاص تھی.

مثلاً حضرت موسیٰ شرفِ تکلّم سے مستفید تھے اور حضرت عیسیٰ احیاءِ موتیٰ اور شفاء امراض کی صفتِ خاص سے مستفید تھے. مگر سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم صفتِ علمی میں ممتاز و سرفراز ہیں اور سب جانتے ہیں کہ علمی صفت وہ صفت اور فضیلت ہے. جس کو تمام محاسن و اوصاف اور انسانی کمالات پر فوقیت اور فضیلت حاصل ہے. تمام صفات اپنی کارگزاری میں علم کے محتاج ہیں اور علم ہی پر مراتبِ صفات ختم ہوتے ہیں.

پس جو نبی صفتِ علم سے مستفید ہو وہی مراتب میں سب انبیاءؑ میں از روئے مقامِ نبوت زیادہ بلند اور مخدوم و مکرّم ہوگا اور یہ ظاہر ہے کہ جو نبی کمالاتِ علمی و عملی میں سب سے بلند ہو وہی سید الانبیاء بھی ہو سکتا ہے اور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے بڑی خصوصیت اور سب سے بڑا شرف و امتیاز یہی ہے.

بزرگانِ دین نے ارشاد فرمایا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جامع حیثیات و اوصاف اور ہر لحاظ سے مشعلِ ہدایت اور نمونۂ عمل تھے اور اِسی وجہ سے آپ کی بلندیٔ مرتبت و رفعتِ مقام ایسی مسلّمہ ہے کہ کوئی پہلو بلندی کا آپ کے مکمل اُسوہ سے باہر نہیں، بلکہ اُس کا پایا جانا ایسا متحقق ہے کہ اُس میں ازلیّت و اخرویّت پائے بغیر چارہ نہیں تا کہ تمام افراد اپنی اپنی جگہ، اپنی اپنی حیثیت کے مطابق، آپ سے ہدایت اور روشنی حاصل کر سکیں. آپ صرف پیغمبر نہ تھے جو تبلیغ ہی پر اکتفا فرماتے، نہ صرف عابد تھے جو کسی جنگل یا پہاڑ کے درّہ میں بیٹھ کر محض اللہ اللہ کرتے، نہ صرف دنیادار تھے کہ زندگی جاہ و طمطراق کے ساتھ گزار دیتے. آپ نے تو ہر خیال اور ہر درجہ کے لوگوں کو ہر قسم کی پاکیزہ تعلیم دینی تھی تا کہ شاہ و گدا، امیر و غریب اور ادنیٰ و اعلیٰ سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض سے فیض اندوز ہو سکیں اور یہی ہر نوع سے رفعتِ ذکر کا سبب ہے.

منقولات کو اگر ایک طرف بھی رکھ دیا جائے تو معقولات میں غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ رفعتِ ذکر کا مقام مولا کریم کے ذکر کے ساتھ عالمِ بالا میں، ملاء الاعلیٰ میں، ملائکہ میں، عرشِ اعظم پر، کتبِ سماویہ میں، تحتِ الثریٰ میں، نمازوں میں، اذانوں میں، آبادیوں میں، ویرانوں میں، سمندروں میں، پہاڑوں میں، عبادت و اخلاق میں، رعب و داب میں، حقائق و دقائق میں اِس طرح ثابت ہوتا ہے کہ اُس کی حقیقت سے کسی انجان سے انجان کو بھی تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں. عملی دنیا کے اولوالعزموں کا مطالعہ کیجئے تو یہ رازیوں بھی طشت ازبام ہو جاتا ہے.

اہل اللہ

کروڑوں تو شاید مگر لکھو کھہا بندے اللہ کے یقیناً ایسے ملیں گے جو اپنی نجات سیدنا عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی ذاتِ ستودہ صفات سے وابستہ سمجھتے ہیں اور آج ہی نہیں بلکہ سینکڑوں برس سے سمجھتے

چلے آئے ہیں. یہاں عقیدہ کی صحت و غلطی پر بحث نہیں بلکہ مقصودِ نفس یہ ہے کہ اُن کی زبانوں پر نام ہے تو غوث الاعظم کا، دلوں میں اعتقاد ہے تو محبوب سبحانی کا، لیکن ذرا سوچ کر بتایئے کہ شیخِ ممدوح اور اُن کے سارے پیش رو اور پس رو، حسن بصری، جنید بغدادی، خواجہ اجمیری، شیخ احمد سرہندی، نظام الدین دہلوی، شہاب الدین سہروردی، فرید الدین اجودھنی، علی احمد صابر کلیری، گنج بخش علی ہجویری رحمہ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سب کے سب کس بات پر نازاں اور کس شئے پر فخر رکھنے والے ہیں؟ اپنی تقدیس و سروری پر یا عرب کے اُمیؐ کی غلامی اور مکہ کے یتیم کی چاکری پر؟ اللہ اللہ! کروڑوں کے پیشوا ،سرکار ﷺ کے آستانِ پاک کی جاروب کشی فخر سمجھتے ہیں. دنیا میں بے شمار رشی، راہنما و راہب اور اہلِ ریاضت گزرے ہیں مگر یہ اعزاز و امتیاز نہ کسی کے حصے میں آیا ہے اور نہ آئے گا.

محدثین

امام بخاریؒ کے مرتبہ و عظمت کو کون نہیں جانتا. جن کی کاوش و تحقیق کی نظیر کسی ملک و قوم میں نہیں ملتی اور امام مسلمؒ، امام مالکؒ، امام ابوداؤدؒ، امام ترمذیؒ، امام نسائیؒ رحمہ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے اشغالِ علمی کس سے پوشیدہ ہیں؟ جنہوں نے اپنی ساری کی ساری عمریں اِسی پر ختم کر دیں کہ وہ صرف ایک اُمی ہی کے ارشادات و اعمال جمع کریں. عسقلانیؒ اور عینیؒ، طیبیؒ اور قسطلانیؒ، سخاویؒ اور شوکانیؒ، قاضیؒ اور نوویؒ رحمہ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور اُن جیسے ہزاروں دوسروں نے اپنی زندگیوں کو کس چیز کے لیے وقف کر دیا. یہی کہ مکی اُمی کے اقوال کی شرح و تفسیر اور اُس کی جانب منسوب الفاظ کی تنقیح و تنقید کریں.

محققین

ابنِ جوزیؒ، وابنِ تیمیہؒ اور ابنِ قیمؒ رحمہ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی ساری ساری زندگیوں کا کارنامہ یہی تو ہے کہ فلاں فلاں بدعات اُس محبوب کی سنت کے خلاف ہیں اور فلاں فلاں اقوال اُس جانب منسوب کرنا اُس پر افتراء کرنا ہے. کیا کسی بڑے سے بڑے ادیب، مہندس، فاضل، راہ نما کے ملفوظات اِس کاوش سے جمع کیے گئے ہیں. یا کسی کا ایک ایک لفظ، ایک ایک فقرہ اور ایک ایک قول اتنی سخت جرح اور موشگافیوں کے پاکیزہ نفوس کے واسطہ اور سچوں کی شہادتوں سے یوں سلسلہ بہ سلسلہ منقول ہو کر اہل جہاں تک من و عن پہنچا ہے؟ کہنا پڑے گا نہیں اور ہرگز نہیں.

مؤرخین

ابنِ اسحاقؒ اور ابنِ ہشامؒ، سہیلیؒ اور زرقانیؒ، ابنِ سعدؒ اور قاضی عیاضؒ، دمیاطیؒ اور مغلطائیؒ اور اُن کے صدہا شاگردوں اور دوستوں کے ضخیم مجلدات کس بات پر دلالت کرتے ہیں؟ اِسی پر کہ اُس معلمِ

کائنات کی سیرت کا ایک ایک گوشہ اُنھوں نے محفوظ کیا اور اُسی کی کتابِ زندگی کی ایک ایک سطر حفظ کرنا اپنے لیے صد ہزار نجات سمجھی.

آئمہ مجتہدین

امام ہمام سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے بچہ بچہ واقف ہے. کوئی دل ایسا نہیں جو آپ کی عظمت سے خالی ہو. آپ اور آپ کے شاگرد، بلکہ اُن کے شاگردوں کے شاگرد اِس پایہ کے تھے کہ معاصرین اور مابعد آنے والوں نے اُنہیں امامِ وقت تسلیم کیا. لیکن خود یہ امامِ ابوحنیفہ اور امام شافعی امام مالک اور امام احمد اور ان کے احباب ورفقا، سفیان ثوری اور اوزاعی، ابو یوسف اور محمد، زفر اور حسن، حماد اور مزنی، طحاوی اور سرخسی اور ہزار ہا فقہار رحمہ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین جو آج تک ہو چکے ہیں. اُن کا مشغلۂ حیات کیا رہا ہے اور یہ گروہ در گروہ کیا کرتے رہے ہیں. اُسی اُمی محبوب کے لائے ہوئے قانون کی شرح وتفسیر اور اُسی بے پڑھے کی بتائی ہوئی شریعت کے فروع کا حل اور جزئیاتِ احکام کا استنباط، جس کو وہ وسعت حاصل ہے جو کسی قانون کو نصیب نہیں.

صوفیاء

مثنوی شریف مولینا روم آج بھی کتنے دلوں کو مست کئے اور کتنی محفلوں کو گرمائے ہوئے ہے.

یہ مولانا رومی، خواجہ حافظ، سعدی شیرازی، نظامی گنجوی، خسرو اور جامی، عطار اور سنائی رحمہ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین صدیوں سے کس کے نام پر وجد کرتے اور کس کے گیت گاتے چلے آرہے ہیں. وہی بادیہ عرب کا بوریا نشین جس کے لیے شاعری کوئی مرغوب اور دل خوش کن مشغلہ نہ تھا اور ﴿وَمَا عَلَّمْنَاہُ الشِّعْرَ وَمَا يَنبَغِي لَهُ﴾ کا امتیازی نشان رکھتا تھا. جو شعر کہنا تو بجائے خود شعر کو موزونیت کے ساتھ پڑھ بھی نہ سکتا تھا. جس کے سوا ایسی عقیدتِ قلب اور خلوصِ وارادت کے ساتھ جہان بھر میں کچھ نہیں لکھا گیا اور نہ یوں بے تاب ہو ہو کر پکارا گیا ہے.

عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے نام سے کس کا کلیجہ نہ دہلا. بڑے بڑے سورماؤں کے چھکے چھوٹے، خالد سیف اللہ رضی اللہ عنہ کی شمشیرِ خارا شگاف اور عمر بن العاص رضی اللہ عنہ کی تدبیروں نے پتھروں کو پانی پانی کر دیا. ہارون اور مامون، سلجوق اور ویلم، غزنوی وغوری، تیمور و بابر، عثمان وسلیم، طارق وقاسم، لودھی وخلجی، ہمایوں وجہانگیر، شاہجہان واورنگ زیب، کس شمع کے پروانے تھے اور کس کی خاک بوسی کو اپنا معراجِ کمال اور وسیلہ نجات سمجھے؟ اُسی حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے نورِ نظر اور حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا کے لعل کی.

غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف اور اُن کے نقش قدم پر چلنے والوں نے اسرارِ دین اور معالجۂ امراضِ

نفسانی پر جو دفتروں کے دفتر تیار کر دیئے اُن کا حاصل اور لب لباب کیا ہے؟ اُسی نبی اُمی کے لائے اور پھیلائے ہوئے دین کی حمایت و نصرت اور اُسی کی تبلیغ و ترویج. ابوالحسن اشعری، ابوبکر باقلانی، رازی اور آملی، نسفی اور جرجانی نے عقائد و کلام میں تصانیف کا جو انبار لگا دیا ہے اور اُن کے متبع جس طرح ہر دور میں پیدا ہوتے رہے ہیں اور آج چودھویں صدی ہجری کے وسط میں بھی جو کام ہو رہا ہے اُس پایہ کا علمِ کلام کس شخصیت کا حصہ ہے؟ صرف اُسی عرب کے صحرا کے نبی کا جو عبدالمطلب کا پوتہ اور عبداللہ ذبیحؓ کا بیٹا تھا.

مفسرین

مفسرین کرام کے اسماءِ گرامی اور اُن کے علمی کارنامے کس پر روشن نہیں. تابعین میں ضحاک اور قتادہ، مجاہد اور ابنِ زیاد نے جو معانیءِ قرآن کی خدمت کی، اُس کا صلہ کس کے امکان میں ہے؟ اور ابنِ جریر کی تیئس مجلّدات کو کون بھول سکتا ہے اور ابن کثیر کی محنت و جستجو کی داد کون دے سکتا ہے؟ بیضاوی و زمخشری کی قدر کس کے دل میں نہیں؟ ابن حبان اور ابوسعود نے اپنی پیاری عمریں اسی خدمت کے لیے وقف کر دیں. چشمِ تصور دیکھ رہی ہے کہ یہ سب کے سب اپنے اپنے مجلّدات لیے ہوئے اُسی اُمی کی خدمت میں دست بستہ اُس کی نگاہِ کرم کے منتظر کھڑے ہوئے ہیں اور اُن کی سب سے بڑی تمنا یہی ہے کہ اُس کے قدموں پر نثار ہو جائیں.

صرفی ونحوی

صرف ونحو اور لغت کی طرف آیئے. اِس میدان میں بھی ایک سے ایک بڑھ کر امامِ فن نظر آئیں گے. ایسے کہ جن پر خود فن کو ناز ہے. کسائی اور ابوالاسود، خلیل اور سیبویہ، ابنِ مالک اور ابنِ حاجب، مطرزی و جوہری، ابنِ منظور و زبیدی، کسی نے صرف پر لکھا اور کسی نے نحو پر اور کسی نے لغت کو اپنا موضوع بنایا. لیکن اِن تمام اَن تھک ریاضتوں اور بے حساب الفاظ کے ذخیروں کے پیچھے مقصودِ اصلی سب کا کیا رہا؟ یہی کہ اُس محبوبِ خدا کے فرمودہ دین کی خدمت. غور کا مقام ہے کہ کیا دنیا میں اُمیوں کو یہی مرتبے حاصل ہوا کرتے ہیں؟ جو اولوالعزم اہل علم کو بھی نصیب نہیں ہوئے.

فلسفی

سب سے آخر فلسفیوں کے گروہ کو لیجئے، جو کبھی کسی کے نہیں ہوئے. ہر نظریہ ہیچ اور ہر دلیل متروک. لیکن یہاں انوکھا ہی طریق کار ہے. ابنِ سینا، ابنِ رشد، طوسی و فارابی، رازی و شیرازی سب کے سب اُسی زلفِ معنبر کے اسیر اور سب کے دامنِ عقیدت اُسی اُمیؐ کے بندِ نعلین سے وابستہ نظر آتے ہیں.

پاکستان کے چھوٹے چھوٹے قریوں اور موضعوں سے لے کر عرب کے ریگستانوں اور چٹیل میدانوں، افریقہ کے صحراؤں اور بیابانوں، لندن، پیرس اور امریکہ کے تمدّن زاروں تک، ہر روز اور ہر روز میں بھی پانچ پانچ بار کس کے نام کی پکار اللہ تعالیٰ کے اِسم پاک کے ساتھ ساتھ ہوتی رہتی ہے؟ اپنی ذاتی عقیدت مندی کو الگ رکھیے، محض ایک خالی الذھن اور ناطرفدار تماشائی کی حیثیت سے محض واقعات پر نظر کر کے فرمائیے کہ یہ مرتبہ واکرام کسی رہبر، کسی ہادی کو حاصل ہوا ہے؟ جو آسمانوں کے نبی، چرند وپرند کے نبی، زمینوں کے نبی، عرش وفرش کے نبی، کوہ ودشت کے نبی، سمندروں اور پہاڑوں کے نبی، حیوانات وجمادات کے نبی اُمی کو حاصل ہوا. اور حاصل بھی اُس وقت ہوا جب کہ قوّت والے اور زور آور قریش اپنے خیال میں اُس کو ہمیشہ کے لیے مٹا دینے کے مستحکم ارادے کر چکے تھے، تو وعدہ ہوتا ہے: ﴿وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ﴾ ہم نے تیرے لیے تیرا ذکر بلند کر رکھا ہے. جس میں ازلیت واوّلیت اور بقاودوام کی مستحکم حقیقتیں پوشیدہ ہیں.

اگر ذکر اُس کا بلند نہ ہوگا تو اور کس کا ہوگا؟ نام اُس کا سرفراز نہ ہوگا تو اور کس کا ہوگا؟ بلندیٔ ذکرِ محمد ﷺ کی یہ وہ تفسیر ہے جو اوراقِ لیل ونہار پر پونے چودہ سو برس سے ثبت چلی آرہی ہے اور حشر سے آگے تک چلی جائے گی پھر حشر کے دن بھی جو عنداللہ حضور ﷺ کا مرتبہ ہوگا. وہ تو ہوگا ہی، اُس سے قطع نظر کر کے صرف اُس مرتبہ کا تصوّر کیجیے جو محض اُس بلندیٔ ذکر کے لحاظ سے اُس روز حاصل ہوگا، کہیں سے ملوک وسلاطین فوج در فوج آرہے ہیں. کہیں سے تاجروں کے ٹھٹ کے ٹھٹ، کہیں سے محدثین کرام اور فقہائے عظام جوق در جوق حاضری کی تمنا لے کر حاضرِ حضور ہو رہے ہیں، کہیں سے مفسّرین، اہلِ اُصول، اہلِ تصوف، اہلِ لغت، اہلِ سیر، اہلِ رجال، اہلِ صرف ونحو، اہلِ معانی، اہلِ بیان، اہلِ اخلاق، اہلِ منطق، اہلِ فلسفہ غرضیکہ جس فن کو لیجئے اُسی کے آئمہ، ادب سے پرے جمائے اور ہاتھ باندھے خادمانہ انداز میں کھڑے ہیں. کون ہے جو اُس انعام کی تصویر کھینچے اور اُس میدان کا تصور کر سکے. وَصَلَّی اللّٰهُ عَلٰی حَبِيْبِهٖ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمْ.

آدابِ دربارِ رسالت

﴿ اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ ﴾

(تحقیق) یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مومنوں کو اپنی جان سے بھی اولیٰ ہیں [الاحزاب ۳۳:۶]

چشمِ فلک نے لکھوکہا دنیوی تاجداروں کے درباروں کا جاہ وجلال اور تزئین و آرائش بھی دیکھی ہوگی کہ چاؤش ونقیب، خیل وحشم، تخت وتاج، تزک واحتشام اور حاجب ودربان سب کچھ موجود ہوتے ہیں. جب کہیں جا کر شاہی رعب وداب بمشکل کام کرسکتا ہے، لیکن دربارِ رسالت میں یہ کچھ بھی نہ تھا. ایک سادگی تھی جو پورے دربار پر چھائی ہوئی تھی. نہ روک تھی نہ ٹوک، نہ در نہ دربان، نہ قالینوں کا فرش، نہ زرق برق وردیوں والے چوب دار، نہ تخت وتاج کی آرائش، اِس کے باوجود وہ ہیبت تھی، وہ جلال تھا کہ لوگ بیٹھے ہوئے ایسے معلوم ہوتے تھے کہ اُن کو کھجوروں کے کھوکھ (یعنی کٹے تنے) سمجھ کر اُن کے سروں پر چڑیاں آبیٹھتی تھیں. جب سرورِ کائنات مفخرِ موجودات صلی اللہ علیہ وسلم کچھ کلام فرماتے تو دربار بھر میں ایک سناٹا چھا جاتا. ہر شخص مؤدب ہوتا اور سب کے سب سر فرطِ ادب سے جھکے دکھائی دیتے. کوئی فخر وامتیاز نظر نہ آتا اور نہ ہی کسی امیر یا غریب درباری کی نشستوں کا یقین ہوتا. جس مرتبہ ولیاقت کا آدمی ہوتا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُس سے اُسی قسم کی گفتگو فرماتے اور اُس کی صوری ومعنوی حیثیت کے مطابق پیش آتے. روم وایران کے درباروں کی طرح گو اِس دربار میں رسمی تعظیم وقیام وبجود نہ تھا، تاہم آپ جوشِ محبت میں کبھی کبھی کسی کے لیے ضرور کھڑے ہو جاتے کیونکہ تعظیم ومحبت میں بڑا فرق ہے اور اِس کھڑے ہونے میں حلیمہ سعدیہؓ، آپ کا رضائی بھائی حضرت زبیرؓ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں. آپ کا دربار آپ کی مسجد ہی تھی. مسجد ہی عدالت، مسجد ہی مدرسہ، مسجد ہی مہمان خانہ، مسجد ہی کچہری اور مسجد ہی درس و ارشاد کا گہوارہ تھی. صحابہ کرامؓ نے ایک جانب آپ کے لیے چھوٹا سا مسجد کا چبوترہ بنا دیا تھا. حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُسی پر جلوہ افروز ہوتے تو چاروں طرف صحابہ کرامؓ حلقہ بنا کر بیٹھ جاتے. کوئی امتیاز نہ تھا اور باہر سے آنے والا یہ امتیاز ہی نہ کرسکتا تھا کہ "شمعِ محفل" کون ہے؟ اور اِس دربار کی سیادت کسے حاصل ہے؟ بدوؤں کے اکثر قبائل آتے اور وحشیانہ انداز میں مخاطب ہوتے مگر آپ پرواہ نہ فرماتے.

تعلیم وارشاد کی صحبتیں صبح کے وقت منعقد ہوتیں اور ہر قسم کے مسائل زیرِ بحث آتے۔ کبھی ہر نماز کے بعد بھی وعظ فرمایا جاتا مگر پند و نصائح کے مبحث پر خصوصاً تیسرے روز گفتگو ہوتی۔ بعض اوقات لوگ رونے لگ جاتے اور کبھی کبھی ہلکا سا تبسمانہ رنگ بھی پیدا ہو جاتا۔ آپ دقیق مسائل اور عسیر الفہم موضوعات پر گفتگو پسند نہ فرماتے جنہیں عوام نہ سمجھ سکیں۔ ایک مرتبہ بعض صحابہؓ میں مسئلہءِ تقدیر پر بحث چھڑی ہوئی تھی کہ حضور ﷺ حجرہ شریفہ سے باہر تشریف لے آئے اور فرمایا کہ کیا تم قرآن کو ٹکرا دینے کے لیے پیدا ہوئے ہو؟ گذشتہ اقوام ایسے ہی عمل سے برباد ہوئی ہیں۔ لوگ شہرت طلبی کو بالعموم خلوصِ عمل کے مخالف سمجھتے تھے، لیکن حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی ثواب کا کام کرے گا تو شہرت لازماً ہو گی مگر مقصد ثواب ہونا چاہیے۔

غرضیکہ دربار کیا تھا ایک فیضِ قدس تھا جس سے لوگ بڑی بڑی بصیرتیں حاصل کرتے، کیونکہ سرکارِ دو عالم ﷺ کی حیاتِ انسانی کا ہر دائرہ مکمل تھا۔ جہاں آپ نے عامہ اہلِ عالم کو شریعت غرا کی کامل تعلیم دے کر استادِ جہاں اور بہترین خلائق بنا دیا تھا، وہاں خواص کو طریقت کی تعلیم سے روحانیت وعرفان کے مشاہدات بھی کرائے اور ﴿وَفِیْ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ﴾ کی عملی تفسیریں بھی سمجھائیں، تاکہ یہ سلسلہ اولیاء اللہ کے ذریعے تا قیامِ قیامت اصلاحِ اُمت کا کام کرتا رہے اور صوفیائے عظام حضور ﷺ کے نائب ہونے کی حیثیت سے ہر ضرورت کے وقت میدان میں آئیں۔

ایک روز اِسی قسم کی ایک مجلسِ عرفان منعقد تھی جس میں حضرت صدیق اکبر، علی المرتضیٰ، عثمان ذوالنورین، ابو ہریرہ، عبداللہ بن مسعود، خالد، بلال، ہلال اور دیگر سخن شناس صحابہٴ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین مجلس میں تشریف فرما تھے اور حضور ﷺ ایک پیرِ طریقت اور مرشدِ حقیقت کی حیثیت سے سجادہ پر تشریف رکھتے ہوئے حقائقِ معرفت، اسرارِ عرفان اور رموزِ مخفی، خاص محویّت و خاص انداز کے ساتھ بیان فرما رہے تھے۔ محفل کی محفل ایک بقعہءِ نور بنی ہوئی تھی۔ تجلیات پرتو افگن تھیں۔ عجیب کیفیت اور عجیب رنگ تھا کہ حضرت عمرؓ بھی تشریف لے آئے۔ آپ کے محفل میں بیٹھتے ہی سرکارِ دو عالم نبی مکرم ﷺ خاموش ہو گئے۔ حاضرین متعجب ہوئے کہ شاید یہ حقائق و اسرارِ ربانی سرکارِ دو عالم حضرت عمرؓ کو بتانا نہیں چاہتے۔ حضور ﷺ نے حاضرین کے اِس خیال سے آگاہی پاتے ہی فرمایا، یہ بات نہیں کہ میں عمر سے کچھ چھپانا چاہتا ہوں مگر طفلِ شیر خوار کو گوشت اور حلوہ نقصان کرتا ہے اور جب بچہ بالغ ہو جاتا ہے پھر سب کچھ کھاتا ہے۔ حضور ﷺ کے اِس ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ اِس وقت حضرت عمرؓ اسلام میں ایک مبتدی کی حیثیت میں تھے اور آپ کی تعلیمِ روحانی ابتدائی تھی جو بعد کو مکمل ہوئی۔ یہاں سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ وہ پیر غلطی کرتے ہیں جو مبتدیوں اور نااہلوں کے سامنے اسرارِ معرفت بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں کیونکہ راز کی بات جب بھی باہر جائے گی شریعت و طریقت کو نقصان پہنچے گا اور دونوں نظریات ٹکرا کر فتنہ برپا ہو گا۔ چنانچہ اِس سکوت کے بعد اِسی مجلس میں حضور ﷺ نے حضرت عمرؓ

کو آگے تعلیم دینی شروع کی اور فرمایا: ((مَنْ عَرَفَ اللّٰهُ لَا یَقُوْلُ اللّٰهُ وَمَنْ یَقُوْلُ اللّٰهِ لَاعَرَفَ اللّٰه))
یعنی جو کوئی پہچانتا ہے اللہ کو، کہتا نہیں اللہ. اور جو کوئی کہتا ہے اللہ، وہ پہچانتا نہیں اللہ. گویا بچہ جب تک باپ کے رتبہ سے آگاہ نہیں ہوتا، اُس وقت تک اُس کا نام نہیں لیتا. جب واقف ہو جاتا ہے تو اُس کے بعد ادب باپ کا نام لینے سے باز رکھتا ہے. اِس پر حضرت عمرؓ نے سوال کیا کہ یہ کیا شناخت ہوئی کہ بندہ آقا کا نام نہ لے اور اُس کو یاد نہ کرے؟ فرمایا. قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَمَا كُنْتُمْ﴾ اے عمر جو شخص اپنے آقا کے ہمراہ یا حضور میں حاضر ہو اور اُسے دیکھ بھی رہا ہو اُس کا اُس کو پکارنا یا یاد کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ حضرت عمرؓ نے پھر عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میرے ماں باپ قربان ہوں، خدا ہمراہ کہاں ہے؟ فرمایا ﴿اِنَّ اللّٰهَ فِیْ قُلُوْبِ الْعِبَادِ﴾ یعنی اللہ بندوں کے دلوں میں موجود ہے. پھر عرض کیا بندہ کہاں ہے؟ فرمایا ﴿وَهُوَ الْاِنْسَانُ﴾ یعنی وہ انسان ہے. لیکن اے عمر ذہن نشین کر لو کہ دل کی بھی دو قسمیں ہیں، ایک قلبِ مجازی اور دوسرا قلبِ حقیقی. قلبِ حقیقی وہ دل ہے جو نہ بائیں طرف ہے نہ دائیں طرف، نہ نیچے ہے نہ اوپر ہے، نہ دور ہے نہ نزدیک. لیکن مرشدِ کامل کے ارشاد اور صحبت کے بغیر کوئی بھی اِسے سمجھ نہیں سکتا. حقیقت یہ ہے کہ قربِ ربانی پر یہ چیز حاصل ہوتی ہے. ارشاد ہے کہ ((قُلُوْبُ الْمُؤْمِنِیْنَ عَرْشُ اللّٰهِ تَعَالٰی وَقَلْبُ الْمُؤْمِنِ حَافِرَةٌ مِنْ ذِكْرٍ كَثِیْرٍ فَهُوَحَیٌّ)) یعنی مومنوں کے دل ربّ العزت جل وعلا شانہٗ کا عرش ہیں اور مومن کا قلب زیادہ ذکر و شغل میں رہنے سے زندہ ہو جاتا ہے اور حضرات صوفیائے کرام اور درویشانِ عظام کی اصطلاح میں یہی مقام "ذکرِ خفی" ہے. حضرت عمرؓ نے پھر سوال کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ مومن اور مسلم میں کیا فرق ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا ((لَیْسَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ یَجْتَمِعُوْنَ فِی الْمَسَاجِدِ وَیَقُوْلُوْنَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ عَلَى الرَّسْمِ)) یعنی جو لوگ مسجدوں میں جمع ہو کر محض رسمی طور پر کلمہ پڑھتے ہیں وہ مومن نہیں. اے عُمر رسمی طور پر کلمہ پڑھنے والے حقیقت میں مومن سے بے خبر ہیں اور مومن سے بیخبر ہونا تو درکنار رہا منافق ہیں. اِس لیے کہ زبان ظاہری سے تو لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہتے ہیں لیکن حقیقت سے بالکل بے بہرہ اور بہت دور ہیں اور نہیں جانتے کہ کلمہ کیا ہے؟ اور اِس کا مقصود کیا ہے؟ اِس کے معانی کیا ہیں؟ اِن معنوں میں لَا اِلٰهَ کہنا "کہ ہے" اور "نہیں ہے". اوّل "نہیں ہے" کہتے ہیں اور آخر میں "ہے" کہتے ہیں اس طرح وہم و شک میں پڑ جاتے ہیں. جو قطعی کفر ہے. رسمی کلمہ کو گویائی زبان کے سوا اور بجز زبانی جمع خرچ کے کچھ نہیں جانتے کہ کس کی نفی کر رہے ہیں اور کس کا اثبات؟ حضرت عمرؓ پھر عرض گزار ہوئے یا رسول اللہ ﷺ پھر کلمہ کیا ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ حق سبحانہٗ وتعالیٰ کے سوا کوئی موجود نہیں اور محمد ﷺ ظہورِ خدا ہیں. اِس لیے چاہیے کہ خطرۂ ماسوا اللہ کی نفی کرے اور ذاتِ احدیت کو ہر چیز اور ہر جگہ میں ثابت قرار دے. قال اللہ تعالیٰ ﴿فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾ یعنی ہر جگہ کہ منہ کرو اُسی

جانب اللہ تعالیٰ کو متوجہ پاؤ گے. اے عمر! جب بندہ انہی صفات کی نفی اور ذاتِ خدا کا اثبات کرے تو وہ درجۂ نہایت پر پہنچے گا اور مَنْ عَرَفَ رَبَّهٗ كَلَّ لِسَانُهٗ کی منزل میں آئے گا. یعنی جو اپنے رب کو پہچان لیتا ہے اُس کی زبان بند ہو جاتی ہے اور یادِ الٰہی و ذکرِ خداوندی کی وادی سے بڑھ جاتا ہے. اے عمر! یقین رکھ اور خوب سمجھ لے کہ جب تک سالک اپنی نفی نہ کرے اور یاد اللہ سے نہ گزرے، وہ وحدت کی منزل میں نہیں آتا اور دوئی کے جھمیلے میں پڑا رہتا ہے اور دوئی ہی عین شرک و کفر ہے اور حقیقی کلمہ کا یہی مطلب ہے.

حضور ﷺ کی یہ تعلیم محض الفاظی اور عقلی نہ تھی. جو ارشاد کیا جاتا تھا وہ دکھایا بھی جاتا تھا. یہ کلمہ کی تعلیم تھی جو تصوف کی اعلیٰ ثانوی تعلیم کا پہلا عینی درس تھا اور یہی مفہوم ہے اُس ارشادِ باری تعالیٰ کا ﴿يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ﴾ یعنی ”اے ایمان والو! لبیک کہو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی پکار پر جب وہ رسول بُلائے تمہیں اُس امر کی طرف، جو زندہ کرتا ہے تمہیں“. یعنی مومنوں کو لازم ہے کہ جس وقت رسول اللہ ﷺ بلائیں خواہ وہ کسی حالت میں ہوں فوراً بلا توقف جواب دے کر حاضرِ حضور ہو جائے. خواہ عبادت کی حالت میں ہی کیوں نہ ہو. کیونکہ ہوسکتا ہے کہ جو نماز وہ ادا کر رہا ہے اُس کی ہی منسوخی کا حکم آ گیا ہو. چنانچہ صحیح بخاری میں ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ ایک روز ایک صحابی ابوسعید بن کعب ؓ کی طرف سے گزرے. آپ نے اُن کو طلب فرمایا. سرکار کی آواز تو اُنہوں نے سن لی مگر ذرا دیر سے حاضر ہوئے. آپ ﷺ نے اُن سے تاخیر و توقف کا سبب پوچھا تو اُنہوں نے عرض کیا. یا رسول اللہ ﷺ میں نماز میں تھا اِس لیے فوراً حاضرِ حضور نہ ہوسکا. اِس کے جواب میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ کیا تو نے یہ حکم خداوندی قرآنِ کریم میں نہیں پڑھا کہ ”قبولِ حکمِ رسول بلا توقف واجب ہے“ اور پھر آیت مندرجہ بالا تلاوت فرمائی. اِسی طرح آدابِ رسالت بھی سمجھائے جاتے اور عرفان و اسرارِ سرمدی کے راز بھی بے نقاب کر کے وجد و قال کے رموز سے آگاہ فرمایا جاتا.

آدابِ نبوی ﷺ کے متعلق قرآنِ پاک میں ایک دوسری جگہ سورۂ نور میں ارشاد ہوتا ہے ﴿لَا تَجْعَلُوْا دُعَاءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا﴾. یعنی اے مومنو! تم ہمارے محبوب کو پکارنا اور بلانا ایسے رنگ میں نہ اختیار کرو، جیسے تم آپس میں ایک دوسرے کو بلاتے ہو بلکہ حضور ﷺ کو کمالِ تعظیم و توقیر سے بلاؤ. اِس لیے کہ ہمارے محبوب نہایت عظیم الشان اور عالی قدر ہیں. اُن کو دوسروں کے مساوی خیال کرنا اور عوام کی حیثیت پر محمول رکھنا بہ نصِ قرآنی حرام ہے. اِس کے علاوہ اور بھی ایک آیت شریفہ سورۂ حجرات میں ہے. جس کے حکم نے صحابہ کرامؓ میں سے بعض صحابہ ؓ کو دربارِ نبوت کی حاضری سے محروم کر دیا. چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ﴾ یعنی اے

مومنو! آنحضرت ﷺ کی آواز سے اپنی آوازوں کو بلند نہ کرو اور نہ ہی آپس میں ایک دوسرے کو پکارنے کی طرح محبوب ﷺ کو پکارو (جیسے تم ایک دوسرے کو عمومی زبان میں پکارتے ہو) مبادا تمہارے تمام اعمالِ صالحہ جو تم نے کیے اور ساری جو تم نے نیکیاں کمائیں، ضبط و خبط اور ضائع ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو.

بخاری میں ابن زبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اس آیتِ شریفہ کے نزول کے بعد کئی دن تک حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ دربارِ رسالت میں حاضر نہ ہوئے. اِس لیے کہ اُن کی آواز قدرتی طور پر عام آوازوں سے موٹی اور بلند تھی. حاضرین دربارِ رسالت سے کسی نے کہا کہ میں اُن کا حال معلوم کروں کہ وہ کیوں حاضر حضور ﷺ نہیں ہوتے؟ چنانچہ وہ اُن کے درِ دولت پر حاضر ہوئے تو دیکھا کہ حضرت ثابت رضی اللہ عنہ سر جھکائے ہوئے مغموم و محزون بیٹھے ہیں. پوچھا کہ کیا حال ہے؟ ثابت رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ حال کیا عرض کروں. جب سے یہ آیت سرکارِ دو عالم ﷺ پر نازل ہوئی ہے مجھے اپنے اعمالِ صالحہ کے ضبط ہونے کا پتا چل گیا ہے کیوں کہ میں بلند آواز ہوں. اُس شخص نے اس گفتگو کی اطلاع حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کی اور پھر واپس حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا کہ ثابت رضی اللہ عنہ مجھے حضور ﷺ نے پھر بھیجا ہے کہ تم کو بشارت دوں کہ ﴿اِنَّکَ لَسْتَ مِنْ اَهْلِ النَّارِ وَ لٰکِنَّکَ مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ﴾ یعنی تو ناری اور جہنمی نہیں بلکہ تو اہلِ جنت سے ہے اور معالم میں یہ واقعہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ جب یہ آیت اُتری تو ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ راستے میں بیٹھ کر رونے لگ گئے. حضرت عاصم رضی اللہ عنہ نے دیکھا تو پوچھا کیوں روتے ہو؟ بولے، اِس آیت کے نزول نے رُلا دیا ہے کیوں کہ میں بلند آواز ہوں اور ڈرتا ہوں کہ کہیں یہ میرے حق میں ہی نہ اتری ہو. پھر وہاں سے اُٹھ کر گھر چلے آئے اور بیوی سے کہا، جب میں اپنے حجرے میں جاؤں تو دروازہ بند کر دینا. میں اُس وقت تک باہر نہ نکلوں گا جب تک حضور ﷺ راضی نہ ہو جائیں. یا اللہ تعالیٰ مجھے موت نہ دے دے. اُدھر عاصم رضی اللہ عنہ دربارِ نبوت میں حاضر ہوئے اور نبی مکرم ﷺ سے ثابت کا واقعہ بیان کیا. اُس وقت حضور ﷺ نے فرمایا: جاؤ! ثابت رضی اللہ عنہ کو میرے حضور میں لاؤ. حضرت عاصم رضی اللہ عنہ آئے اور حضور ﷺ کا ارشاد سنایا. ثابت رضی اللہ عنہ ساتھ ہو لیے اور آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پہنچے. ارشاد ہوا: اے ثابت! تجھے کس چیز نے رُلایا ہے؟ عرض کیا کہ اِس آیت کا نزول میں نے سمجھا میرے حق میں ہے، کیوں کہ میں بلند آواز ہوں. فرمایا اے ثابت رضی اللہ عنہ! کیا تو خوش نہیں کہ اَنْ تَعِیْشَ حَمِیْدًا فَتُقْتَلَ شَهِیْدًا وَ تَدْخُلَ الْجَنَّةَ. یعنی "تو زندہ رہے تو نیک نام اور مارا جائے تو شہید اور داخل ہو جنت میں". اِس بشارت کو سن کر ثابت رضی اللہ عنہ نے عرض کیا رَضِیْتُ بِبُشْرَی اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَلَا اَرْفَعُ صَوْتِیْ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ یعنی میں رسول اللہ ﷺ اور اللہ کریم جل شانہٗ کی بشارت کے ساتھ راضی ہوا اور میں کبھی اپنی آواز کو رسول اللہ ﷺ کی آواز پر بلند نہیں کروں گا علماءِ اُمت کا اس مسئلے میں اجماع ہے کہ یہ تمام امور جیسا کہ

حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ ظاہری میں ممنوع اور مومنوں کے لیے واجب العمل تھے ویسے ہی بعد میں بھی واجب العمل ہیں اور قیامت تک ممنوع رہیں گے۔

حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کے متعلق مشہور روایت ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ جنگِ یمامہ میں شہید ہوئے اور زندگی میں جتنا عرصہ زندہ رہے اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم اُن کو چلتے پھرتے دیکھ کر کہا کرتے تھے کہ یہ جنتی جا رہا ہے کیوں کہ انہی کے اس عمل پر اس آیت کا نزول ہوا۔ ﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ یَغُضُّوۡنَ اَصۡوَاتَہُمۡ عِنۡدَ رَسُوۡلِ اللّٰہِ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ امۡتَحَنَ اللّٰہُ قُلُوۡبَہُمۡ لِلتَّقۡوٰی ؕ لَہُمۡ مَّغۡفِرَۃٌ وَّ اَجۡرٌ عَظِیۡمٌ﴾ یعنی "بے شک جو لوگ اپنی آوازوں کو رسول اللہ ﷺ کے حضور میں پست کرتے ہیں وہ وہی ہیں جن کے دل اللہ تعالیٰ نے تقویٰ سے آزمائے، اُن کے لیے مغفرت اور بڑا اجر ہے"۔ بزرگانِ دین نے فرمایا ہے کہ حضور ﷺ کی یہ حرمت حیاتِ ظاہری اور حیات بعد الموت میں مساوی ہے اور بحضور روضۂ اقدس بھی آواز کا بلند کرنا اور بے تکلف بولنا حرام ہے۔ چنانچہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دو آدمی مسجدِ نبوی ﷺ میں بزمانہ خلافت امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ بلند آواز سے باتیں کرتے تھے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تشریف لے آئے اور اُن کی گفتگو سن کر فرمایا کہ تم کو معلوم ہے تم کہاں بیٹھے ہو؟ اور یہ بتاؤ کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ اُنہوں نے عرض کیا کہ ہم طائف کے رہنے والے اور حضور ﷺ کی مسجد میں بیٹھے ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر تم مدینہ طیبہ کے رہنے والے ہوتے تو میں تم کو سزا دیتا۔ یہ اِس لیے فرمایا کہ اہل مدینہ ایسے مسائل میں بوجہ قرب وقدامتِ اسلام خوب جاننے والے تھے اور طائف والے دور ہونے کے باعث مابعد الاسلام بھی تھے کیوں کہ اُن کا اسلام لانا فتح مکہ کے بعد ہوا۔ لفظ لَا تَجۡہَرُوۡا سے مفسرین نے آپ کو "خالی نام سے نہ پکارنا" مراد لیا ہے۔ جیسے یا محمد ﷺ، یا احمد ﷺ وغیرہ بلکہ فرمایا "یا نبی اللہ"، "یا رسول اللہ" ﷺ کہنا چاہیے تا کہ دوسروں سے مساوات نہ ہو اور آیت شریفہ ﴿یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَقُوۡلُوۡا رَاعِنَا وَ قُوۡلُوا انۡظُرۡنَا﴾ سے تو مستفاد ہوتا ہے کہ وہ الفاظ ہی چھوڑ دو جن کے استعمال سے یہود کی پکار میں کوئی ذرا سا پہلو بھی میرے محبوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کی توہین کا نکلتا ہو۔ یعنی ابتداء میں جب تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین دربارِ نبوت میں حاضر ہوتے اور سرکارِ انبیا ﷺ کچھ پند ونصائح بیان فرماتے تو جو لوگ ذرا دور ہوتے یا آوازِ مبارک پوری طرح نہ سنتے تو عرض کرتے رَاعِنَا یَا رَسُوۡلَ اللّٰہِ ﷺ یعنی اے اللہ کے رسول! ہماری بھی رعایت فرمایئے اور ہماری طرف بھی متوجہ ہوئیے۔ اِن الفاظ کو سن کر بعض منافقین جو مسجد میں حاضر ہوتے، اپنی زبانوں کو ذرا کھینچ کر ازراہِ توہین رَاعِیۡنَا کہہ دیتے، جس کے معنی بجائے رعایت کے چرواہے یا احمق کے ہو جاتے ہیں، تو اُن کا یہ حاسدانہ فریب مولا کریم جل وعلا شانہٗ کو اپنے محبوب کے حق میں پسند نہ آیا اور مومنوں کو ارشاد فرما دیا کہ اے ایمان والو! تمہارے لفظ رَاعِنَا کے استعمال کرنے کو دیکھ کر کفار ومنافقین بھی ازراہِ بغض وکینہ

اپنی نافرمان زبانوں سے میرے محبوب کے حق میں رَاعِنَا بولتے ہیں، جس سے مخفی طور پر میرے محبوب کی توہین کا شائبہ پیدا کر لیتے ہیں لہٰذا تم لفظ رَاعِنَا کا کہنا ہی ترک کر دو اور لفظ اُنْظُرْنَا سے خطاب کرو کہ یا رسول اللہ ﷺ ہماری جانب نظر فرمائیے یا دیکھئے تا کہ کفار و منافقین رَاعِنا کہہ ہی نہ سکیں کیوں کہ تم ہم کلام ہوتے وقت اِس کو بطورِ تعظیم و تکریم استعمال کرتے ہو اور وہ بباطن توہین و تحقیر کا مطلب لیتے ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ ایسا لفظ جس سے دشمن کا تکلم مخفی طور پر بھی محبوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تحقیر و توہین پر دلالت کرتا ہو، ترک ہی کر دیا جائے. اِس پر مفسرین نے لکھا ہے کہ اِسی لفظ پر حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کا چند یہودیوں سے جھگڑا ہوا کہ تم یہ لفظ بول کر حضور ﷺ کی توہین مراد لیتے ہو. اگر تم نے پھر بولا تو میں تم میں سے ایک ایک کو قتل کر دوں گا. اُنہوں نے جواباً کہا: اے سعد! اِس لفظ کا استعمال رسول ﷺ کی جناب میں مسلمان بھی تو جائز رکھتے ہیں. یہ سن کر حضرت سعدؓ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ اے ایمان والو! تم ہمارے پیغمبر کی جناب میں لفظ رَاعِنا نہ کہو، کیوں کہ یہودی تمہارے قول کو سند ٹھہرا کر اور فاسد معنی مراد لے کر ہمارے محبوب کی خدمت میں استعمال کرتے ہیں اور اِس میں ایک قسم کی قبیح تلبیس اور بد باطنی کی بو آتی ہے.

امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر کبیر میں فرماتے ہیں کہ اس آیت میں ندا یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِس لیے ہے کہ تاکید و تنبیہ کمال شفقت کے ساتھ پائی جائے کیوں کہ مخاطب اُس کے فدایانِ رسول ﷺ ہی ہیں.

آدابِ رسالت و رسول اللہ ﷺ میں ایک اور آیت نازل فرمائی گئی ہے. جس میں کچھ زبان سے بولنا یا کہنا تو درکنار ہر ایسی بات جو حضور ﷺ کے مزاجِ معلّٰی پر بوجھ کا باعث بنے. مولا کریم نے مسلمانوں کے لیے وہ بھی ممنوع قرار دے دی ہے. چنانچہ سورۃ احزاب میں ارشاد ہوتا ہے. ﴿یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتَ النَّبِیِّ اِلَّاۤ اَنْ یُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰی طَعَامٍ غَیْرَ نٰظِرِیْنَ اِنٰىهُ وَ لٰكِنْ اِذَا دُعِیْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَ لَا مُسْتَاْنِسِیْنَ لِحَدِیْثٍ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ یُؤْذِی النَّبِیَّ فَیَسْتَحْیٖ مِنْكُمْ وَ اللّٰهُ لَا یَسْتَحْیٖ مِنَ الْحَقِّ﴾ یعنی "اے ایمان دارو! نبی ﷺ کے گھروں میں نہ داخل ہو، مگر یہ کہ تم کسی کھانے پر بلائے جاؤ. باتوں میں دل نہ لگاؤ کیوں کہ تمہارا یہ فعل ہمارے محبوب کو تکلیف دیتا ہے. وہ تم سے حیا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ حق فرمانے سے نہیں شرماتا."

اِس آیت کا شانِ نزول امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے اِس طرح بیان فرمایا ہے کہ جب حضور ﷺ نے زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا تو طعامِ ولیمہ تیار کرایا اور صحابہ کرامؓ کو طلب فرمایا. اُن میں سے ایک ایک گروہ آتا اور کھانا کھا کر چلا جاتا. جب سب کھا کر فارغ ہو گئے تو

حضرت انسؓ نے عرض کیا کہ اب کیا ارشاد ہے؟ فرمایا: کھانا بڑھاؤ! چنانچہ کھانا بڑھا دیا گیا اور دو تین آدمی بیٹھے باتیں کرتے رہے. حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود اٹھ کھڑے ہوئے تا کہ یہ آدمی بھی چلے جائیں اور آپ ازواجِ مطہرات کے حجروں کی جانب تشریف لے گئے اور ہر حرم کے حجرہ پر پہنچ کر فرماتے: السلام علیکم یا اہل البیت ورحمۃ اللہ! آگے سے جواب عرض ہوتا: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ. فرمایئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اہل کو کیسا پایا؟ اللہ تعالیٰ مبارک کرے. تمام حجروں سے ہو کر پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو دیکھا کہ وہ دو تین آدمی ابھی بھی بیٹھے ہیں. آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہایت باحیا تھے، اُن کو کچھ نہ فرمایا اور پھر واپس ہو کر حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرے کا رخ فرمایا لیکن پیچھے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع پہنچی کہ وہ اشخاص چلے گئے ہیں. آپ صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لے آئے اور ایک پاؤں دروازے کے اندر رکھا اور حجاب ڈال دیا.

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اِس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتنی سی اذیّتِ قلبی بھی باری تعالیٰ کو منظور نہیں کہ بلائے ہوئے دوست اور مہمان کھانا کھانے کے بعد باتوں میں لگ جائیں اور محبوب صلی اللہ علیہ وسلم پر اُن کا بیٹھنا تنگی پیدا کرے. فوراً حکم آ گیا کہ کھانا کھا کر فوراً اجازت مانگ لیا کرو تمہارے باتوں میں لگ جانے سے ہمارے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف ہوتی ہے.

ایسا ہی ایک لطیف اشارہ سورۂ توبہ میں ہے. ارشاد ہوتا ہے ﴿مَا كَانَ لِأَهْلِ الْمَدِينَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِنَ الْأَعْرَابِ أَنْ يَتَخَلَّفُوا عَنْ رَسُولِ اللَّهِ وَلَا يَرْغَبُوا بِأَنْفُسِهِمْ عَنْ نَفْسِهِ ط﴾ یعنی مدینہ والوں اور اُس کے اردگرد رہنے والوں کو جائز نہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ دیں اور اپنی جانوں کے تحفظ کی جانب راغب ہوں. تفسیر احمدی میں ہے کہ ابوخیثمہ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمراہی سے رہ گئے تھے اور مجاہدین کے چلے جانے کے بعد یہ اپنے باغ میں گئے. آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حسین وجمیل بیوی نے فرش بچھایا. عمدہ کھجوریں پیش کیں. ٹھنڈا پانی حاضر کیا. آپ (یعنی ابوخیثمہؓ) نے سب اشیاء دیکھ کر فرمایا: گوسایہ گنجان، کھجوریں پختہ، آبِ سرد، بیوی حسین، سب کچھ موجود ہے لیکن اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم دھوپ اور کڑکتی لُو میں ہوں تو یہ اچھا نہیں کہ میں یہاں آرام کروں. خیال آتے ہی فوراً اٹھ کھڑے ہوئے، ناقہ کسا، تلوار حمائل کی، نیزہ اٹھایا اور تیز ہوا کی طرح روانہ ہوئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو راستہ میں ہی جا لیا.

اُدھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی راہ کی جانب نظر اٹھائی اور دیکھا کہ ایک تیز رفتار سوار آ رہا ہے. دیکھ کر بطور تمنا فرمایا کہ کیا اچھا ہو، یہ سوار ابوخیثمہؓ ہو. پھر جب قریب آئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو دیکھا تو بہت خوش ہوئے اور اُن کے حق میں طلبِ مغفرت فرمائی. حقیقت یہ ہے کہ جملہ آیاتِ قرآنیہ سے روزِ روشن کی طرح یہ ثابت ہوتا ہے کہ سرکارِ انبیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام مخلوقِ الٰہی سے اعلیٰ و بالا اور افضل واکرم

ہیں اور ''بعد از خدا بزرگ توئی'' کا صحیح استحقاق حضور ﷺ ہی کو حاصل ہے جیسا کہ حضرت سراج الامت امام ہمام سیدنا امام اعظم رضی اللہ فرماتے ہیں:

وَاللّٰہُ یَا یٰسِیْنَ مِثْلُکَ لَمْ یَکُنْ فِی الْعٰلَمِیْنَ وَحَقٌّ مِنْ اَنْبَاکَ

یعنی خدا کی قسم تمام مخلوقِ الٰہیہ میں آپ ﷺ جیسا نہ کوئی ہوا ہے، نہ ہوگا اور قسم ہے اس کے حق کی جس نے آپ ﷺ پر قرآن اتارا ہے، بے شک آپ ﷺ کی ذاتِ بابرکات بے مثل و بے مانند ہے اور جہان بھر میں نہ کوئی آپ ﷺ کا عدیل ہے، نہ مثیل. آپ ﷺ اشرف المخلوقات اور اکمل المکنونات پیدا فرمائے گئے ہیں.

بخاری شریف میں خود سرکارِ دوعالم ﷺ فرماتے ہیں ((اَیُّکُمْ مِثْلِیْ)) اور دوسری حدیث میں ارشاد ہوتا ہے ((لَسْتُ مِثْلُکُمْ)) یعنی تم میں میری مانند کون ہے؟ اور میں تمہاری مثل نہیں ہوں. پھر ایک تیسری حدیث شریف میں ہے ((لَسْتُ کَھَیْئَتِکُمْ)) یعنی میں تمہاری ہیئت پر بھی نہیں ہوں.

اِن ارشادات کے بعد کون سا ایماندار ہے جو یہ کہنے کی جرأت کرے کہ آپ ﷺ میری مثل ہیں اور اگر ایسا کہنا جائز رکھتا ہے تو اُس کو ایمان کی فکر کرنی چاہیے. جس کی مثل ساری کائنات میں پیدا نہیں فرمائی گئی، ایک لایعقل حیوانِ ناطق کو اس دعویٰ میں کہاں تک صادق سمجھا جا سکتا ہے.

عظمتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

﴿ هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا ط ﴾

''وہ خدا ہے جس نے اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کے ساتھ روانہ فرمایا
اور دینِ حق کے ساتھ تاکہ اُس کے دین کو سب دینوں پر غالب فرمائے
اور کافی ہے اللہ تعالیٰ گواہی دینے والا۔'' [التوبہ ۹:۳۳]

عظیم انسانوں کی عظمت پر اہلِ دنیا کا ایمان لے آنا ایک مسلّمہ امر ہے۔ یہاں کی ہر ہستی اپنے اپنے خیال کے مطابق مظاہرِ عظمت کی رنگا رنگ پرستاریاں کرتی ہے لیکن مظاہر عظمت کا تخیل قطعاً جداگانہ ہے جس میں کبھی بھی مشابہت نہیں ہوئی۔ ہر فرد اور ہر گروہ، اپنا اپنا ذوق اور اپنی اپنی نظر رکھتا ہے۔ حکومت و حکمرانی میں عظمت ہے جس پر بادشاہ و حکّام ایمان لاتے ہیں اور شہرت کے بھوکے اُس کی عبادت کرتے ہیں۔ طمّاع اور حریص اس کے آگے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ مال و دولت میں عظمت ہے۔ دولت منداس پر ایمان رکھتے ہیں اور دل و دماغ کے ساتھ اُس کی پوجا کرتے ہیں۔ اِسی طرح اہلِ علم و حکمت کی بھی ایک عظمت ہے اور اُن کے پجاری بھی موجود ہیں۔ حسن میں بھی عظمت ہے اور اُس کے پرستاروں کی بھی کمی نہیں۔ طاقتِ جسمانی میں بھی عظمت ہے جس کے سامنے اکثر ضعیفوں اور کمزوروں کے سر جھکے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ غرض کہ کوئی فن اور صفت ایسی نہیں جس میں عظمت نہ ہو اور اُس کے معتقد اور پرستار بھی نہ ملتے ہوں۔

شاید کوئی بھی اِس مبہم اور مضطرب مفہوم کی تحدید نہیں کر سکتا جس کا نام لوگوں نے عظمت رکھ چھوڑا ہے لیکن اِس پر بھی وہ قدیم سے، دنیا کے لیے ایک بڑا فتنہ رہا ہے۔ ہر شخص اس کو غرض و غایت قرار دیتا ہے۔ اس کے لیے جدوجہد کرتا ہے اور اس کو انسانوں کے مراتب تولنے کی میزان سمجھتا ہے۔

اگر عظمت کا فتنہ اور عظماءٗ کی پرستش موجود نہ ہوتی تو انبیاءِ کرام علیہم السلام کے ذکر پر کسی کے لیے روا نہ ہوتا کہ انہیں عظیم قرار دینے کی بحث کرے۔ اِس لیے کہ انبیاءِ مرسلین علیہم السلام کی شان اِس

سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے کہ انسانی عظمت کی تمام صفوں میں اُن کی جگہ ڈھونڈھی بھی جائے، کیوں کہ یہ صفیں جسمانی کبریائی کے فریبوں اور مادی برائیوں کی ضلالت اندیشیوں سے اِس درجہ پست ہو چکی ہیں کہ انسانیتِ اعلیٰ کے مظاہرِ علو و رفعت کے لیے اُن کی طرف نظر بھی نہیں اٹھائی جا سکتی۔

پھر ہادیٔ سُبل، مولائے کل محمد رسول اللہ ﷺ کا تو مقام رفعت اور بھی بلند ہے۔ جس کی ذاتِ اعظم و اکمل نے اس کے سوا کچھ بھی قبول نہیں فرمایا کہ تمام انسان کنگھی کے دندانوں کی طرح بالکل برابر ہو جائیں۔ نہ عربی کو عجمی پر اور نہ عجمی کو عربی پر کوئی امتیاز ہو۔ انہوں نے یہ فتویٰ بھی دے دیا کہ سب آدمی ہم مرتبہ ہیں اور سب آدمؑ کی اولاد ہیں۔ اُن کی عظیم اور غیر عظیم دو قسمیں ہر گز نہیں ہو سکتیں۔ آپ اِس ارضی عظمت پر کبھی متوجہ نہیں ہوئے، جس کے فتنہ نے اہلِ دنیا کو مفتون بنا رکھا ہے، اِس لیے کہ یہ عظمت درحقیقت بلند نفس انسانوں کے لیے ذِلّت اور رب العٰلمین کی جناب میں شرک ہے۔ حضور ﷺ عظما کی پرستش کے لیے دنیا میں تشریف نہیں لائے تھے اور نہ ہی ایک ''نبی الکل'' کی یہ شان ہو سکتی ہے۔ دنیا خواہ ساری کی ساری ہی عظیم شخصیتوں کی پجاری نظر آئے، حضور ﷺ نے انسانی ساخت کی یہ عظمت کسی بڑے سے بڑے انسان کے لیے بھی تسلیم نہیں فرمائی اور نہ اپنی ذات ہی کے لیے پسند کی حالانکہ وہ حضور ﷺ کے اپنے اختیار میں تھی۔ ایک عظمت نہیں، ایسی ہزاروں عظمتیں، جن پر اہلِ دنیا مرتے رہے حضور ﷺ کے سامنے آئیں، قدم بوس ہوئیں مگر سرکار ﷺ نے کسی ایک پر بھی اظہارِ رغبت نہ فرمایا اور منہ پھیر لیا۔ مولا کریم جلّ شانہٗ نے اختیار دیا کہ عبدیت کے ساتھ نبوت پسند فرمائیں یا بادشاہت کے ساتھ نبی ﷺ ہوں۔ کائنات کے خزانوں کی کنجیاں سامنے ڈال دی گئیں، تاج و تخت کی ساری شوکتیں جمع کر کے مختار فرمایا گیا مگر حضور ﷺ نے عبدیت پسند فرمائی اور غربت کو اختیار کیا۔ اِس لیے کہ آپ ﷺ کی ذات پاک و مقدس کی خوشی اِس میں تھی کہ فقیری میں زندہ رہیں، فقیری میں آخری وقت دنیا سے تشریف لے جائیں اور فقیروں ہی کے زُمرے میں حشر و نشر ہو۔

جو لوگ بادشاہت اور اُس کی عظمت کے پجاری ہیں وہ دیکھ سکتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم نبی اکرم فخرِ بنی آدم و آدم ﷺ نہ تو بادشاہ تھے اور نہ اُنہوں نے بادشاہ ہونا پسند فرمایا۔ آپ ﷺ دنیا کے مال و دولت سے تہی دست تھے اور اُن کی ابدی دولتوں کا خزانہ فقر و فاقہ تھا۔ جو لوگ دنیا کے عظیم سپہ سالاروں اور فاتحوں کے جاہ و جلال کے لیے نگاہِ ادب اور دلِ عظمت سرا رکھتے ہیں، اُن کو معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کے رسول و محبوب محمد مصطفےٰ ﷺ کی فاتحانہ جنگیں وہ نہ تھیں جن میں بادشاہوں کی طرح وہ بھی کبر و غرور کا مجسمہ نظر آتے، اور نہ اُن کے لیے یہ لکھنا تعجب میں ڈالتا ہے کہ وہ اُمّی تھے، کیوں کہ دنیا کا صناعی لکھنا پڑھنا نہ تو اُنہوں نے سیکھا تھا اور نہ کسی نے اُنہیں سکھانے کی جرأت کی تھی بلکہ اُن کی تعلیم کا کالج صرف خداوند قادرِ مطلق کا دربار تھا۔

ہم دعویٰ سے کہتے ہیں کہ اِس سوال کا جواب کہ کیا سیدنا محمد ﷺ نے کوئی بھی مادی یادگار چھوڑی جو مصر کے اہرام کی سی عظمت رکھتی ہو؟ یا کوئی شہر بسایا جس کی عظمت قسطنطنیہ کے برابر ہو؟ یا اُن کی تعریفیں کہیں سنگی لاٹوں (پتھریلے میناروں) پر کندہ پائی گئیں؟ جواب ایک ہی ہے کہ ہرگز نہیں. نہ کوئی شہر اُن کے نامِ نامی واسمِ گرامی پر آباد نظر آتا ہے اور نہ کوئی سڑک موسوم دکھائی دیتی ہے. ہزاروں بادشاہوں کے ناموں پر شہر آباد دیکھے گئے مگر رسول اللہ ﷺ کے نامِ مبارک پر ایک بالشت زمین بھی کہیں نہیں پکاری گئی، اِس لیے کہ آنحضرت ﷺ خیالی اور فانی عظمتیں رکھنے والوں میں سے نہ تھے. اُن کی تاریخ لکھنے والوں کو اُن کی عظمت، اِن حقیر مظاہرِ عظمت میں تلاش نہیں کرنی چاہیے بلکہ حضور علیہ السلام کی عظمت کے ڈھونڈھنے والے انسان کو اگر انکی عظمت معلوم کرنے کی ضرورت ہے تو اُس کو آپ کی عظمت صرف ایک کلمہ میں مل سکتی ہے جو وہ لائے تھے اور اُسی میں ان کی پوری عظمت قائم بھی ہے اور وہ کلمہ ہے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ.

مال و دولت کی عظمت، جاہ و حشمت کی عظمت، حکومت و سلطنت کی عظمت، علوم و فنون کی عظمت، غرض یہ کہ ہر طرح کے دنیوی اعزاز کی عظمتیں مل کر بھی اِس عظمت کو نہیں پہنچ سکتیں جو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ میں پنہاں اور مضمر ہے. نہ دنیا کے تمام قارون، تمام سکندر، تمام ارسطو، تمام بادشاہ اور تمام فلاسفر اس ایک کلمہ طیبہ کی عظمت کے سامنے کوئی وقعت رکھتے ہیں اور نہ اِس کی عظمت کے سامنے اُن کی فانی عظمتوں کی کوئی حقیقت و حیثیت ہو سکتی ہے.

سرکارِ دو عالم ﷺ اِس دنیا میں تشریف لائے اور یہی کلمہ اہلِ دنیا کے آگے پیش فرمایا مگر دنیا اس کی قدر نہ پہچان سکی. مخالفانہ آوازے کسے، تلواریں سونتیں، بھالے اور نیزے تانے، توپوں اور تیرو تفنگ سے اس کی حقیقت کا مقابلہ کرنا چاہا مگر یہ ایک کلمہ تھا جو ساری دنیا سے ٹکرایا اور اُس میں زلزلہ پیدا کر دیا. نتیجہ یہ ہوا کہ اہلِ دنیا مٹ گئے مگر وہ کلمہ ابدی طور پر دنیا میں باقی رہا اور اپنی ناممکن التسخیر قوتِ قاہرہ سے اپنا راستہ بناتا رہا، جس سے اُس کی سرحدی اور اَن مٹ عظمت اب بھی باقی ہے. جوں جوں کفر نے اِس کے مٹانے کے لیے اُس کو جنگی دعوتیں دیں، توں توں یہ بھی میدان میں ڈٹ جانے والا ثابت ہوتا رہا اور اُس نے وہ جنگیں لڑیں جن میں اُس کو آج تک کبھی شکست نہیں ہوئی اور اُس کی یہ جنگیں جسم و آلات اور خون ریزی کی آرزو مند جنگیں نہ تھیں بلکہ اُس کی جنگیں ہمیشہ حقیقت و معنی اور زندگی کی جنگیں تھیں. اگر یہ دنیا کے پرستاروں کی طرح دنیا میں جنگوں کا سلسلہ لے کر آتا تو اِس کے لیے بھی قیامِ دوام نہ ہوتا. آخر اہلِ جہاں کو کہنا پڑا.

مٹ گئے، مٹتے ہیں، مٹ جائیں گے اعدا تیرے
نہ مٹا ہے، نہ مٹے گا، کبھی چرچا تیرا

سرورِ کائنات، مختارِ شش جہات محمد رسول اللہ ﷺ دنیا میں ایک ایسے راہ نما کی حیثیت سے تشریف لائے جو صرف اہلِ دنیا کو یہ بتانے کے لیے تشریف لایا کرتا ہے کہ اپنے آپ کو خدا کا بنا کر عذاب الیم سے بچاؤ اور زندگی مشیتِ ایزدی کے ماتحت گزار ولیکن جہان والوں نے اُن کو ٹیڑھی نظروں سے دیکھا اور نفسانیت کے آئینے میں اُس کے مقدّس مقصد اور اُس کے پاکیزہ مشن پر شبہ کیا کہ یہ دنیا کے لیڈروں کی طرح ہمیں اپنی اغراض پرستی کے ماتحت اڈے لگانا چاہتا ہے مگر وہ آئینہ انوارِ الٰہی، وہ تھا، جس میں ہر دیکھنے والے نے اپنا چہرہ اور اپنی ہی شکل کے خد وخال دیکھے. ابوجہل کو حبشی سیاہ فام کی طرح اس آئینہ سے اپنا چہرہ نظر آیا اور صدیقِ اکبرؓ کو اپنا. ایک ثالث بالخیر دیکھنے والی آنکھ نے محققانہ ٹوہ لگائی اور کہا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کا کلمہ دو حالتوں سے خالی نہیں. یا تو وہ حق ہے یا باطل. اگر یہ کلمہ باطل ہے (حالانکہ وہ باطل نہیں) تو عالمِ وجود سے اسی طرح محو ہو جائے گا، جس طرح تمام باطل کلمے اور غلط نظریات محو ہو گئے. علمِ حق اور عقلِ سلیم کی روشنی اس کو اُسی طرح ملیامیٹ کر دے گی جس طرح طلوعِ آفتاب کے ساتھ ہی ظلمتِ شب کافور ہو جاتی ہے، لیکن اگر وہ کلمۂ طیبہ حق ہے (حالانکہ وہ حق ہے) تو علمِ حق اور عقلِ صادق کے انوار اس کے لیے اس دنیا میں اور بھی زیادہ کشادہ راستے کھول دیں گے تا کہ وہ تمام جہان پر چھا جائے. مشرق ومغرب پر قبضہ کرے اور تمام دلوں میں اتر جائے. کالے، گورے، امیر، غریب، عربی، عجمی، عالم، جاہل، سب اس کے سامنے سرنگوں ہو جائیں.

الغرض وہ دن ضرور آنے والا ہے جب صرف علمِ حق ہی کی سلطنت ہوگی. جاہلوں کی جہالت، حاسدوں کا حسد، متعصبوں کا تعصب، وہم پرستوں کے اوہام، مدعیانِ علم باطل کے ظنون، سب کے سب نیست ونابود ہو جائیں گے اور صرف ایک عقلِ صادق وفہمِ حقیقت اندیش ہی حکمران ہوگی. حق باطل سے جدا ہو جائے گا اور طیب وخبیث میں اشتباہ باقی نہ رہے گا. صرف وہی تعلیم انسانیت کے سامنے آنے کی جرأت کر سکے گی جو کارسازِ فطرت کی حقیقی تعلیم ہوگی.

حق وباطل کا فیصلہ نہ صلیبوں کی تلواریں کر سکیں گی، نہ مجاہدین کی شمشیریں. نہ پادریوں کی تبلیغی مشینیں اور نہ پیشوایانِ مذاہب کے خودساختہ دعوے. بلکہ یوں سمجھئے کہ حقیقت شناسی کے میدان میں نام نہاد علم ودانش کی روشن خیالیاں اور مقدّس جمود وتقلید کی راسخ الاعتقادیاں بھی فضائی کہر کے نمود سے زیادہ حیثیت نہیں رکھیں گی. یہ سب کچھ محض ایک غوغا ہے جو علمِ حق کا نعرہ بلند ہوتے ہی سکونِ موت میں تبدیل ہو جائے گا اور کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کی کامل فتح مندی، بناوٹی علم وعقل کے بندھن توڑ کر جہل وغرور کی تمام چٹانوں کو پاش پاش کر دے گی اور جہان والوں کی آنکھوں پر سے جہل واوہام کے کثیف پردے اٹھ جائیں گے. خداوندِ عالم حق وباطل میں فیصلہ فرمائے گا اور کلمۂ طیبہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ زمین کی خشکیوں اور تریوں پر سربلند چلے گا. اُن کے سامنے ہر عظمت زائل ہو جائے گی اور

ہر عظمت کا مدعی ہلاکت کی تاریکیوں میں گم ہو جائے گا، کیوں کہ کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ہی ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔ وہی اِس جہانِ فانی کی تنہا ابدیّت ہے جو نہ کبھی زائل ہوگی، نہ ہلاک۔ کیوں کہ اس کی بنیاد حق ہے اور وہ ایک ایسی عظمت ہے جس کا ستون الوہیّت ہے، لہٰذا اِسے الوہیّت کا خلود اور ابدیت حاصل ہے۔ زمین بدل جائے، آسمان بدل جائے، نظامِ کون ومکاں بدل جائے، فلسفے مٹ جائیں، دانائیاں غائب ہو جائیں مگر کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ باقی ہے اور رہے گا جس پر ہر طرف سے اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ کی گواہی ثبت ہوگی اور یہی وہ عظمت ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ جلَّ وعلاشانہٗ کی حیی و قیوم ذات، حیی وقیوم ہے، تب تک کلمہ طیبہ اور سید الانبیا محمد رسول اللہ ﷺ کی عظمت بھی لازوال اور اَنمٹ ہے۔

وَصَلَّی اللّٰہُ عَلٰی حَبِیْبِہٖ مُحَمَّدٍ وَّآلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ.

شبِ اسریٰ

مسئلہ معراج قرآنِ پاک سے ثابت ہے اور سورۂ اسریٰ کے شروع ہی میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے. ﴿ سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَی الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ﴾ ''پاک ذات ہے وہ اللہ جو اپنے بندے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو راتوں رات مسجد حرام یعنی خانہ کعبہ سے مسجدِ اقصیٰ یعنی بیت المقدس تک لے گیا، جس کے گرداگرد ہم نے برکت عطا کر رکھی ہے تاکہ ہم اُس کو اپنی قدرت کی نشانیاں دکھلائیں. درآں حالیکہ وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے.''

واضح ہو کہ ﴿سُبْحٰنَ﴾ میں اختلاف ہے کہ یہ لفظ عربی علم صرف کی رُو سے کیا صیغہ ہے؟ بعض نے اِس کو علم بھی گمان کیا ہے اور وجہ اِس کی ﴿ اَلَّذِیْ ﴾ کی جانب صفت کی نظر کر کے ہے اور بعض علمائے کرام نے کہا ہے کہ ﴿سُبْحٰنَ﴾ باب تفعیل کا مصدر بھی آتا ہے اور اسم مصدر بھی ہوتا ہے اور ہر حال میں وہ علم جنسی واسطے تنزیہ و تقدیس کے ہے اور مراد اِس سے ہر نقص و برائی سے اظہار پاکیزگی اللہ تعالیٰ ہے اور یہ نہیں کہ پاک کرنے سے اُس میں پاکیزگی ہو. شیخ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا مراد یہ ہے کہ جن کلمات سے بندے سے تسبیح واقع ہوتی ہے اُن کا علم ہے. بالجملہ یہ لفظ کمالِ پاکیزگی بدرجہ انتہا پر دلالت کرنے سے فقط اللہ تعالیٰ کے واسطے مخصوص ہو گیا ہے تو ترجمہ یوں ہوا. ﴿ سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ ﴾ پاک ہے وہ، جو لے گیا اپنے بندے کو. ﴿ اَسْرٰی ﴾ اول شب یا شب کی رفتار کو کہتے ہیں بعض علما نے کہا ہے کہ رات میں لے جانے کے ہیں. زجاج رحمۃ اللہ علیہ نے ﴿ اَسْرٰی ﴾ بمعنی سیر لیا ہے جیسا کہ پہلے ذکر ہوا.

﴿ بِعَبْدِہٖ ﴾ علماء اُمت کا اِس میں اجماع ہے اور کسی فرقہ یا فرد کا اختلاف نہیں کہ اِس مقام پر ''عبد'' سے مراد سید المرسلین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں. اہلِ علم نے فرمایا کہ عبودیّت اعلیٰ مقام ہے، کیوں کہ اگر عبد سے زیادہ مکرّم کوئی اِسم ہوتا تو اللہ تعالیٰ اِس مقام پر وہ ارشاد فرماتے. پس رسول و نبی سے زیادہ اشرف یہاں عبد کو فرمایا. اہلِ الحق یعنی اولیاً اللہ و مشائخین نے اِس پر بالاتفاق تصریح فرمائی ہے کہ الوہیّت و ربوبیّت میں یکتا ذات، اللہ واحدہٗ لاشریک لہٗ ہے اور عبودیّت میں ذاتِ بابرکات، سیدِ کائنات محمد رسول

اللہ ﷺ کی ہے، اور آپ کے بعد تمام انبیاء ہیں. پس انبیاءؑ میں سے بھی جس کی عبودیت میں باقی سب سے کم نقص ہے وہ حضور ﷺ سے دوسرے درجہ پر ہے اور ظاہراً وہ بقولِ اہل اللہ، ابراہیم علیہ السلام ہیں. واللہ تعالیٰ اعلم.

اِسی طرح درجہ بدرجہ مراتبِ انبیاءؑ ہیں. مشائخ فرماتے ہیں کہ ہر زمانے میں ایک ولی، عبودیت میں بقدمِ آنحضرت سردارِ دو جہاں ﷺ ہوتا ہے. اُس کو قطب و غوث پکارا جاتا ہے اور باقی اولیاء اللہ دیگر انبیاءِ کرام علیہم التحیۃ والسلام کے قدم پر ہوتے ہیں. وہ تمام تر اُس ایک غوث کے تابع ہوتے ہیں. منجملہ مرتبۂ عبودیت نہایت اعلیٰ مرتبہ ہے.

﴿ لَیۡلًا ﴾ (رات میں) بطریق تجرید یا توضیح ہے. جیسے کہتے ہیں کہ اپنے پاؤں سے چلا، یا منہ سے بات کرو. حالانکہ چلنا ہمیشہ پاؤں سے ہی ہوتا ہے اور بات کرنا منہ سے. لَیۡلًا کو نکرہ فرمایا کہ اِس سے تقلیل کا فائدہ پہنچے. یعنی فرمایا کہ پوری رات بھر نہیں، بلکہ رات کی تھوڑی مدت میں یہ واقعہ ہوا کوئی اس کو تمام رات کی سیر نہ سمجھ لے اور صاحبِ کشاف نے اِس کی تائید میں بعض سلف کی قرأت بھی پیش کی ہے. جنہوں نے لَیۡلًا کی بجائے مِنَ اللَّیۡلِ پڑھا یعنی رات کے تھوڑے حصہ میں واقعہ معراج ہوا.

﴿ مِنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ﴾ مسجد حرام یعنی خانہ کعبہ اور اُس کے اردگرد کی جگہ (جو حرم میں داخل ہے) سے ﴿ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا ﴾ مسجد اقصیٰ تک، جسے بیت المقدس بھی کہا جاتا ہے. یہ انبیاءِ کرام سابقین علیہم السلام کا قبلہ ہے. اہل کتاب اس کو ہیکل کہتے ہیں. یہ مسجد یروشلم ملکِ فلسطین میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تخمیناً پانچ سو برس بعد تعمیر کی تھی جس پر بنی اسرائیل کی شرارتوں سے کئی بار صدمے آئے اور گرائی گئی، پھر بنائی گئی. آنحضرت ﷺ کے عہدِ معدلت مہد میں شہزادۂ روم طیطس کی گرائی ہوئی مسجد کا ایک ڈھیر پڑا ہوا تھا. مسجد اُس جگہ کا نام ہے جہاں ایک مرتبہ عمارت، عبادت گاہ کے طور پر تعمیر ہو چکی ہو. عمارت کا نام مسجد نہیں ہوتا کیوں کہ عمارت بدلتی رہتی ہے مسجد نہیں بدلتی. اِس کے آس پاس عیسائیوں نے مذہبی عمارات تعمیر کر رکھی تھیں. اُس زمانے میں اُن کو بھی بیت المقدس اور مسجدِ اقصیٰ کہتے تھے، جن کے نشان آنحضرت ﷺ نے قریش کے دریافت پر بیان فرمائے تھے. بعض اہلِ لغت نے اقصیٰ کے معنی آگے سے آگے کے بھی کیے ہیں جس سے سرکارِ دو عالم ﷺ کی بلندی و انتہائے سفر معلوم ہوتی ہے یعنی حضور ﷺ ایسے مقام پر تشریف لے گئے جو آگے سے آگے تھا. جہاں تک ربّ العزت نے چاہا اور جس کا ادراک محال ہے پھر مسجد اقصیٰ کی تعریف فرمائی گئی.

﴿ اَلَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ ﴾ جس کے گرد ہم نے برکت دی ہے. اِس برکت کی پوری کیفیت تو علمِ الٰہی عزّ وجلّ میں ہے مگر ظاہری برکات کی نسبت تو خازن رحمۃ اللہ علیہ نے کہا دریاؤں، نہروں، باغوں سے تمام علاقہ سرسبز و شاداب ہے اور باطنی برکات یہ ہیں کہ تمام انبیاء علیہم السلام کا قبلہ ہونے کے علاوہ مزاراتِ

انبیاء وصالحین سے بھی پُر ہے اور اُسی طرف قیامت کو خلائق کا حشر ہوگا. ایک حدیث شریف میں ہے، مبارک ہو شام کو 70 ہزار فرشتے ہر روز اُس پر سایہ کرتے ہیں اور اُس میں نماز کا ثواب 50 ہزار نماز ہے جیسے 50 ہزار نماز کا ثواب مدینہ طیبہ کی مسجدِ نبوی میں ہے. پھر اسریٰ کے فوائد میں سے بعض پر تشریح فرمائی.

﴿ لِنُرِيَهُ مِنْ اٰيٰتِنَا ﴾ تا کہ ہم اپنے بندے کو اپنی نشانیاں دکھلائیں لیکن ہماری قدرت و عظمت میں وہ نشانیاں بھی تھوڑی ہیں اِس لیے ''مِن'' تبعیضیہ سے فرمایا کہ ''بعض نشانیاں'' دکھلائیں.

﴿ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴾ بے شک وہی سمیع اور بصیر ہے. بعض نے کہا کہ ضمیر، ہٗ اللہ تعالیٰ کی طرف ہے اور شیخ عکبریؒ نے تبیان میں نقل کیا ہے کہ ضمیر واسطے آنحضرت ﷺ کے ہے اور یہ مستحسن ہے کیوں کہ آنحضرت ﷺ کو سننے والا اور دیکھنے والا ہونا مدح اور لیاقتِ معراج پر دال ہے یعنی ایسے بندے کو یہ عروج دیا جس کو اپنی قدرتِ کاملہ سے اِس لائق فرمایا کہ وہ سمیع، سماعِ خطاب کے لائق تھا اور آیاتِ الٰہی کو ظاہری آنکھوں سے دیکھنے والا تھا. یہی وجہ ہے کہ دوسرا کوئی بندہ اِس مرتبے کو نہ پا سکا اور آپ کی نبوتِ تامہ کے لیے جو تمام زمانہ کے لیے ہو، ایسا ہی ہونا ضروری تھا. بعض علماء نے فرمایا کہ سمیع منکروں کے بے ہودہ سوالات پر تہدید کے لیے آیا اور بصیر اُس عجیب ترین سیر میں حضرت کی نگہبانی کے لیے آیا ہے. یعنی جس قدر سفر تھا، وہ اللہ کی نگہبانی میں تھا. جیسے مسافر کو کہا جاتا ہے: ''اللہ تیرا نگہبان ہے'' ایسے ہی یہاں ''بصیر'' آیا ہے.

اِسی آیتِ مبارکہ میں اللہ کریم تبارک وتعالیٰ نے اُس عظیم الشان واقعۂ معراج کا ذکر فرمایا ہے جو اپنی نوعیت اور افضلیت کے لحاظ سے ہمارے حضور نبی الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کا ایک ممتاز معجزہ ہے. قبل اِس کے کہ اِس آیت کے مختلف پہلوؤں پر ایک تحقیقی بحث کی جائے، یہ ضروری ہے کہ قارئین کرام حقیقتِ معجزہ سے بھی روشناس کرا دیے جائیں.

حقیقتِ معجزہ

معجزہ وہ خلافِ عادت عمل ہے جو کسی نبی کے صدق کی دلیل ہو اور اُس کے تبلیغی اصولوں میں سے کسی اصل کے منافی نہ ہو. جو چیز کہ خلافِ عادت اور خلافِ قانونِ قدرت کسی شخص سے سرزد ہو تو اُس کو خارقِ عادت کہتے ہیں مثلاً عادت یوں جاری ہے کہ بھوک پیاس کھانے پینے سے دور ہوتی ہے. درخت اور پتھر اور حیوانات، گائے، بھینس، اونٹ، گدھا وغیرہ انسان سے کلام نہیں کرتے. کوئی درخت یا پتھر کسی کے بلانے سے بحرکتِ ارادیہ نہیں آ سکتا وغیرہ وغیرہ. پس جو کوئی ایسا کر دے تو یہ کام اُس کا خارقِ عادت ہوگا. اب یہاں سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ جو کام بذریعہ آلات واسباب ہوں، خواہ

وہ اسباب مخفی ہوں یا ظاہر. جیسے دوا سے بیمار کا تندرست ہونا، کشتی سے دریا عبور کرنا، خارق عادت نہیں.
پھر یہ خارق عادت اگر مدعیِ نبوت سے ظاہر ہو تو اُس کو معجزہ کہتے ہیں کہ مخالف کو اُس کی مثل پیش کرنے
سے عاجز کر دیتا ہے. اگر یہ خارقِ عادت نبی کے پیرو سے ثابت وصادر ہو. اگر وہ ولی ہے تو اُس کو
کرامت، اگر غیر ولی مومن صالح سے صادر ہو تو اس کو معاونت، نبوت سے قبل سرزد ہو تو ارہاص اور
اگر کسی بُرے شخص سے صادر ہو تو اِس کو استدراج کہتے ہیں.

دوسری بات یہ ہے کہ خدا کی رحمتِ عامہ کا مقتضیٰ یہ ہے کہ وہ نبی کے ذریعہ اپنی مخلوق کو اپنے راز سے بہرہ مند کرے اور اِس سے عام لوگوں کو نفع پہنچائے. طبیعتِ سلیم رکھنے والے تو نبی کو اِس طرح پہچان لیتے ہیں جس طرح بچہ بغیر کسی کے کہے، سنے اور رغبت دلائے کے ماں باپ کو جان جاتا ہے. پس جو ہستی مَبداءِ ولادت میں بچے کو ماں کی چھاتیاں بتلا دیتی ہے، وہی لوگوں کو مربیِّ روحانی (نبی) کی خبر دیتی ہے. لیکن وہ لوگ جن کی طبیعت میں کچھ کجی ہوتی ہے، بغیر کسی علامت دیکھنے کے تصدیق نہیں کرتے. جیسا کہ بعض بیمار دوا، اکثر بغیر شیرینی ملائے نہیں پی سکتے. پس جس طرح مہربان طبیب اُس میں شیرینی ملا دیتا ہے تاکہ مریض اپنی صحت کے لیے دوا کو قبول کرے، اِسی طرح وہ حکیم ورحیم خود بھی نبی کے ہاتھ کوئی امر خارق عادت جسے معجزہ کہتے ہیں، اُن کی تصدیق کے لیے صادر کرتا ہے اور اِس معجزہ سے بہت سے فوائد ظاہر کرنے مقصود ہوتے ہیں مثلاً:

(1) منکرین کو نبی کی تصدیق نصیب ہو جاتی ہے.

(2) غالباً وہ معجزہ فی نفسہ کوئی خیر اور عام فائدہ کی چیز ہوتا ہے جیسا کہ آنحضرت ﷺ کا اپنی انگشتانِ مبارک سے پانی جاری کر کے ایک جم غفیر کو اُس پانی سے سیراب کرنا، پھر لوگوں میں اُس سے نُور پیدا ہونا وغیرہ وغیرہ.

بعض فلسفیوں نے معجزہ کے متعلق بزور فلسفہ مخالف کلام کیا ہے اور تاویلاتِ رقیقہ کے ذریعے سے قرآن اور مسلمانوں کی کتابوں سے استدلال کر کے انکار کی صورت نکالی ہے، جو سراسر مُلمّع کاری ہے. پابندِ فلسفہٴ قدیمہ مسلمانوں میں ایک معتزلہ نامی فرقہ پیدا ہوا تھا جن کے نزدیک قرآن کی یہی بڑی خدمت تھی کہ وہ قرآن اور حدیث کو تاویلات کے ذریعے سے فلسفہءِ یونانی کے موافق کیا کرتے تھے اور جہاں موافقت نہ ہو سکتی تھی وہاں اُس حدیث کا انکار کر دیتے تھے. یہ اِس لیے کہ اُس وقت کا فلسفہ اُن کے نزدیک حق ثابت ہو گیا تھا. پھر ایسا کرنے سے اسلام فلسفہ کی ٹکر سے محفوظ رہتا تھا. ورنہ اُن کے نزدیک چُور چُور ہو جاتا، جیسا کہ آج کل ہندوستان کے بعض مسلمان فلسفہءِ حال کے مطابق وہی طرز اختیار کیے ہوئے ہیں. مگر متقدمینِ اسلام نے جماعتِ معتزلہ کی تمام کوششوں کو بے کار جانا اور

حقارت سے ٹھکرا دیا جس کا نتیجہ آج سمجھ میں آ رہا ہے کہ اُنھوں نے خوب کیا تھا، کیوں کہ جب پرانے فلسفہ کا آج کے نئے فلسفہ کی ٹکر سے چُورا ہو گیا ہے تو اُس کے ساتھ اسلام کا بھی چُورا ہو جاتا. اِس طرح موجودہ فلسفہ کا اگر آگے چل کر غلط ہونا ثابت ہو گیا اور ہو گا اور ہوتا جا رہا ہے، تو پھر اُس کے مطابق اسلام کا کیا حشر ہوگا. لہٰذا معجزہ دوسرے معنوں میں بے ایمانوں کا ایمان ہے اور یہ قوت قریباً قریباً تمام انبیاء علیہم السلام نے منکرین کے سامنے انکی طلب پر یا بلا طلب استعمال کی ہے، جس سے اُن کی دعوت کو زیادہ قلوب میں قبولیت کا موقعہ ملا اور یہ حقیقت بھی معجزہ کے اظہار سے منکرین پر کھل گئی کہ رسالت کا مدعی رسول ہے. پس جس شخصِ نیکِ عادت، ہادیٔ سیرت نے نبوت کا دعویٰ کر کے معجزہ دکھا دیا، خواہ اُسی وقت یا بعد اُس کے، یا تعلیمِ اُمت کے لیے، یا اور وقت میں، بلا شک وشبہ یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ یہ شخص مدعیٔ نبوت نبی ہے. الغرض عہدۂ نبوت کی تصدیق کے واسطے معجزہ فرمانِ خداوندی ہے کہ جس کے دیکھتے ہی قلوب اُس کی طرف اِس طرح کھنچے آتے ہیں، جس طرح لوہا مقناطیس کی طرف. اب جو شخص برخلاف مشاہدہ اِس جذبِ مقناطیس کا انکار کرے وہ کج فہم ہی نہیں بلکہ ضدی ہے. سرکارِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم سے بے شمار معجزات اِس غرض وغایت کے ماتحت ظہور میں آئے، جن میں سے جسمانیت کے معراج کا واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بندگی وعظمت کا ایک اہم نشان ہے.

اِس معجزۂ معراج کا تذکرہ قرآنِ کریم میں ایک دوسرے مقام پر ستائیسویں پارے کی ’’سورۃ النجم‘‘ کے شروع میں بھی آتا ہے. ہوسکتا ہے کہ خیالاتِ مذکورہ آپ کے لیے کچھ اجنبیت رکھتے ہوں مگر ہر حال میں یہ قابلِ غور ضرور ہیں. کیوں کہ قرآنِ پاک کے قریب تر اور سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اِس مسئلے کا مطالعہ محض واقعات وروایات کی بنا پر نہ کیا جائے بلکہ معراج پر لے جانے والی ذات کے ارشاد ہی سے حقیقت کی منزل پر پہنچ کر بے معنی اعتراضات وخرافات سے نجات حاصل کی جائے. چونکہ اِس واقعہ سے کمالِ عظمت وشانِ خداوندی اور منتہائے جمالِ نبوت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم ظاہر ہوتی ہے اِس لیے بعض عقل ونفس کے پجاری اور صرف محسوسات کو حدِ ادراک سمجھنے والے اِس پر زبانِ اعتراض کھول دیتے ہیں حالانکہ واقعۂ معراج میں کسی کو شک وشبہ نہیں اور جمیع اہلِ اسلام ایمان رکھتے ہیں کہ معراج ہوئی اور ضرور ہوئی مگر اختلاف اِس امر پر ہے کہ رُوحانی ہوئی یا جسمانی؟ خواب میں ہوئی یا بیداری میں؟ ایک بار حواسِ ظاہری کے ساتھ ہوئی یا متعدد بار؟ لفظی اختلافات وتکرارِ احادیث اور اُن کی تفاوت اور واقعات کے تنوع کی بنا پر، بعض اصحاب نے یہ رائے قائم کر لی ہے کہ معراج کا وقوع متعدد بار ہوا ہے مگر یہ اصحاب احادیث میں مطابقت نہ پیدا کر سکنے کے باعث معذور ہو گئے کیوں کہ متذکرہ معراج ایک ہی ہے اور متنوع آیات واحادیث اِس کی مختلف کیفیات کو بیان کرتی ہیں.

مسئلۂ معراج اور معترضین

صحیح مسلم شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت موجود ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں مقام حجر میں اِس حال میں کھڑا تھا کہ قریش مجھ سے شب معراج کی سیر پوچھتے اور بیت المقدس کی بہت سی چیزیں دریافت کرتے جاتے تھے جن کو میں بوقتِ قیام بیت المقدس محفوظ نہیں رکھ سکا تھا جس سے مجھے کرب ہوا. پس اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کو میرے سامنے کر دیا اور میں نے ہر اُس سوال کا جواب جو مجھ سے پوچھا گیا من وعن بیان فرما دیا. معترضین کو جب اپنے اعتراضات کے جواب میں مجالِ دم زدن نہ رہی تو کہنے لگے کہ مسجد اقصیٰ کے اوصاف و آثار تو آپ نے سب بیان فرما دیئے. اب ہمارے قافلوں کی جو بیت المقدس کی طرف بغرضِ تجارت وغیرہ گئے ہیں خبر دیجیے. تو سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے تین قافلے مجھے راہ میں ملے. ایک تو روحا میں ملا، جو اپنا گم شدہ اونٹ ڈھونڈھ رہا تھا. میں نے اُن کے برتن سے پانی پیا تھا. جب وہ آئیں تو تم اُن سے دریافت کرنا کہ اُنہوں نے تلاش اونٹ سے واپس آ کر اپنے برتن میں پانی پایا کہ نہیں، اور دوسرا قافلہ مجھے ذی مروہ میں ملا تھا. دو آدمی اس (قافلے) کے ایک اونٹ پر سوار تھے کہ مرکب اُن کا میرے مرکب سے بھڑکا اور اُن دونوں میں سے ایک گرا اور اُس کا ہاتھ ٹوٹ گیا. اِسی طرح کی ایک اور روایت میں ہے کہ حضور ﷺ جب واپسی پر سوار ہی تشریف لا رہے تھے. ایک مقام پر ایک اور قافلہ ملا چنانچہ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ راہ میں ہمارا گزر قریش کے ایک قافلہ پر ہوا جو اپنے اونٹوں پر اناج لادے ہوئے آ رہا تھا. اُن میں سے ایک اونٹ پر دو بوریاں تھیں. ایک کا رنگ سیاہ اور دوسرے کا سفید تھا. جب میرا براق اُس کے نزدیک پہنچا تو وہ بِدکا اور چکرا کر منہ کے بل گرا جس سے اُس کی گردن ٹوٹ گئی اور تیسرے قافلے کو میں نے مقامِ تنعیم میں چھوڑا تھا. فلاں فلاں شخص اُن میں کے خاکستر اونٹ پر سوار قافلہ کے آگے آگے چل رہے تھے اور کل طلوعِ آفتاب تک یہاں آ جائے گا. معترضین طلوعِ آفتاب کا شدت سے انتظار کرنے لگے کہ اگر سورج نکل آیا اور قافلہ نہ آیا تو ہم حضور ﷺ کو منسوب بہ کذب کریں گے کہ ناگہاں سورج نکلا، لوگوں نے دوڑ کر دیکھا تو وہی قافلہ واردِ مکہ ہو رہا ہے اور وہی دو شخص خاکی اونٹ پر سوار قافلے کے آگے آگے چلے آ رہے ہیں. پھر بعد واپسی بقیہ قافلوں کے حالات معلوم کیے گئے. سب نے حضور ﷺ کی تصدیق فرمائی اور بعینہٖ حضور ﷺ کا فرمودہ حال بیان کیا مگر بعض مذبذبین اِس پر بھی ایمان نہ لائے اور کہنے لگے. مَا هٰذَا اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ. وجہ یہ تھی کہ اُن کی عقول پر جہالت اور گمراہی کا پردہ پڑا ہوا تھا اِس وجہ سے واقعہ معراج اُن کی سمجھ میں نہ آیا. برخلاف اِس کے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی عقل، نورِ ایمان سے روشن اور منور تھی. اُنہوں نے سنتے ہی تصدیق کی. پس جو اشخاص اب بھی ابو جہل مردود کی طرح نافہم اور کور

باطن ہیں وہ متبع ابو جہل بن کر انکار کر جاتے ہیں اور جو تابعِ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں اور ایمان روشن رکھتے ہیں وہ آج بھی بغیر تصدیق صادق نہیں رہ سکتے۔

زمانہ حاضرہ کے بعض اہلِ تحقیق نے لکھا ہے کہ دراصل معراجِ نبوی ایک اعلیٰ درجہ کا کشف تھا جو بیداری کے معنوں میں آجانا حقیقتاً ہوسکتا ہے اور ایسے کشف کی حالت میں انسان اپنے ایک ملکی جسم کے ساتھ حسب استعدادِ نفسِ ناطقہ آسمانوں کی سیر کر سکتا ہے۔ پس چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نفس ناطقہ کی استعداد نہایت اعلیٰ درجہ کی تھی اس لیے وہ اپنی ہر معراج میں عرشِ اعظم تک پہنچ گئے۔ دراصل یہ سیر انکشافی تھی، جو بیداری کے مشابہ ہوسکتی ہے بلکہ اس کو ایک قسم کی بیداری سمجھنا چاہیے۔ اس کا نام خواب نہیں رکھا جاسکتا مگر یہ سیر اُس جسمِ کثیف کے ساتھ بھی نہ تھی۔ یہی تحقیق چودھویں صدی کے ایک نامور محقق اور قابل مؤرخ علامہ شبلی نعمانی مصنف سیرت النبی کی ہے۔ اسی طرح دیگر اہل تحقیق نے بھی صحت عقائد سے دور رہ کر وہ صریح ٹھوکریں کھائی ہیں کہ جن کی حد نہیں۔ اُن کو اتنا بھی پتا نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو روحانی معراج چونتیس ہوئے ہیں۔ اُن روحانی معراجوں میں تو کفار بھی معترض نہ ہوئے۔ اِس معراج میں کوئی خاص بات تھی کہ کفار مخالفت کرنے لگ گئے اور دعویٰ معراج کو حیطۂ بشریت سے محال جان کر تکذیب کے درپے ہوگئے۔ معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خواب یا کسی ادنیٰ درجے کے کشف کو ظاہر نہ فرما رہے تھے۔ ورنہ کافروں کو جھٹلانے کی ضرورت نہ ہوتی، کیوں کہ خواب میں ہر انسان عجائبات دیکھ سکتا ہے۔ پھر ایسی حالت کس خصوصیت کی محتاج ہوتی ہے اور اُس کی عظمت وشان کیسی۔ قرآنِ کریم کا اِس واقعہ کو بطورِ معجزہ مخالفین کے سامنے لانا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ کا چیرا جانا، براق پر سوار ہونا، مسجدِ اقصیٰ میں نماز پڑھنا ہی نہیں بلکہ امامتِ انبیاءٔ کرانا، سوالوں جوابوں کا ہونا، حضرت جبرائیل علیہ السلام کو اُن کی اصلی شکل میں دیکھنا، سدرۃ المنتہیٰ میں دودھ کا پینا، پچاس نمازوں کے فرض ہونے پر موسے علیہ السلام کی درخواست سے متواتر تخفیف کی گفتگو کرنا، جنت ودوزخ کا ملاحظہ فرمانا، صبح مکہ میں کرنا اِس واقعہ کے اظہارِ بیان میں تامل وتردّد سے کام لینا، پھر قریش کا مذاق اڑانا اور انکار وتعجب کرنا، بعض کمزور اعتقاد لوگوں کا اِس واقعہ کا سن کر مرتد ہو جانا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا اِس واقعہ کی تصدیق پر صدیق کا لقب پانا، تمام صحابہ سلف وخلف کا معراجِ جسمانی پر اجماع ہونا، یہ سب امور جو صحیح احادیث سے ثابت ہیں اور قطعی طور پر ثابت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معراج شریف جسم وروح دونوں کے ساتھ تھا اور عالمِ بیداری میں ہوا تھا، کیوں کہ خواب کفار کے حق میں جب تک وارد نہ ہو، بطریق معجزہ نہیں ہوا کرتا اور نہ شقِ صدر جسمانی، روحانی وانکشافی معراج کے لیے ضروری ہے، نہ روحانی وانکشافی پرواز محتاجِ براق تھی اور نہ نمازوں کی فرضیت کوئی خوابی فعل تھا۔ پھر ایسے اہم واقعہ کو جس کے ایک ایک جزو کا تعلق جسمانیت کا مقتضی ہے بلاوجہ محض موجودہ سائنس وعلوم سے مرعوب ہوکر بے جا تاویلات سے کام

لینا اور الفاظِ قرآنی کے اصل مفہوم سے بلا دلیل شرعی ظاہر سے پھرنا، ایک مومن کی شان سے بعید اور انتہائی درجہ کی ڈھٹائی ہے. چنانچہ حضرت محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج جسم شریف کے ساتھ ہوا ہے. اگر روح کے ساتھ خواب یا نیند میں ہوتا تو کفار اُس سے انکار نہ کرتے اور نہ جھگڑا کرتے. یہ جھگڑا محض اِس لیے کیا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو معراجِ جسمانی کی خبر دی تھی اور اُن مقامات کی خبر دی تھی جہاں جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے تھے".

بعض اہلِ عقل نے تو ایک نئی تنقیح اور نکالی ہے کہ اسرائے بیت المقدس جسمِ مطہر کے ساتھ بیداری میں ہوا اور اُس سے آگے صعود الی السمأ انکشافِ روحانی تھا، لیکن یہ ایک ہی سفر ہے. وقوع کے لحاظ سے دو جدا جدا امر نہیں ہیں. بعضوں کا کہنا کہ اسرائے بیت المقدس اور ہے اور معراجِ سماوی اور ہے اور سیرِ بیت المقدس جو قرآن کریم سے ثابت ہے حالتِ بیداری و جسمانی میں ہوئی مگر معراجِ سماوی روحانی صورت، میں کیوں کہ بعض احادیث سے معراجِ سماوی میں سواریِ براق کا تذکرہ نہیں بلکہ یہ اسرائے بیت المقدس میں ہے.

حقیقت یہ ہے کہ جن احادیث میں سواریِ براق کا تذکرہ معراجِ سماوی کی نسبت نہیں ہے، وہ راویوں کی طرف سے بطریقِ اشتباہ یا اختصار، بیان کی گئی ہیں اور اِسی پر محدثین متفق ہیں جیسے کہ بعض احادیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے شبِ معراج میں تین پیالوں میں دودھ، شراب اور شہد کا پیش کیا جانا بیان ہوا ہے اور بعض میں صرف دودھ اور شہد یا دودھ اور شراب کا تذکرہ ہے اور بعض میں مقامِ انبیاً اور محلِ ملاقات میں ابراہیم علیہ السلام کا چھٹے آسمان میں ہونا بیان فرمایا گیا ہے اور بعض میں بیت المعمور کے ساتھ تکیہ لگائے ہوئے ساتویں آسمان میں مذکور ہوا ہے، تو یہ سب بہ سببِ اشتباہ راویوں کے ہے، نہ کہ اختلافِ وقوع میں. جمہور محققین کا مذہب یہ ہے کہ یہ واقعۂ معراج بیداری میں حالتِ بدنی کے ساتھ ایک ہی بار ظہور میں آیا ہے. علیحدہ علیحدہ دو واقعات روحانی اور جسمانی نہیں ہیں. باقی رہا یہ مسئلہ کہ اسرائے بیت المقدس جسمانی بحالتِ بیداری اور معراجِ سماوی کشفِ روحانی تھی تو اس کی وضاحت بھی کردی جاتی ہے تاکہ معترضین کا اعتراض نہ رہے.

چنانچہ حافظ سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اِس اشکال کو (جو انبیاء علیہم السلام کو آسمانوں میں دیکھنے پر باوجود اِس کے کہ بدن اُن کے قبروں میں ہیں لازم آتا ہے) لکھ کر جواب دیا ہے کہ ارواحیں اُن کی بدنوں کی صورت میں متشکل ہوئی تھیں یا اُن کے بدن بمعہ ارواح حضرت کی ملاقات کو حاضر ہوئے تھے کیوں کہ انبیاء علیہم السلام کا اِس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد چلنا، پھرنا احادیث سے ثابت ہے اور وہ زندہ ہیں. اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام فرمایا ہے کہ اُنکے بدنوں کو کھائے اور بدن اُن کے ارواحوں کی مانند لطیف ہیں. پس اُن کے ظہور کے لیے عالمِ ملک و ملکوت میں بوجہ کمالِ قدرتِ ذوالجلال کوئی

بھی ایسا امر مانع نہیں ہے جیسے قرطبی نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ بیت المقدس میں اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے لے کر عیسیٰ علیہ السلام تک تمام انبیاء کو حضور ﷺ کی اقتدا کے لیے جمع فرمایا اور سات جماعتیں حضور ﷺ کے پیچھے تھیں. یہاں یہ بات خاص طور پر یاد کے قابل ہے کہ بیت المقدس میں امامتِ انبیاء علیہ السلام کے لیے حضور ﷺ کو امام بنایا جانا با جسمِ عنصری تھا کیوں کہ نماز محض ارواح پر نہ تھی اور نہ ارواح از روئے شریعت مکلف بہ نماز ہو سکتی ہیں. پھر اس کے ساتھ یہ بھی الزام آتا ہے کہ امامِ جسمانی کی اقتدا میں محض ارواح کا حاضر ہونا جماعتِ شرعی اور امامتِ شرعی کے منشأ کو پورا نہیں کرتا تو ثابت ہوا کہ سب انبیاء نے حضور ﷺ کی اقتدا با اجسام کی اور حضور ﷺ کی امامت بہ روحانیت محضہ تھی تو پھر عیسیٰ اور ادریس علیہ السلام نے اقتدا نہ کی ہو گی کیوں کہ وہ دونوں باعتقاد جمہور اہل سنت والجماعت باجسدِ عنصری آسمانوں پر اٹھائے گئے ہیں اور روح کی امامت میں جسمانیت کے ساتھ اقتداء شرعاً صحیح اور قابلِ قبول نہیں، حالانکہ حدیثوں میں تمام انبیأ علیہم السلام کی شمولیت فرمائی گئی ہے اور یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ لطافتِ اجسام کے لحاظ سے اُن کے لیے کوئی بھی ایسا امر مانع نہیں. غرض یہ کہ اس بات میں کثرتِ احادیث سے ثابت ہے کہ حضور ﷺ باجسدِ عنصری معراج کو تشریف لے گئے.

خاتم المحدثین علامہ زرقانی شرح مواہب اللدینہ میں فرماتے ہیں کہ یہ بات کوئی ممتنع نہیں ہے کہ سرکار دو جہاں ﷺ متشکل بجسد و روح نظر آئیں کہ آپ کو اور دیگر انبیا علیہم السلام کو بعد وفات اُن کی ارواح پھر اُن کو مل گئیں اور اجازت ہو گئی کہ اپنی قبور سے نکل کر عالمِ بالا اور عالمِ ماتحت میں تصرف کریں.

یہاں پر سب سے اہم یہ کہ آیت مبارکہ میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے عبد کو سیر کرائی اس لفظ سے باقتضاء النص ثابت ہوتا ہے کہ یہ سیر جسمانی تھی. کیونکہ عبد، مجموعہ روح و جسد کو کہا جاتا ہے نہ کہ اُس کا اطلاق صرف روح پر صحیح ہو. قرآنِ کریم میں جہاں کہیں بھی یہ لفظ آیا ہے اس سے مراد روح مع الجسد ہی ہے. مثلاً ارشادِ باری تعالیٰ ہے.

ا۔ ﴿ نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَأْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ﴾ ”یعنی قرآن کریم نازل کیا ہم نے اوپر بندے اپنے کے پس مثل اِس کی کوئی سورت لے آؤ“.

کیا یہاں عبد سے مراد صرف روح ہے یا روح مع الجسد ہے؟ ایک معمولی فہم کا انسان بھی سمجھ سکتا ہے کہ قرآنِ کریم کا نزول محض روح پر نہیں ہوا اور یہاں عبد سے روح مع الجسم ہی مراد لیا جائے گا.

ب۔ ﴿ اَرَاَيْتَ الَّذِيْ يَنْهٰى عَبْدًا اِذَا صَلّٰى ﴾ ”کیا تو نے اُس کو یعنی ابو جہل کو دیکھا ہے جو بندہ کو نماز پڑھنے سے روکتا ہے“.

اِس آیت سے بھی مراد روح مع الجسد ہے. کیونکہ ابوجہل صرف نمازی کی روح کو نماز پڑھنے سے نہیں روکتا تھا.

ج- ﴿ وَاِنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبۡدُ اللّٰهِ یَدۡعُوۡهُ کَادُوۡا یَکُوۡنُوۡنَ عَلَیۡهِ لِبَدًا ﴾ ''یعنی جب اللہ کا بندہ محمد ﷺ نماز پڑھنے کو کھڑا ہوا تو قرآن سننے کے لیے جنّ اُس پر ٹوٹے پڑتے تھے.''

اِس سے معلوم ہوا کہ نماز پڑھنے کے لیے صرف آپ کی روح نہیں کھڑی ہوئی تھی، بلکہ مع الجسد نماز پڑھا کرتے تھے جنّوں کا اجتماع صرف روح پر نہیں تھا.

د- ﴿ کَانَتَا تَحۡتَ عَبۡدَیۡنِ مِنۡ عِبَادِنَا صَالِحَیۡنِ ﴾ ''یعنی وہ دونوں عورتیں ہمارے دو نیک بندوں کے گھر میں تھیں.''

اِس آیت سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ کسی عورت کا کسی عبد کے گھر میں ہونا، محض روح سے متعلق بہ علاقۂ زوجیت نہیں سمجھا جاتا اور نہ اِس کے خلاف کوئی عملی یا علمی دلیل ہے. جہاں خاوند محض روح اور اُس کی عورت بہ علاقۂ زوجیت، جسمانی صورت میں اس کی روح سے ہی تعلق رکھے.

د- پانچویں آیت میں ہے ﴿ ذِکۡرُ رَحۡمَتِ رَبِّکَ عَبۡدَهٗ زَکَرِیَّا ﴾ اِس آیت میں بھی عبد سے مراد روح مع الجسد ہے. غرضیکہ اِس قسم کی قرآنِ کریم میں بے شمار مثالیں موجود ہیں جن سے عبد سے مراد روح مع الجسد ہے. پس اِس سیر کو روحانی قرار دینا یا انکشافی کہنا کسی طرح بھی قرآن کریم کی منشاء کے مطابق نہیں.

علامہ شبلی نے قرآن وحدیث سے عبد کے مفہوم کو روحانی عبد بلا جسم مراد لینے میں بڑا زور لگایا ہے اور بڑی کوشش کے بعد ایک آیت پیش کر سکے. وہ بھی جس کا ظہورِ خطاب اِس مطلب کو پورا نہیں کرتا بلکہ اُس کا صحیح خطاب نفسِ مطمئنہ کی طرف ہو رہا ہے اور خدا کے مقبول بندوں کے ساتھ ہونے کا ارشاد ہوتا ہے. نفسِ مطمئنہ کو عبد کے لفظ سے مخاطب نہیں فرمایا گیا. بلکہ عبادی کا لفظ اُس جماعت پر بولا گیا ہے جو اپنے صالح عمل کی بنا پر دینوی زندگی میں روح مع الجسد رکھتے ہوئے پاکیزہ نفوس کے ساتھ بارگاہِ رب العزت میں ممتاز تھے اور اِس کے بعد نیک انجام ہونے کے باعث اہلِ جنت فرمائے گئے. اِس کے یہ معنی نہیں کہ عبادی سے مراد عباد بلا جسد ہوں. نفس مطمئنہ، لوامہ، ملہمہ، امارہ اور ہے اور عبد اور چیز ہے. نفسِ مطمئنہ عبد نہیں ہو سکتا اِس مفہوم کے تحت ابن جریر نے کہا کہ مراد فَادۡخُلِیۡ فِیۡ عِبَادِیۡ سے یہ ہے کہ اپنے جسم کی طرف لوٹ جائے. اِس سے معلوم ہوا کہ نفس مطمئنہ اور ہے اور مراد بعبادی،

عباد مجسم یا اجسام عباد اور ہیں.

یہاں پر رفع شکوک کے لیے ہم ان تینوں بزرگوں کے ارشادات کی بھی توضیح کئے دیتے ہیں، جن کو بطورِ دلائل منکرین معراجِ جسمانی پیش کرتے ہیں تاکہ متلاشی حق پر اصلیت کا انکشاف ہو جائے.

الغرض نقلی روایات کی بنا پر جو لوگ معراج کو روحانی قرار دیتے ہیں اور جسمانی معراج کا انکار کرتے ہیں وہ اپنے دعویٰ کی تائید میں صحابہؓ سے صرف تین بزرگوں کے اقوال پیش کرتے ہیں. حضرت سیدنا حذیفہؓ وام المومنین حضرت عائشہؓ اور حضرت معاویہؓ بن ابی سفیانؓ اور انہی کو علامہ محمد بن جریر طبریؒ نے ذکر کیا ہے. چنانچہ حضرت ام المومنینؓ فرماتی ہیں کہ معراج کے تمام واقعات خواب تھے. حضور ﷺ کا جسدِ اطہر اپنی آرام گاہ سے جدا نہ ہوا تھا صرف آپ کی روح کو سیر کرائی گئی اور اسی کے قریب حضرت حذیفہؓ اور حضرت معاویہؓ کے بیانات ہیں. مگر معترضین اپنے اعتراضات اور روایاتِ پیش کردہ کی اصلیت پر غور نہیں کرتے کہ یہ دلائل دعویٰ میں کہاں تک تقویت رکھتے ہیں. ہم ان ہی دلائل کی رو سے یہ ثابت کریں گے کہ معراج مبارک روحانی نہیں بلکہ جسمانی تھی.

نمبر 1: ترمذی شریف میں جو حدیث آئی ہے اُس میں سیدنا حذیفہؓ کا یہ قول موجود ہے کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ نے لیلۃ المعراج میں براق کو بیت المقدس کے حلقہ سے باندھا تھا، اُن کا قول غلط ہے. کیا براق آپ کا مطیع نہ تھا جو آپ کو اُس کے باندھنے کی ضرورت پڑی؟ اِس کو تو اللہ کریم نے آپ کا مسخر فرما دیا تھا. پس حضرت حذیفہؓ کے اِس قول سے صاف عیاں ہے کہ اُن کو جمہور سے تمام مسئلہ معراج میں اختلاف نہیں، بلکہ صرف براق کے پتھر سے باندھنے یا نہ باندھنے میں اختلاف تھا. شاید منکرین نے اِن ہی الفاظ سے اپنے انکار کو تقویت پہنچانی چاہی ہو. حالانکہ یہ حضرت حذیفہؓ کا اپنا اجتہادی قول ہے. اُنہوں نے یہ نہیں فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے ایسا سنا ہے. برخلاف اِس کے کہ جو اصحابہ کرامؓ معراجِ جسمانی کے قائل ہیں اور احادیثِ معراج کو روایت کرتے ہیں وہ بالتصریح اُن کی روایت حضور اقدس ﷺ سے کرتے ہیں. نیز یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ حضرت حذیفہؓ واقعہ معراج کے بعد اسلام لائے ہیں تو اُن کے قول سے سابق الاسلام صحابہ کرامؓ کی احادیث کا معارضہ کیونکر ہو سکتا ہے، جو معراجِ جسمانی کے قائل ہیں.

نمبر 2: واقعہ معراج ہجرت سے پہلے کا ہے. خود حضرتِ معاویہؓ اُس وقت ایمان نہیں لائے تھے. آپ ہجرت سے ایک سال بعد مدینہ منورہ میں مشرف باسلام ہوئے. اُن کی وہ روایت جو ابنِ جریر نے تفسیر اسراء اور ابن اسحاق نے اپنی سیرت میں ذکرِ معراج میں لکھی اور جس کی بناء پر حضور ﷺ کی معراج کو روحانی یا رویائے صادقہ کہا جاتا ہے مع سند کے حسب ذیل ہے:

((عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ اِسْحَاقَ قَالَ حَدَّثَنِي يَعْقُوْبُ بْنِ عُتْبَةَ بْنِ الْمُغِيْرَةَ اَنَّ مُعَاوِيَةَ بْنِ اَبِي

سُفْيَانَ كَانَ اِذَا سُئِلَ عَنِ الْاَسْرٰى رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَيَقُوْلُ كَانَتْ رُؤْيَا مِنَ اللّٰهِ صَادِقَةٌ))

ترجمہ: ''محمد ابن اسحاق سے روایت ہے. اُنہوں نے کہا کہ یعقوب بن عتبہ بن مغیرہ نے بیان کیا کہ معاویہ بن ابی سفیانؓ سے جب معراج کا واقعہ پوچھا جاتا تو وہ کہتے کہ یہ خدا کی طرف سے ایک سچا خواب تھا''

حالانکہ یہ روایت جمہور محدثین کے نزدیک منقطع ہے. کیونکہ یعقوب نے حضرت معاویہؓ سے خود نہیں سنا ہے اور نہ ہی اُنہوں نے حضرت معاویہؓ کا زمانہ پایا ہے.

((حَدَّثَنَا اِبْنِ حَمِيْدٍ قَالَ حَدَّثَنَا سَلْمَةَ عَنْ مُحَمَّدٍ قَالَ حَدَّثَنِىْ بَعْضَ اٰلِ اَبِىْ بَكْرٍ اَنَّ عَائِشَةَ كَانَتْ تَقُوْلُ مَا فُقِدَ جَسَدُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَلٰكِنْ اِسْرَا بِرُوْحِهٖ)) ''ابن حمید نے ہم سے بیان کیا. اُن سے سلمہ نے، سلمہ سے محمد بن اسحاق نے اُنہوں نے کہا کہ حضرت ابو بکرؓ کے خاندان کے ایک شخص نے مجھ سے بیان کیا کہ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا جسم مبارک گم نہیں کیا گیا بلکہ آپ نے روح مبارک کے ساتھ عروج فرمایا'' اور ایک دوسری روایت میں ہے. وعن معاویہ مثلہ ''اور حضرت معاویہؓ بھی اسی کی مانند روایت فرماتے ہیں''.

اس روایت سے بھی معراجِ جسمانی کا اختلاف ثابت نہیں ہوتا کیونکہ اِس روایت کے سلسلہ میں محمد بن اسحاق اور حضرت عائشہ صدیقہؓ کے درمیان کوئی نامعلوم الاسم راوی ہے یعنی خاندانِ ابو بکرؓ کا ایک شخص جس کا نام ونشان ہی مذکور نہیں. اِس لیے یہ بھی پایۂ صحت سے فروتر ہے. مشکواۃ شریف جلد ثانی باب الولی فصل اول میں ایک حدیث آئی ہے. جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت اُم المومنین عائشہ صدیقہؓ کا عقد سرکارِ رسالت مآب ﷺ سے سات سال کی عمر میں معراج جسدی سے دو برس قبل درایامِ ماہ شوال مکہ معظمہ میں ہوا اور جب آپ کی عمر مبارک نو برس کو ہوئی تو رخصتی ہوئی. اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس ماہ آپ حضور ﷺ کے یہاں رخصت ہو کر آئیں وہی مہینہ معراج شریف کا تھا. چونکہ تاریخ آمد حرم سرائے رسول اللہ ﷺ میں آپ کی صحیح مذکور نہیں، اِس لیے نہیں کہا جاسکتا کہ وہ معراج سے کتنے دن قبل یا بعد تشریف لائیں؟ کیونکہ اگر معراج سے پہلے تشریف لے آئی ہوتیں تو حضور ﷺ معراج کی شب مکانِ اُم ہانیؓ میں استراحت نہ فرماتے، جیسا کہ حدیثوں سے ثابت ہے اور اگر آپ بعد میں تشریف لائی ہیں تو پھر معراجِ جسمانی کے انکار میں آپ کا کوئی ارشاد پیش کرنا یا کسی ایسے ارشاد کو آپ کی جانب منسوب کرنا کیسے صحیح ہوسکتا ہے؟ ہاں! اگر حضور ﷺ سے نقل فرمایا ہوتا تو حجت ہوسکتا تھا.

معراج کا عقلی ثبوت

معراجِ علمی کے ثبوت کے بعد عقلی دلائل کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جن سے کہ وہ لوگ جن کی

دیدکسی ایمانی عینک کی محتاج ہے اور جو فلسفہ کی تاریکیوں میں گھرے ہوئے ہیں. ہدایت پاسکیں.

نمبر1: کہا جاتا ہے کہ واقعہ معراج خلافِ عقل ہے اور جسمِ کثیف کا صعود الی السماء محال ہے. جیسے مٹی کا ڈھیلا جب اوپر پھینکا جاتا ہے تو جسمِ کثیف کی بنا پر زمین کی جانب واپس آجاتا ہے. معترضین کا یہ اعتراض خود یہ ثبوت بہم پہنچا رہا ہے کہ جو چیز اوپر کو پھینکی جاتی ہے، اوپر جاتی تو ہے کیونکہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اوپر پھینکنے پر ڈھیلا کشش ثقل کے باعث ہاتھ سے نکلتے ہی زمین پر گر جائے، بلکہ بے روک ٹوک اوپر کو چلا جاتا ہے.

رہی یہ بات کہ اوپر جا کر فوراً واپس آجاتا ہے. بہت دیر ٹھہرتا نہیں تو ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ نعوذ باللہ اگر حضور ﷺ کے جسمِ اطہر کو چند منٹوں کے لیے معترض کے خیال پر کثیف ہی مان لیا جائے، حالانکہ وہ ہماری جانوں سے بھی زیادہ لطیف ہے تو حضور ﷺ وہاں کب ٹھہر کر رہ گئے. آپ تو اِس قدر جلدی اتنا طویل سفر کر کے واپس تشریف لائے کہ:

زنجیر بھی ہلتی رہی، بستر بھی رہا گرم
ایک دم میں سرِ عرش گئے، آئے محمد ﷺ

جہاں تک ڈھیلے کی بلندی کا سوال ہے، یہ پھینکنے والے کی طاقت پر منحصر ہے. مثلاً ایک جوان شخص کا پھینکا ہوا ڈھیلا ایک بچے کے پھینکے ہوئے ڈھیلے کی بہ نسبت زیادہ بلندی پر جائے گا اور توپ کے دہانے سے پھینکا ہوا گولہ بندوق کی گولی کے مقابلہ میں یقیناً زیادہ بلندی طے کرے گا. اب چونکہ اللہ تعالیٰ قوی ترین طاقت کا مالک ہے اور وہ خود حضور ﷺ کو سرِ عرش لے جانا چاہتا ہے تو استدلال بالا کب مانع ہے.

نمبر2: کہا جاتا ہے کہ جسمِ عنصری کا قلیل وقت میں بیت المقدس یعنی مسجد اقصیٰ پہنچنا آسمانوں پر اور آسمانوں سے آگے عرش تک جانا، باوجود جسمِ عنصری کے روحانیت سے ملنا، جنت و دوزخ کا دیکھنا عقلاً ممنوع ہے اور حکماء نے اِس کے محال ہونے پر اور آسمانوں کے خرق والتیام کے محال ہونے پر دلائل قائم کیے ہیں اور اہلِ ادیانِ حقہ سے عیسائی، یہودی کوئی اس کا قائل نہیں.

اِس قولِ معترض کا جواب یہ ہے کہ ایسے جسمِ عنصری کا جس کی عنصریت اپنی لطافت کے لحاظ سے روحانیت سے بھی بڑھ کر ہو، ایسی حرکتِ سریع کرنا محالات سے نہیں. ایک عالم کا تجربہ شاہد ہے کہ ریل اور تار برقی کی حرکت اِسی نوعیت سے ہے، جس کو کبھی بھی محال نہیں سمجھا گیا اور اِسی طرح آسمانوں کا خرق والتیام جن خیالاتِ فاسدہ سے محال ثابت کیا جاتا ہے، اُن کی حکماءِ اسلام نے اپنی تحقیق میں پوری قلعی کھولدی ہے اور یہ امر واضح تر کر دیا ہے کہ حکماءِ یونان نے محض اپنے عقلی ڈھکوسلوں سے زمین و آسمان کے قلابے ملائے ہیں. مسائل طبیعات و ہیئت میں کوئی ٹھوس بات پیش نہیں کر سکے. انجیل و

بائیبل کو ماننے والے پکے عیسائی آسمانوں کے خرق والتیام کو محالات سے نہیں مانتے. ہاں اگر کوئی ملحد عیسائی تسلیم نہ کرے تو یہ اُس کی ہٹ دھرمی اور کج فہمی ہے. دیکھئے انجیل مرقس کے سولہویں باب انیسویں درس میں ہے کہ مسیح خداوند لوگوں سے کلام کرنے کے بعد آسمانوں پر چڑھ گیا اور خدا تعالیٰ کے داہنے ہاتھ پر جا بیٹھا یعنی حضرت عیسیٰ آسمان پر چلے گئے اور اِسی طرح دوسری کتاب السلاطین کے دوسرے باب میں مذکور ہے کہ ایلیا یعنی حضرت الیاس علیہ السلام اور الیسع باتیں کرتے جاتے تھے کہ ایک گاڑی اور آگ کے گھوڑے نمودار ہوئے. اُس پر چڑھ کر ایلیا آسمان پر چلا گیا اور اسی طرح ایک شخص فسیس ولیم اسمٹ اپنی کتاب طریق الاولیا میں حضرت اخنوخ علیہ السلام کا زندہ آسمان پر جانا بیان کرتا ہے.

اہلِ اسلام تو قاطعتہً اِس پر متفق ہیں کہ:

(الف) مثلاً جرمِ آفتاب جو 166 کرہ ارض کے برابر ہے. ایک لمحہ میں کئی ہزار سالہ راہ طے کرتا ہے اور اِس کی سرعت وحرکت کو عند العقل بعید نہیں سمجھا جاتا تو سرعتِ رفتارِ آفتابِ فلکِ رسالت کو کیوں تعجب سے دیکھا جاتا ہے؟

(ب) آفتابی شعاعیں اور کرنیں اور ضو قمری، موٹے شفاف شیشہ سے دوسری طرف نکل جاتی ہیں، حالانکہ وہ مجسم ہیں اور اِس تیزی سے اُن کا نفاذ ہوتا ہے کہ عقل انسانی متحیر رہ جاتی ہے یعنی فی گھنٹہ بہتر کروڑ میل حرکت کر جاتی ہیں. پس ایسے ہی اگر حضور ﷺ کا وہ سراپا نوری جسم جو شعاع آفتابی سے کئی ہزار گنا زیادہ حرکتِ نفوذ رکھتا ہے، صاف شفاف آسمانوں سے گزر جائے تو کون سے تعجب کا اِمکان ہے؟

(ج) ابلیسِ لعین کہ جو بدترین خلق ہے. اِس سرعت سے مشرق ومغرب کی سیر کرلے کہ وہم و گمان میں نہ آئے اور پھر ہر شرارت کے ساتھ اُس کا الحاق بھی مان لیا جائے تو اُس بہترین کائنات سے آن کی آن میں زمین سے عرش تک کی مسافت طے کرنے میں کیوں کر شبہ ہوسکتا ہے؟ کیا مزے کی بات ہے کہ معترضین جیسے خود کثیف تر انسان خود مریخ وقمر میں کودنے کی تیاریاں کر رہے ہیں اور نبوت کے لطیف تر اور نوری جسم مطہر کو معذور جانتے ہیں.

(د) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا چرخ چہارم پر قیام اور حضرت ادریس علیہ السلام کا بہشت میں سیرِ سماوات کے بعد داخل ہونا "روح مع جسم" نصِ قطعی سے ثابت ہو، پھر سید الانبیا علیہ السلام کا کہ اُن سے مرتبہ میں رفیع الشان ہیں، آسمانوں پر جانا کیوں کر ناممکن ہوسکتا ہے.؟

(ہ) دیکھا گیا ہے کہ باز کے پاؤں میں چوبِ تر باندھ دیتے ہیں کہ اُس کے بوجھ کی وجہ سے پرواز نہ کرسکے، لیکن اگر وہ لکڑی خشک ہوجائے اور اُس کا ذاتی وزن خشکی کے سبب ضائع ہوجائے تو پھر باز کا مع چوبِ خشک ہوا میں اُڑ جانا کیوں کر بعید از قیاس ہوسکتا ہے.؟ یونہی حضور ﷺ کہ شہبازِ اقصائے ((اَنَا نُوْرٌ مِّنْ نُّوْرِ اللّٰهِ)) کے تھے اور آشیانہ ﴿وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ﴾ میں نزول فرمایا تھا.

﴿ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ ﴾ کی چوبِ گراں قدم کرم میں رکھی گئی تا کہ اِس کے باعث اُمتِ گنہگار میں قرار پائیں. پھر جو تابش آفتابِ عنایتِ الٰہی سے اُس وجود کا ثقلِ بشریت دور ہونے سے جسم مع روح فوق العرش پرواز کریں تو کیا تعجب ہے.؟

(و) تجربہ شاہد ہے کہ تماشہ کرنے والے انڈے کے اندر کی زردی بذریعہ سوزن نکال کر اُس کے اندر شبنم بھر دیتے ہیں اور اُس کے سوراخ کو موم سے بند کر کے جب دھوپ میں رکھتے ہیں تو گرمیءِ آفتاب سے شبنم گرم ہو کر اوپر کو اُٹھتی ہے اور ساتھ انڈے کو بھی لے جاتی ہے. پھر کیا مشکل ہے کہ وجودِ نورِ خدا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریح ﴿ اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ ﴾ کے بعد طبائع بشریت اور اخلاطِ جسمیتِ کثیف سے پاک ہو کر اعانت کشاکش ﴿ سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی ﴾ سے پرواز کرے تو عقل باور نہ کرے.

(ز) پارہ اور پٹرول پر ہی غور کیجیے جن کی اصل کثیف ہے. جب ذرا سی گرمی پہنچی، فوراً آسمان کو اڑ گئے، تو جاننا چاہیے کہ کثیف، لطیف کی طرف کیوں کر گیا؟ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم مع الجسد آسمان پر نہیں جا سکتے.؟

(ح) شریعت کا قاعدہ ہے کہ اگر دو چیزیں جو غالب و مغلوب ہوں آپس میں ملی ہوں تو حکم، غلبہ کے باعث، غالب کو ہوتا ہے. مثلاً آبِ دہن خون آلود نکلے تو حکم غالب پر ہے. اگر خون غالب ہے تو ناقصِ وضو ہے. وگرنہ وضو رہے گا. یہی صورت نقوذ میں ہوگی. اگر نقرہ غالب ہے حکم جید کا دیا جائے گا، اگر غِش یعنی کھوٹ غالب ہے تو حکم کھوٹے کا ہوگا وغیرہ وغیرہ، تو اسی پر غور کیجیے کہ جب روحِ پُر فتوح محبوبِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم پرواز کناں ہوا، پھر کیا جائے تعجب ہے؟

(ط) دورِ حاضرہ میں عام مشاہدہ ہو رہا ہے کہ ہوائی جہاز جو جسمِ کثیف رکھتا ہے مع سینکڑوں جسم کثیف کے پرواز کرتا رہتا ہے اور یہ جسم کثیف مانع پرواز نہیں تو جسمِ اطہر حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم جو الطف عن الھوا ہو، بُراق پر چشم زدن میں سیرِ افلاک کرے تو کون سا استحالہ لازم آتا ہے.؟

(ی) منکرینِ کوتاہ نظر اپنے ہی نورِ باصرہ پر ذرا توجہ فرمائیں کہ آنکھ اٹھاتے ہی احساس سیاراتِ فلک کرنے لگتا ہے. پھر جسمِ مطہر محمدی صلی اللہ علیہ وسلم جو اُن کی نگاہوں سے لکھوکھا درجے لطیف ترین ہے. قطعِ مسافتِ زمین و آسمان فرمائے تو اس کے محال ہونے کی کیا وجہ ہے؟

نمبر 3: معترضین اِعتراض کرتے ہیں کہ حدیث میں آتا ہے کہ معراج کے متعلق جب بیت المقدس کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تامّل سے فرمایا. پھر جب حجاباتِ نظر اٹھا دیے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوالوں کے جواب دیے، حالانکہ تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ بیت المقدس جو خاص ہیکلِ سلیمانی تھی، بُخت نصر کے حادثے میں برباد کر دی گئی تھی اور اُس کی تعمیر جو بعد میں ہوئی، اُس کو انطاکیہ کے بادشاہ انٹیوکس نے حضرت مسیح علیہ السلام

سے پیشتر ہی گرا دیا تھا۔ اس کے بعد جو تعمیر ہوئی وہ حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانے تک نہیں ہوئی تھی جس کی سرپرستی ہردوس حاکمِ شام کرتا تھا جو قیصر روم کا گورنر تھا۔ اُس کو حضرت مسیح علیہ السلام کی پیش گوئی کے مطابق آپ کے صعود سے تخمیناً چالیس برس بعد قیصرِ روم طیطوس نے بیخ و بُن سے گرا دیا تھا اور اُس کی بنیادوں میں ہل چلا دیے تھے۔ اِس کے بعد اُس کی تعمیر کا قصد کوئی نہ کر سکا اور مدتوں تک اس بنیاد سے آگ کے شعلے نکلتے رہے جو یہود پر مسیح کے ساتھ بدسلوکی کرنے سے قہرِ الٰہی تھا۔ آخر کار وہ تعمیر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے تک خراب پڑی رہی اور پھر آپ نے اُس کی تعمیر کی تو دریں حالت وہاں نماز کیوں کر پڑھی گئی؟ اور پھر کون سے نشانات کے متعلق سوالوں کے جواب دیے گئے؟

معترضین حضرات کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ مسجد اُس جگہ کا نام ہے جو عمارات کے گر جانے یا بدل جانے سے نہیں بدلتی اور وہ اپنی حیثیت میں زمین سے آسمان تک مسجد ہی ہوتی ہے۔ بیت المقدس یعنی وہ خاص ہیکل جس کو معترض نے پیش کیا ہے، گو منہدم ہو چکی تھی مگر اُس کے پاس عیسائیوں نے مکانات بنا رکھے تھے جن کو خود عیسائی اور عام لوگ ہیکل اور بیت المقدس ہی کہتے تھے جن کو قریشِ مکہ نے جب کہ وہ بغرضِ تجارت اُس دربار میں جاتے تھے تو دیکھا تھا۔ اُنہیں کی نسبت وقتِ معراج میں جو ہیکل کی موجودہ حالت تھی، کفار کے استفسار پر آنحضرت ﷺ نے بیان فرمایا تھا۔ رہا اُس کا (ہیکل کا) مکہ میں آپ کے سامنے موجود ہونا جسے دیکھ دیکھ کر آپ ﷺ قریش کو جواب فرماتے اور نشانیاں بتلاتے تھے جیسا کہ صحیح مسلم شریف میں مروی ہے تو اِس سے مراد یہ نہیں کہ ملائکہ اُن مکانات کو اٹھا کر مکہ لائے تھے بلکہ آپ کو روحانی انکشاف تھا جو آنحضرت ﷺ کے لیے محال نہیں کیوں کہ آپ مؤید بالہام تھے۔

نمبر 4: کہا جاتا ہے کہ زمین و آسمان کے مابین کرۂ نار اور کرۂ زمہریر واقع ہیں جن میں سے گزرنا محال امر ہے۔ معترضین کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ فی زمانہ یہ سوال بے سود سا ہے کیوں کہ موجودہ سائنس نے اِس کا جواب مکمل طور پر پیش کر دیا ہے۔

تجربہ شاہد ہے کہ تیز رفتاری کی کوئی حد معین نہیں ہے جو چیز آپ جلتی آگ میں پھینکیں گے خواہ وہ روئی کا گالا کیوں نہ ہو، جس زور سے پھینکی جائے گی۔ اتنی ہی وہ بے ضرر آگ سے پار جا نکلے گی۔ یہی حال طبقۂ برودت کا ہوگا۔

اب بلندی پر جانے والے ہوں سرکارِ کائنات، مختارِ شش جہات محمد رسول اللہ ﷺ، جن کا جسمِ اطہر ہماری جانوں سے زیادہ لطیف ہے اور لے جانے والی ذات اللہ تعالیٰ جل وعلا شانہٗ کی ہو، تو کرۂ نار و کرۂ زمہریر سے گزرنا معترض کے نزدیک کیوں کر ناممکن ہے؟

نمبر 5: کہا جاتا ہے کہ اگر واقعہ معراج سرکارِ دو جہاں محمد رسول اللہ ﷺ بیداری کا ہوتا تو قرآنِ کریم میں اس کو لفظ لیلاً کی قید سے مقید نہ فرمایا جاتا، الہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ خواب کا

ہے. معترضین کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ چونکہ واقعہ معراج رات کو ہوا اس لیے ''لیل'' کا لفظ لایا گیا. اگر دن کا ہوتا تو ''نہار'' استعمال کیا جاتا. اس کا یہ مطلب نہیں کہ جہاں کسی فعل کے پورا ہونے میں لفظ ''لیل'' آئے. وہ واقعہ خواب ہی کا ہوتا ہے. اِس مقام پر ''لیلاً'' کا لفظ نکرہ واقع ہوا ہے تاکہ تقلیل کا فائدہ پہنچے جس سے مراد پوری رات نہیں بلکہ رات کا بعض حصہ ہے. اِس لفظ سے یہ بھی ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اِس قدر طویل سفر اور لمبی سیر رات کے تھوڑے عرصے میں کرائی گئی جس سے قادر و قیوم کی قدرت کا عظیم الشان اظہار ہوتا ہے. اِس سے یہ نظریہ قائم کر لینا ایک کھلی ہوئی گمراہی ہے کہ واقعہ معراج خواب تھا کیوں کہ قرآنِ کریم میں متعدد واقعات کا تعین لفظ ''لیل'' سے کیا گیا ہے.

مثلاً ارشاد ہے ﴿فَاَسْرِ بِعِبَادِیْ لَیْلاً اِنَّکُمْ مُّتَّبَعُوْنَ﴾ ''پس میرے بندوں کو راتوں رات لے کر چل. تحقیق تم پیچھا کیے جاؤ گے.'' یہ آیت موسیٰ علیہ السلام کا بنی اسرائیل کو فرعون کے شہر سے نکال کر لے جانے کا واقعہ ہے، جو عین عالم بیداری میں وقوع پذیر ہوا تھا. دوسری جگہ یوں ارشاد ہوتا ہے. ﴿فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ﴾ یعنی لے نکل اہل اپنے کو رات میں. یہاں سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ قومِ لوط کا واقعہ رات کو چل نکلنے کا ہوا جس کے نکل جانے کے بعد اُن کے باقی اہلِ دیہہ کو عذاب کیا گیا تو یہ خواب نہ تھا کہ لیل کے مذکور ہونے سے بیداری کا انکار کرا دے.

نمبر 6: کہا جاتا ہے کہ جب آنحضرت ﷺ معراج کو تشریف لے گئے تو کئی برسوں کی مدت کا اندازہ قیام فرمایا تھا. پھر اتنی دیر آپ کا بستر کیوں کر گرم رہا اور زنجیرِ درِ حجرہ کیوں کر متحرک رہی؟

موجودہ سائنس کے ایجادات کی بنا پر ایسے اعتراضات زبان پر لانا بھی عقل و فہم کی توہین ہے، مثلاً تھرماس (سفری بوتل) میں حسبِ منشأ چیزیں سرد یا گرم رکھی جا سکتی ہیں اور جہاں تک حرکت کا تعلق ہے کلاک یا ٹائم پیس سالہا سال لگاتار متحرک رہتے ہیں. اب ذرا غور کیا جائے تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے کہ خدائے قادر و توانا جو انسانی قوت کا خالق ہے. آنحضرت ﷺ کے بستر کو گرم اور زنجیرِ درِ حجرہ متحرک رکھے تو کون سا استحالہ لازم آتا ہے.؟

نمبر 7: اعتراض ہوتا ہے کہ اُفقِ اعلیٰ کے قریب جسے عرفِ عام میں سدرۃ المنتہیٰ کہا جاتا ہے. کانٹے دار درختوں کا ہونا ''سدرہ'' کیا معنی رکھتا ہے؟

معترض صاحب کو سدرہ کے لفظ نے ایسا مبہوت کیا ہے کہ وہ خار دار بیری کے علاوہ سدرہ کا اور کوئی مفہوم سمجھ ہی نہیں سکتے. حالانکہ بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کے نام اُن کی جنسیت کی بنا پر خود حضرتِ انسان نے وضع کر لیے ہیں اور اُن سے اُن کے نام کا مطلب لے کر موضوع نہیں سمجھا جاتا. مثلاً ڈاکٹر اقبالؔ کی کتاب بالِ جبرائیل کیا وہی بالِ جبرائیل ہے جو اپنا اصل موضوع رکھتا ہے؟ کسی شہر کا نام ''اللہ آباد'' ہونے سے یہ نتیجہ لازم نہیں آتا کہ وہاں خدا کی رہائش ہے. یونہی سدرۃ المنتہیٰ کا تذکرہ ہے

اور وہ اپنی بلندی کے لحاظ سے ایک خاص مقام ہے. اِس کے نام کے لحاظ سے درخت بیر کا وہاں سمجھنا اور کانٹوں کا خطرہ محسوس کرنا ایک بے ضرورت استنباط ہے. اِس کے علاوہ قرآنِ کریم اِس کی نفی نہیں فرماتا کہ اِس دنیا کے علاوہ کہیں اور بیری کا درخت ہی نہیں بلکہ اُس نے بہشت میں بیری کے درخت کا ہونا ذکر فرمایا ہے یعنی ﴿ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ وَّ طَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ ﴾ یعنی کانٹے صاف کی ہوئی بیریاں اور پھل سے لدے ہوئے کیلے کے پودے ہوں گے.

رسائی نہیں عالمِ ھُو میں اُس کی   گزر خاک پر ہے نظر خاک پر ہے
یہ باعث ہے الفت کا اس خاک داں کی   کہ وہ عالمِ پاک سے بے خبر ہے

غرض یہ کہ جو لوگ واقعہ معراج کو روحانی یا خواب کی رویئت مان کر بعید از امکان ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں. اُنہیں یہ بھی سوچنا چاہیے کہ آخر اس واقعہ کی اصل غرض و غایت کیا ہے جو اِس شدّ ومدّ سے اِس واقعہ کی عظمت کا اعلان ہو رہا ہے.؟

معترضین حضرات اگر تعصب کی عینک اُتار کر واقعہ معراج کی اصلیت پر غور کریں تو یہ پتا چل جائے گا کہ یہ صریحاً تعلیمِ اُمت کے لیے نبی کی طرف سے ایک فعل ہے کیوں کہ نبوت کے تمام احکام اُس کی اپنی ذات کے لیے نہیں ہوتے. لہذا ہمیں اُن فوائد و بصائر کی جانب بھی متوجہ ہونا چاہیے، جو اِس آیت میں اشارۃً فرمائے گئے ہیں.

حقیقتِ کلام

﴿ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْىٌ يُّوْحٰى ﴾

''اور یہ پیغمبر اپنی خواہش سے بات نہیں بولتا، اِس کی بات سوائے وحی کے

جو اس کو بھیجی گئی ہے اور کچھ نہیں.'' [النجم ۵۳: ۳-۴]

یہ جملہ اولیٰ ﴿مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى﴾ کی دلیل ہے کہ حضور ﷺ کا بہکنا اور بے راہ چلنا ممکن و متصور ہو ہی نہیں سکتا. کیوں کہ آپ اپنی خواہش سے کوئی بات فرماتے ہی نہیں. جو فرماتے ہیں وحیِ الٰہی ہوتی ہے اور اُس میں آپ کے خلقِ عظیم اور اعلیٰ منزلت کا بیان ہے. نفس کا سب سے اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ وہ اپنی خواہش ترک کر دے. اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور افعال میں فنا کے اُس مقام پر پہنچے کہ اپنا کچھ باقی نہ رہا. تجلیءِ ربانی کا یہ استیلائے تام ہوا کہ جو کچھ فرماتے ہیں وہ وحیِ الٰہی ہوتی ہے.

اور متعدد تفاسیر میں یہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایسے پاکیزہ ہیں کہ اُن میں سوائے ارادہ حق تعالیٰ کے اپنی خواہشِ جسمانی کا کچھ نشان ہی نہیں، لہٰذا آپ اپنی خواہش کے موافق کوئی بات نہیں فرماتے بلکہ جو کچھ اُن کی زبانِ مبارک سے نکلتا ہے وہ عین وحیِ حق تعالیٰ ہوتی ہے. اِس سے ظاہر ہوا کہ قرآنِ مجید کے علاوہ جو بھی کچھ آپ فرماتے تھے وہ سب ''وحیِ خفی'' ہوتی تھی اور قرآن ''وحیِ جلی'' ہے.

حضرت اشعیاء علیہ السلام و انبیائے سابقین کی زبان سے لوگوں کو آگاہ کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اُس خاتم النبیین پیغمبر علیہ السلام کے منہ میں جس کے لیے ازل میں معاہدہ لیا گیا تھا، اپنا کلام ڈالوں گا وہ میری ہی زبان سے کلام کرے گا. جس نے نہ مانا میں اُس سے انتقام لوں گا.

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اُنہوں نے آنحضرت ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ میری اُمت کے ایک آدمی کی شفاعت سے اللہ تعالیٰ جنت میں قبیلۂ ربیع یا مضر کے برابر لوگوں کو داخل فرمائیں گے. ایک صحابی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ ربیعہ بہت تھوڑے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ میری زبان سے وہی نکلتا ہے جو مجھ کو وحی ہوتی ہے. [رواہ مسندِ احمد]

اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ ابتدا میں جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنتے تھے یاد رکھنے کی غرض سے لکھ لیا کرتے تھے. ایک مرتبہ قریش کے چند آدمیوں نے اُن سے کہا کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات لکھ لیتے ہو حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایک بشر ہیں اور بعض اوقات آپ غصے کی حالت میں بھی کلام فرماتے ہیں. عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں لکھنا چھوڑ دیں. پھر میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اِس بات کا تذکرہ کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ تو لکھا کر! پس قسم ہے حق عز و جل کی کہ میری زبان سے وہی بات نکلتی ہے جو حق ہے. [رواہ احمد وابوداؤد]

حدیثِ ابوہریرہؓ میں ہے کہ ایک مرتبہ بعض اصحابؓ نے عرض کیا کہ آپ ہم سے خوش طبعی اور مزاح کی بات بھی فرماتے ہیں (تو کیا ایسے موقع پر بھی آپ حق ہی فرماتے ہیں؟) آپ نے فرمایا کہ ہاں میں وہی کہتا ہوں جو حق ہے. [رواہ احمد]

مثلاً ایک مرتبہ ایک ضعیفہ کو آپ نے فرمایا کہ بوڑھی عورت جنت میں نہیں جائے گی تو وہ عورت غمگین ہوگئی. اِس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جنت میں اللہ تعالیٰ اُن کو نوجوان باکرہ کر کے داخل کرے گا معلوم ہوا کہ آپ کی خوش طبعی بھی حق گوئی پر مبنی ہوتی تھی.

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ میں لوگوں کو دیکھا کہ درختِ خرما میں نر کو مادہ درخت کے ساتھ اِس خیال سے لگاتے ہیں کہ اُن میں پھل زیادہ آئے تو آپ نے ایسا کرنے سے منع فرمادیا. چنانچہ آئندہ سال پھل کم پیدا ہوا تو آپ نے فرمایا کہ اپنی دنیا کے معاملات میں تم جانو، اور میں جب تم کو امرِ دین میں حکم دوں تو اُس کی اتباع کرو. اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ امورِ دنیا میں آپ کا کلام وحی الٰہی سے متعلق نہیں ہوتا تھا. سو اِس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ بعض کلام کے اسرار و حکمت ہماری سمجھ میں نہیں آتے. یہ تو ہماری سمجھ کا قصور ہے. اللہ تعالیٰ کسی کی حسنِ نیت کی بنا پر اُس کے لیے دنیاوی معیشت کے واسطے آسائش و فراخی کی ایسی صورت پیدا کر دیتا ہے جو عادت کے خلاف ہو مگر یہاں پر توکل اور بھروسہ پورا پورا چاہیے اور اگر کسی عادت کی وجہ سے دل میں تردّد ہوا تو وہ نتیجہ پیدا نہیں ہوتا اور تردّد کے معاملے میں انسان مجبور ہے. مثلاً خرما میں مادہ کو نر کے ساتھ ملانے سے پھل کے زیادہ پیدا ہونے کا خیال اُن کے دلوں میں جما ہوا تھا اور اِس عادت کے چھوڑنے میں اُن کو ہیجان پیدا ہوا اور اِس بنا پر انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آئندہ سال قلت پھل کی شکایت کی حالانکہ ایسا ہونا ممکن ہی نہ تھا کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بلا ارادہ بھی کوئی بات ارشاد فرمادیتے تو وہ غیر ممکن امر بھی ممکن ہو کر رہتا. پھر یہاں خرما کے معاملے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بالارادہ ارشاد فرمایا تھا، یہ پورا کیوں کر نہ ہوتا؟ درحقیقت یہ اُن لوگوں کا تخیل اور واہمہ تھا جس میں وہ مدت سے مبتلا تھے. اگر سرکارِ انبیاؑ علیہ السلام کے ارشاد پر اِسی طرح قائم رہتے جیسا کہ ارشاد ہوا تھا تو پھلوں کی کمی کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے حل

ہو جاتا. بعض اوقات انسان کا اپنا وہم بھی بلا وجہ اُس کو پابندِ بلا کر دیتا ہے. صاحب تفسیر مرادیہ نے اِسی بات پر ایک حکایت لکھی ہے. وہ لکھتے ہیں کہ حضرت شرف الدین یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ اپنے ایک ارادت مند کے پاس گئے اور فرمایا کہ گھر سے دودھ لاؤ کہ گرم کر کے پیئیں. مرید نے عرض کیا کہ قبلہ ہمارے ہاں یہ سلسلہ مدت سے جاری ہے کہ اگر بھینس یا گائے کے بچہ جننے کے بعد چالیس دن کے اندر اندر ہم دودھ کو آگ پر گرم کریں تو بھینس مر جاتی ہے. آپ کو تعجب ہوا کہ یہ کیا قصہ ہے. آپ نے ارادت مند کو مجبور کیا کہ دودھ لاؤ اور اپنی ہی بھینس کا لاؤ تاکہ ہم اِس کا تجربہ کریں. اُس نے عرض کیا آپ کا تجربہ ہوگا ہماری بھینس مر جائے گی، مگر آپ نے اُس کو تسلی دی اور سہ بارہ اُس کو گھر سے دودھ لانے کا حکم دیا. چنانچہ وہ دودھ لے آیا جب آگ پر رکھا تو گھر سے پیغام آیا کہ بھینس کھڑی کھڑی گرگئی ہے اور مر رہی ہے. حضرت شرف الدین یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ یہ سن کر اُس کے گھر تشریف لے گئے. دیکھا تو واقعی بھینس مر رہی ہے. آپ نے گری ہوئی بھینس کے منہ پر دو چار جوتے مارے اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی. مرید متعجب ہوا اور پوچھا کہ حضرت یہ کیا بات تھی؟ آپ نے فرمایا کہ میں نے جب اِس کو دیکھا کہ مر رہی ہے تو مکاشفہ سے معلوم کیا کہ تمہارے خیال کے قیام کے واسطے شیطان اِس کا سانس روک کر اُس کے نتھنے اور منہ بند کیے ہوئے ہے تاکہ آئندہ بھی یہ قائم رہے. میں نے ''لاحول پڑھ'' کر جوتے رسید کیے تو چھوڑ کر بھاگ گیا اور بھینس کا سانس جوڑ کا ہوا تھا کھل گیا اور اُٹھ کر کھڑی ہوگئی.

جو کوئی اللہ تعالیٰ پر توکل کرے یعنی بالکل مطمئن ہو تو اللہ تعالیٰ آسان طریقے سے اُس کے لیے وہی نتیجہ پیدا کر دیتا ہے، جو دوسروں کو مشقت سے حاصل ہوتا ہے. پس ظاہر ہوا کہ آپ کا سب کلام حق ہے اور سمجھنے کے واسطے البتہ معرفت درکار ہے. بعض لوگوں نے گمان کیا کہ ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى﴾ فقط احکامِ شریعت کے ساتھ خاص ہے کیوں کہ بعض افعال میں آپ نے فرمایا کہ میں بشر ہوں. جیسے تم بھولتے ہو، میں بھی کبھی بھول جاتا ہوں. جیسا کہ آپ ایک مرتبہ نمازِ فجر کے وقت سو گئے جیسے کہ دوسرے لوگ سو جاتے ہیں. اِس کا جواب یہ ہے کہ آپ کی ذاتِ مبارک سے انسانی ہدایت مقصود تھی، لہٰذا آپ کے حق میں وہ بشری افعال جاری ہوتے تھے تاکہ اُن احکام سے اُمت کو آگاہی ہو. اگرچہ آپ کو اُن کی خود کوئی ضرورت نہ تھی. صبح کے وقت نماز میں غفلت طاری ہونا آپ کی ذات مبارک سے بعید تھا کیوں کہ آپ عین الشھود کی معرفت میں تھے. آپ کا سونا بھی ہزار ہا بیداری سے افضل تھا.

چنانچہ حدیث صحیح میں وارد ہے کہ ''میری آنکھیں سوتی ہیں میرا دل نہیں سوتا''. چونکہ طلوعِ فجر وغیرہ کے احکام آنکھ سے متعلق ہیں لہٰذا اِس حکم کے بیان کرنے کے لیے روح مبارک کو روک لیا گیا تاکہ اُمت پر رحمت و آسانی ظاہر ہو.

معلوم ہوا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول و فعل سب وحیِ الٰہی کے ماتحت تھا اور جو کچھ سرکارِ انبیاء حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ظہور پذیر ہوتا وہ آپ کی ذات کے لیے نہیں بلکہ تعلیمِ اُمت کے لیے بحکمِ ربانی ہوتا. وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْھُدٰی

مسئلہ علم غیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

﴿ ...... وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴾

اور سکھلا دیئے آپ کو وہ سب علوم جو آپ نہیں جانتے تھے

اور آپ پر اللہ تعالیٰ کا یہ بڑا فضل ہے [النساء ۴:۱۱۳]

کسی مسئلہ پر بحث کرنے سے پہلے یہ جان لینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی نوعیت کیا ہے اور قائل اُس کی حقیقت کو اپنے عقیدہ اور خیال میں کیا جگہ دیتا ہے اور کیا قائل بھی اپنے قول میں لغزش کر سکتا ہے یا نہیں؟ چنانچہ اسی تحت میں جب ہم کو یہ معلوم ہو جائے کہ علمِ غیب کیا ہے اور پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اور وہ اِس کے کیونکر مستحق ہیں اور علمِ غیبِ الٰہی اور علمِ غیب نبوی میں کیا فرق ہے اور اِس عقیدہ کے رکھنے یا نہ رکھنے سے ایک مسلمان گنہگار تو نہیں ہوتا؟ پھر یقیناً ایک بے تعصب اور ذی علم و فہم انسان صحیح نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے.

غور کرو مذہب کیا چیز ہے اور اِس کی حقیقت کیا ہے.؟ مذہب انسان کی عملی زندگی کے لیے چراغِ راہ ہے. انسان اور اُس کی عملی زندگی کا تعلق تمام تر مادیات سے ہے اِس لیے ماورائے مادہ کی نسبت صرف وہیں تک اِس کے ساتھ تعلق رکھتی ہے جہاں تک وہ انسان کی عملی زندگی کے لیے ضروری ہے. یعنی مذہب میں دو چیزیں ہوتی ہیں، عقائد اور عبادات اور دوسرے الفاظ میں اُن کی یہ تعبیر ہو سکتی ہے کہ مذہب علم اور عمل سے مرکب ہے. پھر علم کی دو قسمیں ہیں. ایک وہ جو مادیات سے ماخوذ اور انہی سے وابستہ ہے اور اُس کے متعلق ہم میں بذریعہ مشاہدہ اور تجربہ کے یقین پیدا ہوتا ہے. دوسرا وہ علم ہے جس کا تعلق ماورائے مادہ سے ہے اور جس کے جاننے کا ذریعہ صرف تخیل، تصور اور ظن ہے. مثلاً آگ جلاتی ہے. یہ علم مادی ذریعہ ''احساس'' سے ہم کو حاصل ہوا ہے. اِس لیے سب کو اِس درجہ یقین ہے کہ غلطی سے بھی ہم آگ میں کودنے کی ہمت نہیں کر سکتے. لیکن دوسرا علم یہ ہے کہ انسان مرنے کے بعد دوسرا جنم لیتا ہے. مگر اِس علم پر اعتماد کر کے کیا کوئی انسان اپنی زندگی کا آپ خاتمہ کر دینے کو تیار ہو گا؟

حضرت شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایک خط میں امام فخر الدین رازی علیہ الرحمت کو نصیحت فرماتے ہوئے کہتے ہیں کہ اب عقل مند کے لیے مناسب ہے کہ وہ خدا کے جود وکرم کی خوشبوؤں سے فائدہ اٹھائے اور نظر واستدلال کی قید میں نہ پھنسا رہے. کیونکہ وہ اِس طرح ہمیشہ مشتبہ حالت میں رہے گا. چنانچہ مجھ سے تمہارے ایک دوست نے ملاقات کی جو تمہارے ساتھ حسنِ عقیدت رکھتا تھا اور بیان کیا کہ اُس نے تم کو ایک روز روتے ہوئے دیکھا. پھر جب اُس نے اور دوسرے حاضرین نے رونے کا سبب دریافت کیا تو تم نے یہ جواب دیا کہ ایک مسئلہ جس پر تیس برس سے میں اعتقاد جمائے ہوئے تھا، اُس وقت ایک دوسری دلیل سے مجھ کو غلط ثابت ہوا ہے اور رونا اِس امر پر ہے کہ کیا اِس کے بعد جو تحقیق مجھ پر آگے ظاہر ہو گی کیا وہ بھی پہلے کی طرح غلط نہ ہو گی؟ یہ خود تمہارا قول ہے اور واقعی وہ شخص جو عقل اور استدلال کے مرتبہ سے آگے نہیں بڑھا، اُس کے لیے ناممکن ہے کہ سکون اور اطمینان حاصل کر سکے اور بالخصوص خدائے تعالیٰ کی معرفت میں. سوائے بھائی! تم کیوں استدلال کے گرداب میں پڑے ہو؟ اور کیوں ریاضات ومجاہدات اور مکاشفات وخلوات کا وہ طریقہ اختیار نہیں کرتے، جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع فرمایا ہے اور جس کا نتیجہ یہ ہے کہ تم بھی وہ چیز حاصل کر لو جو انہوں نے حاصل فرمائی.

حضرت محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کے متذکرہ بالا خط سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص انوارِ نبوت سے مستنیر ہوئے بغیر محض اپنی عقلی تحقیق پر بھروسہ کر کے الٰہیات کی کنہہ تک پہنچنا چاہے گا، یا کائناتِ ارضی و سماوی کو اپنی عقل کے ناتمام گز سے ناپتا رہے گا، وہ یقیناً بجائے کعبہ کے ترکستان کو چلا جائے گا. اُس کے اوہام اُس کی عقل سے مزاحمت نہ کریں گے اور وہ ہمیشہ تخیلات وشکوک کے گرداب میں پھنسا رہے گا.

نبوت اور نبی کا مفہوم

حضرت حجۃ الاسلام امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں. انسان اصل پیدائش کے لحاظ سے جاہلِ محض پیدا ہوا ہے. پیدا ہونے کے وقت وہ اقسامِ موجودات میں سے کسی چیز سے واقف نہیں ہوتا. سب سے پہلے اُس میں لمس کا مادہ پیدا ہوتا ہے. جس کے ذریعہ سے وہ اُن چیزوں کو محسوس کرتا ہے جو چھونے سے تعلق رکھتی ہیں. مثلاً حرارت، برودت، رطوبت، یبوست اور نرمی وسختی. اِس حاسہ کو مرئیات ومسموعات سے کوئی تعلق نہیں. جو شئے محض سننے سے معلوم ہو سکتی ہے اُس کے حق میں یہ حاسہ بالکل معدوم ہے. اِس کے بعد انسان میں دیکھنے کا حاسہ پیدا ہوتا ہے جس کے ذریعے وہ رنگ اور مقدار کا ادراک کر سکتا ہے. پھر سننے کی قوت پیدا ہوتی ہے پھر چکھنے کی یہاں تک کہ محسوسات کی حد ختم ہو جاتی ہے اور ایک نیا دور شروع ہوتا ہے. جس میں تمیز کی قوت حاصل ہوتی ہے اور اُن چیزوں کا خیال کر سکتا ہے جو حواس کی دسترس سے

باہر نہیں. پھر آگے حل کا زمانہ آتا ہے جس سے ممکن، محال، جائز، ناجائز کا ادراک ہوتا ہے. اِس سے بڑھ کر ایک اور درجہ بھی ہے جو عقل کی سرحد سے آگے ہے اور جس طرح تمیز و عقل کے مدرکات کے لیے حواس بالکل بیکار ہیں، اِسی طرح اِس درجہ کے لیے عقل محض بیکار ہے اور اِس درجہ کا نام ''نبوت'' ہے. بعض لوگ اِس درجے اور اِس کی خصوصیات کے منکر ہیں. لیکن یہ انکار اُسی قسم کا ہوسکتا ہے. جس طرح وہ شخص عقلی چیزوں کا انکار کرتا ہے، جس کو ابھی عقل کی قوت عطا نہیں ہوئی. اس تحقیق کے لحاظ سے اصطلاحی طور پر نبوت کی تعریف کرنا چاہیں تو یوں کریں گے کہ نبوت وہ قوت یا ملکہ ہے. جس سے اُن اشیاء کا ادراک ہوسکتا ہے. جن کا ادراک حواس سے، تمیز سے اور عقل سے قطعاً نہیں ہوسکتا.

لفظ نبی لغتہً یا تو نبوۃ سے ماخوذ ہے. جس کے معنی زمین سے بلند ہونے کے ہیں اور لغوی و اصطلاحی معنوں میں مناسبت اس طرح ہے کہ اللہ کریم جل وعلاشانہٗ نبی کو تمام مخلوق پر شرف وفضیلت عطا فرماتا ہے، یہاں تک کہ اُس کے درجے مرتبے اور منزلت کو سب پر بلند فرما دیتا ہے. اِس بنا پر وہ فعیل بمعنے مفعول ہوگا اور یا ''نبی'' نبا سے ماخوذ مانا جائے تو اِس کے معنی خبر کے ہوں گے. اِس صورت میں وہ فعیل بمعنے فاعل ہوگا. جس کی مناسبت اِس طرح ہوگی کہ نبی اللہ تعالیٰ سے خبر پا کر بندوں کو اطلاع فرماتا ہے اور شریعت میں نبی کا اطلاق اُس ہستیٔ مقرب بارگاہِ الٰہی پر ہوتا ہے. جس کو خداوندِ عالم جل مجدہٗ اپنے احکام بندوں تک پہنچانے کے لیے منتخب فرمائے. حکماء کہتے ہیں کہ نبی وہ ہے. جس میں تین خواص پائے جائیں:

اول: اپنے جوہرِ نفس کی صفائی اور شدتِ اتصال بالمبادی العالیہ اور بغیر کسی بیرونی عمل اور سابقہ کسب و تعلیم کے غیب کی خبروں سے اطلاع دے.

دوم: اُس کے ہیولیٰ ءِ عنصری میں حقائق اشیاء کے ادراک اور صورِ الٰہیہ کے انکشاف کی قابلیت وصلاحیت ہو.

سوم: ملائکہ کی صورِ متخیلہ مشاہدہ کرے اور بذریعہ وحی کے کلام الٰہی کو سنے.

اِس سے ثابت ہوا کہ نبوت کے تسلیم کرنے کے یہ معنی ہیں کہ نبوت ایک درجہ ہے جو عقل سے بالاتر ہے اور جس میں وہ آنکھ کھل جاتی ہے جس سے وہ خالص اشیاء معلوم ہو جاتی ہیں، جن سے عقل بالکل محروم ہے اور یہی دوسرے معنوں میں اسیرانِ عقل کے لیے علم غیبِ نبوت ہے.

اب سنئے کہ علماءِ کرام علمِ غیب کے متعلق کیا فرماتے ہیں اور اُن کے نزدیک غیب کس چیز کا نام ہے.

تفسیر کبیر جلد اول مصری صفحہ 169 سطر 27 ''اِنَّ الْغَیْبَ هُوَ الَّذِیْ یَکُوْنُ غَائِباً عَنِ الْحَاسَّةِ'' یعنی غیب وہ ہے جو حاسہ سے باہر ہو یعنی حواسِ خمسہ: دیکھنے، سونگھنے، سننے، چکھنے اور چھونے

سے الگ ہو۔

تفسیرِ عزیزی میں شاہ عبدالعزیز جلد اول سورہ بقرہ ص 57 سطر 28 میں لکھا ہے۔ "غیب، نامِ آں چیز است کہ از ادراکِ حواسِ ظاہرہ و باطنہ خارج باشد" یعنی غیب وہ چیز ہے جو حواسِ ظاہری و باطنی کے ادراک سے خارج ہو اور یہی تعریف تفسیر عزیزی جلد دوم ص 205 سطر اول میں شاہ عبدالعزیز صاحب نے فرمائی اور اسی کے ماتحت ہمیں سرکارِ کائنات ﷺ کا علم ثابت کرنا ہے اور اسی کے ماتحت اہلِ سنت کے عقیدہ کا اظہار ہوگا اور وہ یہ ہے کہ علمائے کرام اہلِ سنت، حضور سرورِ عالم، تاجدارِ عرب و عجم ﷺ کے لیے نہ جمیع غیوبِ نامتناہیہ علم ثابت کرتے ہیں اور نہ جملہ معلوماتِ الٰہیہ کا۔ مقابلتاً حضور ﷺ کے علم کو علمِ الٰہی سے کوئی برابری کی نسبت نہیں دیتے، اور یہ بھی عقیدہ نہیں رکھتے کہ ذرہ کو آفتاب سے، یا قطرہ کو سمندر سے جو نسبت ہے، یہی خالق و مخلوق میں متصور ہو جائے۔ کیونکہ خدا اور رسولِ خدا میں مماثلت اور مساوات سوءِ ادب باری تعالیٰ ہے۔ تمام مخلوق کے علوم، علمِ الٰہی کے حضور میں اقل قلیل اور کوئی ہستی نہیں رکھتے۔ ہم نہ مثل اور برابری کے قائل ہیں کہ خدا اور رسولِ خدا کے علمِ غیب کو ایک کر دکھائیں اور نہ عطائے الٰہی اور فضائلِ ایزدی کے منکر، کہ شانِ نبوی کو گھٹائیں اور خداوندِ عالم کے ذمہ امکانِ کذب کے بہتان لگائیں۔ معترضین کا یہ کہنا کہ علمائے اہلِ سنت خدا کے علمِ غیب میں برابری اور مماثلت کر دیتے ہیں، محض بہتان اور علمائے اہلِ سنت پر صریح افترا ہے۔ یہ عقیدۂ ضالہ بفضلہ تعالیٰ اہلِ سنت کے کسی ایک کا بھی نہیں۔ ہاں مخالفین کی طرح منکرِ علمِ غیب رسول اللہ نہیں ہیں۔ یہ ضرور مانتے ہیں کہ "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" اور ایسی وسیع فضیلت کے لیے وسعتِ علم بھی ایسی ہی ہونی مانتے ہیں کہ حضور ﷺ کی روحِ اقدس سے عالم کی کوئی چیز، عرشی ہو یا فرشی، دنیا کی ہو یا آخرت کی، آپ سے پردۂ حجاب میں نہیں ہے۔ حضور ﷺ سب کے عالم ہیں اور ذرہ ذرہ حضور ﷺ پر ظاہر و روشن ہے مگر حضور ﷺ کے اِس علم کو علمِ الٰہی سے کوئی مساوات نہیں کیونکہ وہ علم "غیر متناہی" ہے اور حضور ﷺ کا علم خواہ کتنا ہی وسیع ہو۔ "متناہی" ہے اور متناہی کو غیر متناہی سے کوئی مساوات کا تعلق نہیں ہوتا۔

ہاں اتنی وسعتِ علم دیکھ کر اگر مخالفین سٹ پٹا جائیں کہ رسول اللہ ﷺ کے لیے مان لیا اور خدا کے پاس اب اِس کے سوا باقی کیا رہ گیا ہوگا؟ اور اُن کی تنگ ظرفی؟ علمِ الٰہی کو بھی محدود اور نہایت کم استعداد کا خیال کرے تو یہ اُن کی اپنی کوتاہ فہمی ہے کہ علمِ الٰہی کو عالم میں منحصر خیال، کریں یا علمِ متناہی کے برابر ٹھہرائیں۔ اہلِ سنت علمِ الٰہی کو محدود نہیں مانتے اور نہ علمِ متناہی سے مماثلت کر کے علمِ قدیم ازلی سے جس کے معلومات لاانتہا ہیں، کوئی مزاحمت کرتے ہیں، کیونکہ علمِ قدیم کے معلومات اس عالم میں منحصر نہیں، اور ظاہر ہے کہ اسرارِ ربوبیت اور اوصافِ الوہیت جو غیر متناہی ہیں، اس وسعت کے ساتھ تسلیم کرتے ہیں جو حضور ﷺ کو عطا فرمائی گئی ہے اور علمِ الٰہی کو اس کی بے مثال عظمت کے ساتھ ذاتی اور

مخصوص بحق مانتے ہیں. درحقیقت یہ مغالطہ اُن ہی لوگوں کو ہوتا ہے جو رسول خدا کے علم کے مقابلے میں علم الٰہی کو بھی محدود اور متناہی خیال کرتے ہیں اور خداوند عالم کے علم کی تنقیص کرنے میں مبتلا ہیں. اگر وہ لوگ اللہ جل شانہٗ کی قدرت اور علم سے واقف ہوتے تو رسولِ خدا ﷺ کے علم کی وسعت کا انکار نہ کرتے ہوئے اہلِ سنت والجماعت کو مساوات کرنے کا الزام نہ لگاتے اور حقیقت میں بات یہ ہے کہ مدارجِ نبوت اور مراتبِ رسالت کے کمالات کا وہی منکر ہو سکتا ہے جو خداوندِ عالم کی قدرت و عظمت سے بے خبر ہو۔

کتاب الابریز کے مصنف اسی کتاب کے ص 43 میں اپنے شیخ کی نسبت دے کر فرماتے ہیں کہ اِس امتیاز میں سب سے زیادہ قوی روح ہمارے نبی ﷺ کی ہے کہ اِس روحِ پاک سے عالم کی کوئی چیز پردہ میں نہیں. یہ روحِ مقدس عرش اور اُس کی بلندی، پستی ءِ دنیا و آخرت، جنت و دوزخ، سب پر مطلع ہے. کیونکہ یہ سب اُسی ذاتِ مجمع کمالات کے لیے پیدا کی گئی ہیں- آپ ﷺ کی تمیز اُن جملہ عالموں کی خارق ہے. آپ کے پاس اجرامِ سموات کی تمیز ہے کہ کہاں سے پیدا کیے گئے؟ کیوں پیدا کیے گئے؟ اور کیا ہو جائیں گے؟ اور آپ کے پاس ہر آسمان کے فرشتوں کی بھی تمیز ہے اور اِس کی بھی کہ وہ کہاں سے اور کب پیدا کیے گئے اور کہاں جائیں گے؟ اور اُن سے اختلافِ مراتب اور منتہائے درجات کی بھی تمیز ہے اور ستر (۷۰) پردوں اور ہر پردہ کے فرشتوں کے جملہ حالات کی بھی تمیز ہے. عالمِ علوی کے اجرامِ نیّرہ، ستاروں، سورج، چاند، لوح و قلم، برزخ اور اُس کی ارواح کی بھی ہر طرح امتیاز ہے، اِسی طرح ساتوں زمینوں اور ہر زمین کی مخلوق، خشکی اور تری کا بھی حال معلوم ہے. اِسی طرح تمام جنتیں اور اُن کے درجات اور اُن کے رہنے والوں کی گنتی اور مقامات سب خوب معلوم ہیں. لیکن اِس علمِ نبوت کی علم قدیم ازلی سے کوئی نسبت نہیں. اِس لیے کہ اُس کی معلومات بے انتہا ہیں. اس کی وضاحت منہاج النبوّت ترجمہ مدارج النبوت جلد اول ص 346 سطر 5 میں یوں فرمائی گئی ہے ﴿فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِہٖ مَا اَوْحٰی﴾ یعنی وحی کیا پروردگار نے طرف اپنے بندے کے جو کچھ وحی کیا، بطریق الہام کے. یعنی وحی کیا سو کیا. خدا جانتا ہے یا اُس کا رسول، دوسرا کیا پا سکتا ہے. تمام علوم اور معارف و حقائق اور بشارات، اشارات اور اخبار و آثار اور کرامات و کمالات اُس الہام کے احاطہ میں داخل ہیں اور تمام کو یہ شامل ہے اور کثرت و عظمت سے ہے جو ملہم لایا اور بیان نہ کیا. اِن اشارات کے تئیں اوپر اس بات کے، کہ سوائے علام الغیوب کے اور اُس کے رسولِ محبوب کے کوئی اس پر احاطہ کرنے والا نہیں ہو سکتا۔

اِن ہر دو عبارات سے رسولِ خدا کے علم کی نسبت معلوم ہو گیا ہے کہ وہ کس قدر ہے اور متقدمینِ اسلام اِس کے متعلق کیا عقیدہ رکھتے ہیں اور یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ باوجود اس طرح ماننے کے علمِ الٰہی

سے اُس کی کوئی مماثلت نہیں ہوتی. اب اِس کو دو عنوانوں میں علیحدہ علیحدہ معلوم کیجئے. تا کہ علمِ الٰہی اور علمِ نبوی کی مماثلت اور مساوات کا شبہ نکل جائے اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ سلف صالحین نے علمِ الٰہی کے متعلق کیا عقیدہ رکھا ہے اور علمِ نبوی کو کس مرتبہ تک تسلیم کیا ہے.

بیانِ علم اللہ تعالیٰ میں

صحیح بخاری جلد دوم ص 176 سطر 4 مطبوعہ مصری، قصہ حضرت موسیٰ وخضر علیہم السلام، ((فَلَمَّا رَكِبَا فِي السَّفِينَةِ جَاءَ عُصْفُورٌ فوقع عَلٰى حَرْفِ السَّفِينَةِ فَنَقَرَ فِي الْبَحْرِ نَقْرَةً أَوْ نَقْرَتَيْنِ قَالَ لَهُ الْخِضرُ يٰمُوسٰى مَا نَقَصَ عِلْمِي وَعِلْمُكَ مِنْ عِلْمِ اللّٰهِ إِلَّا مِثْلَ مَا نَقَصَ هٰذَا الْعُصْفُورُ بِمِنْقَارِهِ مِنَ الْبَحْرِ)). [الحدیث بلفظہٖ]

یعنی موسیٰ اور خضر علیہما السلام کشتی پر سوار ہوئے تو ایک چڑیا کشتی کے کنارے پر آ کر بیٹھی اور اُس نے اپنی چونچ کو سمندر میں ڈبو دیا. پس حضرت خضر نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ میرا علم اور تمہارا علم اور سارے جہانوں کا علم اللہ تعالیٰ کے علم کے مقابلے میں اتنا ہے جتنا چڑیا نے سمندر میں سے اپنی چونچ میں لیا.

شرح عقائد علامہ تفتازانی علیہ الرحمۃ ص 27 میں ہے کہ معلومات اللہ تعالیٰ اکثر من مقدوراته مع الامتنا ھیھما. یعنی اللہ تعالیٰ کے معلومات مقدورات سے بہت زیادہ ہیں. باوجود اِس کے کہ دونوں کی کوئی انتہا نہیں. [معلومات کی مقدورات کی]

شرح مواقف، موقف ثانی علامہ جرجانی میں ہے واعلم ان معلومات الله تعالیٰ اکثر من مقدورات مع ان کل واحد منهما غیر متناهیه یعنی جان لو، تحقیق اللہ تعالیٰ کی معلومات بہت زیادہ ہیں اُس کے تقدیر کئے ہوئے سے، باوجود اِس کے کہ ہر ایک اُن دونوں میں سے غیر منتہی ہے.

حاشیہ بیضاوی میں علامہ خفاجی علیہ الرحمہ سے ہے ان معلومات الله تعالیٰ لانهایته لها وغیب السمٰوت والارض وما یبدونه وما یکتمونه قطرةمنها یعنی تحقیق اللہ تعالیٰ کی معلومات کی انتہا نہیں ہے اور غیب آسمانوں کا اور زمینوں کا اور جو کہ ظاہر کرتے ہیں اور چھپاتے ہیں اس کو اس سے ایک قطرہ ہے.

کیمیائے سعادت، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ میں ہے. وهیچ سلیم دل نبود که ایں قدرنداند، که علم فرشتگان و آدمیاں درغیب علم حق تعالیٰ نا چیز است وهمه راگفته که﴿ وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا ﴾ فرمایا: کوئی سلیم دل نہیں جو اِس قدر نہ جانے کہ علم فرشتوں اور آدمیوں کا، علم حق تعالیٰ کے حضور میں ناچیز ہے اور اُس نے سب کو فرمادیا ہے کہ

تم علم سے بہت تھوڑا دیئے گئے ہو۔
الغرض اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ عقیدہ علمائے اسلام اہل سنت کا ہے۔ جو ''مشتے نمونہ از خروارے'' دو چار کتب سے بالااختصار نقل کردیا ہے، تاکہ معترض بھائی کو یاد رہے کہ ہم اِس میں یعنی علمِ الٰہی میں کسی مساوات ومماثلت کے معتقد نہیں ہیں؟

بیان علم رسول اللہ ﷺ میں

علم رسول اللہ ﷺ کا ذکر کرنے سے پہلے یہ ذکر کردینا بے محل نہ ہوگا کہ ہمارے بعض بھائی بغیر دیکھے سنے اہلِ سنّت کو طعن کرتے ہیں کہ یہ لوگ اپنے مشرکانہ عقیدہ کے ماتحت مراتبِ علم ونعمت میں خداوندِ عالم جلّ شانہٗ اور رسول اللہ ﷺ کو برابر کردیتے ہیں اور اِس قدر بڑھاتے ہیں کہ تمیز ہی نہیں چھوڑتے، مگر یہ بات ہماری سمجھ میں آج تک نہیں آئی کہ بڑھانے گھٹانے کا معاملہ اُن بھائیوں نے کہاں سے ثابت کیا ہے؟ علمائے اہل سنت تو پکار پکار کر فرما رہے ہیں کہ ہم اس سے بری الذمہ ہیں، اور ہمیں اس عقیدہ سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ ہاں عنایاتِ ایزدی کا رسولِ خدا کی نسبت اقرار ضرور کرتے ہیں، کیونکہ اُس کے اقرار کئے بغیر کوئی مومن، مومن نہیں ہوسکتا۔

کس قدر تعجب انگیز یہ امر ہے کہ خدا کے دیئے ہوئے کی بھی نسبت کرنا یہاں کی مذہب انگیز زمین میں کفر اور شرک سے تعبیر کیا جاتا ہے جو سراسر شانِ نبوی میں تعصب اور سوءِ فہمی کے مترادف ہے۔ خدا اگر اپنے محبوب ومختار نبی (فداہ امی وابی) کو اپنے انعام سے مالا مال فرماتا ہے تو اِس میں متعصبین کو چون وچرا کا کیا حق ہے؟ کیا وہ علم الٰہی کی کوئی حد مقرر کرتے ہیں جس کے ساتھ برابری کا شبہ اُن کو دن رات رسولِ خدا کی طرف سے بے چین رکھتا ہے؟ اور اگر وہ بے حد اور بے انتہا ہے تو اس برابری کی غیرت کے کیا معنی ہیں؟ ہم اِس شبہ کو یہاں صاف کرتے ہیں اور ایک دو حوالہ جات سے دکھاتے ہیں کہ ہمارا عقیدہ علمِ غیب رسول اللہ ﷺ کے متعلق کس طرح ہے۔ معلوم کیجئے کہ علمِ غیب کی تقسیم دو طرح پر ہے۔

اول: حقیقی یا استقلالی یا ذاتی۔

دوسرا: اضافی یا وہبی یا تعلیمی۔

پہلی قسم کا علمِ غیب جو بلا کسی وسیلہ یا ذریعہ کے ہے، بالاستقلال ذاتی ہے اور وہ خاص اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔

اور دوسرا علمِ غیب جو اضافی یا وہبی یا تعلیمی ہے، وہ آنحضرت ﷺ اور اولیاء کرام کو ثابت ہے۔

جس کا ہم آگے چل کر بفضلہٖ تعالیٰ وضاحت سے ثبوت پیش کریں گے۔ انشاء اللہ

سب سے پہلے ہم معترض صاحب کے ایک ہم عقیدہ عالم کی تحریر پیش کرتے ہیں کہ وہ اس عقیدہ میں کیا کچھ اظہار کرتے ہیں۔ دیکھو کتاب صراطِ مستقیم مولوی اسمٰعیل صاحب دہلوی بلفظہٖ ص 101، سطر 2۔

الف- وھمچنیں اصحابِ ایں مراتبِ عالیہ و اربابِ ایں مناسب رفیعہ ما ذونِ مطلق در تصرفِ عالم مثال و شہادت مے باشند، وایں کبار اولی الاید والا بصار را میرسد کہ تمامی کلیات را بسوئے خود نسبت نمائند. مثلاً ایشان را میرسد کہ بگوئیند کہ عرش تا فرش سلطنتِ ما است ......الآخر.

ب- افادہ برائے انکشاف حالات سمٰوات و ملاقات ارواح و ملائکہ جنت و نار و اطلاع بر حقائق آں مقام دریافت امکنہ آنجا انکشافِ امرے از لوحِ محفوظ ذکرِ "یا حی یا قیوم" است.

بلفظہٖ ص 117، سطر 7۔

وہ لکھتے ہیں رسول اللہ ﷺ کی ہستی الگ رہی، صرف اولیاء کرام علیہ الرحمۃ والرضوان کے یہ مراتب ہیں کہ تمام زمینوں آسمانوں کے حالات اور دوزخ وجنت کی سیر اور لوح محفوظ پر اطلاع پانا، اُن کا ثابت ہے اور یہ بھی استحقاق رکھتے ہیں کہ اُن کو جائز ہے وہ یہ بات بھی کہہ دیں کہ عرش سے لے کر فرش تک ہماری بادشاہی اور سلطنت ہے۔ یہاں سے معلوم ہو گیا ہے کہ جب اولیاء کرام کا تمام جہانوں پر تصرف اور علم غیب اور لوحِ محفوظ پر اطلاع ہے۔ جو رسول اللہ ﷺ کے علم غیب کے مقابلے میں ایک قطرہ کے بھی مقدار نہیں تو پھر آنحضرت ﷺ کے تصرف اور علم کا کیا اندازہ ہوگا۔

تفسیر روح البیان کے ص 375 پر ایک عبارت یوں ہے قال شیخنا العلامہ القا اللہ بالسلامۃ فی "الرساۃ الرحمانیۃ فی بیان الکلمۃ العرفانیۃ" علم اولیاء من علم الانبیاء بمنزلۃ قطرۃ من سبعۃ البحر و علم الانبیاء من نبینا محمد ﷺ بھذا لمنزلۃ وعلم الحق سبحانہٗ بھذا لمنزلۃ یعنی رسالہ رحمانیہ فی بیان کلمۃ العرفانیہ میں ہے کہ علم اولیاء اللہ کا علم انبیاء علیہم السلام کے مقابلہ میں سات سمندروں میں سے ایک قطرہ ہے اور علم تمام انبیاء علیہم السلام کا مقابلہ میں علمِ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے ایسا ہے جیسے ایک قطرہ۔ زرقانی شرح

مواہب اللدینہ میں حجۃ الاسلام امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ نبوت اُس چیز سے عبارت ہے. جس کے ساتھ نبی مختص ہے اور غیروں سے ممتاز ہے. ایک یہ کہ جو امور اللہ تعالیٰ اور اُس کی صفات اور فرشتوں اور آخرت کے ساتھ متعلق ہیں، نبی اُن کے حقائق کا عارف ہوتا ہے اور دوسروں کو کثرت معلومات اور زیادتی کشف و تحقیق میں اُس سے کچھ نسبت نہیں. دوم یہ کہ اُن کی ذات میں ایک ایسا وصف ہے جس سے افعالِ خارقہ عادت تمام ہوتے ہیں. جس طرح کہ ہمیں ایک وصف قدرت کا حاصل ہے کہ جس سے ہمارے حرکاتِ ارادیہ پورے ہوتے ہیں. سوم یہ کہ نبی کو ایک ایسا وصف حاصل ہے جس سے ملائکہ کو دیکھتا ہے اور اُن کا مشاہدہ کرتا ہے. جس طرح کہ بینا کو ایک وصف حاصل ہے. جس کے باعث وہ نابینا سے ممتاز ہے. چہارم یہ کہ نبی کو ایک ایسا وصف حاصل ہے جس سے وہ غیب کی آئندہ باتوں کا ادراک کر لیتا ہے.

اِس عبارتِ امام غزالیؒ سے صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ جل شانہٗ نے انبیاء علیہم السلام کو حقائقِ امور کا علم عطا فرمایا اور کثرتِ معلومات، زیادتئ کشف و تحقیق میں اور سب سے ممتاز فرمایا ہے. افعالِ خارقہ کی ایسی صفت عطا فرمائی ہے جیسے ہم کو حرکاتِ ارادیہ کی، کہ ہم جب چاہیں حرکت کریں. ایسے ہی وہ جب چاہیں، افعالِ خارقہ ظاہر فرمادیں. ایک صفت ایسی دی جس سے وہ ملائکہ کو اِس طرح دیکھتے ہیں جس طرح بینا اندھے کے مقابلہ میں دیکھتا ہے، اور ایک صفت غیب کی ایسی عنایت فرمائی جس سے غائب کی آئندہ باتیں وہ جانتے ہیں. جس سے سرورِ کائنات ﷺ اور دیگر انبیاء علیہم السلام و اولیائے کرام کا علیٰ قدر مراتب مطلع از غیب ہونا ثابت ہو جائے گا. اِس کے بعد مخالف و مطابق کو حق کے قبول کرنے میں اختیار ہوگا. وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلَاغُ

وہ حوالہ جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے یہ ہے ملاحظہ ہو ملا علی قاری مرقاۃ المفاتیح جلد ص 54 میں تحریر فرماتے ہیں.

" ان الغیب مبادی ولواحق فھو مباد یھما لا یطلع علیه ملك مقرب و لا نبی واما اللواحق فھو ما اظھرہٗ الله تعالیٰ علی بعض احبابه لوحة علمه و خرج بذالك عن الغیب المطلق و صار غیبا اضیافاً و ذالك اذاتنورت القدسیه وازداد نورا منتھا و اشراقھا بالاعراض عن ظلمة عالم الحس و تجلیة القلب عن صداء الطبیعة و المواظة علی العلم والعمل و فیضان الانوار الالٰھیة حتی یقوی النور و ینبط فی فضاء قلبه و منعکس فیه النقوش المرتسمه فی اللوح المحفوظ

ویطلع علی المُغیبات و یتصرّف فی عالم السفلی بل یتجلی حینئذن الفیاض الاقدس بمعرفته التی حی اشرف العطایا فکیف بغیره."

خلاصہ یہ کہ:- "غیب کے مبادی پر کوئی ملک مقرب و نبی مرسل مطلع نہیں، البتہ غیب کے نورِ حق پر اللہ تعالیٰ نے اپنے بعض احباب کو مطلع فرمایا ہے، جس کے علوم میں سے ایک لوح کا علم بھی ہے اور یہ غیب اضافی ہے اور یہ جب ہے کہ جب روحِ قدسیہ منور ہوتی ہے اور عالم جس کی ظلمت اور تاریکی سے اعراض کرنے، دل صاف ہونے، علم وعمل پر مواظبت کرنے اور انوارِ الٰہیہ کے فیضان کے باعث اُس کی نورانیت اور اشراک زیادہ ہو جاتا ہے اور لوحِ محفوظ کے نقوش اُس میں منعکس ہو جاتے ہیں اور یہ مغیبات پر مطلع ہوتا ہے اور عالمِ سفلی میں تصرّف کرتا ہے. بلکہ اس وقت خود فیاضِ اقدس جل شانہٗ اپنی معرفت کے ساتھ تجلی فرماتا ہے اور یہی بڑا عطیہ ہے. جب یہی حاصل ہو تو اور کیا رہ جائے گا۔"

اِس عبارت سے پورے طور پر واضح ہو گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے احباب کے دل میں ایسا روشن نور عطا فرماتا ہے. جس میں لوحِ محفوظ اِس طرح منعکس ہو جاتی ہے جیسے آئینہ میں صورت. اِس نور پاک سے اللہ تعالیٰ کے احباب غیبوں پر مطلع ہوتے ہیں. عالم میں تصرف کرتے ہیں بلکہ خود اللہ کریم اُن کے دلوں میں تجلی فرماتا ہے.

اور سنئے: کتاب الابریز شریف کے ص 262 پر ایک عبارت آتی ہے. جس کا خلاصہ ترجمہ فقیر یہاں درج کرتا ہے. وہ یہ ہے کہ: "تحقیق اگر زندہ ہیں جبریلؑ ایک لاکھ برس سے دوسرے لاکھ برس تک یا اِس قدر زندہ رہیں کہ جس کی کوئی حد نہیں تو بھی معرفت سرورِ عالم ﷺ سے اور اُن کے علم سے جو اُن کے رب جل مجدہٗ نے عطا فرمایا ہے، چوتھا حصہ بھی نہیں پائیں گے اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سیّدنا جبریلؑ زیادہ علم والے ہوں سرورِ دو جہاں ﷺ سے؟ حالانکہ جبرائیلؑ اُن ہی کے نور سے پیدا کئے گئے ہیں".

دُرَرُ الغَوّاصِ عَنِ فتوٰی عَلَی الخَوّاص حضرت علامۂ اجل امام وہاب الدین شعرانی ص 85 میں ہے.

قال ولما لقن رسول الله صلی الله علیه وسلم علی ابن ابی طالب رضی الله عنه وخلع علیه ذالك صار یقول عندی من العلم الذی اسرہ الیٰ رسول الله صلی الله علیه و سلم مالیس عند جبرئیل ولا میکائیل فقال لهٗ ابن عباس کیف ذالك یا امیر المومنین فقال ان جبرائیل علیه السلام تَخُلَف عن رسول الله ﷺ لیلة الاسراء وقال مامنا الا له مقام معلوم فلا یدری ما وقع بعد ذالك الرسول الله صلی

اللہ علیہ و سلم.

یعنی جب تعلیم کیا رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی ابن ابی طالب ؓ کو یعنی حضرت علیؓ پر اُس تلقین کو پیش کیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمانے لگے. میرے پاس اُس علم میں سے جس کو میں نے رسول اللہ ﷺ سے حاصل کیا، وہ علم بھی ہے جو جبرائیل و میکائیل جیسے فرشتوں کے پاس بھی نہیں ہے. اِس پر حضرت ابن عباسؓ نے آپ سے سوال کیا کس طرح ہے یہ؟ یعنی اِس کا مطلب کیا ہے؟ اے امیر المومنین! پس جواب دیا حضرت علی کرم اللہ وجہ الکریم نے تحقیق جبرائیل علیہ السلام پیچھے رہ گئے، رسول اللہ ﷺ سے شبِ معراج میں، اور کہا جبرائیل علیہ السلام نے کہ ہم میں کوئی ایسا فرشتہ نہیں ہے. جس کے لیے ایک خاص حد نہ ہو بلکہ ہر ایک کے لیے ایک مقام ہے جو معیّن و مقرر ہے کہ اُس سے تجاوز نہیں کر سکتا. پس نہیں جانتے جبرائیل علیہ السلام جو کچھ بعد میں رسول اللہ ﷺ پر واقع ہوا. جب وہ الگ ہو گئے اور یہ اپنے مقام پر رہ گئے تھے.

کیا میرے اشرف المخلوقات دوستوں کو اب بھی اپنی فضیلت اور رسولِ خدا ﷺ کے علم و اختیار کا احساس نہ ہوگا. جب اپنے علم کے متعلق حضرت علی کرم اللہ وجہٗ رسول اللہ ﷺ کی وساطت سے معلومات بڑھنے پر جبرائیل علیہ السلام پر فوقیت ظاہر فرماتے ہیں. سرکارِ دو عالم، تاجدارِ کائنات محمد رسول اللہ ﷺ کی علمی کیفیت تو اُن اقوال سے کہیں بالاتر ہے.

اب یہ عبارت اور کلام تو کسی معمولی شخصیت کا نہیں، حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کا ہے، جن کی نسبت حضور ﷺ نے فرمایا: ((اَنَا مَدِيْنَةُ الْعِلْمِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا)) ''میں علم کا شہر ہوں اور علی اُس کے دروازے ہیں.'' حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اِس سند پر بھی منکرین کو اگر سمجھ نہ آئے تو پھر اُن کو خدا سمجھائے.

افضل الرسل کے علمِ غیب کے متعلق آیاتِ قرآنی

اس سے پہلے کہ علم غیب کے متعلق آیاتِ قرآنی درج کروں. مشککین کو یہ واضح طور پر بیان کر دینا ضروری جانتا ہوں تاکہ بصیرت سے کام لے کر سمجھیں کہ علمِ الٰہی ''ذاتی'' ہے اور علمِ نبوی اور تمام مخلوق کا علم ''عطائی''. وہ واجب ہے، یہ ممکن. وہ قدیم، یہ حادث. وہ نا مخلوق، یہ مخلوق. وہ نا مقدور، یہ مقدور. وہ ضروری البقا، یہ جائز الفنا. وہ ممتنع التغیّر، یہ ممکن التبدل. اِن عظیم تفرقوں کے بعد کیسے مماثلت ہوتی ہے اور کیوں کر شرک ہو سکتا ہے؟ اِس واضح عقیدہ پر بھی اگر احتمالِ شرک ہوگا تو اِس کا اہل کوئی دیوانہ ہو سکتا ہے. کسی عاقل کے نزدیک تو علمِ الٰہی سے مساوات کا ہونا بھی ممکن نہیں. یہ ہے عقیدۂ جماعت سلف صالحین اور علمائے اہل سنت والجماعت کا. جس پر مندرجہ ذیل آیات اِسی مفہوم میں شاہد

ہیں، جن کو فقیر خوفِ طوالت سے بالا اختصار پیش کرتا ہے. ملاحظہ ہوں:

آیت نمبر 1: ﴿ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِىْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴾ ''اور اللہ جل شانہٗ یوں نہیں کہ تم کو مطلع کردے غیب پر اور لیکن اللہ جل شانہٗ چھانٹ لیتا ہے اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہے. پس ایمان لاؤ تم اللہ اور اُس کے رسولوں پر، اگر ایمان پر رہو تم اور پرہیزگاری پر، تو تم کو بڑا ثواب ہے.'' [سورۂ آلِ عمران]

تشریح: اس آیت سے خوب طور پر ظاہر ہوا ہے کہ اللہ جل شانہٗ اپنے مجتبٰی و مرتضٰی رسولوں کو غیب پر مطلع فرما دیتا ہے. پھر یہ کہنا کیوں کر صحیح ہوگا کہ یہ علم تعلیمِ الٰہی سے حاصل نہیں ہوتا. بلکہ ضروری مطلب یہ ہوگا کہ خود بخود اپنی ذات اور اَٹکل سے کوئی غیب کو نہیں جانتا، البتہ تعلیمِ الٰہی سے انبیا علیہ السلام جانتے ہیں. کیا اِس آیت کو سننے پڑھنے کے بعد کوئی منکرِ غیب بتا سکتا ہے کہ انبیاؑ کو غیب بتایا جاتا ہے یا نہیں؟ یا ضد اور تعصب کے جوش میں قرآنِ پاک کا بھی خلاف کرتے جانا، مومن کی شانِ ایمانی میں داخل ہے. اب بھی اگر یہ کہا جائے کہ حق سبحانہٗ نے کسی کو اِس پر مطلع نہیں کیا تو کس حد تک بطالت اور جمہور مفسّرین کے خلاف عقیدہ ہے. کیا منکرین کے نزدیک خداوندِ عالم، غیب کی تعلیم پر قادر نہیں ہے؟ حالانکہ اُن کے نزدیک جھوٹ بولنے پر بھی قادر ہے. پھر اُس کی قدرت میں کیا کمزوری وارد ہوتی ہے.

آیت نمبر 2: ﴿ عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ الآیہ ﴾ ''اللہ جل جلالہٗ عالم الغیب ہے. پس کسی کو 'اپنے غیب' پر مطلع نہیں کرتا مگر جس کو کہ چن لے، رسولوں میں سے.'' [سورۂ جن]

تشریح: اِس آیت میں یہ لطیف اشارہ سمجھنے کے قابل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ﴿ لَا يُظْهِرُ غَيْبَهٖ عَلٰٓى اَحَدًا ﴾ نہیں فرمایا کیوں کہ اِس کے معنی ہو جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے غیب کسی پر ظاہر نہیں فرماتا، حالانکہ غیب کا اظہار اولیاء پر بھی ہوتا ہے، اور انبیاء پر بھی اور بذریعہ انبیاء و اولیاء بعض صالحین پر بھی، تو اِس میں غیب کی کُلّی نفی ہو جاتی تھی. بلکہ فرمایا ﴿ لَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ﴾ یعنی اپنے ''علمِ غیبِ خاص'' پر کسی کو ظاہر و غالب اور مسلط نہیں فرماتا مگر رسولوں کو. اِس عجیب بیان سے کیسا مرتبہ قرآن پاک نے انبیاء علیہم السلام کے لیے ثابت فرمایا ہے. تفسیر روح البیان جلد چہارم صفحہ 496 میں اِسی آیت کی تفسیر میں ہے. ابن شیخ نے فرمایا کہ اللہ کریم اپنے غیب خاص پر جو اُس کے ساتھ مختص ہے. رسولِ مرتضٰی کے سوا کسی کو مطلع نہیں فرماتا اور جو غیب اُس کے ساتھ خاص نہیں، اُس پر دوسرے غیر رسول کو بھی مطلع فرما دیتا ہے. اب تو کوئی شک نہیں رہا کہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا غیب ماننا بھی جائز ہے یا نہیں.؟

آیت نمبر 3: ﴿وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ ...... الآية﴾ ''اور نہیں وہ غیب پر بتانے میں بخیل.'' [سورۂ تکویر]

تشریح: ھُو کا مرجع بعض نے اللہ جل شانہٗ فرمایا ہے اور بعض نے حضور ﷺ اور بعض نے قرآنِ کریم. بہر حال ہمارا مدعا حاصل ہے اور مطلب یہ ہوگا کہ وہ غیب کی باتیں چھپا کر نہیں رکھتا یا بتانے میں بخل نہیں کرتا.

تفسیر جامع البیان برحاشیہ تفسیر جلالین صفحہ 490 میں ہے. آنحضرت ﷺ غیب کی خبروں کو جو اُن کو اطلاع ہوتی ہے، بتلانے میں متہم نہیں اور حرف ضاد کی قرات میں اِس کے معنی یہ ہیں کہ آنحضرت ﷺ غیب کی تمام باتوں کو بتلانے میں بخیل نہیں ہیں بلکہ ہر ایک کو سکھلا دیتے اور بخشش کر دیتے ہیں. یہی مطلب تفسیر جلالین صفحہ 490 میں مذکور ہے. جہاں اِس آیت شریف کی تفسیر کی گئی ہے اور تفسیر جمل برحاشیہ تفسیر جلالین شریف زیرِ آیت مبارکہ ﴿عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ﴾ ترجمہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جو کسی جگہ علمِ غیب کی نفی اپنے نفس شریف سے فرمائی ہے تو یہ حق تعالیٰ سے تواضع ہے اور اپنی عبودیت کا اقرار ہے اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ میں خود بخود غیب نہیں جانتا مگر حق تعالیٰ مجھے غیب پر مطلع فرما دیتا ہے.

آیت نمبر 4: ﴿وَعَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمْ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا﴾ ''اور اے رسول (ﷺ) ہم نے تمام علوم تم کو سکھا دیے جو آپ ﷺ نہیں جانتے تھے اور آپ ﷺ پر اللہ کا فضل عظیم ہے.'' [سورۂ نساء]

تشریح: اِس آیت کے متعلق مفسرین متفق ہیں کہ (تجھے اے نبی! وہ باتیں سکھلائیں، جن کو تو نہیں جانتا تھا) اِس عبارت کا مفہوم احکامِ شرعی اور امور غیبی ہیں.

تفسیر مواہب الرحمٰن میں ہے کہ فرمایا حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو بیانِ دنیا و آخرت، عرش و فرش، آسمان و زمین، تمام کائنات، اجرامِ فلکی کا علم اور حلال و حرام سکھلا کر اپنی مخلوق پر حجت کیا.

صاحبِ تفسیر خازن اسی آیت کے تحت میں لکھتے ہیں. فرمایا اللہ تعالیٰ نے کہ وہ سب کچھ تم کو سکھا دیا جو آپ نہیں جانتے تھے یعنی احکامِ شرع و امورِ دین و امورِ غیبیہ اور یہ بھی قول ہے کہ ''علمك'' سے ''علمِ غیب'' ہی مراد ہے، جو حضور ﷺ نہیں جانتے تھے اور بعض علماء نے فرمایا کہ اس کے معنی ہیں کہ تمام خفیہ اور مخفی باتیں سکھلا دیں اور خبردار کر دیا تمام لوگوں کے دلوں کی خفیہ باتوں پر، اور تمام منافقین کے حالات اور اُن کے مکروں پر آگاہ کر دیا جو آپ ﷺ نہیں جانتے تھے، اور اے محمد ﷺ! یہ ہمیشہ سے ہے اور آپ ﷺ پر فضل اللہ تعالیٰ کا عظیم کہ آپ ﷺ کو علم غیب عطا ہوا.

تفسیر روح البیان جلد ششم صفحہ 24 جس کی عربی عبارت کا ترجمہ یہ ہے کہ آپ (ﷺ) کا علم جمیع معلوماتِ غیبیہ ملکوتیہ کو محیط ہو گیا جیسا کہ حدیث بحث ملائکہ میں آیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا حق تعالیٰ نے اپنا دست قدرت میرے شانوں پر رکھا پس اُس کی خنکی میری چھاتیوں میں پہنچی۔ پس جان لیا میں نے علم اولین و آخرین کا اور دوسری روایت میں فرمایا، علم اُس چیز کا جو ہو چکی ہے اور اُس کا جو آئندہ ہو گی۔

تفسیر کبیر مصری جلد سوم صفحہ 310 میں ہے۔ اِسی آیت کے ماتحت یوں لکھا ہے یعنی یہ بزرگ تر دلائل سے ہے، علم کے اشرف فضائل اور مناقب ہونے پر بدیں وجہ، کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا اُوْتِيْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴾ یعنی مخلوق کو تھوڑا سا علم دیا گیا ہے اور ایک برگزیدہ ہستی محمد ﷺ کو ساری مخلوق کے علوم سے جو حصہ ملا، وہ بھی تھوڑا ہی ہے۔ پس اِس تھوڑے کو اللہ تعالیٰ نے بہت فرمایا اور اِس قدر بڑھایا کہ اُس کے علم میں ساری دنیا کا نام بھی تھوڑا ہی فرمایا۔

تفسیر عزیزی سورۂ بقرہ صفحہ 117 سطر 14 میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء میں سے سات نبیوں کو سات علم صراحتاً فضیلت فرمائے ہیں۔ حضرت آدم کو علمِ لغت، جیسے فرمایا ﴿ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ﴾ حضرت خضر علیہ السلام کو علمِ فراست ﴿ وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ﴾ حضرت یوسف علیہ السلام کو علم تعبیر ﴿ وَعَلَّمْتَنِیْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ﴾ حضرت داؤد علیہ السلام کو علم صنعت ﴿ وَعَلَّمْنَاهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ ﴾ حضرت سلیمان علیہ السلام کو علم "منطق الطیر" یعنی جانوروں کی بولی جاننا ﴿ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ ﴾ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو علمِ تورات و انجیل اور اُس کی حکمت، جیسے فرمایا: ﴿ وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰاةَ وَالْاِنْجِيْلَ ﴾ اور حضرت سیّد عالم محبوبِ مکرّم محمد رسول اللہ ﷺ کو علمِ "اسرارِ غیب" جیسے فرمایا: ﴿ عَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ﴾ [بلفظہٖ]

تفسیر جلالین صفحہ 85 سطر 4 زیرِ آیت ﴿ عَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ﴾ فرمایا گیا ہے کہ مِنَ الْاَحْكَامِ الْغَيْبِ یعنی اللہ تعالیٰ کا فرمانا کہ اے رسول! سکھلا دیا تم کو جو کچھ آپ نہیں جانتے تھے۔ وہ تمام احکام اوامر و نواہی اور غیب کے علوم ہیں۔ تفسیر جامع البیان میں اِسی آیت کے ماتحت یوں ارشاد ہے کہ یہ آیت شریفہ مخفی امور کی تعلیم کے متعلق ہے۔ اِسی آیت شریف کے ماتحت تفسیر مدارک کی یوں عبارت ہے۔ عَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ مِنْ اُمُوْرِ الدِّيْنِ وَ الشَّرَائِعِ وَ مِنْ خُفْيَاةِ الْاُمُوْرِ وَضَمَائِرِ الْقُلُوْبِ. یعنی یہ آیت شریف کہ اے رسول ﷺ! آپ کو سب کچھ سکھلا دیا جس کو آپ نہیں جانتے تھے، وہ تمام امور دین کے اور شریعت کے اور تمام غیب کی باتیں اور تمام لوگوں کے دلوں کے بھید اور اندرونی حالات ہیں۔

آیت نمبر 5: ﴿ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ فِيْ بُيُوْتِكُمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ اور میں بتا دیتا ہوں تم کو جو کچھ کھا کر آؤ تم اور رکھ آؤ تم بیچ گھروں اپنے

کے، اِس میں تم کو پوری نشانی ہے اگر تم یقین رکھتے ہو۔" [آل عمران]

تشریح: اِس آیت شریفہ میں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی اُمت کے لوگوں میں پانچ معجزات پیش کیے تھے. اول مٹی سے پرندے کی صورت بنانا اور اُس کو "باذن اللہ" پھونک مار کر صحیح جاندار پرندے کی طرح اڑا دینا. دوسرا مادر زاد اندھے کو بینا کر دینا. تیسرا کوڑھی کو اچھا کرنا. چوتھا مردے کو زندہ کرنا. پانچواں علمِ غیب کے ذریعے یہ بتانا کہ بنی اسرائیل کیا کھا کر حضرت کے پاس آئے ہیں؟ اور اُن کے گھروں میں کیا پونجی پڑی ہے؟ اور ضرورت اِس پانچویں معجزے کی اِس لیے ہوئی کہ بنی اسرائیل کے کم بختوں نے کہا کہ مردے زندہ کرنا تو جادو ہے. کوئی ایسی نشانی غیب دانی کی ہم کو بتاؤ جس سے ہم کو تمہاری نبوت کا یقین ہو جائے، تو عیسیٰ علیہ السلام نے اُن کو اِس طرح بتانا شروع کیا اور یہی کمالین میں لکھا ہے اور روایت حضرت عمار ابن یاسر رضی اللہ عنہ کی بھی آئی ہے. جس میں یوں ذکر ہے کہ بنی اسرائیل نے درخواست کی تھی کہ پروردگار! ہمارے واسطے آپ کی دعا سے آسمان سے دستر خوان کھانے کا نازل فرمایا کرے تو آپ نے عہد لیا تھا کہ کھایا کرو مگر ذخیرہ نہ کرنا اور پاس جمع نہ کرنا. چنانچہ اُنہوں نے اقرار کیا. پھر کھاتے اور رکھ بھی چھوڑتے اور پوشیدہ طور پر بد عہدی بھی کرتے. پھر عیسیٰ علیہ السلام نے اُن کو بتلانا شروع کر دیا کہ اے فلانے تو نے یہ کھایا اور یہ جمع کر دیا ہے. تا آنکہ اللہ نے اُن کو خنزیر کر دیا. معالم میں سدی سے روایت ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام مکتب میں لڑکوں کو بتلا دیا کرتے تھے کہ تیرے والدین نے یہ کھایا اور یہ تیرے لیے رکھ چھوڑا وغیرہ وغیرہ. بہر حال روایات مختلف ہوں یا کچھ شانِ نزول یا وجہِ اشاعت کوئی ہو، ہمارا حاصلِ مطلب یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام غیب جانتے تھے اور قرآنِ کریم بیان فرماتا ہے کہ لوگوں کو بتلایا بھی کرتے تھے جس سے لوگوں کے ایمان درست ہوتے اور وہ عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کی تصدیق کرتے تھے. ہم نے تمہید میں عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم نے بعض انبیاء علیہم السلام کا غیب بیان فرمایا ہے جو حضور سرور کائنات ﷺ سے پہلے تھے اور حضور علیہ السلام کے مقابلے میں مدارجِ نبوت میں کم درجہ رکھتے ہیں. پھر جب ایک رسول اللہ ﷺ کا غلام اپنے مولا و آقا تاجدارِ کونین کو جمیع انبیاء سے افضل اور تمام مرسلین کا سردار مانتا ہے تو کس طرح ہو سکتا ہے کہ وہ دوسرے انبیاءؑ کے مقابلے میں رسولِ اکرم محمد الرسول اللہ ﷺ کی کمی مرتبت کو جائز رکھے اور یہ کہے کہ عیسیٰ علیہ السلام تو غیب جانتے تھے، یعقوب علیہ السلام غیب جانتے تھے، خضر اور موسیٰ علیہما السلام غیب جانتے تھے، نوح علیہ السلام غیب جانتے تھے، یوسف علیہ السلام غیب جانتے تھے، مگر افضل الرسل محمد رسول اللہ ﷺ نہیں جانتے تھے. تمام انبیاء کو جو نعمت حضور ﷺ کے طفیل ملی، وہ تو سب اُس کے حامل ہیں مگر خود رسول اللہ ﷺ اُس سے محروم سمجھے جائیں.

بریں عقل و دانش بباید گریست!

اللہ تعالیٰ ایسے کم فہم لوگوں کو توفیق عطا فرمائے کہ مراتبِ سرکارِ دو جہاں ﷺ کی معرفت اور تمیز کر سکیں.

آیت 6: ﴿وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِہٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ﴾ ''اور وہ موجودات اس کے معلومات سے کسی چیز کو اپنے احاطہءِ علمی میں نہیں لا سکتے مگر وہ جس قدر جس کو دینا چاہے''. [بقرہ]

تشریح: اِس آیت شریف سے ثابت ہوتا ہے کہ معلوماتِ الٰہی کا احاطہ موجوداتِ دنیا سے کوئی ہستی نہیں کر سکتی مگر وہ خود جس کو جس قدر عطا فرما دے. تو گویا کل یا بعض علم کا احاطہ علمِ الٰہی سے کرنا اپنی اٹکل اور قدرت سے بدوں عطائے ایزدی محال ہے اور جن کو عطائے الٰہی سے ہو جائے، اُس کا انکار صریح کج فہمی اور لاعلمی ہے، کیوں کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ نعمتِ ''کفرانِ نعمت'' ہے، اگر ''اظہارِ نعمت'' نہ کیا جائے اور اِسی رنگ میں کسی پر ''عطیہ'' کا انکار بھی جہالت ہے. یہ بھی عطائے الٰہی سے انحراف ہے. کیا اِس آیت میں صاف مفہوم نہیں؟ کہ علمِ الٰہی سے کسی کو حصہ ملنا اور بالخصوص انبیاء علیہم السلام و اولیائے کرام علیہم الرحمۃ والرضوان جو محبانِ خدا ہیں، ممکنات سے ہے، اور اگر اِس آیت سے علم غیب کی نفی ہے تو اِس کا اور کیا مطلب ہو سکتا ہے اور اگر اِس کا مطلب ظاہری علم سے لیا جائے گا تو ظاہری علم کا انکشاف تو اُس کے نزول سے پہلے ہی ثابت ہے. اِس جملہ سے ماقبل جملہ کا مطلب شفاعت کے متعلق تھا جیسے وہاں سے مخلوق کا شافع ہونا مراد ہے. خواہ وہ انبیاء، اولیاء، صلحاء، علماء، شہدا ہوں ویسے ہی علم کی بعض کے لیے مستثنیٰ ہو کر دلیل ہے کہ امرِ الٰہی سے علم غیب کا عطیہ ہو سکتا ہے اور اُس کا انکار شیطانی وسواس سے ہے. بعض علماء نے کہا ہے کہ وہ علم، ''ربوبیتِ حق'' اور اُس کے ''جلال'' کا ہے. بحر الحقائق میں لکھا ہے کہ جو کچھ ہو چکا یہ اُس کا علم ہے کہ حق سبحانہٗ تعالیٰ نے شبِ معراج میں آنحضرت ﷺ کو عطا فرمایا اور جو کچھ ہونے والا ہے، جیسا کہ معراج کی حدیثوں میں وارد ہے. تفسیر معالم التنزیل میں ہے کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ میرے روبرو میری اُمت پیش کی گئی اپنی صورتوں میں، جو مٹی میں تھی، جیسے کہ تمام اولاد، حضرت آدم علیہ السلام کے روبرو پیش کی گئی تھی. تب میں نے جان لیا ہر شخص کو جو مجھ پر ایمان لائے گا اور جو ایمان نہ لا کر کافر رہے گا. پس یہ بات جب منافقین کو پہنچی تو اُنہوں نے مسخری سے کہا کہ (محمد ﷺ) دعوے کرتے ہیں کہ میں جانتا ہوں اُس شخص کو جو مجھ پر ایمان لائے گا اور جو کافر رہے گا. اگرچہ وہ اب تک پیدا بھی نہیں ہوا حالانکہ ہم اُس کے ساتھ رہتے ہیں اور وہ ہم کو بھی نہیں پہچان سکتے اور نہ اب تک اُنہوں نے ہم کو جانا ہے. پس منافقین کی اِس گفتگو سے اطلاع پا کر حضور ﷺ فوراً منبر پر تشریف فرما ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کر کے فرمایا کہ جو میرے علم (غیب)

پر طعن کرتے ہیں، وہ قیامت تک کے حالات مجھ سے پوچھیں، میں اُن سب کو بتلاؤں گا. پس کھڑا ہوا عبداللہ ابن حذیفہ جس کے باپ کے بارے میں لوگ شک کرتے تھے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! بیان فرمایئے! میرا باپ کون ہے؟ تو جواب میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تیرا باپ حذیفہ ہے. اُسی وقت حضرت عمرؓ اُٹھ کھڑے ہوئے اور عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! ہم اللہ تعالیٰ سے راضی ہیں جو ہمارا رب ہے اور اسلام سے جو ہمارا دین ہے اور قرآن سے، جو ہمارا امام ہے اور حضور ﷺ سے، کہ ہمارے نبی اور رسول ہیں. پس معاف فرمایئے، ہمیں اللہ تعالیٰ ہمیں معاف فرمائے. تب فرمایا: حضور ﷺ نے کہ کیا تم نہیں پوچھتے اور تم نے پوچھنے سے بس کر دی؟ اُس وقت حضور ﷺ منبر سے اتر آئے. کیا یہ دعویٰ غیب نہیں تو اور کیا تھا؟ اِسی قسم کی دوسری 29 آیات ہمارے پیش نظر اور ہیں. جن کو ہم اِس لیے درج نہیں کرتے کہ مختصر تحریر طول پکڑ جائے گی. جسے ضرورت ہو فقیر کا رسالہ علم غیب اور کتاب کلمۃ العلیا حضرت مرادآبادی دیکھے.

احادیثِ نبویہ فی علوم غیبیہ

حدیث نمبر1: ((عن طارق بن شهاب قال سمعت عمر رضي الله عنه يقول قام فينا النبي صلى الله عليه وسلم مقاماً فاخبر ناعن بدألخلق حتى دخل اهل الجنته منازلهم حفظ ذالك من حفظه و نسيه من نسيه)) ’’طارق بن شہاب سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے سنا فرماتے تھے کہ آں حضرت ﷺ ہمارے میں (صحابہؓ میں) ایک مقام پر کھڑے ہوئے اور ہم کو خبر دے دی. تمام ابتدائے دنیا سے لے کر قیامت تک کی باتوں کی یہاں تک کہ بہشتی اپنی جگہوں میں داخل ہوں اور دوزخی اپنی جگہوں میں. یاد رکھا اس بات کو جس نے یاد رکھا اور جو بھول گیا، سو بھول گیا.‘‘ [صحیح بخاری جلد دوم کتاب بدا الخلق ص 149، سطر 25]

یہی حدیث مشکوٰۃ شریف صفحہ 506، سطر 6 مطبع مجتبائی میں درج ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ سے مروی ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ہماری مجلس میں قیام فرما کر ابتدائے آفرینش سے لے کر جنتیوں اور دوزخیوں کے اپنی اپنی منزلوں میں داخل ہونے تک کی خبر دے دی اور یاد رکھا اِس کو جس نے یاد رکھا اور بھلا دیا جس نے بھلا دیا.

حدیث نمبر2: ((عن انس رضي الله عنه قال سئالوا النبي صلى الله عليه و سلم حتى احضره بالمسئلة مصعد النبي صلى الله عليه و سلم ذات يوم المنبر فقال لا تسئلوني عن شيئى الانبئت لكم فجعلت النظر يميناً و شمالاً فاذا كل رجلٍ راسه في ثوبه يبكي فانشاء رجل اذآ لا جي يدعى الى غيرابيه فقال يا نبي

اللہ من ابی فقال ابوك حذافة ثم انشاء عمر فقال رضينا بالله ربأ و بالا سلام دينا و بمحمد رسولاً. نعوذ بالله من سوء الخلق فقال النبی صلی الله عليه وسلم ما رايت فی الخير و الشر كاليوم قط انه صورت لی الجنة و النار حتی رأتيهما دون الحائط) ''یعنی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے علم غیب کی بابت پوچھا اور سوال کرنے میں بہت اصرار کیا. تب آنحضرت ﷺ منبر پر تشریف فرما ہوئے اور فرمایا پوچھو جو کچھ پوچھنا چاہتے ہو تا کہ میں بیان کروں. اِدھر اُدھر دائیں بائیں میں نے نظر کی تو معلوم ہوا کہ ہر ایک شخص اپنے منہ پر کپڑا ڈالے رو رہا ہے. اتنے میں کھڑا ہوا ایک آدمی جس کو جھگڑے کے وقت اُس کے باپ کے سوا اور کسی کی طرف نسبت کرتے تھے. اُس نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ فرمایئے میرا باپ کون ہے؟ اُس وقت حضور ﷺ نے فرمایا کہ تیرا باپ حذافہ ہے. پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ فوراً کھڑے ہو گئے اور عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! ہم راضی ہوئے اللہ پر جو ہمارا رب ہے اور اسلام پر جو ہمارا دین ہے اور محمد ﷺ پر جو ہمارے رسول ہیں. ہم خلق کی برائی سے پناہ مانگتے ہیں. پس حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں نے آج کے دن کا سا خیر اور شر نہیں دیکھا. تحقیق وہ متشکل دکھائی دیئے بہشت اور دوزخ، یہاں تک کہ میں نے دونوں کو اُس دیوار کے ادھر دیکھا.'' [صحیح بخاری. جلد چہارم کتاب الفتن صفحہ 161، سطر 35، مطبوعہ مصری 7]

تمام احادیث کا عربی متن چونکہ کتاب کا حجم زیادہ کر دے گا لہذا سب کا ترجمہ بہ تفصیل حوالہ لکھا جاتا ہے. جو دیکھنا چاہے، شک نکال لے.

حدیث نمبر 3: مشکوٰۃ شریف ص 543، سطر 10 باب المعجزات کا ترجمہ عمرو بن اخطب انصاریؓ سے روایت ہے. کہا نماز پڑھائی ہم کو آنحضرت ﷺ نے ایک دن فجر کی اور منبر پر چڑھے. پس ہمارے لیے خطبہ فرمایا یہاں تک کہ ظہر کی نماز کا وقت آ گیا. پھر اترے منبر سے اور ظہر کی نماز پڑھی. پھر منبر پر چڑھے اور خطبہ فرمایا، یہاں تک کہ عصر کی نماز کا وقت آ گیا. پھر اترے اور نماز عصر ادا کی. پھر منبر پر چڑھے اور ہمارے لیے خطبہ فرمایا یہاں تک کہ آفتاب غروب ہوا. یعنی تمام روز وعظ ہی میں گزرا. پس خبر دی ہم کو ساتھ اس چیز کے کہ ہونے والی ہے قیامت تک یعنی وقائع اور حوادث اور عجائباتِ قیامت کے بیان فرمائے. پس اُس میں بہت سے معجزے ہوئے کہا عمرو: نے پس دانا ترین ہمارا ہے (یعنی اب) بہت یاد رکھنے والا اُس دن کو [از مظاہر الحق مطبوعہ نول کشور ربع چہارم ص 613] اور یہی حدیث (حدثنی ابوزید) سے شروع ہوتی ہے. صحیح مسلم جلد دوم ص 390، سطر 27 میں، جو عمرو بن اخطبؓ سے روایت کی گئی ہے لیکن بعض کی تقدیم و تاخیر ہے.

حدیث نمبر 4: مشکوٰۃ شریف کتاب الفتن فصل اوّل ص ۴۶۱ سطر ۸ کا ترجمہ: حذیفہ رضی اللہ عنہ

سے روایت ہے. کھڑے ہوئے ہم میں رسول اللہ ﷺ (کھڑے ہونا، یعنی خطبہ پڑھنا اور وعظ فرمانا) اور خبر دی اُن فتنوں کی جو ظاہر ہوں گے نہیں چھوڑی کوئی چیز کہ واقع ہونے والی تھی، اُس مقام میں قیامت تک، مگر کہ بیان فرمایا. اُس کو یاد رکھا اُس شخص نے جس نے یاد رکھا اور بھول گیا سو بھول گیا اُس کو جو شخص اُس کو بھول گیا یعنی بعضوں نے یاد رکھا اور بعضوں نے بھلا دیا. کہا حذیفہؓ نے کہ تحقیق جانا ہے اِس قصہ کو میرے اُن یاروں نے یعنی جو موجود تھے صحابہ رضوان اللہ علیہم سے اور بعض نہیں جانتے ہیں اِس کو مفصل، اِس لیے کہ واقع ہوا ہے اُن کو کچھ نسیان، جو خواص انسان سے ہے. اور میں بھی انہیں میں سے ہوں کہ جو کچھ بھول گئے ہیں. جیسے کہ بیان کیا اپنے حال کو، اور تحقیق شان یہ ہے کہ البتہ واقع ہوئیں اُن چیزوں میں کہ خبر دی تھی آنحضرت ﷺ نے وہ چیز کہ تحقیق بھول گیا ہوں میں اس کو. پس دیکھتا ہوں میں اُس چیز کو پس یاد میں لاتا ہوں میں اُس کو، جیسے کہ یاد دلاتا ہے شخص، چہرہ شخص کا، یعنی بطریقِ اجمال والہام کے، جب کہ غائب ہوتا ہے اُس سے، اور فراموش کرتا ہے اُس کو ساتھ تفصیل و تشخیص کے، پھر جب کہ دیکھتا ہے اُس کو، پہچان لیتا ہے اُس کو شخص، یعنی ایسے ہی میں وہ باتیں بھولا ہوا ہوں، لیکن جب کہ کوئی بات اُن سے واقع ہوتی ہے تو پہچان لیتا ہوں کہ یہ وہی ہے کہ جس کی خبر رسول اللہ ﷺ نے دی تھی.

نقل کیا اِس کو بخاری اور مسلم نے اور اِسی طرح یہ حدیث کتاب مظاہر الحق ص 313، میں درج پائی گئی ہے اور کچھ الفاظ کی کمی ہے. اِس مضمون کی حدیث حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے صحیح مسلم جلد دوم ص 390 میں ہے اور کتاب اشعۃ اللمعات فی شرح مشکوٰۃ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی جلد چہارم ص 296، سطر 10 میں بھی یوں ہی ہے اور اِس کی فارسی شرح کی عبارت یوں ہے.

”روایت از حذیفه است که گفت ایستاد درما آنحضرت یعنی خطبه خواندو وعظ گفت. ایستادنی نگذاشت، چیزے که باشد وقوع یابد. درآں مقامے که ایستاده بود تاروزِ قیامت نگذاشت دریں مقام چیزے ازما و قائع که شدنی است تا روزِ قیامت.“

حدیث نمبر 5: کتاب صحیح بخاری جلد چہارم باب الاعتصام بالکتب والسنۃ ص 185، سطر 19 کا ترجمہ: حضرت ظہریؒ سے روایت ہے کہ مجھ کو خبر دی انس بن مالکؓ عنہ نے تحقیق حضور ﷺ جس وقت سورج ڈھلا، اپنے گھر سے باہر تشریف لائے اور نمازِ ظہر پڑھی اور منبر پر تشریف فرما ہوئے اور قیامت کے آنے کا حال بیان فرمایا اور فرمایا کہ اِس سے پہلے بڑے بڑے اہم امور ہونے والے ہیں. پھر فرمایا کوئی شخص ہے کہ مجھ سے کسی چیز کا سوال کرے؟ پس پوچھ لے مجھ سے. قسم ہے اللہ کی جو کچھ خبر بھی پوچھو گے میں بتاؤں گا، جب تک میں یہاں کھڑا ہوں. حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ لوگ بہت روئے اور بہت دفعہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ سوال کرو مجھ سے. حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی آنحضرت ﷺ کے

سامنے کھڑا ہوا، اُس نے پوچھا میرے داخل ہونے کی جگہ کہاں ہے؟ فرمایا حضور ﷺ نے کہ تیری جگہ دوزخ میں ہے. پھر اٹھا عبداللہ بن حذافہ اور سوال کیا کہ یارسول اللہ! میرا باپ کون ہے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا. تیرا باپ حذافہ ہے، پھر فرمایا کہ اور پوچھو؟ مجھ سے آخر حدیث تک. ......فقط

حدیث نمبر 6: مشکوٰۃ شریف باب المساجد ص 69 سطر 27 کا ترجمہ عبدالرحمٰن بن عائش سے مروی ہے کہ اُنہوں نے کہا کہ فرمایا پیغمبر خدا ﷺ نے کہ میں نے اپنے رب عزوجل کو اچھی صورت میں دیکھا. فرمایا رب نے کہ ملائکہ کس بات میں جھگڑا کرتے ہیں. میں نے عرض کیا کہ تو ہی خوب جانتا ہے. فرمایا سرورِ عالم ﷺ نے کہ پھر میرے رب عزوجل نے اپنی رحمت کا ہاتھ میرے شانوں کے درمیان رکھا. میں نے اُس کے وصول فیض کی سردی اپنی دونوں چھاتیوں کے درمیان پائی. پس جان لیا میں نے جو کچھ کہ آسمانوں اور زمینوں میں ہے اور حضور ﷺ نے حال کے مطابق یہ آیت تلاوت فرمائی ﴿وکــــذالك الآیۃ﴾ یعنی دکھائے ہم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ملک آسمانوں کے اور زمینوں کے تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو جائیں.

اِس عبارت میں وضع کف مزید فضل اور نہایت تحقیق اور ایصال فیض اور عنایت وکرم اور تائید و انعام سے کنایہ ہے اور سردی پانا دونوں چھاتیوں میں وصولِ اثر ''فیض'' اور ''حصول علوم'' سے کنایہ ہے. اِس حدیث شریف سے آفتاب کی طرح روشن ہو گیا کہ ہمارے مولا وآقا ﷺ کو ہر چیز کا علم مرحمت ہوا.

حدیث نمبر 7: صحیح بخاری مصری جلد چہارم کتاب الفتن ص 162 سطر 14 کا ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ فرمایا رسولِ خدا ﷺ نے کہ یا اللہ ہمارے ملک شام میں برکت فرما اور اے اللہ ہمارے ملک یمن میں برکت دے اور کہا نجد والوں نے کہ ہمارے ملک نجد کے واسطے بھی برکت کی دعا فرمائیے. پھر دوبارہ فرمایا حضور ﷺ نے کہ یا اللہ ہمارے ملک شام میں برکت عطا فرما اور ہمارے ملک یمن میں برکت دے، پھر نجدی بولے کہ ہمارے ملک نجد میں بھی برکت ہو. پس راوی کا گمان ہے کہ یہ دعا تین دفعہ مانگی گئی اور نجد والوں کے حق میں فرمایا کہ وہاں زلزلے اور فتنے ہوں گے اور وہاں ایک شیطان کا سینگ نکلے گا. یہ حدیث شریف بطورِ پیش گوئی کے ہے. جس پر علماءِ ومحدثین متفق ہیں کہ اِس کا ظہور 1200ھ میں ہو چکا ہے. تفصیل واقعہ کے لیے دیکھو کتاب ردالمختار شامی کے باب النجات میں اس کی مکمل تشریح ہے.

حدیث نمبر 8: مواہب اللدینہ میں طبرانی سے بروایت ابن عمر رضی اللہ عنہ مروی ہے. فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ اللہ جلا شانہٗ نے میرے لیے دنیا کو ظاہر فرما دیا. پس میں دنیا کی طرف اور جو کچھ اِس میں تا قیامت ہونے والا ہے سب کی طرف اس طرح دیکھ رہا ہوں جیسے اپنی اس ہتھیلی کی طرف.

علامہ زرقانی شرح مواہب قسطلانی جلد 7، ص 234 میں لکھتے ہیں کہ اللہ جل شانہٗ نے حضور ﷺ

کے لیے دنیا ظاہر فرمائی حضور ﷺ نے اُس کے تمام حالات وحقائق کا احاطہ فرمالیا اور یہ ارشاد فرمانا کہ میں اُس کو اور جو کچھ قیامت تک ہونے والا ہے سب کو مثل اپنے ہاتھ کی ہتھیلی کے دیکھ رہا ہوں اور ملاحظہ فرمارہا ہوں. اِس سے حقیقتاً دیکھنا آنکھ کا مراد ہے، نہ کہ نظر کے مجازی معنی فرمائے گئے ہیں.

الغرض احادیث کی تعداد اِس حد تک ہے کہ اگر اُن سب کو یہاں ذکر کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب علیحدہ تیار ہو جائے، اصلاحِ عقیدہ اور درستیٔ ایمان کے لیے جو نقل کر دی ہیں، یہی کافی ہیں اور خدا کے فضل سے ہمارے مفہوم کی پوری پوری وضاحت فرماتی ہیں، اور اِن سے یہ ثابت ہوگیا ہے کہ احادیث مندرجہ کے تمام ارشادات وملفوظات میں حضور علیہ السلام والتحیۃ کا آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے، جان لینے کا ارشاد تمام علومِ جزوی وکُلّی کے حاصل ہونے اور احاطہ کرنے کا بیّن ثبوت ہے اور یہ کہ حضور ﷺ گزشتہ اور آئندہ تم سے پہلوں اور تم سے بعد والوں، دنیا اور عقبیٰ کے جمیع احوال کی آسمانوں اور زمینوں کے مغیبات کی خبر دیتے ہیں مگر اِس سے اللہ جل شانہٗ کے علم سے کوئی برابری نہیں اور نہ ہی اہل سنت اِس کے قائل ہیں. حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلوٰۃ اللہ علیہ نے ہم سے ایسے وقت میں مفارقت فرمائی کہ کوئی پرندا ایسا نہیں کہ اپنے بازوؤں کو ہلائے مگر حضور ﷺ نے ہم سے اُس کا بھی بیان فرمادیا ہے.

وہ اندھے ہیں جو ہیں منکر نبی کی غیب دانی کے
اندھیرے میں ہیں اب تک شمعِ کافوری کے پروانے

پیش گوئیاں
(معجزاتِ علم غیب)

﴿ ذَالِكَ بِأَنَّهٗ كَانَتْ تَّأْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ...... ﴾

یہ اس لیے کہ لے کر آتے رہے ان کے پاس ان کے رسول روشن نشانیاں...... [المؤمن ۴۰:۲۲]

اگر آغازِ عالم سے یہ مقدس سلسلۂ فیوض نہ ہوتا اور نبوت و رسالت انسان کی دست گیری اور راہ نمائی نہ فرماتی تو یقیناً یہ انسان حیوانوں سے بدتر ہوتا. اُس کی علمی اور عملی قوتیں درختوں، پتھروں اور طاقتور حیوانوں کی پرستش کے لیے وقف ہو جاتیں. آج کی ترقی یافتہ دنیا کا نام ونشان تک نہ ہوتا اور انسان باوجود عقل رکھنے کے بھی تاریکیوں میں ٹھوکریں کھاتا پھرتا. اُس کو ربانی امانت کا تفویض ہونا، خلافت کا منصب عطا کیا جانا، ظاہری و باطنی محاسن سے نوازا جانا، اُس کے اندر جسمانی ہی نہیں بلکہ دماغی اور روحانی قوتیں بھی مرکوز ہونا اور اشرف المخلوقات کے خطاب سے ممتاز فرمایا جانا، اِس امر کا مقتضی تھا کہ قدرت کی طرف سے اُس کی اصلاح و ترقی کے اسباب بھی فراہم کیے جاتے. اس لیے یہ انتظام ملحوظ رکھا گیا کہ اُس کی اصلاح و تعلیم کے لیے روحانی معلّم یعنی انبیاء و مرسلین کرام علیہم السلام وقتاً فوقتاً مبعوث ہوتے رہے تاکہ عرفانِ نفس، عرفانِ رسالت اور عرفانِ رب العزت جلّ شانہٗ کی جو طاقتیں انسان اپنے ساتھ لے کر دنیا میں آیا ہے، اُن کی نشوو ارتقاء اور تعلیم و تربیت کا ظہور ہو اور انسان محض مادیات کی نظر فریبیوں اور سرور و نشاط کی رنگ آفرینیوں میں مدہوش ہو کر اپنی ذمہ داریوں کو فراموش نہ کردے اور اپنی حقیقتِ انسانیہ کو نہ بھول کر اپنے مقصدِ حیات اور منتہائے کمال کو ہر وقت اپنے سامنے رکھے. کیوں کہ رسالت کی علّتِ غائی یہی تھی کہ کفر و ضلالت میں پھنسے ہوئے انسان کو اُس کے خالق و معبود سے شناسا کرادے اور اُس کی نعمتوں سے صحیح طور پر متمتع ہونے کا ڈھنگ سکھادے. اگر عبد و معبود کے درمیان رسالت کا واسطہ نہ ہوتا تو کائناتِ عالم کے اجتماعی نظام کو وہ تباہی خیز نقصان پہنچتا کہ یہ کارخانہ دنیا برباد ہو کر رہ جاتا اور تخلیق عالم ایک فعلِ عبث ثابت ہوتی.

اِس سے معلوم ہوا کہ نبوت و رسالت کا وجود یقینی ہے اور افرادِ انسانی میں پائی جا سکتی ہے. اب اگر کسی خاص شخص کے متعلق بحث ہو کہ وہ نبی ہے یا نہیں تو نبوت و رسالت کی شناخت کے لیے معجزہ کو دلیل قرار دیا گیا ہے یعنی جس شخص سے معجزہ صادر ہو اس کی نسبت یقین کیا جائے گا کہ خداوندِ عالم جلّ و علا شانہٗ نے اس سے خطاب کیا ہے اور وہ اصلاحِ عالم کے لیے خداوندِ عالم کا فرستادہ ہے. لہٰذا ظہورِ معجزہ کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ جس طرح ایک مذہب کے لیے صرف عقلی طور پر اپنی عمدگی دکھلانا کافی نہیں ہے. ایسا ہی ایک ظاہری راست باز کے لیے صرف یہ دعویٰ کافی نہیں ہے کہ وہ خدا کا فرستادہ ہے. اس کے لیے ایک امتیازی نشان اور مخالفین کے لیے ایک معقول اور زبردست دلیل ہونی چاہیے جو اس کی سچائی پر گواہ ہو اور مکّاروں اور راست بازوں میں روزِ روشن کی طرح فرق بتلا دے اور وہ نشان معجزہ ہے. جس کی سات شرطیں ہیں.

نمبر1- خدا کا فعل ہو. نمبر2- خارقِ عادت ہو. نمبر3- اس کا معارضہ ناممکن ہو. نمبر4- مُدّعیءِ نبوت سے ظاہر ہو. نمبر5- دعویٰ کے موافق ہو. نمبر6- نبی کا مکذّب نہ ہو. نمبر7- دعویٰ پر مقدّم ہو.

لفظِ معجزہ لغتِ عرب میں اعجاز سے نکلا ہے. جس کے معنی مدمقابل کو عاجز و بے طاقت کر دینے کے ہیں. یعنی کسی شخص کو اُس کی مثل لانے سے عاجز کر دینا اور اصطلاح میں معجزات سے مراد وہ امورِ خارقِ عادت ہیں جو انبیاء علیہم السلام سے بطور اظہار و اثباتِ نبوت صادر ہوں اور رسالت کے جھٹلانے والوں کو اُس کی نظیر لانے سے عاجز کر دیں کہ جن سے اُن کی نبوت پر استدلال کیا جا سکے. معجزہ کی بحث شروع سے علمِ کلام کا ایک معرکتہ الآرا مسئلہ رہا ہے اور اب تو جس قدر انسان حقائق اشیأ سے زیادہ واقفیت بہم پہنچاتا جا رہا ہے اور طبیعتوں میں حقیقت طلبی اور غور و فکر کا مادہ بڑھتا جا رہا ہے اور بھی طرح طرح کے اعتراضات اس پر بڑھتے چلے جا رہے ہیں.

اِس مسئلہ کے مشکل ہونے کا اندازہ اِس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ موجودہ زمانہ تو الگ رہا، حضرت امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے زمانے کے متعلق لکھا ہے کہ انقلابِ عادت کا قائل ہونا صعب اور مشکل ہے اور اربابِ عقل و فہم اِس سے مضطرب ہیں. خود مسلمانوں میں ایک فرقہ نیچری ہے جس کو معجزات سے انکار ہے اور وہ کسی امرِ خارق عادت کے محال ہونے کے قائل ہیں اور جمہور اہل اسلام سے اِس مسئلے میں سخت اختلاف رکھتے ہیں، لہٰذا ضروری ہوا کہ معجزات پر جس قدر اعتراضات ہوتے ہیں اُن پر مختصر مگر مدلل بحث کر کے اُن کا خاتمہ کر دیا جائے. (بعونہٖ تعالیٰ)

جو لوگ امرِ خارق عادت کے منکر ہیں. اُن کے خیالِ فاسد کی بنیاد محض اِس یقین پر ہے کہ عالم (جہان) میں جو کچھ ہوتا ہے وہ علت و معلول، سبب و مسبب، شرط و مشروط اور اثر و مؤثر کے سلسلے کے

بغیر نہیں ہوتا۔ اِسی سلسلے اور نظام کا نام فطرت اور قانونِ قدرت ہے اور اسی کی طرف قرآن کریم کی اِس آیت میں اشارہ ہے ﴿ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ﴾ یعنی خدا کی خِلقت میں تبدیلی نہیں ہو سکتی اور اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء میں جو خواص و تاثیرات رکھ دیئے ہیں وہ اُن سے کبھی بھی منفک نہیں ہو سکتے جیسے آگ کا کام جلانا ہے لہٰذا آگ اپنی اِس تاثیر اور خاصیت کو کھو نہیں سکتی بلکہ (نَعُوذُ بِاللّٰهِ) خود خداوندِ عالم بھی تبدیلئ خاصیت نہیں کر سکتا۔ اِس بنا پر نیچر کے دلدادہ جس بات کو اپنے علم و عقل سے خارج سمجھتے ہیں فوراً اُس کے متعلق حکم لگا دیتے ہیں کہ یہ ناممکن ہے اور قانونِ قدرت کے خلاف ہے مگر وہ قانونِ قدرت کی حقیقت کو نہیں جانتے۔

دنیا میں جس قدر بڑے بڑے فلاسفر اور دانا گزرے ہیں اُنہوں نے صدقِ دل سے اِس بات کا اعتراف کیا ہے کہ خداوندِ عالم کے علم و قدرت کے سامنے انسان کا علم ایک ذرّہ کے برابر بھی حیثیت نہیں رکھتا۔ چنانچہ دنیائے سائنس کا شہرۂ آفاق شاہ سوار جو اُن فلاسفروں میں شمار کیا جاتا ہے، جن کے اقوال کو خود باختہ نیچری نَعُوذُ بِاللّٰهِ وحیءِ الٰہی سے زیادہ درجہ دیتے ہیں۔ خدا کے علم و قدرت کے متعلق لکھتا ہے:

> ''خدا کی صفت علم ہے لیکن اُس کا علم کیا ہے؟ انسان کا علم تو اُس کی قوتِ تفکر میں ہے لیکن علمِ اقدس کسی تفکر و تامل کا محتاج نہیں۔ باقی رہی قدرتِ الٰہی تو قدرتِ الٰہی کا یہ حال ہے کہ انسان کو اپنی قوتِ عمل کے لیے وسائلِ عمل کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن خداوند کائنات کو کسی وسیلہ کی ضرورت نہیں اور قوتِ الٰہی خود اپنی قوت سے عمل کرتی ہے۔ خداوندِ عالم قادر ہے کیوں کہ وہ ارادہ رکھتا ہے اور اُس کا ارادہ ہی اُس کی قدرت ہے۔''

یہ کوئی معمولی شخص کا اعترافِ عجز نہیں اور یہ رائے عاجزانہ صرف ڈوسّو Dosso ہی نہیں رکھتا بلکہ تمام تر فلاسفر یہی کہتے ہیں کہ ہمارے علم و عقل کی حقیقت یہ ہے کہ ہم کچھ نہیں جانتے اور ہمارے علم و عقل کو خدا کے علم و قدرت کے مقابلے میں اِس قدر بھی وقعت نہیں جیسے زمین و آسمان کے مقابلے میں ایک ذرہ کی ہو۔ نیز فلاسفروں کا ہی قول ہے کہ چونکہ انسان کا علم و عقل نہایت محدود اور ناقص ہے، اِس لیے وہ قانونِ الٰہی کی حد بندی بھی نہیں کر سکتا اور کسی امر کی نسبت حد لگا دینا دو متناقض اقراروں کو اپنے کلام میں جمع کرنا اور خدائے قدوس کے لامحدود علم و قدرت کو اپنی عقل کے دو انچی گز سے ناپ لینے کا مضحکہ انگیز دعویٰ کرنا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علومِ انسانی عقل کے ماتحت ہیں اور محض حواسِ ظاہری اور باطنی کے ذریعے حاصل ہوتے ہیں اور یہ آلہ قوانینِ قدرت کی شناخت کا خود محدود ہے۔ ہمارے معلومات بیشتر وہ ہیں جو خود ہمارے حواس نے اپنی کوشش سے ہمارے لیے وضع اور جمع کیے ہیں۔ مگر اِن آیاتِ حواس میں پروردگارِ عالم نے اُسی قدر قوت اور تیزی عنایت فرمائی ہے جو اُس حکیمِ مطلق نے ہمارے لیے ضروری اور مناسب سمجھیں، لہٰذا عقلِ انسانی کا یہ منصب نہیں کہ وہ ہر ایک چیز کی حقیقت سمجھ لینے کا دعویٰ کر بیٹھے۔ حتیٰ

کہ قوانینِ الٰہیہ بھی اُس کے علم وعقل کے ماتحت ہو جائیں. پس اِس لحاظ سے ہم دعویٰ کے ساتھ کہتے ہیں کہ لامحدود، بذریعہ محدود کے دریافت نہیں ہوسکتا. لہٰذا جن مشاہدات و تجربات اور قوانینِ الٰہیہ کو ہم معلوم شدہ اور یقینی خیال کرتے ہیں وہ بھی دراصل کامل طور پر معلوم نہیں ہوتے.

پھر بدیہیات کے متعلق انسان کے علم کی اصلیت اور بنیاد محض اتنی ہے کہ نظامِ قدرت میں جو چیزیں ہمیشہ ایک ہی طرح پر وقوع میں آتی رہتی ہیں، اُن کے استقراء سے ایک علم کُلی بنالیتا ہے حالانکہ یہ بنیاد ہی غلط ہے. بہت ممکن ہے کہ بہت سے واقعات ایسے ہوں جو ہمارے مشاہدے میں نہ آئے ہوں. پھر زبردستی ہم تمام واقعات کو کیسے ایک کُلی کے ماتحت لاسکتے ہیں؟ کیا ہماری علم وعقل نے عالم کے تمام علل واسباب کو معلوم کرلیا ہے؟ اور کیا اُنہوں نے علت ومعلول کے تعلق کو قطعی طور پر سمجھ لیا ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو وہ کس معیار پر قوانین الٰہیہ کی حد بندی کر رہے ہیں؟ اور اعجازِ خدا کے علم وقدرت کو اپنے علم وعقل کے دائرے میں کیوں کر محصور کرتے ہیں؟

پس ثابت ہوا کہ انسان کا سمجھا ہوا قانونِ قدرت کوئی چیز نہیں اور ''خواصِ نیچر'' یہ قبول کرانے پر کوئی دلیل نہیں. بلکہ محض تحکم ہی تحکم ہے اور قانونِ قدرت کی بنا پر کسی امر خارقِ عادت کا انکار کرنا کسی طرح بھی جائز اور معقولیت پر مبنی نہیں. یہ بھی واضح رہے کہ ہم خواصِ اشیاء کے تو منکر نہیں، جس پر نیچریوں کو ان کے ثبوت پر دلائل قائم کرنے کی تکلیف گوارا کرنا پڑے، بلکہ ہم خواصِ اشیاء کو مانتے ہوئے اِس بات کے قائل ہیں کہ عقلاً یہ کوئی ضروری نہیں اور نہ ہی اس پر کوئی دلیل ہے کہ خواصِ اشیاء کسی حال میں بھی اُن سے جدا نہ ہوں. یعنی نَعُوْذُ بِاللّٰہِ خداوند عالم جل شانہٗ کو بھی یہ اختیار اور قدرت نہ ہو کہ وہ اشیائے عالم کا موجد اور خالق ہونے کے باوجود، اُن کے خواص کو کسی وقت بھی سلب نہ کر سکے. لہٰذا عقلاً بھی یہ ممکن ہے کہ خواص، اشیاء میں موجود بھی رہ سکتی ہیں اور اُن سے معدوم بھی ہوسکتی ہیں. عقل نہ اُن کے موجود ہونے کو محال سمجھتی ہے اور نہ اُن کے معدوم ہونے پر کوئی استحالہ لازم رکھتی ہے. پس ''خواصِ اشیاء'' خداوند عالم جل وعلا شانہٗ کے تحت وتصرف میں ہیں. خواصِ اشیاء اپنے موصوفات کے لیے ضروری نہیں. ہیں اُن کے سلب پر کسی سبب سے، یا بلا سبب، مولا کریم قادر ہے اور وہ کسی چیز کا پابند نہیں.

اِس کی واضح مثال یہ ہے کہ سبز جھنڈی سے ریل چلتی ہے اور سرخ جھنڈی سے رک جاتی ہے. یعنی ریلوے والوں نے ریل کے چلنے اور رکنے پر یہ قاعدہ بنالیا ہے، لیکن اگر وہ اپنی عادت اور قانون کو بدلنا چاہیں اور اِس کے خلاف کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں. یہی مثال قوانین الٰہیہ کا ہے. یعنی جو قوانین قدرت اور اسباب معلوم ہوئے ہیں، وہ جھنڈی کی مانند ہیں اور اُنہی کے مطابق کارخانۂ قدرت چل رہا ہے اور یہ انتظام کر رکھا ہے کہ جب کوئی طبعی سبب پایا جاتا ہے تو اپنی عادت کے موافق اُس کے مسبَّب کو بھی موجود کردیتا ہے اور اگر وہ چاہے تو اُس کے خلاف بھی کرسکتا ہے اور جب قادر وقیوم خدا کسی مصلحت سے اپنے

مستمرہ قانون کے خلاف کوئی امر پیدا فرما دیتا ہے تو اُس کو خرقِ عادت (معجزہ) کہتے ہیں.

دراصل جو چیز عام عادت کے خلاف واقعہ ہوتی ہے، وہ خرقِ عادت سے تعبیر کی جاتی ہے، گو وہ اصولِ قدرت کے خلاف نہیں ہوتی مگر اُس کے اسباب ایسے دقیق اور مخفی ہوتے ہیں کہ منکرینِ معجزہ کے علم وعقل سے خارج نظر آتے ہیں.

نیک طینت فائدہ اٹھاتے ہیں، جو فراست وفہم، دور بینی و باریک نظری، انصاف پسندی و حقیقت پرستی، خداترسی وتقویٰ شعاری کا ارادہ رکھتے ہیں، چنانچہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ تفہیماتِ الٰہیہ میں لکھتے ہیں کہ معجزات وکرامات، امورِ اسبابی ہیں لیکن اُن پر گمان غالب ہوگیا ہے. اِسی وجہ سے یہ اور اسبابی امور سے ممتاز ہیں. اِس لیے اہلِ سنت جو خرقِ عادت کے قائل ہیں اِس سے اُن کی مراد صرف یہ ہے کہ وہ واقعہ جو عام عادتِ جاریہ کے خلاف وقوع میں آیا ہے گو وہ بظاہر عادتِ جاریہ کے خلاف واقعہ ہوا ہے لیکن درحقیقت خلافِ قانونِ قدرت نہیں. ہاں انسانوں کے خود ساختہ قانون قدرت کے ضرور خلاف ہے اور اُس کی حقیقت پیچھے ذکر ہو چکی ہے. پس نتیجہ کے طور پر حسبِ ذیل امور ثابت ہوئے.

1- معجزہ ممکن الوقوع اور خدا کا فعل ہے.

2- مدعیٔ نبوت سے معجزات صادر ہوتے ہیں.

3- نبوت اور پیغمبری کا وجود ہے.

4- جس سے معجزہ صادر ہوتا ہے وہ نبی ہوتا ہے.

اب یہ سمجھنا باقی ہے کہ امر خارق عادت کی، جو کسی شخص سے ظاہر ہو، دو قسمیں ہیں: یا تو اُس کا ظہور شخصِ مذکور سے کسی دعویٰ کے ساتھ ہوگا یا بغیر دعویٰ کے، اگر دعویٰ کے ساتھ ہوگا تو اُس کی چار قسمیں ہیں. یعنی وہ دعویٰ، یا الوہیت کا، یا نبوت کا، یا ولایت کا، یا سحر کا ہوگا. مدعیٔ الوہیت سے ظہورِ خوارق ممکن ہے اور یہ ضروری نہیں کہ کوئی شخص اُس کا معارض ہو اور اُسے عاجز کر دے. جیسا کہ نقل کیا گیا ہے کہ فرعون الوہیت کا مدعی تھا اور اُس سے خارقِ عادت امور ظاہر ہوتے تھے اور ایسا ہی دجّال کے حق میں بھی منقول ہوا ہے. ایسے شخص سے ظہورِ خوارق اِس لیے جائز ہے کہ اُس کا جھوٹا ہونا ظاہر ہے کیونکہ اُس کی شکل وصورت اور اُس کی جسمیت وخلقت اُس کے کذب پر دلالت کرتی ہے اور اُس کے ہاتھ پر امر خارقِ عادت کے ظہور سے التباس واقع نہیں ہوتا.

اور مدعیٔ نبوت دو حال سے خالی نہیں. یا حقیقتاً صادق ہوگا یا کاذب. اگر وہ واقعی صادق ہے تو اُس کے ہاتھ سے ظہورِ خوارق واجب ہے، اور اگر وہ کوئی امر بھی خارقِ عادت نہ دکھلا سکے تو فی الحقیقت وہ نبی نہیں ہے. جو لوگ نبوتِ انبیاء کے قائل ہیں اِس پر اُن سب کا اتفاق ہے کہ اگر وہ مدعیٔ نبوت واقع

میں کاذب ہے تو اُس سے ظہورِ خوارق جائز نہیں ہے اور اگر بالفرض ظاہر ہو بھی تو اُس کے لیے کسی معارض کا ہونا ضروری ہے جو اُس کو مغلوب کر سکے اور نیچا دکھا سکے۔

مدعیِ ولایت سے ظہورِ خوارق، بالاتفاق جائز ہے۔ مگر اس بارے میں اختلاف ہے کہ آیا یہ بھی جائز ہے یا نہیں کہ وہ کرامات کا دعویٰ کرے اور اُس کے دعویٰ کے مطابق کرامات کا ظہور ہو۔ مدعیِ سحر سے اہلِ سنت کے نزدیک ظہورِ خوارق جائز ہے مگر معتزلہ کے نزدیک جائز نہیں۔ اگر وہ شخص جس سے امر خرقِ عادت ظاہر ہو، کسی امر کا مدعی نہیں ہے تو اُس کی دو صورتیں ہیں: یا وہ نیک کردار، یا عبادت گزار ہوگا، یا بدعمل گنہگار۔ اگر نیک کردار یا عبادت گزار ہے تو ولی اللہ ہے اور اس سے جو امر خرقِ عادت ظاہر ہوگا، اُس کو کرامت کہیں گے۔ اور اگر فاسق بدکار ہے تو اس سے جو امر خرقِ عادت ظاہر ہوگا وہ استدراج کہلائے گا۔

معجزہ کی اِس مختصر سی بحث کے بعد اب یہ جاننا باقی ہے کہ ظہورِ معجزات بھی دو قسم پر ہیں۔ ایک وہ جو حضور ﷺ کے دستِ مبارک پر آپ کی حیاتِ طیبہ ظاہری میں ظہور پذیر ہوئے اور دوسرے وہ ہیں جو حضور ﷺ کے ارشادات میں آنے والے حالات و زمانہ کے متعلق ''بطورِ پیش گوئی'' کتبِ حدیث اور کتاب اللہ میں درج ہیں۔ اِن اوراق میں وہی معجزات اہلِ نظر و فہم کے آگے پیش کیے جائیں گے جو بطور پیش گوئی حالات پیش آنے والوں کے متعلق سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمائے۔ اِن میں سے بعض سو فیصدی حضور ﷺ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد ظہور پذیر ہو چکے ہیں اور بعض قیامت تک ظاہر ہوتے رہیں گے، کیونکہ حضور پُر نور شافع یوم النشور ﷺ کے معجزات کا حصر و حساب ناممکن اور فہمِ انسانی سے بالاتر ہے اور یہی حضور ﷺ کے علمِ غیب اور کمالِ وسعتِ علم کا مظاہرہ ہے۔

چنانچہ غزوۂ ہند کی پیش گوئی ارشادِ نبوت سے تین سو ترانوے (393) سال بعد ظہور پذیر ہوئی جو سنن نسائی اور بیہقی میں حضرت سیدنا ابو ہریرہؓ سے اِن الفاظ میں روایت کی گئی ہے ((قَالَ وَعَدَنَا رَسُوْلُ اللهِ ﷺ غَزْوَةَ الْهِنْدِ)) یعنی وعدہ فرمایا ہم سے رسول اللہ ﷺ نے کہ مسلمان ہندوستان میں غزوہ کریں گے۔ معلوم کیجئے کہ حضرت امام نسائیؒ کا سال ولادت 215ھ اور وفات 303 ہجری المقدس میں ہے اور ہندوستان میں سلطان محمود غزنوی نے 393 ہجری میں بہ نیت جہاد کیا۔ گویا سنن نسائی کی اشاعت کے تقریباً ایک صدی گزرنے کے بعد حضور ﷺ کی پیش گوئی غزوۂ ہند پوری ہوئی اور کتب اسلامیہ میں ہند کی تصریح یہ کی گئی ہے کہ جو ممالک دریائے اٹک کے اُس پار واقعہ ہیں وہ ''ہند'' کہلائے جاتے ہیں اور دریائے سندھ سے پار رہنے والوں کو ہند کی مناسبت سے ہی ہندو کہا گیا ہے۔

ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ ((لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى تَخْرُجَ نَارٌ مِنْ

اَرْضِ الْحِجَازِ، تُضِیءُ اَعْنَاقَ الْاِبِلِ بِبُصْرَی)) [بخاری:۸:۱۱۷] ''یعنی قیامت نہیں آئے گی جب تک حجاز میں ایسی آگ نمایاں نہ ہوگی جو بصریٰ کے اونٹوں پر اپنی روشنی ڈالے گی.'' حضور ﷺ کی اس پیش گوئی کا اظہار یکم جمادی الثانی 654 ہجری کو ہوا اور حجاز کے پہاڑی سلسلوں میں سے ایک پہاڑ ہے. جو مدینہ طیبہ کے بالکل قریب تھا. اُس سے آتش فشانی شروع ہوئی اور 2 جمادی الثانی کو زلزلوں کے جھٹکے محسوس ہوئے. 3 جمادی الثانی کو زلزلوں کی رفتار نے زیادہ شدت اختیار کرلی. 4 تاریخ کو زلزلہ کے ساتھ گرج اور گونج کی ہیبت ناک آوازیں پیدا ہونے لگیں. 5 تاریخ کو زمین سے آسمان تک غلیظ وتاریک دھوئیں کے بادل چھا گئے اور آگ کے بے پناہ شعلے فضا میں بلند ہونے لگے اور پہاڑ کے پتھر پگھل پگھل کر بلندی سے زمین پر لڑھکنے لگ گئے. ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سرخ اور روشن شعلوں کا ایک آبشار ہے جو پہاڑ سے پانی کی طرح زمین پر پڑ رہا ہے. مدینہ طیبہ اور اُس کے گرد و پیش کی تمام آبادیاں خوف و ہراس سے گھروں کو چھوڑ کر مسجد نبوی میں پناہ گزین ہونا شروع ہو گئیں. آگ کا رخ بڑی تیزی سے مدینہ طیبہ کی جانب ہو رہا تھا کہ تمام خدا پرستوں نے جمعہ کی رات کو باوجود ہزارہا پریشانیوں اور خانماں بربادیوں کے مسجد نبوی میں نہایت خشوع وخضوع کے ساتھ نوافل ومناجات اور ذکر وفکر میں شب بیداری کی اور بارگاہِ نبوت میں روضۂ اقدس کی جالی پکڑ پکڑ کر گڑگڑائے اور التجائیں پیش کیں. سرکارِ دو عالم رحمت للعٰلمین ﷺ کی شانِ رحمت میں تموّج پیدا ہوا اور ملائکۂ رحمت نے آگ کا رخ مدینہ طیبہ کی مخالف سمت کر دیا اور اہل مدینہ نسیم بہار جنت کے ٹھنڈے جھونکوں میں مطمئن ہو گئے. بہت سے مؤرخین نے اِس واقعہ کی عینی شہادت پر کئی کتابیں تصنیف فرمائی ہیں. چنانچہ حضرت امام شیخ صفی الدّین رحمہ اللہ تعالیٰ صدر مدرس بصریٰ اپنی چشم دید شہادت دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جس روز اُس آتش فشاں پہاڑ کی آگ کا ظہور حجاز میں ہوا اُسی رات بصریٰ کے بدوی قبائل نے آگ کی روشنی میں اپنے اپنے اونٹوں کو بصریٰ سے دیکھا اور شناخت کیا اور حضرت امام محمد بن اسمٰعیل بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے 256 ہجری اور امام مسلم بن الحجاج رحمہ اللہ تعالیٰ نے 361 ہجری میں وصال فرمایا. بخاری شریف اور مسلم شریف کی اشاعت تمام بلادِ اسلامیہ میں اُن کی مقبولیت عامہ کے باعث دونوں حضرات کی زندگیوں میں ہی ہو چکی تھی، جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ پیش گوئی حضور ﷺ کی شیخین حدیث کی وفات سے چار سو سال بعد پوری ہوئی اور حضور ﷺ کا علمِ غیب ساڑھے چھ سو سال کے بعد ہونے والے واقعہ کا اظہار یوں فرمایا جا رہا ہے، جیسے حضور اُس کو بیان فرماتے وقت ظاہری آنکھوں مبارک سے ملاحظہ فرما رہے ہیں.

صحیحین شریفین میں ایک اور پیش گوئی یوں درج ہوئی ہے ((لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰی تُقَاتِلُوا التُّرْکَ، صِغَارَ الْاَعْیُنِ، حُمْرَ الْوُجُوْهِ، ذُلْفَ الْاُنُوْفِ، کَاَنَّ وُجُوْهَهُمْ

الْمَجَانُّ الْمُطْرَقَةُ)) [بخاری: ۲۹۲۸] ''یعنی قیامت قائم نہ ہوگی (پھر چند باتوں کے بعد فرمایا) یہاں تک کہ تم اُن ترکوں سے جنگ نہ کرلو گے جو چھوٹی آنکھوں والے اور سرخ چہروں والے اور چپٹی ناکوں والے اور اُن کے چہرے ڈھال کی طرح چوڑے ہوں گے''۔

حضور پرنور ﷺ نے اپنے وسیع علم کے ذریعے تاتاری ترکوں کا ایسا نقشہ کھینچا اور حلیہ بیان فرمایا کہ تاریخی بصیرت رکھنے والے حضرات اُس عظیم ترین تاریخی واقعہ سے بخوبی واقف ہیں کہ فتنہ تاتاریہ کے بانی ہلاکوخان نے اپنے ہلاکت خیز حملوں سے دنیائے اسلام کو اِس حد تک پہنچا دیا تھا جہاں سلطنت اسلامیہ کے پاش پاش ہوجانے کے امکانات مکمل نظر آتے تھے۔ خلافت بغداد اور شکوہِ خراسان اُسی فتنہ عظیم کے نذر ہوگئے۔ مگر مولا کریم نے اپنے محبوب ﷺ کے ارشادات کو ایسا پورا فرمایا کہ تاتاری خون ریزیوں کا سارا زور ایشائے کوچک میں شکستِ عظیم کھا کر ہمیشہ کے لیے فی النار والسقر ہوگیا۔

ایک اور حدیث شریف میں یوں ارشاد ہوا ہے عَنْ ثُوْبَانَ مُوْلٰی رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہ ﷺ ((عِصَابَتَانِ مِنْ اُمَّتِیْ اِحْتَرَزَ هُمَا اللّٰهُ مِنَ النَّارِ: عِصَابَةٌ تَغْزُو الْهِنْدَ وَ عِصَابَةٌ تَكُوْنُ مَعَ عِيْسَى بْنِ مَرْيَمَ عَلَيْهِمَا السَّلَامُ)) [نسائی: ۳۱۷۵] یعنی ثوبانؓ جو غلام تھے رسول اللہ ﷺ کے روایت کرتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ میری اُمت کے دو گروہ ہوں گے، جن کو اللہ تعالیٰ دوزخ سے محفوظ رکھے گا۔ ایک وہ جو ہندوستان میں جہاد کرے گا اور دوسرا وہ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہوگا۔ اِس حدیث شریف سے نزولِ مسیحؑ کے منکروں کو سبق لینا چاہیے کہ وہ کون سا گروہ ہوگا؟ اور عیسیٰ علیہ السلام کب نازل ہوں گے؟ فاعتبروا۔

حضور ﷺ کے علم پاک سے ایک دوامی پیش گوئی صحیحین میں درج ہے، جو بنو شیبہ سے تعلق رکھتی ہے۔ جب 20 رمضان المبارک 8 ہجری کو مکہ معظمہ فتح ہوتا ہے اور سرورِ کائنات، مختارِ شش جہات، محمد رسول اللہ ﷺ بیت اللہ شریف میں جلوہ افروز ہوئے۔ اعلانِ عام ہو چکا ہے کہ جو بیت اللہ شریف میں آجائے اُس کو پناہ ہے۔ اہل مکہ منتظر ہیں کہ دیکھئے شیبی خاندان نے جو اذیتیں اور تکلیفیں حضور ﷺ اور اصحابِ حضور ﷺ کو پہنچائی ہیں اُس کی پاداش میں سرکارِ رسالت مآب ﷺ سے کیا ملتا ہے؟ مگر وہ رؤف و رحیم مولا اور رحمۃ اللعلمین تاجدار ﷺ شیبہ بن عثمان بن طلحہ ''کلید بردارانِ کعبہ'' کو اپنے قریب طلب فرماتے ہیں۔ چہرۂ اقدس پر بشاشت و شادمانی، لب ہائے اطہر پر تبسم کی فراوانی قربان ہو رہی ہے۔ پھر زبانِ حق ترجمان سے ارشاد ہوتا ہے ((خُذُوْهَا خَالِدَةً تَالِدَةً لَا يَنْزَعُهَا يَا بَنِيْ اَبِيْ طَلْحَةَ مِنْكُمْ اِلَّا ظَالِمٌ)) ''لو یہ چابی سنبھالو! ہمیشہ کے لیے تم سے یہ کلید کوئی بھی نہ چھینے گا، مگر وہی جو ظالم ہوگا''۔ سبحان اللہ! 8 ہجری کے بعد آج (1365) سال گزر چکے ہیں اور کیا کیا انقلاب اِس عرصہ میں نہ آئے مگر دنیا دیکھ رہی ہے کہ کلیدِ کعبہ بنوشیبہ ہی کے پاس چلی آ رہی ہے، جن کو حضور ﷺ نے

اپنے دستِ مبارک سے عطا فرمائی تھی. اور اگر اس ایک پیش گوئی کا تجزیہ کیا جائے تو اِس ایک پیش گوئی کی تین پیش گوئیاں سامنے آتی ہیں:

1- یہ کہ خاندانِ شیبی (خاندان ابوطلحہؓ) کا قیامت تک باقی رہنا اور اُس کی نسل کو بقائے دوام کی عزت حاصل ہونا.

2- کلید بیت اللہ کی حفاظت اور کلید برادری کا معاملہ ہمیشہ انہی سے متعلق رہنا.

3- شیبی خاندان سے کلیدِ کعبہ کے چھیننے والے کا ہمیشہ کے لیے ''ظالم'' کا خطاب پانا.

ایسی انگنت پیش گوئیاں ہیں جو حضور ﷺ کے معجزاتِ علمِ غیب کے سلسلہ میں پیش کی جا سکتی ہیں. جن کو دنیا کی کوئی طاقت غلط ثابت کرنے اور جھٹلانے کی جرات نہیں کر سکتی. اگر ذوق اور ایمان ہو تو ذرا ''شفا شریف'' قاضی عیاضؒ کا ایک نظر مطالعہ کیجئے. پتہ چل جائے گا کہ اُس علمِ نبوت کا بحرِ بے پایاں کس قدر وسیع اور عریض ہے، جس کی انتہا ہی نہیں اور نہ کوئی اُس کی اتھاہ گہرائی میں غواصی کر سکتا ہے.

قاضی عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آئمہؒ نے بلاشک وہ باتیں بیان کی ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحاب کو بتائی ہیں اور اُن کا وعدہ دیا ہے. یعنی آپ کا اپنے دشمنوں پر غالب آنا اور مکہ معظمہ و بیت المقدس، یمن، شام، عراق کا فتح کرنا، امن کا ظاہر ہونا حتیٰ کہ ایک عورت حیرہ سے مکہ معظمہ تک سفر کرے گی اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہ ڈرے گی، اور مدینہ میں لڑائی ہوگی اور خیبر علیؓ کے ہاتھ پر کل فتح ہوگا اور اللہ تعالیٰ آپ کی اُمت پر دنیا فتح کرے گا، اس کی نعمتیں ان کو دی جائیں گی. کسریٰ اور قیصر کے خزانے مسلمان تقسیم کریں گے اور ان میں فتنے، اختلاف اور خواہشات پیدا ہوں گی اور وہ پہلے لوگوں کے طریق اختیار کریں گے. وہ تہتر فرقے ہو جائیں گے. اُن میں سے ناجیہ فرقہ ایک ہوگا اور یہ کہ اُن کے فرش نفیس ہوں گے، اُن میں سے بعض ایک لباس صبح اور ایک شام بدلیں گے. اُن کے سامنے ایک کھانے کا برتن رکھا جائے گا، ایک اٹھایا جائے گا. اپنے گھروں پر ایسا پردہ ڈالیں گے جیسے کہ کعبہ کا پردہ ہے. پھر آخر حدیث میں فرمایا کہ تم آج کے دن اُس دن کی نسبت بہتر حالت پر ہو اور یہ کہ جب وہ اکٹر کر چلیں گے اور فارس و روم کی لڑکیاں اُن کی خادمہ ہوں گی تو اللہ تعالیٰ اُن کی عداوت باہمی کر دے گا. اُن کے بُرے لوگ اُن کے بہتر لوگوں پر غالب ہو جائیں گے اور اُن کی کفار ترکوں اور کفار خزر اور کفار روم سے لڑائی ہوگی. کسریٰ اور فارس کا ملک تباہ ہوگا حتیٰ کہ پھر کسریٰ اور فارس نہ ہوں گے. قیصر جاتا رہے گا. اُس کے بعد پھر قیصر نہ ہوگا اور بیان فرمایا کہ رُوم کی جماعت آخر تک رہے گی. آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اشراف لوگ مر جائیں گے اور زمانہ چھوٹا ہو جائے گا. فتنے اور جنگ ظاہر ہوں گے اور فرمایا کہ میرے لیے تمام زمین جمع کی گئی اور میں نے زمین کے مشرق اور مغرب دیکھ لیے.

زمینِ ہند کے آخر شرق سے لے کر بحرِطنجہ تک جہاں اُس کے پرے کوئی آبادی نہیں اور یہ وہ مقام ہے کہ جس کی کوئی اُمت پہلے مالک نہیں ہوئی اور جنوب وشمال میں اِس قدر ملک (اسلامیہ) نہیں بڑھا اور آپ نے فرمایا ہمیشہ مغرب کے لوگ حق پر غالب رہیں گے، حتیٰ کہ قیامت قائم ہوگی. امام امین المدنیؒ کہتے ہیں کہ وہ عرب کے لوگ ہیں کیونکہ وہی لوگ ''غرب'' یعنی ڈول سے پلانے میں مشہور ہیں. ایک دوسری حدیث میں ابوامامہؓ کی روایت سے ہے کہ ہمیشہ میری اُمت حق پر غالب رہے گی. اپنے دشمنوں پر قاہر ہوگی. یہاں تک کہ خدا کا حکم آئے اور وہ ایسے ہی ہوں گے. آپ نے بنواُمیہ کے ملک کی اور معاویہؓ کے حاکم ہونے کی خبر دی. اُس کو وصیت کی تھی اور فرمایا بنی اُمیہ مال کو دولت بنالیں گے. (یعنی جہاں چاہیں گے خرچ کریں گے) اور عباسؓ کی اولاد سیاہ جھنڈے لے کر نکلے گی اور اُن کا ملک بنی امیہ سے دگنا ہوگا اور مہدی علیہ السلام نکلیں گے اور یہ کہ آپؐ کے اہلِ بیت مقتول اور ہلاک ہوں گے. حضرت علی رضی اللہ عنہ شہید ہوں گے اور زیادہ بدبخت وہ ہوگا جو اُن کی ڈاڑھی کو اُن کے سر کے خون سے رنگ دے گا. پس حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دشمن خارجی اور ناصبی ہوئے، اور روافض کا ایک گروہ جو اُن کی طرف منسوب تھا، اُنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مطعون کیا (کہ کیوں خلافت چھوڑی). اور فرمایا عثمانؓ ایسے حال میں شہید ہوں گے کہ قرآن پاک پڑھتے ہوں گے اور اللہ تعالیٰ عنقریب اُس کو خلافت کا کُرتہ پہنائے گا اور لوگ اُس کے اتارنے کا ارادہ کریں گے اور یہ کہ اُس کا اللہ تعالیٰ کے اِس قول ﴿فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ﴾ پر گرے گا اور یہ کہ جب تک زندہ رہیں گے فتنے ظاہر نہ ہوں گے. آپؐ نے زبیر اور علی رضی اللہ عنہم کی لڑائی کی خبر دی اور قزمانؔ کے بارے میں فرمایا وہ دوزخی ہے. حالانکہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر خوب بہادری اور صبر کے ساتھ لڑا تھا (جس سے صحابہؓ متعجب تھے) پھر اُس نے اپنے آپ کو قتل کرڈالا اور ایک جماعت کے بارے میں جن میں ابوہریرہؓ، سمرہ بن جندبؓ اور حذیفہؓ تھے فرمایا کہ جو تم میں سب سے آخر مرے گا وہ آگ میں مرے گا پھر ایک دوسرے کی بابت پوچھا کرتے اور اُن میں سے سمرہؓ آخر میں مرے تھے. بہت بوڑھے ہو گئے تھے. آگ سینکتے سینکتے اُس پر گر کر مر گئے اور حنظلہؓ کے بارہ میں جن کو فرشتوں نے غسل دیا فرمایا کہ اُس کی بیوی سے پوچھو کیونکہ میں نے فرشتوں کو دیکھا ہے کہ اُس کو غسل دیتے ہیں. پھر لوگوں نے اُس سے پوچھا تو اُس نے کہا کہ وہ جُنبی ہو کر نکلا تھا اور موقع جنگ کی جلدی نے اُن کو غسل کرنے سے باز رکھا اور جلدی شہید ہو گئے.

اور فرمایا کہ خلافت قریش میں ہے اور ہمیشہ یہ امر قریش میں رہے گا جب تک دین کو قائم رکھیں گے اور فرمایا کہ ثقیف میں کذّاب اور ظالم قاتل ہوگا اور لوگوں نے حُجّاج اور مختار کو دیکھا اور فرمایا کہ مسیلمہ کو اللہ تعالیٰ قتل کرے گا اور فرمایا کہ آپ ﷺ کے اہلِ بیت میں سب سے پہلے بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا آپؐ سے ملیں گی اور آپؐ نے مرتدین سے ڈرایا اور یہ کہ آپؐ کے بعد خلافت تیس سال تک رہے گی. پھر

ملوکیت میں تبدیل ہو جائے گی. آپؐ نے اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ کا حال بیان فرمایا اور امراء کی نسبت فرمایا کہ وہ وقت سے نماز میں تاخیر کریں گے اور فرمایا کہ میری اُمت میں تیس کذاب ہوں گے. اُن میں سے چار عورتیں ہوں گی. دوسری حدیث میں فرمایا تیس دجال کذّاب ہوں گے. منجملہ اُن کے دجال کذاب ہوگا. اُن میں سے ہر ایک خدا تعالیٰ اور اُس کے رسول پر جھوٹ بولے گا فرمایا کہ تم میں میرا زمانہ بہتر ہے پھر جو اُس کے قریب ہوں گے. پھر جو اُن سے قریب ہوں گے.

آپؐ نے قدریہ اور رافضیہ کے نکلنے کی خبر دی اور فرمایا کہ اِس امت کے آخر لوگ پہلوں کو گالیاں دیں گے. آپؐ نے خوارج کی حالت کی خبر دی اور اُن میں ناقص خلقت (ذوالثدین) جس کا ایک بازو عورت کے پستان کی طرح تھا کی خبر دی. آپؐ نے وبا کی خبر دی. جو کہ فتح بیت المقدس کے بعد ہوگی. چنانچہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں ستر ہزار مسلمان طاعون سے فوت ہوئے اور یہ کہ آپ کی اُمت کے لوگ سمندر میں لڑیں گے اور فرمایا کہ اگر دین ستاروں پر ہوگا تو اُس کو ابناءِ فارس وہاں سے بھی لے آئیں گے اور آپ ایک لڑائی میں تھے کہ ہوا تیز چلی تو فرمایا کہ منافق کی موت کی وجہ سے ہوا تیز چلی ہے. تو جب مدینہ شریف کی طرف لوٹے تو اِس امر کو پالیا. (یعنی ایک منافق یہود مرا ہوا پایا) اس کے ہم مجلسوں سے آپ نے فرمایا تھا کہ تمہاری ڈاڑھ دوزخ میں پہاڑ کے برابر ہوگی. آپ نے اپنی اونٹنی کی خبر دی جب کہ وہ گم ہوگئی تھی اور جس طرح کہ وہ ایک درخت میں مہار کے ساتھ لٹکی تھی. آپؐ نے عمیر کے قصے کی جو صفوان کے ساتھ تھا خبر دی تھی. جب کہ اُس نے پوشیدہ مشورہ کیا تھا اور اُس سے شرط تھی کہ نبیؐ کو شہید کر دے اور جب عمیر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا کہ آپ کو قتل کر دے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کے معاملہ اور بھید کی خبر دی تو عمیر مسلمان ہو گیا. آپ نے خبر دی کہ ابی بن خلف عنقریب مارا جائے گا اور عتبہ بن ابی لہب کے بارے میں خبر دی کہ اُس کو خدا کا کتا کھائے گا. آپؐ نے اہل بدر کے بچھڑنے کی اطلاع دی اور جیسا فرمایا تھا. ویسا ہی ہوا اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا کہ میرا بیٹا سیّد ہے. عنقریب اللہ تعالیٰ اِس کی وجہ سے دو جماعتوں میں صلح کرا دے گا. آپؐ نے نجاشی کے فوت ہونے کی جس دن کہ وہ فوت ہوا خبر دی اور فیروز کو خبر دی جب کہ وہ کسریٰ کا ایلچی بن کر آیا تھا کہ کسریٰ آج مرا ہے (اُس کے بیٹے شیرویہ نے اُس کو مار ڈالا ہے) اور جب فیروز کو یہ حال ثابت ہوا تو وہ مسلمان ہو گیا. فرمایا میری بیویوں میں سے جلد مجھ سے ملنے والی وہ بیوی ہوگی جس کے ہاتھ لمبے ہوں گے. پس حضرت زینبؓ بوجہ کثرتِ صدقہ کے لمبے ہاتھ والی تھیں اور آپؐ نے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے کربلا میں شہید ہونے کی خبر دی اور زید بن صوحانؓ کے بارے میں فرمایا کہ اُس کا ایک عضو جنت کی طرف اُس سے پہلے جائے گا سو جہاد میں اُس کا ہاتھ قطع کیا گیا. سراقہؓ کے لیے فرمایا تیرا کیا حال ہو گا جب تجھے کسریٰ کا کنگن پہنایا جائے گا؟ آپؐ نے ابوذرؓ کے نکالے جانے کو فرمایا تو ویسا ہی ہوا اور

فرمایا کہ یہ تنہا ہی زندہ رہے گا اور تنہا ہی مرے گا. آپ نے اُس مال کی خبر دی کہ جس کو آپ کے چچا عباسؓ اپنی بیوی اُم الفضلؓ کے پاس رکھ آئے تھے اور پہلے اُس کو چھپایا تھا تو اُنہوں نے کہا تھا کہ اِس کی خبر میرے اور اس کے سوا کسی کو نہیں تھی. تب وہ مسلمان ہو گئے اور فرمایا کہ عنقریب اِس اُمت میں ایک مرد ہوگا جس کو ولید کہیں گے. (یہ ولید بن زید بن عبد الملک جبار تھا جو بڑا افسادی تھا) وہ اِس اُمت کے لیے فرعونؑ سے جو اپنی قوم کے لیے تھا، بدتر ہوگا اور فرمایا کہ قیامت قائم نہ ہوگی حتیٰ کہ دو گروہ لڑیں گے، جن دونوں کا دعویٰ ایک ہی ہوگا اور عمرؓ سے سہیل بن عمرو کے بارے میں فرمایا کہ عنقریب یہ ایسے مقام پر کھڑا ہوگا جو تم کو خوش کر دے گا. پس ایسا ہی ہوا جس دن کہ رسول اللہ ﷺ کے انتقال کی خبر مکۃ معظمہ میں پہنچی تو اُس نے ویسا ہی خطبہ پڑھا جیسا کہ ابو بکرؓ نے پڑھا تھا. اُن کو ثابت رکھا. اُن کی عقلوں کو قوی کیا اور آپؐ نے جب حضرت خالدؓ کو اکیدر کی طرف بھیجا تو فرمایا کہ تو اُس کو نیل گائے کا شکار کرتا ہوا پائے گا. آپ نے اُس جادو کی خبر دی جس کے ساتھ لبیدؔ بن اعصم نے آپ پر جادو کیا تھا. آپؐ نے قریش کو خبر دی کہ تمہارے کاغذ (خاص نوشتہ کو) کیڑا کھا گیا ہے. جس کے ساتھ وہ بنی ہاشم پر غلبہ پاتے تھے اور اُس کے سبب رحم کو قطع کرتے تھے اور فرمایا تھا کہ اس میں جس جس مقام پر لفظ ''اللہ'' ہے اُس کو باقی رکھا ہے. آپؐ نے اُن قافلوں کی جن پر شب معراج گزرے تھے، خبر دی کہ قافلے فلاں فلاں وقت پہنچ جائیں گے. یہاں تک کہ ان حادثات کو بیان فرمایا کہ جو آئندہ ہوں گے اور ابھی نہ ہوئے تھے. آپؐ نے قیامت کی علامات اور اس کے اترنے کے نشانات، حشر و نشر، نیکوکاروں اور بدکاروں کی خبریں، جنت و نار اور قیامت کے میدان کا ذکر فرمایا.

پس یہ سارے امور آپ کی زندگی میں اور آپ کی وفات شریف کے بعد پائے گئے یہاں تک کہ وہ باتیں بھی پوری ہوئیں جن کی نسبت آپؐ نے اپنے صحابہؓ کو ان کے اسرار اور امورِ ماضی کی خبر دی اور منافقین کے اسرار و کفر کی اطلاع فرمائی تھی. ان کے بارے میں اور مومنین کے بارے میں فرما دیا تھا کہ ''چپ رہو!'' کیونکہ ان میں سے ایک اپنے ساتھی سے کہہ دیا کرتا تھا کہ ''چپ رہو'' کیونکہ خدا کی قسم اگر اس کے پاس کوئی خبر دینے والا نہ ہوگا تو جنگل کے پتھر بھی اس کو خبر دے دیں گے.

مظہرِ اخلاق

﴿ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ﴾

''بے شک آپ عظیم الشان خلق کے مالک ہیں'' [القلم ۶۸:۴]

جس کے اخلاق کا ثناء خواں خود خدائے قدیر ہو. جس کی شان میں ﴿ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ﴾ وارد ہوا ہو اور جو منصبِ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ پر فائز ہو، اُس کے متعلق کچھ عرض کرنا انسانی حوصلہ و ہمت سے بالاتر امر ہے. حضرت معاذ بن جبلؓ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جل وعلا شانہٗ نے مکارمِ اخلاق اور محاسن اعمال ہمارے حضرت رسالت پناہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ ستودہ صفات میں اِس طرح جمع فرما دیے ہیں کہ دنیا کا اور کوئی راہنما 'نئی یا پرانی دنیا کا کوئی انسان، اس امر میں آپ کے مدمقابل کھڑا نہیں ہو سکتا. حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحابؓ و احبابؓ کو کوئی ایسا حکم کبھی نہیں دیا جس میں پہلے اپنا عملی نمونہ اُن کے سامنے پیش نہ فرما دیا ہو. یہی وجہ ہے کہ ہر دشمن سے دشمن بھی آپؐ کے مکارمِ اخلاق اور محاسن خصائل کا معترف نظر آتا ہے اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہدایت و اصلاح اور تزکیہ و تعلیم اور نمونہ تعلیم دونوں کی اشد ضرورت ہوتی ہے اور جہاں کہیں تعلیم بھی بہتر، ہو اور نمونہ تعلیم بھی ساتھ ہو، تو یہ نمونہ اور تعلیم مل کر خدا جانے کیا ہو گئے ہوئے تھے، جس نے اسافلۂ عالم کو اعاظم زمانہ بنا کر رکھ دیا اور نصف صدی گزرنے سے پہلے پہلے دنیا کے بدترین انسان نہ صرف دنیا کے بہترین انسان بن گئے بلکہ دنیا کے پیشوا اور مالک و سلطان ہو کر نکلے. کیونکہ ایک طرف قرآنِ پاک کی تعلیم رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے دی جا رہی تھی اور دوسری جانب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کامل اخلاق کا نمونہ بنی نوعِ انسان کے سامنے پوری درخشانی سے پیش ہو رہا تھا. احیاء العلوم میں حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حضرت سعد بن ہشامؓ نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کی نسبت استفسار کیا تو آپ نے فرمایا کہ تم قرآن نہیں پڑھتے؟ سعدؓ نے عرض کیا کہ پڑھتا ہوں، تو ام المومنینؓ نے ارشاد فرمایا ''قرآنِ کریم تمام آپ ہی کے اخلاقِ کریمانہ کا تذکرہ ہے''. كَانَ

خُلُقُهُ الْقُرْآنُ یعنی حضور ﷺ کا خلق تو قرآن ہی ہے. اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان ایک خلق کو یا اخلاق کے کسی ایک پہلو کو اپنی سعی سے انتہائے عروج پر پہنچا لیتا ہے مگر دوسرے اخلاقی پہلوؤں سے تہی دامن ہو جاتا ہے. مثلاً مروّت و مودّت میں ترقی کر کے کمال پیدا کر لیا اور ہوش مندی، معاملہ فہمی اور عقل سے عاری رہا. اگر مروّت و مودّت کی وجہ سے کمزوری کی صورت اختیار کر جائے تو عاجزی وانکساری کی جانب رجوع کر جاتا ہے. اگر عاجزی وانکساری سے قدم ہٹاتا ہے تو مجسمۂ رحم بن جاتا ہے. رحم میں بڑھا تو عدل وانصاف کے مقتضیات کھو بیٹھتا ہے. لیکن حضور پرنور ﷺ چونکہ کامل الاخلاق تھے، اس لیے ہر خلق میں کامل اور اخلاق کے تمام پہلوؤں میں مکمل رہے، کسی ایک خلق کے کمال سے دوسرا کوئی خلق ناقص نہ تھا. اسی لیے مولا کریم نے آپ کو فرمایا کہ آپ حالتِ اعتدال پر ہیں. گویا ایک ہی ذات قدسی صفات میں بیک وقت جملہ اخلاق کا اجتماع ایک ایسی نادر چیز تھا، جس سے بہتر نہ دنیا والوں نے کبھی دیکھا اور نہ ہی آئندہ اُس کے مشاہدہ کی توقع ہو سکتی ہے. اس برگزیدہ ہستی اس اشرف الانبیاء رسول کے حسن معاشرت، جود و کرم، تواضع وانکساری، رحم ورأفت کے واقعات سے دنیا کی سب سے بڑی مقدس اور پاک کتاب یعنی قرآن حکیم شروع سے آخر تک لبریز ہے. اگر آپ کے سوانح حیات سے آپ کے مکارمِ اخلاق کے واقعات جمع کئے جائیں تو وہ ایک لا انتہا ذخیرہ ہے جن کا عشر عشیر بھی بیان کرنا محال ہوگا.

مثل مشہور ہے کہ جوانی دیوانی ہوتی ہے. یا یوں سمجھیے کہ زندگی کے شباب و بہار کا موسم ہی جوانی ہوتی ہے جس میں تمام آرزوئیں اور اُمنگیں، جذبات واحساسات پورے جوش پر ہوتے ہیں، لیکن آپ کی جوانی نہ دیوانی تھی، نہ جذبات میں بہہ جانے والی چیز، کیونکہ قریشِ مکہ جب دیکھتے ہیں کہ تبلیغ کا کام حضور ﷺ نے علانیہ شروع کر دیا ہے تو طرح طرح کے لالچ دیتے اور اپنے ملک کی امارت و حکومت پیش کرتے ہیں. کبھی خزانوں پر متمکن کرنے کی جھلک دکھائی جاتی ہے تو کبھی عرب کی خوبصورت اور حسین ترین لڑکیاں نکاح میں دینے کا طمع دیا جاتا ہے لیکن وہ شہنشاہِ لولاک، وہ دھن کا پکا، ارادے کا مضبوط، ہمت کا دھنی، الوالعزم رسول ﷺ کوئی اثر قبول نہیں فرماتا. نہ اس کو شادی کی پرواہ نہ دولت کی ہوس. تجارت میں قدم اٹھایا تو محض شفیق چچا کی مالی حالت خراب دیکھ کر، اور شادی پر متوجہ ہوئے تو ایک چہل سالہ خاتون حضرت خدیجۃ الکبریٰ ؓ کے پیغام پر. نہ قریش کی سرداری کا تاج قبول فرمایا اور نہ امیر ترین گھرانوں کی حسین لڑکیاں نکاح میں لینے پر آمادہ ہوئے، بلکہ یوں کہیے کہ ایک وہ دور جس میں سارے عرب کی فرمانروائی حاصل تھی آنے پر بھی آن بان وہی رہی جو پہلے دور کی خزاں میں تھی. ہزاروں ابتلاؤ آزمائش کے پہاڑ سامنے آئے، مگر آپ نے اپنے فرضِ رسالت کو ایسا نبھایا جس کی مثال پوری دنیا پیش کرنے سے قاصر ہے.

تفصیل میں کہاں تک جایا جائے. وہ کون سی ایذاء رسانی یا لالچ کا پہلو ہے جو دشمنوں نے اختیار نہیں کیا؟ نماز سے منع کیا جاتا ہے. نماز پڑھتے ہوئے پشت مبارک پر گوبر کی بھری ہوئی اونٹ کی اوجھریاں رکھی جاتی ہیں، راستہ میں کانٹے بچھائے جاتے ہیں، کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا ہے، رات کو استراحت کے وقت مکان پر پتھر مارے جاتے ہیں. ساحر، کاہن، دیوانہ کا خطاب دیا جاتا ہے مگر آپ ہیں کہ فرائضِ نبوت سے باز نہیں آتے. عام مسلمانوں پر مظالم کی انتہا نہیں. کئی لوگ حبشہ کو ہجرت کر رہے ہیں تو کئی مدینہ کی جانب روانگی کا قصد رکھتے ہیں. خود حضور ﷺ تین سال کے لیے مکہ سے تشریف لے گئے اور شعب ابی طالب میں محصور کر دیئے گئے اور آپ کی وجہ سے تمام بنی عبد المطلب سے عدم تعاون کر دیا گیا اور کھانے کی چیزیں اور پینے کا پانی بھی درّہ میں جانے سے روک دیا جاتا ہے اور وہ نا قابلِ برداشت اذیتیں پہنچائی جاتی ہیں، جس کے تصور سے بھی انسانی روح کانپتی ہے مگر نبوت کی ذمہ داریاں ایک وہ فریضہ ہے جس کے نبھانے کے لیے حضور ﷺ ایک لاجب چٹان کی طرح مستقیم ہیں اور پائے ثبات میں ذرہ بھر بھی لغزش نہیں ہوتی. ہجرت کا واقعہ آپ کی زندگی میں سب سے اہم اور کٹھن واقعہ ہے جب کہ آپؐ کے قتل کا فیصلہ کر کے دشمنانِ الٰہی نے آپ کے مکان کا محاصر کر لیا اور یہ فیصلہ ہو گیا کہ آج آپ کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے، مگر اعجازِ نبوت نے اُن کی آنکھوں میں مٹی ڈالی اور اُن کے دیکھتے ہی دیکھتے حضور ﷺ غارِ ثور میں تشریف لے گئے جو سانپوں اور بچھوؤں کا مسکن تھا مگر محافظِ حقیقی نے آپ کو ہر دشمن سے محفوظ فرما کر مدینہ طیبہ پہنچا دیا.

یہ تھا وہ تاریک پہلو جس پر دشمنوں اور دنیا والوں کی فطرت متحرک ہوئی. اب نبوتِ محمدیہ ﷺ کا اخلاقانہ درخشندہ اور روشن پہلو دیکھیے جب کہ حضور ﷺ اُس سانحہ جان گداز کے آٹھ سال بعد رمضان شریف میں فاتحانہ انداز کے ساتھ مکہ معظمہ میں داخل ہوتے ہیں تو اُن دشمنوں کے ساتھ جنہوں نے بیس سال تک آپؐ پر عرصۂ حیات تنگ کیے رکھا اور کسی امکانی اذیت واہانت میں باک نہ کیا تھا، کیا سلوک روا فرمایا. وہ جس کی مثال دنیا پیش نہیں کر سکتی. چاہیے تو یہ تھا کہ تمام ناروا سلوک کے عوض میں مکہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جاتی اور اُس کے مکینوں کے خون سے کوچہ و بازار رنگین کر دیئے جاتے. دشمنوں کا خون ندیوں کی طرح بہتا اور بچے، بوڑھے، جوان تلوار کے گھاٹ اتار دیئے ہوتے. مگر واہ رے رحمت للعلمین کی شانِ رحمت! کیسی باز پرس اور کہاں کی سزا؟ کسی کو ملامت بھی تو نہیں کی جاتی، حالانکہ یہ ابھی تک اپنے اپنے کفر پر قائم ہیں اور ان میں قاتل، سازشی، خون کے پیاسے، حملہ آور، سب موجود ہیں. اُن میں قریش کے وہ جابر و ستم ران نوجوان بھی کھڑے ہیں جو اسلام اور بانیٔ اسلام کی ہستی مٹانا اپنی زندگی کا مقصدِ وحید سمجھتے تھے. وہ بھی تھے جو نماز کے وقت سجدہ کی حالت میں ناگفتہ بہ گستاخیاں کر چکے تھے. وہ بھی تھے جن کی زبانیں آپ کی ہجو اور آپ کے خلاف بدکلامی میں

ناپاک ہو چکی تھیں. وہ بھی تھے جنہوں نے اُس پیکرِ قدسی کو شعب ابوطالب میں محصور کر کے اپنی سفا کی کی بے انتہائی حرکات کا ثبوت دیا تھا. وہ بھی تھے جن کی تلواروں اور نیزوں کی پیاس خونِ رسول اللہ ﷺ کے سوا کسی چیز سے نہ بجھتی تھی. وہ بھی تھے جنہوں نے مہاجرین و مہاجرات پر ظلم ڈھائے اور صاحبزادی زینب ؓ کو نیزے سے موت کے گھاٹ اتارا. وہ بھی تھے جو رات کو دولت کدۂ نبوت پر پتھر پھینکا کرتے. وہ بھی تھے جو ایمان لانے والوں کو تپتی ریت اور سلگتے ہوئے انگاروں پر لٹاتے اور اُن کے سینوں پر جلتے ہوئے پتھر رکھ کر اُن کی زندگیاں تمام کرنا چاہتے تھے. وہ بھی تھے جنہوں نے ہجرت کی رات تلواریں سونت سونت کر بڑی بے جگری سے قتل کی ٹھان لی تھی تا کہ رسولِ خیر الانام ﷺ کا خاتمہ کر دیں. وہ بھی تھے جنہوں نے ہجرت کے بعد آپ کی تلاش میں بُرے ارادوں پر مکہ کے قرب و جوار کا چپہ چپہ چھان مارا تھا. وہ بھی تھے جو نادار مسلمانوں کو چٹائیوں میں لپیٹ کر اُن کے ناک میں دھواں دیتے تھے. وہ بھی تھے جو کسی سے اللہ کا نام سن پاتے تو مار مار کر بیہوش کر ڈالتے. وہ بھی تھے جو کلمہ گوؤں کو لوہے کی زرہ پہنا کر آگ میں ڈال دیتے تھے، غرضیکہ شرم ساری کے عالم میں مجرمانہ انداز سے گردنیں جھکائے ہوئے تمام ستم کیش امراء اور ظالم و بے رحم سردار اور شقی و بے درد عوام حاضر تھے. سرکارِ دو عالم رحمتِ مجسم ﷺ نے جب اُن کو پابندِ سلاسل دیکھا تو یوں ارشاد فرمایا: اے معشرِ قریش بتاؤ تم آج مجھ سے کس سلوک کی امید رکھتے ہو؟

وہ لوگ دشمن تھے. ایذا رسان اور بد باطن تھے. مگر نبوت کے اداشناس ضرور تھے. وہ جانتے تھے کہ ہمارا قصور ایسا نہیں جو معاف ہو سکے. ہم کشتنی و گردن زدنی ہیں. مگر پھر کیفر کردار کا یہ انجام نہ ہو گا جو ایک ظالم و جاہل دشمن کا ہوتا ہے. سب انتہائی شرم سے سر جھکا کر عرض کرتے ہیں کہ تو کریم ابن کریم ہے. ہمیں تجھ سے اُس بہتر سلوک کی توقع ہے جو حضرت یوسف علیہ السلام نے مصر میں اپنے بھائیوں سے کیا تھا یہ سن کر رحمت اللعلمین نے کمال رحمت سے فرمایا. ((لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ اِذْهَبُوْا وَاَنْتُمُ الطُّلَقَا)) یعنی ''آج تم پر کوئی جرم نہیں. جاؤ تم سب آزاد ہو'' یہی نہیں بلکہ اُن مہاجرین کو جن کے مکانات پر کفارِ مکہ نے قبضہ کر رکھا تھا، فرمایا کہ تم سب اپنے اپنے آبائی حقوقِ جائداد سے دست بردار ہو جاؤ، حالانکہ تقاضائے وقت یہ تھا کہ اُن کی املاک و جائدادوں کا قبضہ اُن کو واپس دلا دیا جاتا.

کیا دنیا کی تاریخ، کسی مذہب کا کوئی راہنما، نیا یا پرانا مہاتما، دوست و دشمن کے مقابلہ میں ایسا خلق و عفو اور رحمت و کرم فرمائی کا فقید المثال نمونہ پیش کر سکتا ہے؟ بعض دفعہ بڑے بڑے پیدا ہونے والے فتنے آپ کے حسنِ اخلاق و شیریں کلامی سے آن کی آن میں مٹ جاتے تھے. غزوہ حنین میں چھ ہزار اوقیہ چاندی مالِ غنیمت میں مسلمانوں کے ہاتھ آئی. حضور ﷺ نے مقامِ جعرانہ پر یہ سب مالِ غنیمت تقسیم فرمایا اور جدید الاسلام قریش مکہ کو جو ''مؤلفتہ القلوب'' تھے. اُس مال سے بہت زیادہ حصہ

دیا اور بعض کو تو اُن کے حصہ سے بھی بڑھ چڑھ کر عطا ہوئی. مثلاً صرف ابوسفیانؓ اور اُن کے بچوں کو تین سو اونٹ اور ایک سو بیس اوقیہ چاندی ملی. منافق لوگ جو فتنہ پیدا کرنے کے لیے ایسے مواقع تلاش کرتے رہتے تھے. اُنھوں نے انصار اور مہاجرین میں تفریق ڈالنے کے لیے اکسانا شروع کر دیا. انصار کو اُن کی باتیں سن کر اُس تقسیم سے رنج ہوا اور خفیہ خفیہ چہ میگوئیاں ہونے لگیں. رفتہ رفتہ یہ آواز سرکارِ دوعالم ﷺ کے سمعِ مبارک تک جا پہنچی تو ایک خیمہ نصب کرایا اور انصار کو اُس میں جمع ہونے کا حکم دیا. جب سب انصار جمع ہو گئے تو حضور ﷺ نے اُس افواہ کے متعلق اُن سے دریافت فرمایا. جواب میں عرض کیا گیا کہ ہاں! ہمیں سے بعض سادہ لوح نوجوانوں نے یہ باتیں کسی وجہ سے کی ہیں مگر کسی ذمہ دار اور پختہ مغز دانا نے نہیں کیں اور نہ ہمیں اس قسم کی بدگمانی ہو سکتی ہے. یہ سن کر حضور ﷺ نے فرمایا:

اے گروہِ انصار! کیا یہ صحیح نہیں کہ تم لوگ گمراہ تھے؟ اللہ تعالیٰ نے میری بدولت تمھیں ہدایت بخشی. تم ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے. مولا رحیم نے میری وجہ سے تم کو غنی فرما دیا. اِس کے جواب میں سب انصار نے عرض کی کہ بے شک ہم پر اللہ اور اُس کے رسول انام ﷺ کا بہت احسان ہے.

پھر فرمایا کہ تم مجھ کو یہ جواب کیوں نہیں دیتے کہ جب ساری دنیا نے آپ کی تکذیب کی تو ہم نے تصدیق کی. جب لوگوں نے تجھ کو چھوڑ دیا تو ہم نے پناہ میں لیا. جب تو محتاج ہمارے پاس آیا تو ہم نے مال و جان سے تیری امداد کی. اے انصار! اگر تم یہ کلمات کہتے جاؤ تو میں کہوں گا کہ تم ٹھیک کہتے ہو، لیکن جانو کہ کیا تم کو یہ بات ناپسند ہے کہ اور لوگ اونٹ اور بکریاں لے کر گھروں کو واپس جائیں اور تم محمد الرسول اللہ ﷺ کو ہمراہ لے کر گھروں میں داخل ہو؟ یہ تقریر سن کر انصار فرطِ محبت سے اِس قدر روئے کہ ڈاڑھیاں تر ہو گئیں اور بے اختیار پکار اٹھے کہ ہم کو صرف محمد ﷺ کی ضرورت ہے. ہم اونٹ بکریاں نہیں چاہتے. اِس کے بعد آپ نے انصار کو تسکین دی اور سمجھایا کہ اہلِ مکہ ''جدید الاسلام'' ہیں اِس لیے میں نے اُن کو ''تالیفِ قلوب'' کے خیال سے زیادہ مال عطا کیا ہے. یہ نہیں کہ تم لوگوں کی نسبت اُن کا حق زیادہ ہے. ہجرت اگر ''مِن جانب اللہ'' مقدّر نہ ہوتی تو میں بھی انصار میں شامل ہوتا. اگر انصار ایک راستہ پر چلیں اور لوگ دوسرے راستہ پر، تو میں ضرور انصار کا راستہ اختیار کروں گا. پھر دعا فرمائی یا الٰہی تو انصار اور اُن کی اولاد پر رحم فرما!.

آپ کی اِس تقریر سے انصار ایسے مسرور و مطمئن ہوئے کہ منافقین کا پیدا کردہ فتنہ آنِ واحد میں فرو ہو گیا.

مخالفینِ اسلام کہتے ہیں کہ مکہ میں پیغمبرِ اسلام ﷺ کی فقر و فاقہ سے گزر ہوتی تھی مگر جب مدینہ میں آئے تو ایک وسیع سلطنت کے مالک بن گئے اور عسرت وسعت سے بدل گئی، مگر تاریخ اس کے خلاف بتاتی ہے. سارا عرب جب آپ کا مطیع و منقاد ہو گیا تو بھی فاقہ سے آپ کا وہی حال تھا.

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے بارہا حضور ﷺ کو بھوک کی کمزوری سے پشت مبارک کو سہارا دیتے دیکھا ہے. متواتر دو دو مہینے تک کاشانۂ نبوت میں آگ نہیں جلتی تھی. کبھی پانی کے دو گھونٹ اور کھجوروں پر اور کبھی بکری کے تھوڑے سے دودھ پر گزراوقات ہو جاتی. اکثر اوقات رات کا کھانا میسر نہ آتا اور بھوک سے آواز بھی پست ہو جاتی. کبھی صبح کو پیٹ بھر کے تناول فرما لیتے تو رات کو کھانا نہ کھاتے. اسلام کی تکمیل اور کائنات پر پورے قبضے کے باوجود آخری ایامِ عمر میں جن کپڑوں میں دنیا چھوڑی اُن کو پیوند لگے ہوئے تھے اور انتقال کے وقت آپ کی زرہ ایک یہودی کے پاس رہن تھی. قیامِ مدینہ میں ہجرت سے وفات تک جیسا کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ ارشاد فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ نے کبھی دو وقت سیر ہو کر کھانا نہیں کھایا، حالانکہ اُس وقت خدا کی اکثر خدائی آپ کے زیرِ نگین تھی. انتقال سے ایک ماہ قبل آپ نے حضرت صدیقہؓ سے فرمایا کہ مجھے دنیا سے کوئی تعلق نہیں. مجھ سے پہلے جتنے اولوالعزم رسول ہو چکے ہیں اُنہوں نے بہت زیادہ مصائب اٹھائے اور صبر کیا پھر اُسی حال میں دنیا سے رخصت ہو گئے. اللہ تعالیٰ نے اُن کے مراتب بلند کئے اور ثوابِ عظیم سے اُن کو نوازا. اِس لیے میں بھی معیشت میں فراخی طلب کرنے سے ڈرتا ہوں. حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور سرورِ دو عالم ﷺ نے کبھی اپنے گزارہ کی تنگی کا حال بطورِ شکوہ بیان نہیں فرمایا. بلکہ اُس کے اظہار سے اُمت کی تسلی و تشفی مقصود ہوتی تھی تاکہ وہ بوقتِ تکلیف اضطراب اور گھبراہٹ کو اپنے قریب نہ آنے دیں.

الغرض آپ حسنِ معاملہ، حسنِ خلق، استقامت، ایثار، سخاوت، شفقت، رحم، ہر صفت میں کامل و مکمل اور تحمل و برداشت میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے.

وَصَلَّے اللّٰہُ عَلٰی حَبِیْبِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَ اَصْحَابِہٖ وَسَلَّمْ

علانیہ تبلیغ

﴿ يَآ أَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ط
وَإِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ﴾

اے رسول! پہنچا دیجیے جو اُتارا گیا ہے آپ کی طرف آپ کے پروردگار کی جانب سے
اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو نہیں پہنچایا آپ نے اللہ تعالیٰ کا پیغام [المائدہ ۵: ٦٧]

کسی گذشتہ باب میں یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ خفیہ تبلیغ کی رُو سے فرزندانِ توحید کی جمعیت چالیس پچاس افراد تک پہنچ گئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو علانیہ تبلیغ کا ارشاد صادر ہوا اور وحیءِ الٰہی نازل ہوئی کہ آپ کو جو حکم دیا گیا ہے اُس کی اب علانیہ تعمیل کرو اور اپنے اقربا کو بھی خوفِ الٰہی سے ڈراؤ. چنانچہ جب آپ نے حرمِ محترم میں اس کی تعمیل کی تو لوگ مشتعل ہو گئے اور دفعۃً ایک ہنگامہ بپا ہو گیا. لوگ وحشیانہ طور سے آپ پر حملہ آور ہوئے. اُس وقت آپ کو حفاظت میں لینے کے لیے آپؐ کے ربیب، حضرت ہالہ بن ام المومنین خدیجہ الکبریٰؓ آڑے آئے. جن پر اتنی تلواریں پڑیں کہ وہ شہید ہو گئے. اسلام کی راہ میں یہ پہلا خون تھا.

اِس ہنگامہ وقتل نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ کفارانِ مکہ کے قلوبِ قاسیہ میں خدا کا تصور جمانا اور تبلیغ احکامِ الٰہی کرنا گویا اپنی موت کو دعوت دینا ہے. مگر سرکارِ انبیاء، رسولِ امین صلی اللہ علیہ وسلم نبی تھے اور آپ کا اولین فریضہ عمل دعوت اسلام تھا اور مکی زندگی کا تیرہ سالہ دور اِسی فریضہ کی ادائیگی میں گزرا. اُس کے بعد ہجرت اور مدینہ منورہ کا پنجسالہ زمانہ بڑی مصروفیت وانہماک کا زمانہ تھا. ایک لمحہ اور ایک ثانیہ بھی یہاں ایسا نہ گزرا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کبھی سکونِ خاطر حاصل کر سکے ہوں. ہر طرف سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے جال بچھے ہوئے تھے اور قریش و یہود کے اتحاد نے آپ کی تمام تر توجہات اپنی طرف مبذول کرا رکھی تھیں. تاہم جب کبھی ان ہجوم وافکار میں فرصت کے چند لمحے نصیب ہوئے. آپ نے انہیں تبلیغ وارشاد کے لیے وقف کر دیا اور رب العزت جل وعلاشانہٗ کی مہربانی سے صلح حدیبیہ کی تکمیل کے بعد آپ کو گونہ مہلت ملی اور سب سے بڑے دشمنِ اسلام کی طرف سے کسی قدر اطمینان حاصل ہوا. اس طمانیت کا ہاتھ

آنا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم من کل الوجوہ اور ہمہ تن تبلیغ وارشاد میں مصروف ہو گئے اور یہ حقیقت ہے کہ جس قدر اسلام پہلے پنجسالہ دور میں نہ پھیلا تھا، اس سے کہیں زیادہ اس فراغت و مہلت کے ایام میں پھیلا.
اس فرصتِ مغتنم میں سب سے بڑا فائدہ جو اٹھایا گیا وہ یہ تھا کہ آپ نے سلاطینِ عالم کے نام دعوت نامے ارسال فرمائے جنہوں نے اسلام کو اپنی عزت وآبرو اور اپنے ملک و وطن کے لیے ایک خطرۂ عظیم سمجھ رکھا تھا. کیونکہ ان کے کانوں میں یہ الفاظ پہنچ رہے تھے کہ اسلام بتوں اور بت پرستی کے لیے ایک تباہی کا پیغام ہے اور ہماری یہ بت پرستی اور صنم آرائی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی.

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو جمع کیا اور اُن کو ایک مہتم بالشان خطبہ دے کر فرمایا: مجھے اللہ تعالیٰ نے نہ صرف پیغمبر بلکہ رحمتِ عالم بنا کر بھیجا ہے. ایسا نہ ہو کہ تم بھی حضرت مسیح کے حواریوں کی طرح اختلاف کے دریا میں غوطے کھانے لگ جاؤ. اٹھو اور میری طرف سے پیغامِ حق دنیا کو پہنچاؤ. اتنا فرما کر آپؐ نے کاتب کو بلوایا اور سلاطینِ زمانہ کے لیے دعوتِ اسلام کے مکاتیب لکھوا کر قاصدوں کے ہاتھ ارسال فرمائے اور جو جو حضرات یہ فرامین لے کر مختلف اطراف وجوانب میں روانہ ہوئے اور جن جن کے نام وہ دعوت نامے لکھے گئے اُن کی مختصر سی فہرست مندرجہ ذیل ہے:

حضرت دحیہ کلبیؓ کو ہرقل شاہِ روم کی طرف بھیجا گیا. حضرت عبداللہ بن خدافہ سہمیؓ کو شہنشاہ خسرو پرویز والیٔ ایران کی طرف. حضرت عمر بن اُمیہؓ کو نجاشی شاہِ حبش کی طرف. حضرت سبط بن عمر بن عبد شمسؓ کو رؤسائے یمامہ کی طرف. حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ کو عزیز والیٔ مصر کی طرف. حضرت شجاعؓ بن وہب الاسدی کو رئیس حدودِ شام حارث غسانی کی طرف.

مکہ والوں کو اِس بنا پر کہ شاہِ حبش کے گورنرِ یمن ابرہہ نے جو مذہباً عیسائی تھا، بیت اللہ شریف پر چڑھائی کی تھی، عیسائیوں سے ایک قلبی عداوت اور گونہ پرخاش وکد ہو گئی تھی اور وہ اُن کو ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتے تھے. اِس لیے جب ایران کے مجوسیوں نے ہرقل شاہِ روم کو جو عیسائی تھا شکست دی تو قریش نے بڑی خوشیاں منائیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو طعنہ دیا کہ دیکھ لیجئے. خسرو پرویز ایک بت پرست نے ہرقل عیسائی جو خدا کا پرستار ہے کو کیسی زبردست شکست دی ہے. اِس طعنہ کا مطلب یہ تھا کہ قریش میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ شاید حضور صلی اللہ علیہ وسلم عیسائیت کے قیام کی حمایت میں ہیں. چنانچہ اِسی غلط فہمی کے زمانہ میں سورۂ روم کا نزول ہوا جس میں مولا کریم کی طرف سے یہ ایک پیش گوئی ارشاد فرمائی گئی تھی کہ چند سالوں کے اندر ہی اندر اہلِ روم، بت پرست ایرانیوں پر غلبہ حاصل کر لیں گے. یہ ارشادِ باری حرف بحرف پورا ہوا اور ہرقل شاہِ روم نے تھوڑے عرصہ کے بعد خسرو پرویز کو وہ انتقامی شکست دی کہ تاریخ آج تک اُس پر قرآنی صداقت کی گواہ ہے. شاہِ ہرقل اِسی کامیابی کا شکریہ ادا کرنے کے لیے حمص سے بیت المقدس آیا اور بڑے شان وطمطراق سے آیا اور یہیں حضرت دحیہ بن خلیفہ کلبیؓ نے وہ نامۂ رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شاہِ ہرقل کے دربار میں پیش کیا. قیصر روم نے خط پڑھتے ہی کہا کہ یہاں کوئی عربی شخص موجود ہو تو اُس کو بلاؤ تا کہ اِس خط کے متعلق بعض ضروری امور معلوم کئے جا سکیں. اِس آواز پر اتفاق کی بات ہے کہ تلاش میں ابوسفیان مل گیا جو بسلسلۂ تجارت شام میں آیا ہوا تھا اور مقامِ غزوہ میں مقیم تھا. لوگوں نے اُسے پیغام دیا کہ تم کو قیصر روم نے طلب فرمایا ہے اور اس کو ساتھ لے کر حاضر دربار کر دیا. قیصرِ روم اپنے پورے شاہانہ ٹھاٹھ میں دربار آراستہ کئے بیٹھا تھا اور تختِ حکومت کے اردگرد رہبانِ و قسیسین کی صفیں قائم تھیں. قیصرِ نے عرب والوں کی جانب جو تاجرانہ حیثیت سے وہاں مع ابوسفیان کے حاضر تھے. خطاب کیا کہ کیا تم لوگوں میں اُس مدعیِ نبوت کا کوئی عزیز یا رشتہ دار ہے. جس کی جانب سے ہم کو یہ خط ملا ہے اور اُس کا نامِ نامی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے؟ یہ سنتے ہی ابوسفیان عرض گزار ہوا کہ جہاں پناہ! میں اُس مدعیِ نبوت کا عزیز ہوں. جو ارشاد ہو بندہ بغیر کسی لگی لپٹی اور کینہ وحسد کے صاف صاف گزارش کر دے گا. اس پر شاہِ روم اور ابوسفیان میں مندرجہ ذیل مکالمہ ہوا:

قیصر روم: کیا تم بتا سکتے ہو کہ اُس مدعی نبوت کی خاندانی حیثیت کیسی ہے؟

ابوسفیان: جہاں پناہ! خاندانی حیثیت سے وہ نہایت شریف النسب اور معزز ہے.

قیصر روم: کیا اُس خاندان سے اِس سے قبل بھی کبھی کسی نے دعویٰ نبوت کیا ہے؟

ابوسفیان: جہاں پناہ دعوائے نبوت تو در کنار کسی کو کبھی نبوت کا تصور بھی نہیں آیا.

قیصر روم: کیا اُس کے خاندان میں پہلے کوئی بادشاہ بھی ہوا ہے؟

ابوسفیان: کوئی نہیں.

قیصر روم: جن لوگوں نے اِس جدید مذہب کو قبول کیا ہے وہ کچھ صاحب اثر اور عالی قدر ہیں یا کمزور؟

ابوسفیان: عالی جاہ نہایت کمزور، غلام اور ادنیٰ درجے کے لوگ ہیں.

قیصر روم: کیا دن بدن اُس کے حلقہ بگوشوں اور پیروؤں میں زیادتی ہوتی جاتی ہے یا کمی؟

ابوسفیان: اُن کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے.

قیصر روم: کیا تم لوگوں کو اُس کے کذب اور جھوٹ کے متعلق بھی کبھی تجربہ ہوا ہے؟

ابوسفیان: نہیں کبھی نہیں.

قیصر روم: کیا تم بتا سکتے ہو کہ کبھی اُس نے اپنے عہد و اقرار کی ہی خلاف ورزی کی ہو؟

ابوسفیان: ابھی تک ہمیں اِس کا تجربہ نہیں ہوا. البتہ اِسی سال اُس سے ہمارا ایک نیا اور جدید معاہدہ ہوا ہے. اُس سے پتہ چل جائے گا کہ وہ اپنے عہد پر قائم رہتا ہے یا نہیں؟

قیصر روم: کبھی تمہاری اور اُس کی آپس میں لڑائی بھی ہوئی ہے؟

ابوسفیان: ہاں کئی جنگیں ہوئی ہیں.

قیصر روم: اِن جنگوں میں نتیجۂ جنگ عموماً کیا رہتا رہا؟

ابوسفیان: یہی کہ کبھی ہم غالب رہے اور کبھی وہ.

قیصر روم: یہ بتاؤ کہ وہ کیا کہتا، کیا سکھاتا ہے اور کیا تعلیم دیتا ہے؟

ابوسفیان: حضور وہ کہتا ہے کہ ایک خدا کی عبادت کرو، کسی اور کو اُس کا شریک نہ ٹھہراؤ، نماز پڑھو، پاک دامنی اختیار کرو، صلہ رحمی کرو اور سچ بولو.

اِن تمام سوالوں کے جواب سن کر قیصر روم نے ابوسفیان سے کہا کہ تم نے اُسے شریف النسب بتایا ہے اور پیغمبر ہمیشہ پاکیزہ نسب اور بلند خاندان ہی ہوا کرتے ہیں. اور تم نے یہ بھی بتایا کہ اُس کے خاندان میں سے کبھی اور کسی نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا اور نہ ہی کوئی بادشاہ ہوا ہے. اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ یہ پہلا ہی خاندانی اثر ہے یا بادشاہت کی تمنا نے اُس کو اس دعوئی پر آمادہ کیا ہے. تم نے یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ اُس نے کبھی لغو بیانی سے کام نہیں لیا اور نہ دروغ بافی سے کبھی سروکار رکھا ہے. بھلا جو شخص خود کبھی جھوٹ نہ بولتا ہو. وہ خدائے قدوس پر کیونکر جھوٹ بول سکتا ہے؟ اور تم نے یہ بھی مانا ہے کہ اُس کے پیروُ اکثر نادار اور کمزور ہیں اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ تمام انبیاء کے پیروُ ابتدا میں اکثر غریب اور ادنیٰ درجہ کے لوگ ہی ہوا کرتے ہیں اور تم یہ بھی بیان کر چکے ہو کہ یوماً فیوماً اُس کا مذہب ترقی کر رہا ہے اور یہی اس کی صداقت وسچائی کی دلیل ہے. تم نے ابھی کہا ہے کہ وہ تقویٰ، نماز اور عفاف کی تعلیم دیتا ہے اگر یہ سب کچھ جو تم نے بیان کیا ہے سچ ہے تو یاد رکھو اُس جگہ تک جہاں میرے قدم ہیں اُس کا قبضہ ہو جائے گا. مجھ کو بھی یہ خیال تھا کہ عنقریب ایک پیغمبر مبعوث ہونے والا ہے لیکن یہ خیال نہیں تھا کہ وہ عرب میں پیدا ہوگا. اگر میرے لیے ممکن ہوتا اور میں وہاں تک جا سکتا تو اُس کے قدم پکڑتا اور اطاعت کرتا.

اِس کے بعد قیصر روم نے حکم دیا کہ یہ نامۂ رسول اللہ ﷺ بلند آواز سے دربار میں پڑھ کر سنایا جائے. چنانچہ بحکم قیصر پڑھا گیا جس کا مضمون یہ تھا.

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف سے جو اللہ کا بندہ اور اُس کا رسول ہے.

یہ خط ہرقل کے نام ہے جو روم کا رئیس اعظم ہے.

اُسے سلامتی ہو جو ہدایت کا پیرو ہے. اُس کے بعد میں تمہیں اسلام کی دعوت دیتا ہوں. اسلام لا تو سلامت رہے گا. خدا تجھے دُگنا اجر دے گا. اور اگر تو نہ مانا اور اسلام قبول نہ کیا تو اہل ملک کا گناہ بھی تیرے اوپر ہوگا.

اے اہل کتاب ایک ایسی بات کی طرف آؤ جو ہم میں اور تم میں مشترک ہے. وہ یہ

کہ خدا کے سوا کسی کو نہ پوجیں اور ہم میں سے کوئی خدا کے سوا کسی کو خدا نہ بنائے اور تم نہیں مانتے تو تم گواہ رہو کہ ہم ماننے والے ہیں۔"

ابوسفیان کے ساتھ قیصر کی جو گفتگو ہوئی تھی اُس سے تمام درباری امرا اور بطارقہ سخت ناراض ہو چکے تھے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خط مبارک کو سن کر وہ اور بھی برہم ہوئے اور غصہ سے دل ہی دل میں پیچ و تاب کھانے لگے۔ قیصر روم اُن کے چہروں کو دیکھ کر اُن کی قلبی کیفیتوں کا اندازہ لگاتا گیا اور دربار کو برخواست کرنے کا حکم دے دیا۔ قیصر روم گو بہت مقتدر اور ایک ذیشان انسان تھا مگر زمانہ کے حالات نے بطارقہ اور پوپوں کا اثر تمام یورپ پر مستولی کر رکھا تھا۔ قیصر جانتا تھا کہ اگر میں نے اُن لوگوں کی خلاف ذرہ بھر بھی قدم اٹھایا تو یہ میری جان کے دشمن ہو جائیں گے اور اُن سے عزت بچانا مشکل ہو جائے گا۔ نامۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پڑھ کر اور سن کر اُس کے قلب میں نورِ اسلام کی روشنی تو پیدا ہوئی لیکن تاج وتخت کے ہاتھ سے نکل جانے کے بھیانک تصور نے اُس کو ہوس کی تاریکی میں گم کر دیا۔

ایسا ہی ایک فرمان آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شہنشاہِ ایران خسرو پرویز کو لکھا اور حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ کو دے کر روانہ فرمایا۔ خسرو پرویز کی جلالت و دبدبہ اور پندارِ حکومت اُس زمانہ میں ایک مسلم چیز تھی اور وہ اپنے وقت کا ایک مہتم بالشان بادشاہ تھا۔ پایۂ تخت اُس کا مدائن تھا۔ جس میں خزائن و دفائن کی کوئی حد نہ تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایلچی سے نامۂ نبوت اُس نے لیا اور پڑھا۔ چونکہ اُس کے دربار کی عظمت اور سطوت اپنے زمانہ میں یکتائی کا رنگ رکھتی تھی۔ اِس لیے عجم میں یہ دستور ہو گیا تھا کہ سلاطین کو جو خطوط و مکاتیب لکھے جاتے تھے اُن میں ادباً پہلے بادشاہ کا نام ہوتا تھا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے طریق پر پہلے اپنا نام لکھا تھا۔ خسرو پرویز نے اُس کو اپنی توہین وتوقیر پر محمول کیا اور متکبرانہ غیظ و غضب میں آ کر یہ کہا کہ مجھ کو اِس طرح لکھتا ہے اور نامۂ مبارک کو پھاڑ کر پرزے پرزے کر دیا جس کا مضمون یہ تھا۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

محمد پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کسریٰ رئیس فارس کے نام۔

سلام ہے اُس پر جو ہدایت کا پیرو ہو اور خدا اور اُس کے رسول پر ایمان لائے اور یہ گواہی دے کہ خدا ایک ہے اور یہ کہ خدا نے مجھ کو تمام کائنات کا پیغمبر مبعوث فرما کر بھیجا ہے۔ تاکہ میں ہر زندہ شخص کو خدا کا خوف دلاؤں۔ اسلام قبول کر، تو سلامت رہے گا۔ ورنہ تمام مجوسیوں کا وبال تیری گردن پر ہو گا۔"

اِس کے بعد خسرو پرویز نے یہ نامۂ نبوت پھاڑ کر پھینک دیا۔ بازان گورنرِ یمن کے نام حکم صادر کیا کہ تم فوراً حجاز سے اُس مدعیِٔ نبوت کو گرفتار کر کے میرے دربار میں حاضر کرو۔ جس نے مجھے اپنی نبوت پر ایمان لانے کی دعوت دی ہے چنانچہ بازان نے فرمانِ خسروی کی تعمیل میں کاخرخسرہ اور بابویہ نامی دو

اشخاص کو دربارِ نبوت میں مدینہ بھیجا تا کہ وہ آپ کو گرفتار کر کے خسرو پرویز کے حضور میں پیش کر دیں. یہ دونوں شخص پیغام لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا کہ آپ کو شہنشاہِ خسرو پرویز نے مدائن بلا بھیجا ہے. اگر اِس حکم کی تعمیل نہ کرو گے تو وہ تم کو اور تمہارے ملک کو برباد کر دے گا. حضور ﷺ نے فرمایا کہ آج رات خسرو پرویز اپنے بیٹے شیرؔویہ کے ہاتھ سے مارا گیا ہے. تم کس خسرو پرویز کا یہ تحکمانہ پیغام دے رہے ہو؟ تم واپس جاؤ اور اُس کو کہدو کہ اسلام کی روشنی اور حکومت کسریٰ کے پایۂ تخت تک پہنچ جائے گی. چنانچہ وہ سخت حیران ہوئے اور واپس چلے گئے.

حضور ﷺ کا تیسرا مکتوب شاہِ مصر کے نام تھا جو حضرت حاطب ابن ابی بلتعہؓ لے کر گئے اور آپ نے شاہِ مقوقش والیٔ مصر کے سامنے پیش فرمایا جس نے بڑی دلچسپی اور توجہ سے پڑھا اور بہت متاثر ہوا اور اُس کے جواب میں گزارش کی کہ:

"محمد ﷺ بن عبداللہ کے نام مقوقش رئیس قبط کی طرف سے

سلام علیک کے بعد میں نے آپ کا مکتوبِ گرامی پڑھا اور اُس کا مضمون و مطلب سمجھا. مجھے اتنا تو معلوم تھا کہ عنقریب ایک پیغمبر مبعوث ہونے والے ہیں، مگر خیال تھا کہ وہ شام میں ظہور کریں گے. میں نے آپ کے قاصد کی عزت کی اور دو لڑکیاں بھیجتا ہوں جن کی مصر کی قوم قبطیوں میں بڑی عزت کی جاتی ہے اور ساتھ ہی میں آپ کے لیے کچھ کپڑا اور سواری کے لیے ایک خچر بھی بھیج رہا ہوں."

شاہِ مصر نے جو دو لڑکیاں خدمتِ اقدس میں بھیجی تھیں اُن میں سے ایک حضرت ماریہ قبطیہؓ تھیں جو حرم نبوی ﷺ میں داخل ہوئیں اور دوسری سیرینؓ تھیں جن کا نکاح حضرت حسانؓ نعت خوانِ رسول اللہ ﷺ سے ہوا. خچر آپ کی سواری میں آیا اور دُلدُل کے نام سے مشہور ہوا. غزوۂ حُنین میں آپ اُسی پر سوار تھے.

تبلیغی سلسلہ میں محبوبِ خدا محمد رسول اللہ ﷺ کا چوتھا مکتوب مبارک نجاشی بادشاہ حبش کے نام تھا. شاہِ نجاشی نے اُس کو نہایت قدر و احترام سے وصول کیا اور پڑھا. جس کے جواب میں یوں عرض پرداز ہوا کہ میں نے آپ کی دعوت قبول کی اور میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ خدا کے سچے پیغمبر ہیں. اُس زمانہ میں حضرت جعفر طیارؓ بھی حبش ہی میں موجود تھے. نجاشی بادشاہ، نامۂ رسول اللہ ﷺ پڑھ کر حضرت جعفر طیارؓ کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہو گیا اور اُس نے اپنے بیٹے کو ساٹھ مصاحبوں کے ساتھ دربارِ رسالت میں حاضری کے لیے بھیجا، مگر قدرتِ خداوندی بادِ مخالف کے تھپیڑوں سے جہاز سمندر میں غرق ہو گیا. حبش میں بہت سے مسلمان موجود تھے جو ہجرت کر کے گئے ہوئے تھے. اُنہی میں رئیس اعظم قریش ابوسفیان کی صاحبزادی اُمِ حبیبہؓ بھی تھیں. چونکہ اُن کے شوہر کا انتقال ہو چکا تھا. اس لیے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کو لکھا کہ آپ اُم حبیبہؓ کو شادی کا پیغام پہنچا کر میرے پاس روانہ کر دیجئے. چنانچہ نجاشی نے نامۂ مبارک موصول ہونے پر حضرت خالد بن العاصؓ کو اِس خدمت پر مامور کیا. اُنہوں نے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایجاب وقبول کے فرائض سرانجام دیئے اور نجاشی نے اپنی طرف سے مہر ادا کیا جو چار سو اشرفیوں پر مشتمل تھا.

تکمیلِ نکاح کے بعد حضرت اُم حبیبہؓ جہاز میں سوار ہو گئیں. حضور صلی اللہ علیہ وسلم اِس دوران میں خیبر تشریف لے جا چکے تھے. آپ تشریف لائیں اور حرم سرائے نبوت میں قیام پذیر ہو گئیں. حضور صلی اللہ علیہ وسلم اکثر دفعہ حضرت اُم حبیبہ سے نجاشی کے حالات دریافت فرمایا کرتے تھے.

سرکارِ دوعالَم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پانچواں دعوت نامہ ہوذہ بن علی رئیس یمامہ کو پہنچا جس میں وہی توحید ورسالت پیش کی گئی تھی. رئیس یمامہ نے حضور کے مکتوب گرامی کے جواب میں لکھا کہ آپ نے جو باتیں تحریر فرمائی ہیں وہ بہت اچھی ہیں لیکن آپ اگر مجھے پانے والی حکومت میں شریک فرمائیں اور اُس سے کچھ حصہ دینے پر آمادہ ہوں تو میں اسلام قبول کرنے کو تیار ہوں. آپ نے یہ بے ہودہ اور لغو سا جواب سن کر فرمایا کہ اِس طرح مانگنے والے کو اگر ایک ٹکڑہ زمین بھی میرے پاس ہو تو میں اُس میں بھی، کسی کو بھی، شریک نہ کروں.

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے چھٹا تبلیغ نامہ حضرت شجاعؓ بن وہب الاسدیؓ کے ہاتھ رئیس حدودِ شام حارث غسانی کو روانہ فرمایا جو ایک جلیل القدر امیر تھا. گو اُس کی مختصر سی سلطنت اتنی خود مختار نہ تھی اور رومیوں کا باجگزار تھا تاہم حدودِ شام میں اطراف کے عربوں پر اُسی کی فرمان روائی تھی اور وہ اپنی حدود میں پوری آزادی کا مالک تھا. حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوت نامے کو پڑھ کر نہایت سیخ پا ہوا اور غضب ناک ہو کر اپنی افواج کو مدینہ منورہ پر فوراً حملہ کا حکم دے دیا. یہ اطلاع کسی سبب سے مدینہ طیبہ میں بھی پہنچ گئی اور اُس کے حملہ کا اندیشہ محسوس ہونے لگا اور مسلمان اُس کے حملہ کا شور سن کر ہر وقت انتظار میں رہنے لگے.

مگر حکمتِ الٰہی ہے کہ جہاں حارث غسانی کے حملہ کا خطرہ لگ رہا تھا وہاں ملوک مناوزہ جو حیرہ کے فرماں روا تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خط پڑھتے ہی مشرف باسلام ہو گئے اور باذان جو یمن کا گورنر تھا اس نے بدیں وجہ اسلام قبول کر لیا کہ خسرو پرویز کے متعلق جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا. وہ سو فیصد ہی صحیح نکلا اور یہی آپ کی صداقت کی دلیل ہے. پھر باذان کا ایمان لانا تنہا نہ تھا، بلکہ اُس کے ساتھ بڑے بڑے عجمی عمائد وشرفاء بھی مشرف بہ اسلام ہو گئے. اُنہی دنوں قریش کے دو بڑے سردار بھی نورِ اسلام سے منور ہوئے جن میں سے ایک خالد بن ولیدؓ اور دوسرے عمرو بن العاصؓ تھے. دونوں خاندانی رئیس اور رئیس زادے تھے. جنہوں نے اسلام لانے کے بعد وہ نمایاں خدمات انجام دیں جو تاریخ میں ہمیشہ اُن کی الوالعزمی اور بلند ہمتی پر گواہ رہیں گی. یعنی خالد بن ولیدؓ نے قیصر روم کا ملک فتح کیا اور عمر بن العاصؓ

فاتح مصر کہلائے۔ اسلامی تاریخ کا جاننے والا ہر طالب علم جانتا ہے کہ فنِ سپاہ گری اور قیادت خالد کا ایک ذاتی جوہر تھا اور تدبر و سیاست میں عمرو بن العاصؓ یگانہ تھے۔ اُن دونوں کا اسلام لانا تھا کہ قریش میں ہلچل مچ گئی اور اُنہوں نے یقین کر لیا کہ ہمارے کفر و شرک کے عقیدے کچھ دنوں کے مہمان ہیں اور ہماری تلواریں اب زیادہ دیر تک اسلام کے خلاف نہیں چمک سکتیں۔ بلکہ جو لوگ ظہورِ نبوت سے پیشتر بت پرستی سے متنفر ہو کر دینِ ابراہیمی اختیار کر چکے تھے اُن میں سے اکثر نے ابتدا ہی میں اسلام قبول کر لیا جن میں سے قبیلہ اوس اور قبیلہ دوس خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اسی قبیلہ دوس کا ایک مشہور شاعر جس کو اہل قبیلہ نے ہزار بار روکا، جس کا نام طفیل بن عمر دوسی تھا، آخر مسلمان ہو ہی گیا۔ ضماد بن ثعلبہ جو ایک دوسرے قبیلہ سے متعلق تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پرانے دوست تھے، یہ سن کر کہ آپ کو نعوذ باللہ جنون ہو گیا ہے علاج کے لیے حاضر ہوئے، کیونکہ اُن کو علاج معالجہ میں کافی مہارت تھی۔ آپ نے اُن کے سامنے توحید کے متعلق چند جملے تلاوت فرمائے۔ ضماد بن ثعلبہ سنتے ہی مسحور ہو گیا اور عرض کرنے لگا کہ یہ نہ جادوگروں اور نہ کاہنوں کا کلام ہے۔ یہ تو سمندر کی تہ تک اُتر جانے والی بات ہے اور مع اپنے قبیلہ کے مسلمان ہو گیا۔ ایسے ہی حضرت ابوذر غفاریؓ اور اُن کا قبیلہ اور قبیلہ اوس و خزرج کے بے شمار لوگ ایمان لے آئے جو گھروں سے تحقیق حال کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے۔

غزوہ احزاب تبلیغِ اسلام کے خلاف ایک وہ خوف ناک جنگ ہے، جس میں مسلمانوں کے لیے تو گونہ خدشات پیدا ہو ہی چکے تھے، مگر اس کے نتیجے نے کفارِ قریش کی کمر توڑ دی اور جو قبائل قریش کے خوف سے مرعوب ہو کر اسلام قبول کرنے میں متامل تھے، جنگِ احزاب کے بعد اُنہوں نے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ میں خود وفد بھیجنے شروع کر دیئے۔ چنانچہ سب سے پہلا وفد قریش کے رعب سے نکل کر جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا وہ چار سو افراد پر مشتمل قبیلہ مزینہ کے لوگ تھے۔ طبقاتِ ابن سعد میں اُس کی پوری تشریح یوں موجود ہے کہ یہ سارے کا سارا قبیلہ مسلمان ہو گیا تھا۔ اسی طرح قبیلہ اشجع کا ایک وفد حاضر حضور ہوا جس کے تین سو افراد بارگاہِ نبوت میں حاضر ہو کر پہلے معاہدہ مصالحت مکمل کرتے ہیں اور کافرانہ رنگ میں ہی تکمیل معاہدہ کر کے واپس ہوتے ہیں مگر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ صحبت کی یہ اعجاز فرمائی تھی کہ وطن مالوف تک پہنچتے پہنچتے ہی مسلمان ہو گئے۔ قبیلہ جہنیہ کے لوگ پورے ایک ہزار کی تعداد میں بصورتِ وفد حاضر دربار ہوئے، اسلام قبول کیا اور ہمیشہ کے لیے غزواتِ اسلامیہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب رہے۔ پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے کہ صلح حدیبیہ نے اشاعتِ اسلام کی رفتار کو تیز تر کر دیا اور جس کثرت سے اِس کے بعد اسلام پھیلا، اُس سے پہلے اِس قدر اُس کا ظہور کبھی نہ ہوا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ صلح حدیبیہ کے بعد مکہ اور مدینہ میں اعلانیہ آمد و رفت شروع ہو گئی اور میل جول پیدا ہونے سے کفار کو مسلمانوں کے ساتھ آزادانہ ملنے جلنے اور اُن کے اخلاق و عمل کی پاکیزگیوں کے مشاہدہ کرنے کا موقع ملا۔ مذہبی

تعصب کسی حد تک کم ہو چکا تھا اور اُن کے قلوبِ قاسیہ بھی نورِ نبوت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے تھے۔

اِس سے اندازہ لگتا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ کرنے کے ارادہ پر مدینہ منورہ سے نکلے ہیں تو آپ کے ساتھ صرف تیرہ سو اصحاب تھے اور اِس کے بعد دو برس کے اندر اندر فتح مکہ میں دس ہزار جان نثارانِ اسلام ہمرکاب نظر آتے ہیں. عمر بن سلمہ رضی اللہ عنہ کی روایت صحیح بخاری میں مرقوم ہے کہ عام عرب، قریش مکہ کے اسلام کا منتظر تھا اور لوگ یہ نظریہ قائم کیے ہوئے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اگر اُن کی قوم اللہ کا رسول مان گئی تو وہ بلاشبہ سچے پیغمبر ہیں. چنانچہ جب مکہ فتح ہو گیا اور ہر قبیلہ نے اسلام کی طرف پیش قدمی کی، تو یہ امر واضح ہو گیا کہ عرب کے اندر فروغِ اسلام میں جو دیر لگی وہ قومی و خاندانی مخالفتوں کے سبب تھی. اِس پتھر کے ہٹتے ہی حق کا آگے بڑھنا یقینی ہو گیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد منظم طور پر مبلغینِ اسلام بیرون جات میں روانہ فرمائے، جن کے ذریعے یمن، عدن، ذوالکلاع، بحرین اور حضر موت میں اسلام پھیلا مگر بعض مقامات پر مسلمان خود بخود ہی فریضہ تبلیغ کی ادائیگی کو اپنا حق سمجھ کر انجام دیتے رہتے، جن کی انفرادی مساعی سے بھی اشاعتِ اسلام میں کافی ترقی ہوئی اور عرب کے ہر کونے میں نورِ اسلام کی شعاعیں جگمگانے لگیں. 8 ہجری میں اسلام اگر ایک طرف سے عراق اور شام کی حدود پار کر چکا تھا تو دوسری جانب یمامہ و عمان تک اُس کی وسعت پاؤں پھیلا چکی تھی. حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایرانی امراء کے لیے 10 ہجری میں وبر بن یحنیس کو حکم دیا کہ وہ اُن میں تبلیغِ اسلام کریں. چنانچہ اِس کی سعی اتنی کامیاب ہوئی کہ فیروز دیلمی، مرکبود اور وہب رضی اللہ عنہ بن منبہ سب کے سب بمع اپنے اعزا و اقارب کے مسلمان ہو گئے اور تمام مسلمانوں سے سب سے پہلے جن بزرگوں نے قرآن حفظ کیا. وہ یہی دو بزرگ وہب بن منبہ اور مرکبود رضی اللہ عنہ تھے. اسلام کی نورانیت نے بھی عجیب عجیب رنگ میں کام کیا ہے. بحرین کا ایک مختصر سا قافلہ تجارت کے لیے شام کو جاتا ہوا راستہ میں مدینہ منورہ ٹھہرتا ہے. اُن میں سب سے بااثر اور مشہور قبائل تمیم، بکر بن وائل اور عبدالقیس کے افراد تھے. مؤخر الذکر قبیلے کا ایک اولوالعزم فرزند منشذ بن حبان تھا. حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُن سب کے پاس خود تشریف لے گئے اور دعوتِ اسلام دی، جس پر یہ سارے افراد اِسی وقت مسلمان ہو گئے اور اُن کے قبائل نے بھی فوراً اسلام قبول کر لیا. اِس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علا حضرمی رضی اللہ عنہ کو بحرین میں تبلیغِ اسلام کی خدمت پر مامور فرمایا اور اُن کی دعوت پر منذر رضی اللہ عنہ بن ساوی بھی مسلمان ہو گئے. جو حکومتِ ایران کی طرف سے اِس علاقہ کے گورنر تھے. اِسی صوبہ میں ایک مشہور جگہ ہجر ہے جہاں والیٔ ایران کی جانب سے ایک شخص بخت نامی حکومت کرتا تھا. سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کے نام بھی دعوت نامہ ارسال فرمایا اور وہ اُس کو پڑھتے ہی شرفِ اسلام سے مشرف ہو گیا. یہی حال حدودِ شام میں فردہ بن عمر کا ہوا جس کو معان میں سلطانِ روم کی طرف سے گورنری کا عہدہ حاصل تھا. توفیقِ ربانی سے نورِ اسلام اُس کے قلب میں خود بخود چمکا اور تعلیماتِ اسلامی سے واقفیت پیدا کر کے یہ خود بخود مسلمان ہو گیا. رومیوں کو اُس کے

مشرف باسلام ہونے کی جب اطلاع پہنچی تو سخت برہم ہوئے اور اُس کو واپس بلا کر پھانسی دے دی۔
مؤرخین نے لکھا ہے کہ جس وقت یہ رسول اللہ ﷺ کا عاشق پھانسی پر چڑھا تھا، اُس وقت بھی اُس کی زبان پر حمدِ خدا جاری تھی۔ ایسے ہی سرکار دو عالم ﷺ کے فرامین و دعوت نامے دیگر علاقہ جات میں بھی پہنچے اور شام و عرب کے درمیانی آباد قبائل مشرف باسلام ہوتے چلے گئے۔ نجران کا علاقہ جو اُس وقت عیسائیت کا مرکز تھا بھی اُس برکت سے محروم نہ رہا اور حضور ﷺ کے دعوت نامے پڑھ کر وہاں کے گرجا کا مسیحی محافظ مع مذہبی ساٹھ اماموں کے مدینہ منورہ میں آئے اور مسجد نبوی میں قیام پذیر ہوئے اور وہیں اُنہوں نے مشرق کی جانب منہ کر کے اپنی مذہبی عبادت ادا کی اس کے بعد کچھ حضور ﷺ سے مناظرہ کیا پھر مباہلہ پر تیار ہوئے مگر حوصلہ نہ پڑا اور سالانہ خراج دیتے رہنے کی شرط پر صلح کر کے واپس ہو گئے۔ 10 ہجری میں حضور ﷺ نے حضرت خالد ؓ کو وہاں بھیجا جن کی تین دن کی تبلیغ سے قبیلہ بنو حارث جو ایک مشرک قبیلہ تھا، اسلام لے آیا اور حضرت خالدؓ چند یوم قیام کر کے واپس آ گئے۔
الغرض وہ قبائلِ عرب و شام جو مکہ والوں کے فیصلہ کا انتظار کر رہے تھے، فتح مکہ و خیبر کے بعد قریش و یہود کی طاقتیں پاش پاش ہوتے دیکھ کر سمجھ گئے کہ اب نہ سرکشی کام دیتی ہے اور نہ انتظار کا یارا ہے لہٰذا سفارتوں کے ذریعے اس مسئلے کو حل کیا جائے۔ کیونکہ وہ یہ بھی جان چکے تھے کہ بہت دیر انتظار کر کے بھی اسلام اختیار کرنا ہی ہوگا، ہم اسلام لائیں تو ہمارے ہی لیے بہتر ہے اور اگر نہ بھی لائیں اور ہمیں مجبور بھی نہ کیا جائے تو بھی زیرِ اقتدار تو آنا ہی پڑے گا۔ چنانچہ ہر گوشۂ عرب سے سفارتیں آنا شروع ہو گئیں۔ چند سفارتوں کے سوا جو حضور سے معاہدہ کر کے واپس گئیں باقی سب نورِ ایمان سے مستفیض ہوئیں۔ بنو تمیم کے قبیلے کی سفارت کا تذکرہ ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ جو بڑی شان و شوکت کے ساتھ آئی اور عربی فخر و غرور کے ساتھ دربارِ نبوت میں پہنچی۔ بڑے بڑے خطیب و شعراء جو دربارِ ایران سے انعامیہ خلعتیں حاصل کر چکے تھے اس میں شامل تھے۔ انہوں نے جو حضور ﷺ سے خطابت و شاعری میں نہایت رعب و داب اور شکوہ و جلالت سے مناظرہ کیا لیکن بالآخر اعترافِ عجز کے ساتھ اسلام قبول کر گئے۔
اِن مختصر واقعات پر ایک ہی طائرانہ نظر واضح کر دیتی ہے کہ عرب کی فطرت وہ نہ تھی جس پر کوئی ترغیب و ترہیب اثر انداز ہو سکتی۔ وہ ہر معقول بات کا جواب بھی کلام سے نہیں بلکہ تلوار سے دیتے تھے۔ اگر اسلامی تعلیم کی سادگی اور سچائی حضور ﷺ کی پُر انوار زندگی کی کشش اور تائیدِ ربِ قدیر نہ ہوتی تو ایک قلیل مدت میں اسلام تمام عرب پر کیونکر چھا جاتا اور بڑے بڑے فرعونوں کے سر اُس کے سامنے کس طرح جھک جاتے؟ یہی وہ چیز ہے کہ مخالفین بھی پکار اٹھتے ہیں کہ اشاعت اسلام تلوار کی رہین منت نہیں۔ والسّلام

ہجرت اور اُس کی حقیقت

﴿قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ؕ وَاَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ ؕ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾

”اے میرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم فرمادیجئے کہ اے میرے مومن بندو تم اپنے رب سے ڈرتے رہو.
وہ لوگ جو اِس دنیا میں نیکی کرتے ہیں، اُن کے لیے آرام ہے اور اللہ کی زمین
بہت کشادہ ہے .صابروں کو بے شمار اجر ملے گا۔“ [الزمر ۳۹:۱۰]

اِس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ مومن جو کفار کے عذابوں کو مشقت سے برداشت کریں اور دوسرے ملکوں میں ہجرت کر جائیں. جن کی جانیں اُن کے اپنے وطن میں بوجھ ہو گئی ہیں تو خدا کی زمین وسیع و کشادہ ہے اور صبر کرنے والوں کے لیے بے حساب اجر ہے.

ہجرت کی علت

انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا سبب ہر زمانہ میں یہ ہوا ہے کہ وہ خدا کی ناشناس مخلوق کو خدا کے حضور وتصور کی ایسی صحیح راہنمائی فرمائیں جس سے خالق و مخلوق کا قطع شدہ رشتہ از سرِ نو قائم ہو جائے. یہ راہنمائی گو نہایت پاکیزگیِ اخلاق اور سنجیدگیِ مذاق، رأفت و رحمت اور محبت و موانست سے ہوا کرتی ہے مگر خدا کی آواز سے ناآشنا کان اور اس کے نظارے سے نابینا چشمی نے اس راہنمائی کو اپنی آبائی اجدادی مذہبیت اور اپنی من گھڑت روحانیت کے منافی خیال کر کے ہمیشہ مخالفت پر آمادہ ہوئے اور نبی کی تعلیم کو ہر لحظ انھوں نے اپنی ذاتی شہرت و قابلیت کے لیے مضر و مہلک تصور کیا. جس کا نتیجہ یہ رہا کہ اس دعوتِ حق کے جواب میں ہر طرف سے تلوار کی جھنکاریں سنائی دیتی رہیں اور یہ قاعدہ ہے کہ انسان جب حق و باطل، نور و ظلمت اور ایمان و کفر کے مجادلہ میں گھر جائے اور حق کے مقابلہ میں اُس کی بطالت کوئی مدلل جواب نہ پیش کر سکے، نور کی ضیا پاشی میں اُس کی ظلمت بھاگتی ہوئی نظر آئے اور ایمان کے

سامنے اُس کا کفر صداقت کے دلائل سے عاری ہو جائے تو پھر وہ کھسیانی بلی کی طرح کھمبا نوچنے کی صورت اختیار کرنے کے لیے تلوار کی مدد طلب کرتا ہے اور پھر ایسے ماحول جس میں اُس کی تلوار کو روک بھی کوئی نہ سکے، جس میں نہ کوئی قانون ہو نہ ضابطہ، بے آئینی کا دور دورہ، جس کی لاٹھی اُس کی بھینس کا قانون، خود کسی کے دس آدمیوں کو بھی قتل کر دیں تو پرواہ نہیں، مگر دوسرے کی محض زبان سے ہی اپنی مرضی کے خلاف ایک کلمہ بھی سنیں تو گوارا نہیں اور اپنے کسی ایک فرد کی نکسیر بھی پھوٹے تو قیامت برپا کر لیں. چوری، ڈکیتی، جھوٹ، فریب، قتل، زنا، بلوہ، فساد، مار پیٹ، قمار بازی، قتل اولاد، جس قوم میں جرم نہ ہو. بلکہ یہی جرائم ہی فطرتِ ثانیہ بن گئے ہوں، اس کے اخلاق کا مظاہرہ تلوار سے نہ ہو تو اور اُس کے پاس رہ ہی کیا جاتا ہے. جس سے وہ دعوتِ حق پر کان دھرے اور آوازِ نبوت کو اپنا سکے. کسی عدالت و آئین کا نہ ہونا اور چاروں طرف سے تاریکی میں گر کر زندگی گزارنا، ایسے افراد کو بے ہودگی و بے راہ روی پر مجبور کر دیتا ہے اور یہی وجہ ہوتی ہے کہ یہ لوگ دل رکھنے کے باوجود فقاہت سے دور، آنکھیں رکھتے ہوئے معرفت سے معذور اور کان رکھتے ہوئے سماعت سے مجبور ہوتے ہیں.

یہی حالت اُس وقت بھی نظر آتی ہے. جب سرکارِ انبیاء محمد رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوتے ہیں اور تمام عرب ایک جہالت کدہ بنا ہوا ہے. تمام انسانوں پر ایک بے راہ روی اور بے آئینی کی تاریکی مسلّط ہے. نہ کوئی عدالت ہے نہ قانون' نہ کوئی اصول ہے نہ آئین' جرائم و ذمائم اُن کے جزِ وطبیعت بن گئے ہیں. گویا اُن کے نزدیک دنیا میں گناہ کی حیثیت ہی کوئی نہیں. اور ایک عرب پر ہی کیا موقوف تھا ایران و روم اور ہندوستان کی بھی (جو مہذب و متمدن سلطنتیں کہلاتی تھیں) یہی حالت تھی کہ نہ کوئی ضابطہ تھا نہ قانون، فرماں رواؤں اور امیروں کی زبان ہی تعزیراتِ ہند کا کام کرتی تھی.

روم میں ضروری آئین سازی و جمہوریت کی مشق کی گئی، لیکن برائے نام. جو آج وضع ہوا وہ کل منسوخ ہو گیا. امراء و روساء کی جماعت ہر زمانہ میں بااقتدار رہی اور اس نے کبھی بھی عام انسانی حقوق کے احترام کو ضروری نہ سمجھا. عورتوں، غلاموں اور زیر دستوں پر نہ صرف قہر کی بجلیاں ہی گرتی رہیں، بلکہ ان کا قتل، ان کی فروخت، ان پر ظلم، کبھی کوئی گناہ ہی نہیں خیال کیا گیا. مزارعین، صناعوں اور مزدوروں کے لیے قطعاً کوئی اصول نہ تھا. ان کے مالک و آقا اور ان کے گاؤں کے متمول لوگ ہی ان کے بادشاہ تھے. جہاں بیرونی تمام ممالک میں انسانیت اس بے چارگی میں مبتلا تھی وہاں ہندوستان کے اچھوتوں کی جان بھی برہمنوں کے ہاتھوں غیر انسانی سلوک سے ذبح ہو رہی تھی. عرب میں اسی بے آئینی و بے ضابطگی اور رعونت و خود پسندی کا اثر خود حضور ﷺ کی ذاتِ گرامی تک بھی پہنچنے سے نہ رکا اور اسی بے

ہودہ روش کے ماتحت سرکارِ دوعالم ﷺ پر بھی قہر کی بجلیاں گرائی گئیں اور آپ کو بھی قصابانہ مظالم اور جلادانہ سفاکی وشقاوت کا ہدف بنایا گیا۔ ہر قسم کی اذیتیں پہنچائی گئیں اور ہر نوع کے مظالم روا رکھے گئے۔ کوڑے کرکٹ پھینکے گئے۔ راہ میں کانٹے بچھائے گئے، پتھر مارے گئے اور سب وشتم کیا گیا۔ مذاق اڑائے اور آوازے کسے، لونڈوں سے کلوخ اندازی کرائی گئی اور ''دیوانہ'' مشہور کیا گیا۔ لفنگوں اور گستاخوں کی پارٹیاں ہر وقت تاک میں رہتیں اور بسا اوقات گھر سے نکلنا دوبھر کر دیتیں۔ ہر شخص خون کا پیاسا ہو کر آپ کے قتل کے منصوبے سوچ رہا تھا بلکہ حضور ﷺ کے علاوہ عام فرزندانِ توحید پر بھی اس قدر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا تھا کہ ہر ابن ابوجہل جان کا لاگو بنا ہوا تھا۔

ایسی حالت میں جب مظالم وشدائد کا سیلاب سر سے گزرنے لگا حق کی پر امن آواز تیغوں کی جھنکاروں میں ملا کر فنا کرنے کا فیصلہ ہو گیا اور صورتِ حالات نے انتہائی طور پر نازک صورت اختیار کر لی تو محافظِ اسلام نے مسلمانوں کو دارالامان مدینہ کی طرف رخ کرنے کا حکم بھیج دیا اور فرمایا: اے میرے محبوب! ایمان والوں کو کہہ وہ ان لوگوں سے درگذر کرتے ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ کے نعم وقم کی امید نہیں رکھتے فرماؤ کہ تم اپنے رب سے ڈرتے رہو۔ وہ لوگ جو اس دنیا میں نیکی کرتے ہیں۔ ان کے لیے سکھ ہے اور اللہ کی زمین کشادہ ہے اور صبر کرنے والوں کو بے شمار اجر دیا جائے گا۔ گویا مومنین کفار کی اذیتوں کو صبر سے برداشت کرتے ہوئے ہجرت کر جائیں۔

یہ حکم پہنچتے ہی حضور ﷺ نے تراسی فرزندانِ توحید کو ہجرت کا حکم فرمایا جن میں حضرت عثمانِ غنیؓ اور اُن کی اہلیہ محترمہ اور حضور نبی کریمؐ کی صاحبزادی بھی شامل تھیں لیکن خود حضور اقدس ﷺ جو اُن ستمگارانِ مکہ کے حقیقی ہدف تھے، اپنے لیے ہجرت کے متعلق حکمِ خدا کے ابھی منتظر تھے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ بقول معاندین اگر خدانخواستہ جان بچانے کے لیے کفار سے فرار مقصود ہوتا تو دیگر مہاجرینِ اسلام سے پہلے خود حضور ﷺ ہجرت کر کے اپنی جان بچاتے، مگر یہ نہیں ہوا۔ بلکہ تراسی فرزندانِ اسلام کو ہجرت کے لیے حکم سنانے اور بھیج دینے کے باوجود بھی حضور خود مکہ مکرمہ میں قیام پذیر رہے تا کہ مشیتِ ایزدی کے حکمِ ثانی کی تعمیل کی جائے تبلیغ وجہاد سے راہِ فرار اختیار کرنا نبوت کا شیوہ نہیں ہو سکتا کیونکہ اگر نبی اللہ ہی راہِ فرار اختیار کرے تو وہ تبلیغی مشکلات کی برداشت کا سبق کیونکر دے سکتا ہے۔ بھلا جو دنیا میں قوانینِ الٰہی کے نفوذ اور آئینِ الٰہی کے ماتحت نہ چلنے والی دنیا کو زیر وزبر کرنے کے لیے تشریف لائے۔ وہ جان بچانے اور بھاگنے کے لیے ہی آیا کرتا ہے؟ اُس کی ہستی تو وہ ہوتی ہے جس کی ذات، صفات، کلام، دین، دنیا، ہر شئے کا محافظ اس کا مبعوث فرمانے والا ہوتا ہے ﴿وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ کی ہزاروں تسلیاں اور ﴿اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ کی بے شمار طمانتیں ہر لحاظ سے اُس پر سایہ

فگن رہتی ہیں. وہ چلتا ہے تو رب العزت کے سائے میں، اور بولتا ہے تو اُس کے بلائے سے، اُس کی حرکات وسکنات، اُس کا قیام وسفر، اُس کا جہادو آباد، اُس کی سکونت وہجرت سب کچھ خدا کا ہوتا ہے. اُس کے قلبِ اطہر میں اسرار اور اُس کے سینۂ اقدس کے انوار اور اُس کے رُخِ انور کی تابانی، اُس کی حیاتِ جاودانی، سب کچھ اُسی کا ہوتا ہے. یہی وجہ ہے کہ مولا کریم نے اُس کی گفتگو کو اپنی گفتگو اور اُس کے ہاتھ کو اپنا ہاتھ اور اُس کی ذات کو اپنی رحمت فرما کر اُس کے وجودِ مقدس کو سرتاپا برہان اور اُس کا بال بال اپنی خدائی کا نشان بتایا ہے. لاتعداد خفیہ حفاظتی اسباب اور بے شمار ملائکہ مرتاب اس کی جلو میں چلتے ہیں. وہ میدانِ جنگ میں بھی اپنے خدا کی حفاظت پر اتنا ہی مطمئن ہوتا ہے جتنا گھر کی چاردیواری میں. وہ میدانِ بدر کو بھی اُسی مسرت سے دیکھتا ہے جس طرح غارِ حرا کو، وہ مکہ سے ہجرت کرتے ہوئے بھی ویسی ہی طمانیتِ قلب رکھتا ہے، جیسی مدینے پہنچ کر. یہی سبب ہے کہ ہجرت ایک مظلوم اُمت کو اُس کے مستقبل کی تسکین کا سبق ہے، نہ کہ نبی اللہ کے خوف و ہراس کا نقش. نبی تو صدائے حق کی وہ لاجب چٹان ہوتا ہے جس کو باطل ہلا نہیں سکتا اور جس میں زمین وآسمان کو تہ وبالا کرنے کی قوت اور اِس جہانِ آب وگِل کو درہم برہم کرنے کی مکمل طاقت ووسعت ہوتی ہے.

ہجرت کا حکم

پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اِن قوائے وتصرفات کے باوجود نبی پاک ﷺ کو ہجرت کا حکم کیوں ہوا؟ اِس کا جواب کسی گذشتہ بحث میں گزر چکا ہے کہ نبی دوعالم ﷺ کا ہر قول وفعل، خدا کا قول وفعل ہوتا ہے اور وہ دنیا میں اپنی نجات کے لیے مبعوث نہیں فرمایا جاتا، بلکہ اہلِ دنیا کو نجات کے طریق سمجھانے کے لیے آتا ہے. اُس کا تمام عمل اُس کی اپنی ذات کے لیے نہیں ہوتا، بلکہ دنیا کو اپنے مالک الملک کے وضع کردہ قالب میں ڈھالنے کے لیے مبعوث فرمایا جاتا ہے. اگر وہ پانی ہے تو خود بخود اس قالب میں ڈھل جائے گی اور اگر لوہا ہے تو اُسے یہ اپنے جلال کی آتشِ سوزاں میں ایسا پگھلائے گا کہ وہ سیال ہو کر اُس کے قالب میں ڈھل جائے. چونکہ نبی اللہ دنیا میں قانونِ الٰہی کا نافذ کرنے والا ہوتا ہے. اِس لیے اگر شریف النفس اور سلیم الفطرت انسان اُس کو نرمی اور محبت سے مان لیں تو اُس سے بڑھ کر مہربان کوئی نہ ہوگا اور اگر سرکش اور ضدی انسان اُس قانون سے بغاوت کرنے پر تل جائیں تو پھر اُس جیسا کوئی دوسرا سخت گیر بھی نہیں ہوسکتا. تاریخ شاہد ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے جو عفو وکرم کا نمونہ اپنی حیاتِ مقدسہ میں پیش فرمایا ہے اُس کی نظیر دنیا کے کسی بڑے سے بڑے مدعیِ اُمن وصلح کے ہاں نہیں مل سکتی. لیکن اِس کے ساتھ ہی جب قوت وطاقت کی ضرورت پڑی تو کم وبیش ستر جنگوں میں بہ نفسِ نفیس، شمشیر بکف شریک ہوئے یا اُن قدوسیوں کی جماعت کو روانہ فرمایا جو دنیا میں انسانیت کی معراجِ کبریٰ

کے مظہر اتم تھی۔ اُس کا حکم اطاعتِ الٰہی کے باب میں اپنے پرائے کے لیے یکساں ہوتا ہے۔ نہ وہ غیر پر ظلم روا رکھے اور نہ اپنوں کو رعائتیں دے۔ کیا تاریخ دان حضرات کو معلوم نہیں کہ کچھ لوگ جو اسلام کا اقرار کر چکے تھے اور کفارِ قریش کے خوف سے علانیہ اظہار نہ کرتے تھے، جب انہیں بہت ہی تنگ ہونا پڑا تو حکم ہوا کہ جو مسلمان غیر اسلامی ماحول کو بشرط استطاعت نہ بدلے یا فقدانِ استطاعت کی صورت میں وہاں سے ہجرت نہ کر جائے، یعنی اپنی متاعِ ایمانی کی حفاظت کے لیے وطن و دیگر محبوباتِ وطنیہ کو قربان نہ کر دے، اللہ تعالیٰ کے نزدیک اُس کے ایمان کی کوئی قدر و قیمت نہیں اور یہی حکمِ ہجرت کی علت تھی، جس نے ہر کمزور مسلمان پر راحت و رحمت اور امن و سلامتی کے بے شمار دروازے کھول دیئے تھے، تا کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کی گونج اور ایمان باللہ کی حفاظت کے لیے اگر فضا تنگ پائے تو وطنیت پرستی کے بت خانہ سے باہر ہو جائے کیونکہ ایک توحید پرست اور اسلام پسند انسان کے لیے ایمان کو خطرے میں ڈال کر، وطن کا راگ الاپنا، بالکل بعید از فہم چیز ہے۔

واقعۂ ہجرت

یہ واقعہ وہ ہے جو تمام اسلامی دنیا یا تاریخِ اسلام کا بنیادی پتھر ہے۔ جس کی یاد ہر سال کے اختتام و آغاز میں مخفی ہے۔ یہ دنیا کی تمام قومی یادگاروں کی طرح قوت کی کامرانیوں کی یادگار نہیں بلکہ کمزوری کی فتح مندیوں کی یادگار ہے۔ یہ طاقت اور حکومت کی یادگار نہیں بلکہ محکومی و بیچارگی کی یادگار ہے۔ یہ اسباب و وسائل کی فراوانیوں کی یادگار نہیں بلکہ بے سروسامانیوں میں کامیابیوں کی یادگار ہے۔ یہ فتحِ مکہؔ کی یادگار نہیں جسے دس ہزار تلواروں نے فتح کیا تھا بلکہ یہ فتح مدینہ کی یادگار ہے۔ جس کو ایک آوارہ غربت اور بے سروسامان ہستی کی روح (ہجرت) نے فتح کیا، مگر اس نے مدینہ کی غیر مسلح درویشانہ فتح کو فراموش کر دیا ہے حالانکہ تاریخ اسلام میں مذکورہ ساری فتح مندیاں اُسی ایک اوّلیں فتح کی برگ و شاخ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ظاہری فتح مندیوں کے اعلان کا وقت آیا تو اُس وقت سب سے پہلے اُسی معنوی فتح مندی کی یاد لوگوں کو دلائی گئی۔ ﴿ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ؕ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾ [۹:۴۰] واقعہ ہجرت ایک ہی واقعہ نہ تھا بلکہ بے شمار اعمال و وقائع کا مجموعہ تھا۔

اسلام کے ظہور کی تاریخ دراصل دو بڑے اور اصولی عہدوں میں منقسم ہے۔ ایک عہد مکہؔ معظمہ کی زندگی اور اعمال کا ہے دوسرا مدینہ منورہ کے قیام و اعمال کا۔ پہلا آنحضرت ﷺ کی بعثت سے شروع ہوتا ہے اور ہجرت پر ختم ہو جاتا ہے اِس کی ابتدا غارِ حرا کے اعتکاف سے اور انتہا غارِ ثور کے

انزِواد (کونے میں بیٹھنا) پر ہوتی ہے. دوسرا ہجرت سے شروع ہوکر حجۃ الوداع پر ختم ہو جاتا ہے. اس کی ابتدا مدینہ کی فتح سے ہوئی اور تکمیل مکہ کی فتح پر.

دنیا کی نظروں میں اسلام کے ظہور و اقبال کا اصلی دور دوسرا دور تھا کیونکہ اُسی دور میں اسلام کی پہلی غُربت ختم ہوئی اور ظاہری طاقت و حشمت کا سروسامان شروع ہوا. بدر کی جنگی فتح ہتھیاروں کی پہلی فتح تھی. مکہ کی فتح عرب کی فتح کا اعلانِ عام تھا. لیکن خود اسلام کی نظروں میں اس کی زندگی کا اصلی دور دوسرا نہیں پہلا تھا. وہ دیکھتا تھا کہ اس کی ساری قوتوں کی بنیادیں دوسرے میں نہیں پہلے دور میں استوار ہوئی ہیں. بلاشبہ بدر کے ہتھیاروں نے اپنی غیر مسخر طاقت کا دنیا میں اعلان کر دیا لیکن جو ہاتھ ان ہتھیاروں کے قبضوں پر جمے تھے، ان کی طاقتیں کس میدان میں تیار ہوئی تھیں؟ بلاشبہ مکہ کی فتح عرب کی فیصلہ کن فتح تھی لیکن اگر مدینہ کی فتح ظہور میں نہ آتی تو مکہ کی فتح کی راہ کیونکر کھلتی؟ یہ سچ ہے کہ مکہ ہتھیاروں سے فتح ہوا، لیکن مدینہ ہتھیاروں سے نہیں بلکہ ہجرت اور اس کے دور کے اعمال سے فتح ہوا تھا. پس دوسرے دور میں جسم کتنا ہی طاقتور ہو گیا ہو لیکن اس کی روح پہلے ہی دور میں ڈھونڈنی چاہیئے.

پہلا دور درخت تھا، دوسرا اُس کے برگ و بار تھے. پہلا دور بنیاد تھی، دوسرا استون و محراب تھا. پہلا نشوونما کا عہد تھا، دوسرا ظہور و انفجار کا، پہلا معنی و حقیقت تھا، دوسرا صورت و اظہار. پہلا روح تھا، دوسرا جسم. پہلے نے پیدا کیا، درست کیا اور مستعد کر دیا، دوسرے نے قدم اٹھایا، آگے بڑھا اور فتح و تسخیر کا اعلان کر دیا. دوسرے کا ظہور کتنا ہی شاندار ہو لیکن اولین بنیاد و استعداد کی عظمت پہلے ہی کو حاصل ہوتی ہے.

سنہ ہجری کی ابتداء

قومی زندگی کی بنیادی مقومات میں سے ایک نہایت اہم چیز سنہ اور تاریخ ہے. جو قوم اپنا قومی سنہ نہیں رکھتی، وہ گویا اپنی بنیاد کی ایک اینٹ نہیں رکھتی. قوم کا سنہ اُس کی پیدائش اور ظہور کی تاریخ ہوتا ہے. یہ اُس کی قومی زندگی کی روایات قائم رکھتا ہے اور صفحہ عالم پر اُس کے اقبال و عروج کا عنوان ثبت کر دیتا ہے. گویا یہ قومی زندگی کے ظہور و عروج کی ایک جاری و قائم یادگار ہے. ہر طرح کی یادگاریں مٹ جا سکتی ہیں لیکن یہ نہیں مٹ سکتی، کیونکہ سورج کے طلوع و غروب اور چاند کی غیر متغیر گردش سے اُس کا دامن بندھ جاتا ہے اور دنیا کی عمر کے ساتھ ساتھ اُس کی عمر بھی بڑھتی رہتی ہے. آج آگسٹس اور بکرماجیت، جلال الدین ملک شاہ اور اکبر اعظم کے نام اُن کے سنین کے ذریعہ سے زندہ ہیں اور ہمارا حافظہ اُن سے گردن نہیں موڑ سکتا.

نیز یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اسلام کے ظہور سے قبل دنیا کی متمدن اقوام میں متعدد سنہ جاری تھے. اُن میں سے زیادہ مشہور یہودی رومی، اور ایرانی سنین تھے. عرب جاہلیت کی اندرونی زندگی اِس قدر

متمدن نہیں تھی کہ حساب و کتاب کی کسی وسیع پیمانہ پر ضرورت ہوتی. اوقات و مواسم کی حفاظت اور یادداشت کے لیے ملک کا کوئی مشہور واقعہ لے لیتے اور اسی سے وقت کا اندازہ لگا لیتے. منجملہ سنین جاہلیت کے ایک ''عام الفیل'' تھا یعنی شاہ حبش کے حجاز پر حملہ آور ایک واقعہ، عرب کے حساب و کتاب میں، بطورِ سن کے مستعمل رہا. ظہورِ اسلام کے بعد یہ اہمیت خود عہدِ اسلام کے واقعات نے لے لی اور صحابہ کرام کا قاعدہ ہو گیا کہ عہدِ اسلامی کے واقعات میں سے کوئی ایک اہم واقعہ لے لیتے اور اُسی سے حساب لگا لیتے. ہجرتِ مدینہ کے بعد ہی سورۂ حج کی وہ آیت نازل ہوئی تھی جس میں قتال کی اجازت دی گئی تھی.

﴿ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ...... ﴾ [۳۹:۲۲] اِس لیے کچھ دنوں تک یہی واقعہ بطور ایک سنہ کے کام دیتا رہا. لوگ اِس کو اذن سے تعبیر کیا کرتے تھے اور یہ تعبیر وقت کے ایک خاص عدد کی طرح یادداشت میں کام دیا کرتی. اسی طرح سورۂ براۃ کے نزول کے بعد برأت کا بھی بول چال میں رواج رہا. عہدِ نبوی ﷺ کا آخری سنہ ''الوداع'' تھا. آنحضرت ﷺ کے آخری حج شریف کا واقعہ جو ''حجۃ الوداع'' کے نام سے مشہور ہو گیا تھا اور ہجرت کے دسویں سال پیش آیا تھا اور بعض روایات سے تو اسی قسم کے بے شمار سنوں کا پتہ چلتا ہے.

مثلاً سنة التمحيص، سنة التوفئه، سنة الزلزال، سنة الاستاسى. علامہ بیرونی نے آثار الباقیہ میں اسی طرح کے دس سنوں کا اور بھی ذکر کیا ہے.

الغرض آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد کچھ عرصہ تک یہی حالت جاری رہی لیکن جب حضرت عمرؓ کی خلافت کا عہد شروع ہوا تو ممالکِ مفتوحہ کی وسعت اور دفاترِ حکومت کے قیام سے حساب و کتاب کے معاملات زیادہ وسیع ہوئے اور ضرورت پیش آئی کہ سرکاری طور پر کوئی ایک سنہ قرار دے لیا جانا چاہیے. چنانچہ اس مسئلہ پر غور کیا گیا تو ''سنہ ہجری'' عمل میں لائے جانے کا فیصلہ ہوا. اس وقت تک واقعۂ ہجرت پر سولہ برس گزر چکے تھے.

احساسِ ضرورت اور مشورۂ صحابہ

''سنہ ہجری'' کا تقرر کیونکر عمل میں آیا؟ کیوں تمام صحابہ کرامؓ اور حضرت عمرؓ کا ذہن اِس طرف گیا کہ اسلامی سنہ کی ابتداء واقعۂ ہجرت سے کی جائے؟ یہ تاریخِ عالم کا ایک ضروری اور نتیجہ خیز مبحث ہے اور اس بارے میں متعدد روائتیں منقول ہیں، جن میں سے سب سے زیادہ مشہور روایت میمون بن مہران کی ہے، جس کو تمام مؤرخین نے نقل کیا ہے، اور خلاصہ اُس کا یہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک کاغذ حضرت عمرؓ کے سامنے پیش کیا گیا جس میں شعبان کا مہینہ درج تھا. حضرت عمرؓ نے دریافت فرمایا کہ اِس مندرج

شعبان سے کون سا شعبان مراد ہے؟ اِس سال کا یا آئندہ سال کا؟ پھر آپ نے سربرآوردہ صحابہ کرامؓ کو جمع فرمایا اور کہا کہ اب حکومتِ اسلامی کے مالی وسائل بہت زیادہ وسیع ہو گئے ہیں اور جو کچھ ہم تقسیم کرتے ہیں وہ ایک ہی وقت میں ختم نہیں ہو جاتا، اِس لیے ضروری ہے کہ مکّہ میں حساب و کتاب کے لیے کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ اوقات ٹھیک طور پر منضبط ہو سکیں. اِس پر بہت سے حاضرینِ دربار نے کہا کہ اِس معاملہ میں ایرانیوں سے مشورہ کرنا چاہیے کہ اُن کے ہاں اس کے طریقے کیا تھے؟ چنانچہ حضرت عمرؓ نے ہرمزانؔ کو بلایا اور اُس کے سامنے یہ مسئلہ رکھا. ہرمزانؔ نے جواب میں عرض کیا کہ ہمارے ہاں ایک حساب موجود ہے. جس کو ''ماہ روز'' کہتے ہیں. اسی ''ماہ روز'' کو عربی میں مُعَرَّب بنالیا جائے. پھر یہ سوال پیدا ہوا کہ اسلامی حکومت کی تاریخ کے لیے جو سنہ اختیار کیا جائے اُس کی ابتدا کب سے ہو؟ چنانچہ اس پر متفقہ طور سے فیصلہ ہو گیا کہ ہجرت کے برس سے کی جائے. چنانچہ حساب و کتاب اور دفتری کاروبار کے لیے ''سنہ ہجری'' قرار پایا. [از تاریخ کبیر ذہبی و تاریخ مصر مقریزی]

ایک دوسری روایت ابن حبان نے قرہ بنؔ خالد سے بھی نقل کی ہے، جس میں ایک دوسرے واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے پاس یمن سے ایک عامل آیا. اُس نے عرض کیا کہ لکھنے پڑھنے میں آپ لوگ تاریخ نہیں لکھتے کہ فلاں بات، فلاں سنہ، میں اور اُس سنہ کے فلاں مہینے میں ہوئی. اس پر حضرت عمرؓ اور لوگوں کو بھی اس کا خیال ہوا اور اِس کے متعلق ضروری ضروری امور پر غور کیا جانے لگا. پہلے سب نے ارادہ کیا کہ سنہ کا حساب حضور پر نور شافع یوم النشور ﷺ کے مبعوث ہونے کے وقت سے شروع کریں. پھر خیال ہوا کہ آپ کی وفات سے شروع کیا جائے، لیکن آخر میں یہ رائے قرار پائی کہ ''اسلامی سنہ'' کا تقرر ''ہجرت'' سے ہو.

اِن روایات کی مزید تشریح امام شعبیؒ کے بیانات و روایات سے ہوتی ہے، جو محبؔ طبری نے نقل کئے ہیں. یعنی ابو موسیٰ اشعریؓ نے حضرت عمر فاروقؓ کو لکھا کہ آپ کی جانب سے ہمارے نام خطوط آتے ہیں مگر اُن پر کوئی تاریخ درج نہیں ہوتی اور یہ وقت وہ تھا کہ حضرت عمرؓ نے حکومت کے مختلف دفاتر قائم کر دیئے تھے اور خراج کے اصول و قواعد طے پا گئے تھے، اِس لیے محسوس ہو رہا تھا کہ ضبطِ اوقات کے لیے ایک خاص تاریخ قرار پا جائے. پرانی تاریخیں موجود تھیں، لیکن وہ پسند نہیں کرتے تھے کہ انہیں اختیار کیا جائے. اب جو موسیٰ اشعریؓ نے لکھا تو وہ لکھنا، اُن کی مزید توجہ کا باعث بن گیا. حضرت عمرؓ نے صحابہ کو جمع کر کے مشورہ کیا. اِس مجلس شوریٰ میں سب کی رائے یہی قرار پائی کہ ہجرت کا واقعہ بنیاد ٹھہرا کر ہجری کی ابتدا کی جائے اور اختیار کرنے میں یہی پسندیدہ بھی ہے. [ریاض النضرہ]

ابو ہلال عسکری نے الاوائل میں اور مقریزی نے تاریخ میں، حضرت سعید بن المسیبؓ سے نقل کیا ہے کہ واقعہ ہجرت سے سنہ شروع کرنے کی رائے، حضرت علی علیہ السلام نے دی تھی. چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ جب حضرت عمرؓ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا کہ کس دن سے تاریخ کا حساب شروع کیا جائے؟ تو حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: اُس دن سے، جس دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کی اور مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ تشریف لائے.

یعقوبی نے بھی اسے منجملہ اُن امور کے قرار دیا ہے، جو حضرت علی علیہ السلام کی رائے سے انجام پائے. چنانچہ 16 ہجری کے واقعات میں لکھتا ہے کہ اُسی زمانہ میں حضرت عمرؓ نے ارادہ کیا کہ ضبط کتابت کے لیے ایک تاریخ قرار دے دی جائے. پہلے اُن کو خیال ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے شروع کریں. پھر خیال کیا کہ آپ کی بعثت کے واقعہ سے ابتدا کی جائے، لیکن حضرت علی علیہ السلام نے رائے دی کہ ”واقعہ ہجرت“ سے آغاز کرنا چاہیے.

قومی سنہ کی ضرورت کا کیوں احساس ہوا؟

یہاں دو باتیں نہایت غور طلب ہیں. ایک یہ کہ حضرت عمرؓ اور تمام صحابہؓ نے ”قومی سنہ“ کی ضرورت کو کیوں محسوس کیا؟ دوسرے یہ کہ اِس کی ابتدا واقعہ ہجرت سے کیوں قرار پائی؟ چنانچہ اِس کا جواب شعبیؔ کی روایت سے ملتا ہے کہ حضرت عمرؓ تاریخ کے تعیّن وتقرر کی ضرورت تو محسوس فرما رہے تھے لیکن یہ پسند نہیں فرماتے تھے کہ دوسری اقوام کی تاریخ اختیار کریں. پہلی روایت میں، جس میں ہرمزانؓ کو بلانے اور مشورہ کرنے کا ذکر ہے، یہ ہرمزانِ، خورستان (ایران) کا بادشاہ تھا اور حلقہ بگوش اسلام ہو کر مدینہ منورہ میں مقیم ہو گیا تھا اور حضرت عمرؓ کی مجالسِ شوریٰ میں اِس کا ذکر بار بار اور کثرت سے آتا ہے. [بلاذری وطبری وغیرہما]

البیرونی لکھتا ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے اُس سے مشورہ کیا، تو اُس نے نہ صرف ایرانیوں کا طریقہ ہی عرض کیا بلکہ رومیوں کے طریقہ کی بھی تشریح کی تھی. اُس وقت ایرانیوں کا مروّجہ اور آخری سنہ یزدگرد کا سنہ تھا اور رومیوں کا مشہور سنہ، سکندر کی پیدائش سے شروع ہوتا تھا. یہ معلوم کر کے بعض صحابہ کو خیال ہوا کہ اِنہی دونوں میں سے (ایرانیوں و رومیوں) کے کسی ایک کو اختیار کر لیا جائے. لیکن خود حضرت عمرؓ اور باقی مسلمانوں کی اکثریت اِس کے خلاف رہی اور متفق نہ ہوئے. اِس سے معلوم ہوا کہ ایرانیوں اور رومیوں کے سنین مجمع اصحابہ کرامؓ میں زیر بحث ضرور رہے اور بعضوں نے اُن کے اختیار کر لینے کا مشورہ بھی دیا لیکن عام رجحان اِس طرف تھا کہ نیا سنہ مقرر کرنا چاہیے.

مسئلہ ہجرت تزکیۂ نفس کی اساس ہے

اسلام کی تربیت اور بانیٔ اسلام ﷺ کی پرورش نے صحابہ کرامؓ کے دل و دماغ میں قومی شرف و خودداری کی وہ روح پھونک دی تھی، جو کسی میدان میں بھی اغیار کے طریقِ کار کو اپنانا گناہ سمجھتی تھی. اس کا ایک ہی سے لگاؤ اور ایک ہی سے جوڑ، ہر طرف سے اس کے منہ کو موڑے ہوئے تھا اور وہ ہر شئے کو اُس ایک آئینۂ انوارِ الٰہی میں دیکھنا چاہتی تھی. قومی زندگی کی بنیادیں جن اینٹوں پر استوار ہوتی ہیں اِن میں سے ایک ایک اینٹ کے لیے، من کل الوجوہ اُس کے اندر لگاؤ اور تمیز موجود تھی، اگرچہ وہ لفظوں اور تعبیروں میں انہیں بیان نہ کر سکے. چنانچہ حضرت عمرؓ نے جب اور تاریخ کی ضرورت کا احساس فرمایا تو اگرچہ متمدن اقوام کے سنین اُن کے سامنے رائج و مستعمل تھے، لیکن اُن کی نورِ نبوت میں بھیگی ہوئی طبیعت اُن کی جانب مائل نہ ہو سکی، اِس لیے کہ ایسا کرنا اُن کے لیے نہ صرف قومی شرف و خودداری کے خلاف تھا، بلکہ قومی زندگی کی بنیادی اینٹوں میں سے ایک اینٹ کھو دینے کے مترادف بھی تھا.

الغرض حقیقت پر نظر ڈالیے تو معلوم ہو جائے گا کہ اسلام کی تعلیم و تربیت نے مسلمانوں کے دماغوں کو جس سانچے میں ڈھال دیا تھا وہ ایسا سانچا تھا جس میں کوئی دوسرے درجے کا خیال ڈھل ہی نہیں سکتا تھا اور وہ سانچا صرف اول درجہ کے خیالات کے لیے ہی تھا. بہت ممکن ہے کہ دنیا کے تمدنی علوم و فنون کے رائج نہ ہونے کی وجہ سے وہ کوئی بات علمی طریقوں اور مصطلحہ لفظوں میں نہ ادا کر سکتے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعض اوقات وہ ایک بات کی علت اس شکل و صورت میں نہ دیکھتے ہوں جس صورت میں آج دنیا دیکھ رہی ہے، لیکن ان کی طبائع کی افتاد اور ذہنیتوں کی روش کچھ اس طرح کی بن گئی تھی کہ وہ جب کسی معاملہ پر سوچ بچار کرتے تھے تو خواہ وہ اس کی علت و موجب کو سمجھ سکیں یا نہ سمجھ سکیں، لیکن دماغ جاتا اسی طرف تھا جو علم و حکمت کے بہتر اور بلند پہلو ہو سکتے تھے. اور یہی معنی ہیں انبیاء علیہ السلام کے مقامِ تزکیہ کے ﴿وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾. یعنی دل و دماغ کی اِس طرح تربیت کر دی جاتی ہے کہ ایک موزوں اور مستقیم سانچا ڈھل جاتا ہے. پھر جب کبھی اُس میں کوئی ٹیڑھی چیز رکھی جائے گی وہ قبول ہی نہیں کرے گا صرف سیدھی، بہتر اور موزون اشیاء ہی اُس میں جگہ پکڑ سکتی ہیں. چونکہ قومی مسئلہ ایک وہ مسئلہ تھا جس کے لیے غلط فیصلہ کا ہو جانا قیامت تک تمام قوم کو بے راہ روی کی دعوت دینے اور غلط راستہ پر چلانے کے مترادف تھا، اِس لیے ممکن نہ تھا کہ قومی زندگی کا ایک ایسا اہم معاملہ خلیفۃ المسلمینؓ اور عام صحابہ کرامؓ کے سامنے آتا اور اُن کا دماغ اُس کا صحیح فیصلہ نہ کرتا. اگر ایسا ہوتا تو یہ فیصلہ ہی غلط نہ کہلاتا، بلکہ اسلام کی دماغی تربیت پر بھی دھبہ لگتا. یہ کچھ ضروری نہیں کہ اُنہوں نے اپنے اِس احساس کی کوئی توجیہ و تعلیل بھی کی ہو، کیونکہ نتائج تعبیر و تعلیل سے نہیں، فعلِ صحیح سے پیدا

ہوتے ہیں. دیکھنا صرف یہ ہے کہ وہ اپنے اور اس کے خلاف میلان نہ پیدا کر سکے. وہ باوجود غیر اقوام کی ہر طرح علمی و تمدنی چیزیں قبول کر لینے کے بھی، اُن کا سنہ قبول نہ کر سکے اور اُن کی طبعیت کا فیصلہ یہی ہوا کہ قومی سنہ سب سے الگ اور ایسا ہونا چاہیے، جس کی بنیاد اپنی تاریخ کے کسی ''قومی واقعہ'' پر ہو. گو اُنہوں نے اپنے دفاتر کے لیے ایرانیوں اور رومیوں کی زبان لے لی. اُن کے حساب و کتاب کے قواعد قبول کر لیے. اُن کے حساب کی مصطلحات و اشارات سے بھی انکار نہیں کیا لیکن ان کا سنہ اور تاریخ لینے پر آمادہ نہ ہو سکے، کیونکہ یہ قومی زندگی کی بنیادی اینٹوں میں سے ایک اینٹ تھی جس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنی ہی ہو اور اپنے ہی ہاتھ سے رکھی جائے. چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور اسلام نے جو ذہنیت اُن کی پیدا کر دی تھی، اُسے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا.

اب رہی یہ بات کہ قومی سنہ کا تقرر تو بہترین فیصلہ کا حامل ہو گیا کہ سنہ اور تاریخ اپنے ہی ہوں مگر سوال یہ باقی رہ جاتا ہے کہ سنہ کی ابتدا قرار دینے میں جس قدر بھی سامنے کی چیزیں ہو سکتی ہیں سب کو چھوڑ کر ''ہجرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم'' کا واقعہ جو آغازِ اسلام کی بے سروسامانیوں اور کمزوریوں کی یاد تازہ کرتا تھا. کیوں اختیار کیا گیا اور اس کی علت کیا تھی؟

واقعہ ہجرت کا اختصاص

مسلمانوں کا قومی سنہ قرار دینے کے لیے قدرتی طور پر جو دوسری چیزیں سامنے کی تھیں، وہ اسلام کا ظہور تھا، داعئ اسلام کی پیدائش تھی، نزولِ وحی کی ابتدا تھی، بدر کی تاریخی فتح تھی، مکہ کا فتح مندانہ داخلہ تھا، حجۃ الوداع کا بے پناہ اجتماع تھا جو اسلام کی ظاہری اور معنوی تکمیل و فتح کا آخری اعلان تھا لیکن ان تمام واقعات میں سے کوئی ایک واقعہ بھی سنہ کی تخصیص میں اختیار نہیں کیا گیا. ہجرتِ مدینہ کی جانب نظریں گئیں، جو نہ تو کسی پیدائش کا جشن ہے، نہ کسی شوکت کا ظہور، نہ کسی جنگ کی فتح ہے، نہ کسی غلبہ کا شادیانہ، بلکہ اس زمانہ کی یاد تازہ کرتا ہے، جب کہ داعئ اسلام کے لیے اپنے وطن میں پر امن زندگی بسر کرنا بھی ناممکن ہو گیا تھا اور بے چارگی و مظلومیت کی یہ حد تھی کہ اپنا وطن، اپنا گھر، اپنے خویش و اقارب چھوڑ چھاڑ کر صرف ایک ''رفیقِ غمگسار'' و ''یارِ غار'' کے ساتھ رات کی تاریکی میں ''راہ سپارِ دشتِ غربت'' ہوا تھا.

قومی سنہ دراصل قوم کی پیدائش اور عروج و اقبال کی تاریخ ہوتا ہے. اس کے ذریعے قومیں اپنی تاریخ کا سب سے زیادہ اہم اور بنیادی واقعہ یاد رکھنا چاہتی ہیں. یہی وجہ ہے کہ دنیا میں جس قدر سنہ رائج ہوئے سب کی بنیاد، بانیانِ حکومت و مذہب کی پیدائش، بادشاہوں کی تخت نشینی، انبیاء کی بعثت، ملکوں کی فتح و تسخیر کے انقلاب و انتقال اور حوادثِ عظیمہ ارضیہ سے ہوئی. مگر یہاں کی بات ہی نرالی تھی جو

اہل جہان کی تمام قومی یادگاروں کے خلاف نظر آتی ہے. دنیا کی تمام قومیں فتح واقبال سے اپنی تاریخ شروع کرتی ہیں، مگر انہوں نے اپنی انتہائی بے چارگی وماندگی سے شروع کی. دنیا کی قوموں کا فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے ظہور کی سب سے بڑی فتح یادرکھیں مگر انہوں نے اپنے ظہور کی سب سے بڑی بے سروسامانی یادرکھی. دنیاوالوں نے اپنی تاریخ کی ابتدااُس وقت سے کی جب سے ان میں کوئی بڑاانسان پیدا ہوا، مگر انہوں نے اُس وقت سے کی، جب بڑے انسان کی نہیں بلکہ بڑے عمل کی پیدائش ہوئی. دنیا معنی سے زیادہ لفظ کی، اور روح سے زیادہ جسم کی پرستار ہوتی ہے، مگر یہاں تخم کی جستجو تھی، پھل کی نہیں تھی. چنانچہ صحابہ کرامؓ نے پیدائش و بعثت کے واقعاتِ عظیمہ ترک کر کے واقعۂ ہجرت کا انتخاب کیا. گوان کی نظر میں بھی پیدائش اور ظہور، جشن وکامرانی اور فتح واقبال کی بلندیاں تھیں اور وہ ناکامی ونامرادی کے دلدادہ نہ تھے، مگر وہ فتح واقبال کی صورت اور برگ بارکونہیں دیکھتے تھے، بلکہ حقیقت واساس پرنظر رکھتے تھے. اُن پر یہ حقیقت کھل چکی تھی کہ اسلام کی پیدائش وظہوراور فتح واقبال کی اصلی بنیاداُن واقعات میں نہیں ہے، جو بظاہر نظر آتے ہیں. بلکہ ''ہجرتِ مدینہ'' اوراس کے اعمال وحقائق میں ہے. اس لیے جو اہمیت دنیا کی نگاہیں، پیدائش، بعثت، بدراور فتح مکہ کو دیتی تھیں، وہ اُن کی نظروں میں ہجرتِ مدینہ کو حاصل تھی. یہی وجہ ہوئی کہ اسلامی سنہ کی ابتدا کرنے میں انہوں نے منارۂ محراب کی بلندیوں کومدِ نظرنہیں رکھا، بلکہ زمین کی بنیادوں کو دل ودماغ میں جگہ دی اور اسلامی سنہ کی ابتداء واقعۂ ہجرت سے کی گئی کیونکہ ہجرت ہی تکمیلِ کارکا اعلان تھی.

پس جونہی یہ سوال سامنے آیا کہ اسلامی سنہ کی ابتداء کس واقعہ سے کی جائے تواُنہیں ایک ایسے واقعہ کی جستجو ہوئی، جواُمت کے قیام واقبال کا اصلی سرچشمہ ہو. آنحضرت ﷺ کی پیدائش کا واقعہ یقیناً سب سے بڑاواقعہ تھا لیکن اُس کے تذکار میں شخصیت سامنے آتی تھی اور شخصیت کا عمل سامنے نہیں آتا تھا. بعثت کا واقعہ بھی سب سے بڑاواقعہ تھا لیکن وہ معاملہ کی ابتداتھی، انتہاوتکمیل نہ تھی. بدر کی جنگ اور مکہ کی فتح عظیم کے واقعات تھے، لیکن وہ اسلام کی فتح واقبال کی بنیادنہ تھے، بلکہ کسی دوسری بنیاد کے نتائج وثمرات تھے. یہ تمام واقعات صحابہ کرامؓ کے سامنے آئے لیکن اُن میں سے کسی پر بھی طبیعتیں مطمئن نہ ہوسکیں. بالآخر جب ہجرت کا واقعہ سامنے آیا توسب کے دلوں نے قبول کرلیا، کیونکہ انہیں یاد آ گیا کہ اسلام کے ظہور وخروج کا مبداء حقیقی اِسی واقعہ میں پوشیدہ ہے اوریہی واقعہ اسلامی تاریخ کا مبداء بننا چاہیے.

تحویلِ قبلہ

﴿ قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا ۠ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴾

''تحقیق ہم نے تیرے روئے انور کو آسمانوں میں پھرا دیکھا. پس البتہ ہم تجھ کو اُسی قبلہ کی جانب پھیر دیں گے، جس کی طرف تُو راضی ہے. پس اب مسجدِ حرام کی جانب اپنا منہ پھیر لے. پس پھیرا کرو مونہوں کو اُسی کی طرف جہاں کہیں تم ہوا کرو. اور وہ لوگ جن کو کتاب ملی ہے البتہ جانتے ہیں اُن کے ربّ کی طرف سے وہی ٹھیک ہے. اور اللہ تعالیٰ اُن کے عملوں سے جو وہ کرتے ہیں، بے خبر نہیں ہے.'' [البقرۃ:۱۴۴]

کسی نہ کسی مافوق الانسان ہستی کو اپنا مالک و خالق جاننا، اور قادرِ مطلق ماننا انسانی فطرت میں داخل ہے. ایک جاہل سے جاہل اور وحشی سے وحشی کے ہاتھ بھی (جس نے کبھی خدا کا نام تک نہ سنا ہو) تکلیف و مصیبت میں بالکل غیر اختیاری طور پر، استمداد کے لیے کسی ایسی ہستی کی طرف ضرور اُٹھ جاتے ہیں، جسے وہ ہر شئے پر قادر، اپنی مصیبتوں کا مداوا اور نجات دہندہ سمجھتا ہے. پھر دعا مانگنے کے بعد روح میں کسی قدر تسکین اور قلب میں کسی قدر طمانیت کا پیدا ہو جانا ایک یقینی امر ہے، اور یہ سکون و اطمینان بالکل اُسی قسم کا ہوتا ہے جیسا کہ بچے اُس وقت محسوس کرتے ہیں، جب اُنہیں کوئی ستائے اور وہ اپنا دکھ درد آ کر اپنے ماں باپ سے بیان کر دیں جن کے متعلق اُن کو یقین ہوتا ہے کہ وہ اُن کی مدد پر قادر ہیں. طبعاً دُکھے ہوئے دل میں اِس قسم کے اطمینان کا پیدا ہونا بھی اِسی کا ثبوت ہے کہ اپنے سے بالاتر کسی ہستی کو تسلیم کرنا اور اسے قادرِ مطلق جاننا انسانی فطرت کا تقاضا ہے اور اعتقادی و معنوی طور پر یہی مفہومِ عبادت ہے.

عبادت خواہ محسوس ہستی کی کی جائے یا نادیدہ اور غیر محسوس ہستی کی، لیکن یہ امر سب میں مشترک ہے کہ اُس محسوس یا غیر محسوس ہستی کو جہان کا خالق و مالک، رازق، محی، ممیت وغیرہم اوصاف کا حامل تصور کیا جاتا ہے اور اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر انسان اپنی فطرت میں یہ خواہش لے کر پیدا ہوا ہے کہ

وہ کسی نہ کسی ہستی کو اپنا خالق و مالک بنالے اور ایسی تمام طاقتوں کو اُس کے ساتھ منسوب کرے جو انسان میں نہ پائی جاتی ہوں، اور اُسی خواہش وشوق نے بعض اوقات لوگوں کو اِس بات پر بھی مجبور کر دیا ہے کہ اپنے ہی جیسے انسانوں کے آگے سجدے کیا کریں، جو اپنی بعض خوبیوں اور خصوصیتوں میں عام انسانوں سے اُنہیں بالاتر نظر آئیں اور یہی وجہ ہے کہ بعض افراد نے اَن دیکھے خدا پر ایمان لانے کو مشکل خیال کر کے اِس کے تصور کو تو چھوڑ دیا اور ایک دیکھے ہوئے انسان کو خدا سمجھ کر پوجنے لگے. مہاتما بدھ، کرشن مہاراج، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حضرت عزیر علیہ السلام کی پرستش اِسی مغالطہ کی کڑیاں ہیں جو انسان ہونے کے باوجود بہت سے انسانوں کے نزدیک قابلِ پرستش و معبود سمجھے گئے اور غلط بین انسانوں نے بہت سی صفاتِ الٰہیہ اُن کے ساتھ منسوب کر دیں.

اِن تمام باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ خدا کی ہستی پر ایمان لانا اور اُس کی درگاہ میں سرِ نیاز جھکا کر اپنی حاجات کا اُس سے طلب کرنا، انسانی شریعت میں داخل ہے اور جو معدودے چند حیوانِ ناطق سرے سے خدا ہی کے قائل نہیں وہ صحیح الفطرت انسان نہیں ہیں، جنہوں نے سلیم فطرت کی بجائے اپنی محدود و نارسا عقل کو اپنا رہنما تسلیم کر لیا ہے، جس کے لیے ہر لحظہ گمراہی کا امکان مسلّم ہے.

پھر خدا کی ہستی کو تسلیم کر لینے کے بعد اُس کی محبت و تعظیم اور اُس کا خوف و رعب بھی انسانی فطرت میں داخل ہے اور دنیا کی کسی طاقت سے نہ ڈرنے والا اور صاحبِ قوت وجود بھی اُس دیدہ یا نادیدہ ہستی کے خوف سے کانپ اٹھتا ہے اور اُس کا خوف اُس کو ایسے افعال سے باز رکھتا ہے جن کے متعلق اُس کو خیال ہے کہ یہ افعال میرے معبود کی مرضی کے خلاف ہیں اور یہ عبادت کی دوسری ظاہری صورت ہے.

بالکل ابتدائی زمانے کے حالات کا تو علم نہیں اور نہ یہ بتایا جا سکتا ہے کہ حضرت سیدنا آدم علیہ السلام اور حضرت سیدہ حوّا علیہا السلام کس طریق پر عبادتِ الٰہی کیا کرتے تھے؟ مگر تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ جب حضرت ابوالبشر آدم علیہ السلام جنت سے زمین پر تشریف لائے تو وحشت و تنہائی کو محسوس فرما کر بارگاہِ ایزدی میں عرض گزار ہوئے کہ یہاں کوئی مسقف مکان نہیں اور نہ کوئی عبادت کا سامان. لہٰذا میرے لیے عبادت گاہ کا انتظام فرمایا جائے. حکم ہوا کہ تو عبادت کے لیے ایک گھر بنا کہ یہ دنیا میں خدا کا پہلا گھر ہوگا. آدم علیہ السلام نے عرض کیا کہ جگہ معلوم ہونی چاہیے، چنانچہ جبرائیل علیہ السلام تشریف لائے اور اُنہوں نے کعبۃ اللہ کی جگہ بتائی اور آدم علیہ السلام نے زمین سے اوپر پتھروں سے بنیاد اٹھائی اور ایک غیر مسقف چوکور چار دیواری کھڑی کر لی. جس پر بحکمِ الٰہی ایک خیمۂ نورانی جو ملاء الاعلیٰ میں ملائکہ کی طواف گاہ اور بیت المعمور کے نام سے مشہور تھا لگا دیا گیا اور آدم علیہ السلام وہاں پر طواف فرماتے اور اُسی جہت کو عبادت کے رکوع و قیام اور سجود و سلام کرتے. (جس کی مفصل بحث فقیر نے اپنی کتاب ''سیاحِ لامکان''

میں لکھ دی ہے) اور یہ ہے عبادت کا پہلا طریق جو زمین پر شروع ہوا.

عبادت کے بے شمار طریقے دنیا میں رائج ہیں جن کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے. مثلاً کسی جوگی کا اپنے ایک ہاتھ یا ایک ٹانگ کو زمین سے اونچا رکھ کر خشک کر دینا اور مدتُ العمر کے لیے اپنے آپ کو اپاہج بنا لینا. یا نیند سے نجات حاصل کرنے کے لیے لوہے کی کیلوں پر بیٹھنا، جو ہر وقت جسم میں چبھتی رہیں. یا تیس تیس چالیس یوم کا ایک ہی برت (روزہ) رکھنا. یا ہمیشہ کے لیے شادی نہ کرنا وغیرہ وغیرہ اور یہ عبادت کے وہ اذیّت رساں طریق کار ہیں، جن کو فطرت کے قانون نے ہمیشہ نفرت کی نگاہ سے دیکھا ہے. کیونکہ اگر اسی عبادت کی متمنی ذاتِ باری تعالیٰ ہوتی تو یقیناً اس جہان کی ملذذات پیدا نہ کی جاتیں اور اس معمورہ کے سامانِ خورد و نوش و عیش و راحت سے نفع اٹھانا ایک انتہائی نافرمانی کے مترادف قرار دے دیا جاتا. حالانکہ ایسا نہیں. مگر ہم دیکھتے ہیں کہ باوجود فطرت کی اس اقتضا کے مذہبِ عیسوی کی تاریخ اور ہندو مت کی پوتھیاں، تارک الدنیا راہبوں اور بادیہ نشیں سادھوؤں کی غلط کاریوں سے بھری پڑی ہیں اور یہ دیکھ کر کہ اس قسم کی عبادت کے اس قدر خراب نتیجے نکلتے ہیں، خیال ہوتا ہے کہ یہ عبادت کے طریقے خدا کے مقرر کردہ نہیں ہیں، بلکہ لوگوں نے اپنی اپنی اقوام میں شہرت حاصل کرنے کے لیے خود ایجاد کر لیے ہیں اور اُن میں عالمگیر طریقۂ عبادت بننے کی ذرا سی بھی صلاحیت نہیں.

ہزاروں برس کی تاریخی معلومات کا مطالعہ اور انسانی نفسیات کا تجربہ ہمیں بتاتا ہے کہ خداوندِ عالم جل وعلا شانہٗ کی عبادت کا کوئی ایسا طریقہ مقبول عام نہیں ہو سکتا جس میں بہت سی دشواریاں اور خلافِ فطرت جان کاہیاں پیش آئیں اور تمام قوم کو اُن پر عمل پیرا ہونے کی توفیق حاصل نہ ہو.

عبادت کا نظریہ درحقیقت یہ ہے کہ انسانی عبادت انسان ہی کے فائدے کے پیش نظر نہایت مستحسن اور سہل طور پر ادا ہو کر اُس پر بوجھ نہ بنے، اور انسان رضاءِ الٰہی کے ماتحت پورے ذوق وشوق سے ہمیشہ اُس پر مستعد رہ سکے. اور اس قسم کی عبادت پیش کرنے کا فخر صرف اسلام کی تعلیم کے اُس حصہ کو ہے جو سرورِ کائنات، مختارِ شش جہات، محمد رسول اللہ ﷺ یا دیگر انبیاء علیہم السلام کی وساطت سے دنیا کو پہنچا ہے. اِس لیے انسان بجا طور پر یہ توقع کر سکتا ہے کہ اگر یہ تمام مذاہب والے عبادت کے طریق خداوندِ عالم جل وعلا شانہٗ ہی کے مقرر کردہ ہیں تو اُن میں کوئی نہ کوئی بات تو ایسی ہونی چاہیے جس کی طفیل مقررّہ وقتِ عبادت کے لیے عابد اپنے جسم اور روح کو معبود کا نام جپنے اور اُس کی یاد کرنے میں پوری تسکین اور طمانیت سے مستفید کر سکے، کیونکہ وہ طریقِ عبادت خالق و مخلوق کے تعلقات کی استواری اور عابد و معبود کی راز داری میں قطعاً قابلِ منسوخی سمجھا جائے گا، جس میں معبود کے لیے ایک سیکنڈ کو بھی یکسوئی کا موقع نہ مل سکے اور عابد اپنی جسمانی قوت اور روحانی بے قراری سے ایسا بے چین ہو کہ ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے جذبۂ عبودیت کو تسکین کا اہل نہ بنا سکے.

عبد و معبود کے تعلقات اور بندہ و خدا کے باہمی راز و نیاز چونکہ الفاظ و اشارات کے محتاج نہیں اور اُن کا تمام تر تعلق ہماری قلبی کیفیتوں سے ہے. مثلاً اِدھر سر جھکانے کا خیال پیدا ہوتا ہے تو اُدھر عالم الغیب اُس ارادہ سے مطلع ہو جاتا ہے. اِدھر عابد نے اُس کی تسبیح و تقدیس کی نیت کی، اُدھر اُس کی رحمت کو جوش آ گیا اور عبادت مقبولِ بارگاہِ الٰہی ہو گئی. زبان ہلے یا نہ ہلے. ہاتھ اٹھے یا نہ اٹھے، پاؤں حرکت کریں یا نہ کریں، عجز و نیاز ظاہر کرنے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ عابد کا دل یکسوئی سے اُس کے حضور میں عبادت کو تیار ہو جائے. ہم اپنا منہ پورب کو کریں یا پچھم کو، مشرق کو کریں یا مغرب کو، وہ معبودِ برحق ہر جگہ موجود ہے. گویا تعیینِ جہت و تخصیصِ سمت بھی کوئی ضروری چیز نہیں، لیکن مقصد چونکہ یکسوئی ہے اس لیے اُن چیزوں کے غیر ضروری ہونے کے باوجود بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ہر مذہب نے عبادتِ الٰہی کے لیے کچھ تھوڑے الفاظ مخصوص کر دیئے ہیں جو زبان سے ادا کیے جاتے ہیں اور ہاتھ پاؤں کی کچھ حرکتیں ہیں، جن کے بغیر عبادت مکمل اور درست نہیں ہوتی. مثلاً دست بستہ کھڑے ہونا، پاؤں کو اعتدال پر عریض رکھنا، دو زانو بیٹھنا، ہاتھ جوڑنا، سجدہ کرنا وغیرہ وغیرہ جن کا مطلب سوائے اِس کے کچھ نہیں کہ عابد کی مکمل بیداری با ہوش طریق پر اُس کو معبود کے حضور میں یکسو رکھ سکے اور اُس کا ہر عضو اُس کی عبادت میں شریک ہو.

اب سوال یہ پیدا ہوگا کہ جب ہر طرف معبود کی ذات موجود ہے اور ہر سمت کو یکسوئی کے امکانات ہو سکتے ہیں تو پھر ایک ہی سمت کو منہ کرنا اور ایک ہی سمت میں متوجہ ہو کر معبود سے رشتہ جوڑنے کی سعی کرنا کیوں ضروری ہوگا؟ بات یہ ہے کہ نظریہ یہی صحیح ہے:

﴿فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾ "یعنی جہاں بھی منہ کرو گے خدا کو پاؤ گے."

مگر اُس معبود کے مرتب کردہ کچھ قوانین و اصول ہیں اور عموماً نتائج اُنہی کی بنا پر ظہور پذیر ہوتے ہیں. ﴿فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا﴾ کا نظریہ معبودِ برحق کے فرمان میں تھا، مگر سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے جب درخواستِ دیدار بالفاظ ﴿رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْكَ﴾ بارگاہِ معبود میں گزاری تو ﴿لَنْ تَرٰىنِیْ﴾ کے جواب کے بعد ارشاد ہوا: درخواستِ دیدار، بے حجابانہ، بلا واسطہ کی ہے جس کی اہلیت آپ میں نہیں. لہٰذا آپ میرے اور اپنے درمیان ایک وسیلہ، ایک تجلی گاہ، اور ایک سمت، ایک مقام، معیّن فرمائیں تا کہ متردّد طبع اور متزلزل تخیل، یکجا و یکسو ہو کر میرے انوار کا انتظار کر سکے. جب تک یہ سب کچھ یک سُو نہ ہوگا، دیدارِ باری تعالیٰ کے لیے ایک غیر مطمئن صورتِ حال پیدا ہو جائے گی. اِس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے آدمی کو جس طرح قوتِ عقلیہ کا بیش بہا خزانہ عطا فرمایا ہے اُسی طرح قوتِ خیالیہ کے بھاری خلعت سے بھی نوازا ہے اور اصولی بات ہے کہ جب قوتِ خیالیہ، قوتِ عقلیہ کی معاون بن جاتی ہے، تو اُس

کا فعل واثر، یعنی مجرّدات کا ادراک قوی اور مستحکم ہو جاتا ہے۔ دیکھئے، مہندس احکامِ مقادیر کا ادراک کرتے وقت جب تک صورتوں اور شکلوں کو مصوّر و مُشکّل نہیں کر لیتا اور اپنی قوتِ خیالیہ کو قوتِ عقلیہ کا پورا مددگار نہیں بنا لیتا، مقادیر کے احکام بخوبی ذہن نشین نہیں کر سکتا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ قوتِ خیالیہ کو عالمِ اجسام میں پورا پورا دخل ہے اور جب تک قوتِ عقلیہ و خیالیہ متحد نہ ہوں گی، کسی غرض کے پورا کرنے میں یکسوئی نہ ہوگی اور تضاد رہے گا۔ جس کا نتیجہ بالکلیہ مقصد سے ناکامی ہوگی۔ اس لیے ضروری تھا کہ ارشادِ باری کے ماتحت سیدنا موسیٰ علیہ السلام ایک مخصوص تجلی گاہ پر فوراً متوجہ ہو جاتے تاکہ درخواست کے جواب میں جو نتائج و انوارِ قدسی رونما ہونے والے تھے اُن میں تعویق و تاخیر نہ ہوتی۔ چنانچہ ﴿ فَانْظُرْ اِلَی الْجَبَلِ ﴾ کا حکمِ خداوندی سنتے ہی پہاڑ کی جانب مراقب ہو گئے اور نتیجہ سامنے آ گیا۔ تجربہ شاہد ہے کہ کوئی شخص کسی جلیل القدر حاکم یا بادشاہ کو سلام کے لیے جائے اور اُس کی مدح و ثنا کرنا چاہے تو نقیب و ملازم شاہی اُس کا ہاتھ پکڑ کر حاکم یا بادشاہ کے سامنے مؤدب طور پر کھڑا کر دیتا ہے۔ پھر وہ بادشاہ کی جانب مکمل طور پر دھیان کر کے اپنا مطلب عرض کرنے لگتا ہے اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اور اگر وہ شاہی دربار میں گفتگو کے لیے بادشاہ سے مخاطب ہو اور خیال دائیں بائیں رکھے تو مقصد براری ممکن ہی نہیں بلکہ محال امر ہے جب تک سکونِ محض و یکسوئی اختیار نہ کر لے، اور یہ دونوں امور اُسی وقت میسر آ سکتے ہیں کہ عابد عبادت کے اوقات میں ایک معیّن جہت کا التزام کرے اور اُس جانب سے دوسری جانب پر التفات نہ رکھے۔ یہاں سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ عبادتِ الٰہیہ کے لیے تعیّنِ قبلہ نہایت ضروری و لابدی چیز ہے اور جس جہت یا مکان کو قبلہ معین کیا جائے اُسے کسی محسوس و معقول کمال اور تعلقاتِ مخلوق سے پاک و منزّہ اور خالی ہونا چاہیے۔ کیونکہ جو قبلہ محسوس و معقول کمالات سے، جیسے آفتاب و ماہتاب، سیارہ و ستارہ، آتش و دریا، آراستہ ہوگا یا مخلوق کے تعلقات سے (جیسے انبیاء علیہم السلام کے اماکن و مزاراتِ مقدسہ) صاف نہ ہوگا، عوام کے نزدیک وہ قبلہ بننے کا مستحق نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ حرمت و عبادت اُس مقدس مخلوق اور محسوس معقولِ کمالات کی جانب منسوب ہوگی جن کا علاقہ اُس قبلہ سے ہے نہ کہ خداوند عالم جل و علا شانہٗ کے لیے۔ لہٰذا اُس مکان و جہت کا تعین و تقرر بھی اُسی معبودِ لایزال اور حیّ باکمال کی طرف سے ہونا چاہیے اور جس جہت کی وہ تعین فرما دے اُس کو امرِ غیبی سماوی کے ساتھ ساتھ وابستہ جاننا اور اپنے ناقص عقول و افکار کو اُس کی تعیین و تشخیص میں متزلزل کرنا اور اُس میں بیجا و ناجائز بحث و تمحیص کو عمل میں لانا، درحقیقت رب العزت اور اُس کے مطیع و فرماں بردار بندوں کے طریقِ حقہ سے انحراف اور دوری ڈھونڈنا ہے۔ نیز یہ کہ بندگی اور

عبادت محض معبودِ حق کا ہی حق ہے اور کسی حق دار کا حق بدوں اس کی یقینی اجازت کے کسی دوسرے محل و موقعہ میں صرف کرنا درحقیقت صاحبِ حق کے حق میں تجاوز عن الحد اور ظلم ہے۔ بدیں وجہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابوالبشر آدم علیہ السلام اور ابوالملّت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حق میں اکمل جہات اور افضل امکنہ (کعبہ مکرمہ) کو قبلہ قرار دیا۔ کیونکہ یہی ایک مبارک مکانِ انسان، مبداء ترابی، محسوس و مشاہد ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ انسان کا اصل عنصر ہی (زمین) اسی نقطہ کے نیچے سے پھیلایا گیا ہے اور عبادت کے وقت چونکہ عابد کا ظاہری جسم اپنے ظاہری مبداء کی طرف توجہ کرتا ہے تو اُس کے باطن کو بھی اپنے باطنی مبداء کی جانب مصروف ہونا ضروری ہے۔ بدیں وجہ بھی جہتِ کعبہ ہی کو قبلہ ٹھہرانا ضروری ہوگا، کیونکہ یہ مکان، برکات و کرامات کا مجسمہ، کعبہ معظمہ، ایک ایسی خاص بات سے مخصوص ہے، جو کسی دوسرے مکان میں نہیں پائی جاتی اور وہ یہ ہے کہ قیامت کے دن عرشِ الٰہی کی تجلّی اسی جگہ ہوگی اور اہلِ قیامت قبروں سے نکل کر اسی کے اردگرد کھڑے ہوں گے۔ گو اِس مبارک مکان کی جانب منہ کر کے عبادتِ الٰہی کرنا گویا ہر وقت قیامت کے المناک واقعات اور اپنی کرتوتوں کی باز پرس کا نقشہ بچشمِ عبرت سامنے رکھنا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے صُخراء بیت المقدس، بڑا عالی شان اور خوش نُما قبہ بنا کر اُس کے اردگرد مسجد کا نقشہ کھینچا تھا تو مسجد میں جنت و دوزخ کی تصویریں بھی کھینچ دی تھیں تا کہ جو شخص عبادت کے وقت اُن کی جانب منہ کرے وہ قیامت کے جانگسل مصائب کو یاد کر کے اپنے عملوں میں خاطر خواہ خلوص و اصلاح بھی پیدا کر لے۔

تعمیرِ قبلہ و کعبہ

جب یہ امر متحقق ہو چکا کہ فطری طور پر انسان کو اپنے معبود کے سامنے جھکنے کے لیے کسی جہت و قبلہ کی ضرورت ہے اور اُس کے بغیر یکسوئی و سکونِ قلب ممکن ہی نہیں، تو اِسی نظریہ کے ماتحت ہمارے مولا و آقا سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعثت کے وقت سے ہجرت کے زمانہ تک کعبہ مکرمہ کی جانب رخ کر کے عبادت فرماتے رہے اگرچہ اِس میں کسی قدر اختلاف بھی ہے کہ ہجرت سے پیشتر آپ کس سمت کو متوجہ ہو کر عبادت فرمایا کرتے تھے۔ بعض نے لکھا ہے کہ جب تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ شریف میں جلوہ آرا رہے۔ بیت المقدس ہی کی جانب عبادت میں متوجہ ہوتے رہے۔ اور بعض کا قول ہے کہ قبلۂ ابراہیمی یعنی خانہ کعبہ کی جانب عبادت فرمایا کرتے۔ مگر جب تمام روایات پر گہری نظر ڈالی جائے تو یہ اختلاف بالکل اُٹھ جاتا ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ معظمہ میں صُخرہ بیت المقدس کی جانب متوجہ ہو کر عبادت کرنے کا حکم ہوا تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں رُکنوں کے درمیان میں کھڑے ہو کر تعمیلِ ارشاد کیا کرتے جہاں آنکھوں کے سامنے تو

کعبہ ابراہیمی ہی ہوتا مگر رخِ انور بیت المقدس کی جانب ہی رہا کرتا. بایں وجہ کسی نے سمت، خانہ کعبہ اور کسی نے جہت، بیت المقدس کو قبلہ بتایا ہے. پھر جب حضور مدینہ طیبہ تشریف لے گئے تو خواہ باجتہادِ خود اور خواہ بالہامِ الٰہی تقریباً سوا برس تک بیت المقدس ہی کی جانب منہ پھیر کے نماز ادا فرماتے رہے.

اس اثنا میں یہودی لوگ متعجب تھے کہ محمد ﷺ ہمارے مذہب کے مخالف ہونے کے باوجود قبلہ کے مسئلہ میں ہماری موافقت کرتے ہیں. شاید یہ فیصلہ کے لیے متردد ہیں، یا مدینہ میں ہماری نماز دیکھ کر اُن کو صحتِ قبلہ کا پتہ چلا ہے وغیرہ وغیرہ. لیکن آنحضرت ﷺ اُن کی باتوں سے کبیدہ خاطر تو نہ ہوئے مگر آپ کی عالی ہمتی تحویلِ قبلہ کا تقاضہ کرتی رہی اور آپ ﷺ ہر نماز میں حکمِ الٰہی کے منتظر رہتے. حتیٰ کہ بحسبِ اقتضا آپ ﷺ بنی سلمہ کی مسجد میں نمازِ عصر یا ظہر ادا فرما رہے تھے کہ یہ حکم نازل ہوا. ﴿ قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۖ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ ﴾ اُس وقت آپ ﷺ دوسری رکعت کے رکوع میں تھے. حکمِ الٰہی پا کر بڑی مستعدی کے ساتھ تعمیل فرمائی اور اُسی حالت میں کعبۂ ابراہیمی کی جانب پھر گئے. آپ کا پھرنا مقتدیوں پر بھی فرض ہو گیا کہ وہ بھی کعبۂ ابراہیمی کی جانب منہ کرلیں اور حضور کی اقتدا سے قدم باہر نہ رکھیں. چنانچہ وہ بھی اُسی وقت جانبِ کعبہ پھر گئے اور ''عشرہ مبشرہ'' کا ارشادِ باری تعالیٰ سنا. اس عملِ نبوت سے تعمیرِ قبلہ نہایت ضروری معلوم ہوتی ہے اور شاید اِسی ضرورت کے پیشِ نظر سب سے پہلے آدم علیہ السلام بھی عبادت گاہ کے لیے عرض گزار ہوئے تھے، جس کی اُن کو اجازت ہوئی اور بیت اللہ، یا بیتِ ایل، یا کعبہ، یا مسجدِ حرام، یا بیت الحرام، یا مبینہ، یا اُم رحم، یا الباسہ، یا الحاطم وغیرہ اسماء کا ایک غیر مسقف مکان بنا کر، جس پر ایک نورانی خیمہ تھا، عبادتِ معبود کی جانب رجوع ہوئے جس کی نسبت اہلِ اسلام کا بالکل صحیح دعویٰ ہے کہ یہی سب سے پہلا گھر تھا جو خدا کی عبادت کے لیے بنایا گیا اور اُس کی توحید کا اعتراف کرنے اور اس وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ کی معرفت حاصل کرنے کو جس کی بنیاد رکھی گئی. نیز ایک اور روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا آدم علیہ السلام کے بعد حضرت شیث علیہ السلام نے اِس جگہ پتھروں اور گارے سے ایک مربع صورت کی بغیر جھت کے چار دیواری بنائی جس کو طوفانِ نوح تک قرار رہا. اِس کے بعد طوفانِ نوح ہی کی وجہ سے وہ مختصر سی عمارت منہدم ہو گئی اور اُس کی یادگار کے طور پر ایک سرخ سا ٹیلہ رہ گیا، جس کو لوگ ایسا ہی مقدس سمجھتے رہے جیسے کعبۃ اللہ کو سمجھتے تھے اور اُسی کے پاس حاضر ہو کر خدا سے حصولِ مقاصد کے لیے دعائیں مانگا کرتے تھے.

اِسی تعمیر کے متعلق غالباً قرآن کریم میں بالفاظ سیدنا ابراہیمؑ اشارہ ہے ﴿ رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ﴾ یعنی جب سیدنا ابراہیمؑ نے حضرت ہاجرہ اور اپنے اکلوتے بیٹے اسماعیلؑ کو ریگستانِ عرب میں چھوڑ کر رخصت ہونے لگے تو دعا فرمائی

''اے پروردگار! میں نے اپنی ذریت کو بے آب وگیاہ جنگل میں تیرے بزرگ اور حرمت والے گھر کے پاس چھوڑا ہے''.گویا ابراہیمؑ کی یہ دعا ثابت کرتی ہے کہ تمام عرب اور خود ابراہیمؑ کے نزدیک بھی اِس جگہ کی عظمت اور کعبۃ اللہ کی بزرگی مسلمہ تھی اور اِسی کی تائید قرآن کریم کے یہ الفاظ ﴿ وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ ﴾ یعنی جب ہم نے ابراہیم کو کعبہ کی جگہ بتائی. اِن اشارات سے پتا چلتا ہے کہ تعمیر ابراہیمی سے پہلے بھی یہ مقام مقدس ومتبرّک تھا اور تورات شریف کی کتاب پیدائش میں لکھا ہے کہ اُس (حضرت ابراہیم) نے ''بیت ایل'' کے پورب کے ایک پہاڑ کے پاس اپنا ڈیرہ کھڑا کیا. بیتِ ایل اُس کے پچھّم اور عطی اُس کے پورب تھا. وہاں اُس نے خدا کے لیے ایک قربان گاہ بنائی اور خدا کا نام لیا.

ایک اور روایت سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت آدمؑ کے بعد پہلے صرف ایک دفعہ حضرت شیثؑ نے خانہ کعبہ کی عمارت کو تعمیر کیا تھا لیکن طوفانِ نوح کے بعد باوجود نشان کی موجودگی کے، کسی کو بھی تعمیر کی ہمت نہ ہوئی یہاں تک کہ اتنی مدت کے بعد پھر حضرت ابراہیمؑ نے ہی اپنے صاحبزادے حضرت اسماعیلؑ کی مدد سے اُس کی تعمیر کی.

اِن مقدس معمارانِ بیت اللہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے جو عمارتِ کعبہ تعمیر کی وہ بالکل سادہ اور چار دیواروں کی ایک چوکھنڈی تھی، جس کی ایک دیوار طول میں 33 گز اور دوسری 31 گز تھی. عرض ایک طرف سے 22 گز اور دوسری طرف سے 20 گز. چھت بالکل نہ تھی مگر بے چوکھٹ اور بغیر کواڑوں کے، جس سے اُس کی اندرونی حفاظت ہوسکتی. ایک نامکمل سادروازہ تھا. پھر جب کبھی کسی حادثہ سے یہ عمارت بیت اللہ شریف خراب ہوتی یا گر پڑتی رہی تو اُس زمانہ کے متولی اُسے تعمیر کر دیتے رہے.

کتبِ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ کعبۃ اللہ کی عمارت کے گرنے کے صرف دو ہی سبب ہوتے رہے ہیں. ایک یہ کہ کبھی پہاڑی نالوں سے برسات کے وقت اتنا سیلاب آ گیا کہ اُس کو نقصان پہنچ گیا. دوسرے آتشزدگی یعنی کبھی کسی مجاور وخادم کے ہاتھوں خوشبو وغیرہ جلانے سے آگ کا لگ جانا اور انہی دو اسباب سے اکثر اس کو گزند پہنچا ہے جن کے باعث کبھی کبھی تعمیر میں تبدیلی ہوتی رہی. چونکہ اپنے محلِ وقوع کے لحاظ سے بیت اللہ شریف ایک پہاڑ کے دامن میں واقع ہے اِس لیے جب کبھی مکہ شریف کے پہاڑوں پر بارش ہوتی ہے تو پانی سیلاب کی صورت میں حرم شریف کے اندر چلا جاتا ہے. جس سے بیت اللہ کی عمارت کو اکثر بار نقصان پہنچا ہے چنانچہ اس قسم کا سب سے اہم واقعہ اُس زمانہ میں پیش آیا. جب کہ اس کی تولیت کا فخر قبیلۂ بنوجرہم کو تھا. یہ قبیلہ وہ قبیلہ ہے جس میں حضرت اسماعیلؑ نے شادی کی تھی. اِن بنوجرہم کے زمانۂ خدمت میں ایک بار بہت زور کی بارش ہوئی اور پہاڑوں کے پانی نے

ایک تیز رَو ندی کی شکل اختیار کر لی جو بیت اللہ شریف کی دیواروں سے ٹکرایا اور عمارت بیت اللہ سے بیشتر حصہ کو بہا لے گیا۔ کچھ دنوں بعد جب پانی اُتر گیا اور زمین خشک ہوگئی تو نبی جرہم نے پھر اُنہی بنیادوں پر اُسی شکل میں دوسری عمارت بنادی۔

تعمیر بنی خزاعہ

دوسرا سیلاب جس کا نام سیل القارعہ ہے اُس زمانہ میں آیا، جب کہ کعبۃ اللہ کی تولیت بنوخزاعہ کے ہاتھ میں تھی۔ اِس دفعہ بنی خزاعہ نے تعمیر کعبہ کے علاوہ خانہ کعبہ کے گرد، اِس خیال سے ایک چار دیواری مزید بنادی کہ بعد میں آنے والے سیلابوں کی روک تھام ہو سکے۔ اِس سیلاب میں بنی خزاعہ کی ایک مشہور ترین عورت قارعہ نامی غرق ہوگئی تھی اس لیے انہوں نے اِس سیلاب کا نام سیل القارعہ رکھ دیا۔

تعمیر قصی

یہ قصی بن کلاب سرورِ کائنات، مختارِ شش جہات، محمد رسول اللہ ﷺ سے چھ پشتیں پہلے تھے جن کی تعمیر کردہ عمارتِ کعبہ کو آنحضرت ﷺ کے مبارک زمانہ تک تقریباً دو سو برس ہوتے ہیں۔ علامہ طبری نے لکھا ہے کہ جب بنوخزاعہ کی بنائی ہوئی عمارت اِن قصی بن کلاب کے زمانہ میں گر پڑی تو قصی نے ازسرِنو اُس کی دیواریں بنائیں اور دیواروں کے ساتھ کعبۃ اللہ پر کھجور کی لکڑی کی چھت بھی ڈال دی اور پھر اُس پر سیاہ رنگ کے کپڑے کا غلاف بھی چڑھا دیا۔ یہی عمارت سرکارِ انبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانۂ خورد سالی تک موجود تھی اور اِسی عمارت کے ساتھ واقعہ ''اصحاب فیل'' پیش آیا۔ جس کا مختصر حال یوں ہے کہ ربّ العزت جل وعلا شانہٗ کے مقدس بندے حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے جس خلوص اور پاک دلی سے خانہ خدا کی بامرِ خدا تعمیر کی اور جس محبت وخلوص اور عجز وانکساری سے اُس کی مرجعیت کے لیے دعائیں مانگیں، خداوند جل وعلا مجدہٗ نے اُن کو سنا اور عرب کے تمام اطراف واکناف سے لوگوں کو وہاں جمع ہونے کی اور حج کرنے کی توفیق بخشی۔ تمام حصص کے لوگ بیت اللہ کے حج کو آتے اور خوشی خوشی رحمتِ الٰہی سے دامنِ مراد بھر بھر کر واپس گھروں کو جاتے۔

اُن دنوں میں بھی جب کہ، اور بالخصوص مکہ مکرمہ میں، ایک ایک گھر اور ایک ایک برادری کا جداگانہ بت تھا، اِس بیت اللہ کی مرجعیت میں کچھ فرق نہ آیا۔ باوجودِ کہ حضور سرورِ کائنات ﷺ کی تشریف آوری (پیدائش) سے چند سال پیشتر یمن پر حبشی عیسائیوں نے یورش کر کے یہاں کے اصل حکمرانوں کو شکست دے دی تھی اور ملک پر قابض ہو کر اِس طرح عیش وعشرت میں انہماک پیدا کر لیا کہ

خداوندِ عالم کو بھول گئے، جیسے مشرکین عرب. لیکن یہ کعبہ مکرمہ پھر بھی سجدہ گاہِ عوام تھا. چنانچہ انہی ایام میں جب کہ یہ حبشی عیسائی یمن میں بدکاریوں سے کھیل رہے تھے، حج کا وقت آ گیا اور یمن سے لوگوں کے گروہ در گروہ حج وزیارتِ خانہ کعبہ کے لیے روانہ ہونے شروع ہو گئے. ابرہہ (عیسائی بادشاہ) کو حیرت ہوئی کہ یہ لوگ اتنی تعداد میں اکٹھے ہو کر کہاں جا رہے ہیں؟ وجہ دریافت کرنے پر مکہ معظمہ کو حج بیت اللہ کے لیے اُن کی روانگی کا حال معلوم ہوا. اُس نے پوچھا بیت اللہ کیا شئے ہے؟ چنانچہ اُس کو بتایا گیا کہ وہ ایک پتھر کا بنا ہوا مکان ہے، جس کی تعظیم وتکریم زمانۂ قدیم سے چلی آتی ہے اور اہل عرب کو کوئی طاقت اُس کے حج سے نہیں روک سکتی. ابرہہ نے جب یہ سنا تو آتشِ حسد بھڑکی اور خانہ کعبہ کی حرمت کو مٹانے کا تہیہ کر کے، صنعاء شہر میں اُس نے ایک بہترین گرجا بنانے کا حکم دیا. دیگر شاہانِ حبش سے مدد مانگی اور قصرِ بلقیس کو کھود کھود کر سفید پتھر کی سلیں نکلوائیں اور گرجا کی تعمیر شروع ہوگئی. آبنوس اور ہاتھی دانت کے منبر بنا بنا کر صحن گرجا میں نصب کئے گئے. سونے چاندی کی مرصع سلیبیں کھڑی کی گئیں. تعمیرِ گرجا میں اس قسم کی تعجیل کا حکم تھا کہ جو کاری گر یا مزدور، طلوعِ سورج سے پہلے کام پر حاضر نہ ہوتا، اُس کے ہاتھ کٹوا دیئے جاتے. غرضیکہ تعمیر کا کام نہایت عظیم الشان پیمانہ پر ختم ہوا اور تمام عرب میں اُس کی دھوم مچ گئی.

اُس گرجا کا نام قلیس رکھا اور اُس کی خوبصورتی کو دیکھ کر فخریہ لہجہ میں کہنے لگا: "جب تک کعبۂ ابراہیمی سے لوگوں کا رخ، بہ نیتِ حج اِس گرجا (قلیس) کی جانب نہ پھیر لوں گا مجھے چین نہیں آئے گا" اور اکثر دیکھا جاتا ہے کہ جب بھی خداوندِ عالم جل وعلا شانہٗ کسی اپنے مقبول پر رحمتیں نازل کر کے اپنے کام کی تکمیل کرا لیتا ہے تو اُس کی کامیابی کو دیکھ کر اکثر جھوٹے مدعی بھی اٹھ کھڑے ہوا کرتے ہیں اور چند روز فتنہ وفساد کھڑا کر کے اور چند گمراہوں کو اپنا معتقد بنا کے ایسے تباہ ہوتے ہیں کہ تاریخی اوراق کے سوا اُن کا اور اُن کے پیروؤں کا کہیں نشان تک بھی نہیں ملا کرتا. دنیا کے ہر میدان، اعمالِ صالحہ وکاروبارِ سیئہ میں اِس کی مثال موجود ہے کہ جب کسی صادق نے کامیابی کا میدان مارا تو ہزاروں کاذب بھی اس میدان میں رینگنے کو نکل آئے چنانچہ یہی حال خانہ کعبہ کے حاسدوں اور حریفوں کا ہوا. جو بڑے بڑے طمطراق سے اٹھے مگر آناً فاناً فنا ہو گئے. ان میں سے کعبہ مکرمہ کا سب سے بڑا حریف یہی قلیس ہے جو ابراہہ نجاشی نے بنوایا اور جس کی جانب خلقِ خدا کو اطاعت کرنے کے لیے متوجہ کرتے ہوئے اپنی اور اپنے دیگر ساٹھ ہزار ساتھیوں کی جانیں اُس کی بھینٹ چڑھا دیں مگر وہ کامیاب نہ ہوسکا اور قلیس کی اس شاندار بناوٹ اور سج دھج کے باوجود یہ حالت ہوئی کہ وہ چند ہی دنوں میں ویران ہو گیا اور کوئی راہرو مسافر اُس کی مہیب

بربادی اور مخدوش ویرانگی سے اُس کے پاس سے گزرنے کی بھی جرات نہ کرتا.

آخر عباسی خلیفۂ اول سفاحؔ نے اپنے عامل بھیج کر اُس کو منہدم کرایا اور اُس کی قیمتی اشیاء فروخت کر کے اُن کی قیمت داخلِ خزانۂ شاہی کر دی. اور یہی حال قبیلۂ عطفان کے ایک معبد لیسؔ کا ہوا جو انہوں نے بڑی تگ و دو سے خانہ کعبہ شریف کے مقابلہ میں بنایا تھا اور اس کو حرم کی حرمت دیتے اور بڑے واضح اعتقاد سے اس کی جانب حج اور طواف کو نکلتے، مگر زہیر ابن خباب کلبی اور قبیلۂ غطفان والوں کا آپس میں جھگڑا ہوا اور قبیلۂ غطفان کو شکست ہوئی تو زہیر نے اُن کے ساتھ اُن کے اُس معبد کو بھی مٹا دیا.

ایسے ہی عبدالمسیح بن دارس بن عدی کا قبّہ دار ایک معبد تھا، جو تین سو کھالوں سے بنایا گیا تھا تمام عرب اُس کو کعبۂ نجرانؔ کہتے تھے اور وہ بھی کعبۃ اللہ کی طرح زیارت گاہِ عوام سمجھا جاتا تھا. مگر باوجود عیسائی سلطنت کی محافظت کے وہ بھی قائم نہ رہ سکا. اس کے علاوہ اور کئی معبد اسی غرض و غایت کے ماتحت معرضِ وجود میں آئے کہ بیت اللہ کی توقیر و منزلت کا اعتقاد لوگوں کے دلوں سے نکال کر کسی دوسری جانب راغب کر دیں چنانچہ ذوالخلصہ، ذوالکعبات، سعیدہ وغیرہ بھی اسی شاخسانے کی چند بوسیدہ کڑیاں تھیں جو آخر اپنے بنانے والوں سمیت مٹ مٹا کے فنا ہو گئے.

تعمیرِ قریش

اس تعمیر کا باعث ایک عورت کے کعبۃ اللہ میں خوشبو جلاتے ہوئے غلافِ کعبہ اور عمارت کعبہ کا جل جانا تھا. دیواریں پھٹ گئیں اور اُن میں اتنی دراڑیں پڑ گئیں کہ کعبۃ اللہ کی نئی تعمیر کی ضرورت محسوس ہوئی. اِس تعمیر میں کچھ یہ خیال بھی کام کرنے لگا کہ ہمیشہ پہاڑی نالوں کے سیلاب کعبۃ اللہ کو نقصان پہنچاتے رہتے ہیں، لہٰذا اس کی بنیادیں مضبوط کر کے اُس کی سطح (کرسی) کچھ بلند کر دی جائے. چنانچہ اِس مرتبہ قریش نے چار گز اور ایک بالشت کعبہ شریفہ کی اندرونی سطح کو اونچا کر دیا اور چھت کی بلندی پہلے سے دگنی کر دی اور اندر تین تین پائے دو قطاروں میں کھڑے کر کے چھت کو مضبوط کر دیا. دیواریں طول میں چھ گز ایک بالشت کم کر دیں اور عرض میں بھی ایک نئی بنیاد کچھ کم کر کے کھودی اور دیواریں پختگی سے اٹھائی گئیں. چھت کا پانی اتارنے کے لیے پرنالہ اُس مقام پر ڈالا جو جگہ دیواروں کے طول میں چھوڑ دی گئی تھی. کعبہ شریفہ کے اندر ایک لکڑی کی سیڑھی چھت تک بنائی اور چھت میں ایک روشندان بھی رکھا، تاکہ اندر روشنی پڑتی رہے اور جب کبھی ضرورت ہو تو اُسی کے راستے چھت پر بھی چڑھ سکیں. پھر اُس کے ایک کونے میں حجرِ اسود بھی گاڑ دیا گیا اور یوں کعبۃ اللہ کی تعمیر قریش پوری ہوئی. یہاں پر

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حجر اسود کا کچھ تذکرہ کردیا جائے. جس سے عوام کے معلومات میں اضافہ ہو.

حجر اسود کیا ہے

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے جب کعبۃ اللہ کی دیواریں اٹھائیں، تو آپ کو کسی اچھے سے پتھر کی طلب ہوئی جو بطور یادگار کعبۃ اللہ شریف کے کونے پر نصب کریں. چنانچہ مذہبی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر کوہ ابوقبیس نے زبان حال سے پکار کر کہا کہ یہ امانت ازل سے میرے سپرد ہے اور اسی پہاڑ کا ایک صاف و چوکور پتھر لے کر سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے وہاں نصب کردیا لیکن یہ روایت قرینِ قیاس معلوم نہیں ہوتی، کیونکہ جب کعبہ مکرمہ کی ساری عمارت پتھر کی ہے تو پھر اس میں کسی مزید پتھر سے اضافہ اور اس خصوصیت کے ساتھ کہ کعبۃ اللہ کی باقی تعمیر میں اس کو امتیازی شان حاصل ہو، کیا معنی رکھتا ہے؟ بلکہ اِس کی اہمیت و خصوصیت اس امر کی مقتضی ہے کہ اس پتھر (حجر اسود) کی کوئی نمایاں حیثیت ہے جو اس کو خانہ کعبہ کے تمام عمارتی پتھروں سے ممتاز کر رہی ہے. اگر یہ بھی عام پتھر ہوتا تو اس کے یہاں پر گاڑنے کی کوئی خاص ضرورت نہ ہوتی. معلوم ہوتا ہے کہ اس پتھر (حجر اسود) سے کوئی خاص بات وابستہ ہے جس کے باعث اس کا یہاں پر نصب کیا جانا ضروری سمجھا گیا.

بعض اسرائیلی روایات میں یوں بھی بتایا گیا ہے کہ حجر اسود ایک سیاہ رنگ کا پتھر ہے جو حضرت سیدنا ابوالبشر آدم علیہ السلام کے ساتھ جنت سے اترا تھا اور برف سے زیادہ سفید تھا. بعض روایتوں میں ہے کہ یہ ایک فرشتہ تھا جس کے روبرو اللہ تعالیٰ نے عہدِ الست لیا اور یہ قیامت کو گواہی دے گا. عہد الست کے بعد اس کی صورت فرشتے سے پتھر کی کردی گئی اور کعبہ میں نصب کردیا لیکن اس روایت کی حقیقت حضرت عمرؓ کے اس قول سے کُھل جاتی ہے کہ ''اے حجر اسود! تو ایک معمولی پتھر ہے، نہ کسی کو نفع دے سکتا ہے نہ ضرر، اگر تجھ کو سرورِ کائنات ﷺ نے بوسہ نہ دیا ہوتا تو میں تجھ کو کبھی بوسہ نہ دیتا.''

ایک روایت میں یوں بھی آیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تعمیر کعبہ سے پہلے بطور ''سُترہ'' اس پتھر کو سامنے رکھ کر نماز ادا کیا کرتے تھے. تعمیر کعبہ کے وقت اس کو بھی تیمناً کعبہ مکرمہ کے کونہ میں نصب کردیا.

طبرانی میں ایک روایت ہے کہ حجر اسود جنت کا پتھر ہے اور زمین پر جنت کی کوئی چیز سوائے اس کے اور نہیں. یہ بلور سفید کی طرح روشن تھا. نجاستِ جاہلیت اگر اِس کو نہ لگتی تو جو دُکھ والا اِس کو چُھوتا وہ اچھا ہوجاتا. ابنِ خزیمہؒ کی روایت میں یوں بھی ہے کہ یہ جنت کے یواقیت سے ایک یاقوت ہے، جس کو مشرکین کی خطاؤں نے سیاہ کر ڈالا ہے. حدیث ابن عباسؓ میں مرفوعاً اِس طرح بھی آتا ہے کہ

حجر اسود جنت سے اترا ہے. دودھ سے زیادہ سفید تھا مگر بنی آدم کی خطاؤں نے اِس کو سیاہ کر دیا. نیز ابن عباسؓ مرفوعاً راوی ہیں کہ خداوندِ عالم "حجر اسود" کو قیامت کے دن ایسی صورت میں اٹھائے گا کہ اُس کی دو آنکھیں ہوں گی جن سے دیکھے گا، اور ایک زبان ہوگی جس سے بولے گا، اور جس کسی نے حق سمجھ کر چوما ہے اُس کی گواہی دے گا. ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے. ابن خزیمہ و ابن حبان نے بھی اس کو روایت کیا ہے اور طبرانی کے الفاظ کبیر میں یوں ہیں "يَبْعَثُ اللّٰهُ الْحَجَرَ الْاَسْوَدَ وَ الرُّكْنَ يَمَانِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَهُمَا عَيْنَانِ وَلِسَانَانِ وَشَفَتَانِ يَشْهُدَانِ لِمَنْ اِسْتَلَمَهُمَا بِالْوَفَاءِ" یعنی حجر اسود و رکن یمانی قیامت کو دونوں کے لیے آنکھیں، زبان اور لب ہوں گے اور یہ دونوں اپنے مستلم کے لیے (چھونے والے پر ایمان کی) گواہی دیں گے.

حجر اسود کی سیاہی اور شکستگی کی نسبت اخبار مکہ کا مصنف لکھتا ہے کہ وہ دو دفعہ آگ میں جل جانے کی وجہ سے سیاہ ہو گیا ہے. ایک دفعہ زمانہ جاہلیت میں ایک عورت کے ہاتھ سے کعبہ شریفہ کے پردے میں خوشبو جلاتے وقت آگ لگ گئی تھی جس کے سبب سے بیت اللہ اور حجر اسود دونوں جل گئے تھے. دوسری دفعہ زمانۂ اسلام میں بعد حکومت ابن زبیرؓ آگ لگی تو حجر اسود جل کر تین ٹکڑے ہو گیا اور ابن زبیرؓ نے اِس کے گرد مضبوطی اور تینوں ٹکڑوں کو قابو رکھنے کے لیے چاندی کا حلقہ چڑھا دیا. اور اس سے قبل کا ایک وہ واقعہ بھی ہے کہ جب سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ابھی صغیر سن ہی تھے کہ خانہ کعبہ میں آگ لگی تھی اور ساری عمارت جل گئی جس کو قریش نے نئے سرے سے تعمیر کیا، مگر حجر اسود کو اُس کے مقام پر نصب کرنے کے لیے تمام قبائل قریش میں فساد رونما ہو گیا. ہر قبیلہ یہی چاہتا تھا کہ حجر اسود کے نصب کرنے کا فخر اُسی کو حاصل ہو اور قریب تھا کہ تلواریں بے نیام ہو جاتیں اور کشت و خون تک نوبت پہنچتی لیکن حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے حجر اسود نصب فرما کر اِس جھگڑے کا خاتمہ کر دیا.

حجر اسود کے متعلق ایک بڑی مشہور روایت یہ بھی ہے کہ قبیلہ بنو جرہم جس کا پیچھے ذکر ہوا ہے، جب اپنی خامیوں کی وجہ سے حکومت چھوڑ کر مکہ معظمہ سے نکلا تو انہوں نے یہ ایک شرارت کی کہ حجر اسود کو زمزم کے کنوئیں میں ڈال کر اوپر سے چاہِ زمزم کا منہ بند کر دیا اور خود بھاگ گئے. مدتیں گزر گئیں اور کسی کو حجر اسود اور زمزم کا خیال تک نہ آیا کہ زمزم نکالیں اور نہ یاد ہی رہا کہ وہ کہاں تھا. ہاں ضرورت کے لیے مختلف مقامات پر کنوئیں کھود لیے گئے تھے اور لوگ اُنہیں کا پانی پیتے تھے. یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا حضرت عبد المطلبؓ نے بحکمِ الٰہی خواب میں اس موقعہ کو دیکھ کر زمزم کو نکالا اور اسی سے حجر اسود بھی برآمد کیا.

سیدنا مولا مشکل کشا حضرت علی کرم اللہ وجہٗ اس خواب حضرت عبد المطلب کے متعلق یوں ارشاد فرماتے ہیں کہ حضرت عبد المطلبؓ نے کہا کہ میں سو رہا تھا کہ مجھے خواب میں ایک شخص نے کہا کہ

طیبہ کو کھودو، میں نے پوچھا طیبہ کیا چیز ہے؟ تو وہ شخص بغیر جواب دیئے چلا گیا اور میں بیدار ہو گیا.
دوسری رات پھر وہی شخص آیا اور حکم دیا کہ مضنونہ کو کھودو تو میں نے پھر گزارش کیا کہ مضنونہ کیا شئے ہے؟
قبل اس کے کہ میں جواب سنوں میں بیدار ہو گیا اور وہ صاحب تشریف لے گئے. تیسری شب پھر وہی
بزرگ سامنے آئے اور فرمانے لگے زمزم کھودو. میں نے عرض کیا زمزم کیا ہے؟ تو فرمانے لگے بہت پانی
نکلے گا اور تم کو زیادہ مشقت بھی نہ کرنی پڑے گی. وہ اُس جگہ ہے، جہاں لوگ قربانیاں کرتے ہیں اور
جہاں چیونٹیوں کا بل ہے. تم صبح وہاں جاؤ گے تو وہاں ایک کوا چونچ سے زمین کریدتا ہوا پاؤ گے. پس وہی
جگہ آبِ زمزم کی ہے. چنانچہ جب حضرت عبدالمطلبؓ نے کھودا تو پانی بڑے زور سے نکلا. صفائی کرائی گئی
تو اس کے اندر سے دو سونے کے بنے ہوئے ہرن اور بہت تلواریں اور حجر اسود بھی نکلا. چنانچہ علامہ ابن
خالد نے لکھا ہے کہ ہرن ایرانی زائروں نے کعبہ پر چڑھائے تھے.

حجر اسود کے متعلق مؤرخین نے ایک اور بھی عجیب سا واقعہ لکھا ہے اور وہ یہ ہے کہ فرقہ قرامطہ میں
جو نہایت گمراہ فرقہ تھا ایک شخص ابو طاہر تھا جو بڑا ظالم اور سنگ دل تھا. حاجیوں کو لوٹنا، مسلمانوں کو قتل کرنا
اس کا ایک دل خوش کن مشغلہ تھا. 317 ہجری میں اُس نے عین حج کے موقعہ پر مکہ معظمہ پر حملہ کیا،
حاجیوں کو مارا، کعبہ کی بے حرمتی کی اور حجر اسود اکھاڑ کر اپنے وطن لے گیا اور اس کو اپنے ایک مکان میں
گاڑ کر اُس کا نام ''دارالہجرۃ'' رکھا. اس سے اس کی غرض کعبہ شریفہ سے لوگوں کی روگردانی کرانا تھی مگر یہ
پوری نہ ہو سکی اور کعبہ کو چھوڑ کر کسی نے اس کے ''دارالہجرۃ'' پر توجہ بھی نہ دی. آخر اس کے مسلّم امام
عبیداللہ مہدی نے اس کو لکھا کہ حجرِ اسود کو خانہ کعبہ میں واپس کر دو. مگر اس نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی. پھر
عبیداللہ مہدی کے بعد جب منصور ابن القائم بن المہدی امامتِ اسمٰعیلیہ کا وارث ہوا تو اس نے ابو
طاہر کے بھائی ابوالقاسم کو لکھا کہ اگر تم حجرِ اسود کو مکہ مکرمہ میں واپس کر دو، تو میں تمہیں پچاس ہزار دینار
دوں گا لیکن اس نے قطعاً توجہ نہ کی. آخر ابو طاہر جب مرضِ چیچک سے 332 ہجری میں مر گیا تو قرامطہ کی
طاقت رُو بزوال ہونے لگی تو اس وقت ابو طاہر کی موت کے سات سال بعد 339 ہجری میں خاص
عیدالضحیٰ کے دن معنبر بن حسین قرمطی حجر اسود کو لے کر مکہ معظمہ میں آیا اور جہاں اس کا مقام تھا اس کو
نصب کر دیا. غرضیکہ حجر اسود بتیس سال تک خانہ کعبہ سے علیحدہ شہر ہجر میں رہا اور اس کے بعد اصلی جگہ پر
پہنچا پھر کسی ملحد کو کبھی بھی اس کی بے حرمتی کی جرات نہیں ہوئی.

تعمیر ابن زبیرؓ

امیرِ شام حضرت امیر معاویہؓ کی وفات کے بعد جب یزید جیسے ناہنجار انسان نے تخت سنبھالا تو
حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے اُس کی بعض خامیوں کے پیش نظر اُس کی بیعت سے انکار کر دیا جس کا

نتیجہ یہ ہوا کہ یزید نے اپنی قوت منوانے اور بیعت کا پابند بنانے کے لیے حصین بن نمیرہ کو فوج دے کر مکہ معظمہ پر حملہ کو بھیج دیا اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کئی معرکوں کے بعد شہر میں محصور ہو گئے۔ حضرت عبداللہ کے حفاظتی دستے بیت اللہ شریف کے گرد خیموں میں پڑے تھے اور یزیدی فوج حصین بن نمیرہ کی کمان میں کوہ ابوقبیس پر سے سنگباری میں مشغول تھی۔ جس کی وجہ سے غلاف کعبہ ریزہ ریزہ ہو گیا۔ اسی دوران میں ایک خیمے کو کسی وجہ سے آگ لگ گئی۔ ہوا تیز تھی آگ کے شعلوں نے بیت اللہ شریف کو لپیٹ میں لے لیا اور تمام عمارت کعبہ مکرمہ جل گئی۔ یہ حادثہ 3 ربیع الاول 62 ہجری کو ہوا اور 14 ربیع الاول 62 ہجری کو یزید مر گیا۔ جس کی خبر سن کر 5 ربیع الثانی کو حصین بن نمیرہ بغیر جنگ کو طول دیئے واپس شام چلا گیا۔

اس طرح عبداللہ بن زبیرؓ نے جنگ سے نجات پا کر شرفاءِ مکہ کو بلایا اور کعبۃ اللہ کی نئی تعمیر کا ارادہ ظاہر کیا۔ سابقہ سوختہ عمارت ہموار کر دی گئی اور زمین سے جب نئی بنیادیں استوار کی جانے لگیں تو اتفاق سے سیدنا ابراہیمؑ کے ہاتھ کی رکھی ہوئی سابقہ بنیاد نکل آئی جس پر حضرت ابن زبیرؓ نے عمارت اٹھائی اور دروازے ایک کی بجائے دو رکھ دیئے تا کہ حاجی لوگ مشرقی دروازہ سے داخل ہوں اور مغربی سے باہر نکل جایا کریں سطح کی بلندی چھانٹ دی۔ چوکھٹ کو زمین پر کھڑا کر دیا اور اندرونی بلندی قریش کی بلندی سے 9 گز اور زیادہ کر دی۔ قریش نے کعبہ میں چھ ستون بنا رکھے تھے ان کی بجائے حضرت عبداللہ نے صرف تین رہنے دیئے۔

تعمیر حجّاج بن یوسف

جب عبداللہ بن زبیرؓ کا دورِ حکومت ختم ہو گیا اور وہ عبدالملک بن مروان کے ایما پر شہید ہو گئے اور حجاج بن یوسف مکہ میں داخل ہوا تو اس نے عبدالملک کو لکھا کہ ابن زبیر نے کعبہ میں بعض وہ چیزیں زیادہ کر دی ہوئی ہیں جو پہلے نہ تھیں اور ایک دروازہ بھی بڑھا دیا ہوا ہے، تو اس کے جواب میں عبدالملک نے لکھا کہ اس دروازہ کو بند کر دو اور جو کوئی اور زیادتی بھی ابن زبیر نے کی ہے وہ سب مٹا دو، چنانچہ حجاج نے چھ گز اور ایک بالشت کعبہ کو کم کر دیا۔ قریش کی بنیادوں پر دیواریں اٹھائیں۔ نیا دروازہ قطعی بند کر دیا اور اندرونی سطح چار گز ایک بالشت رکھ کر بھرتی ڈلوا دی۔ چھت کے اوپر جانے کے لیے اندر کی جانب ایک زینہ (سیڑھی) بنائی اور روشنی کے لیے دو روشندان نکلوا دیئے۔

تعمیر تُرکی

جیسا کہ پیچھے ذکر ہوا ہے کہ کعبۃ اللہ کی عمارت کو اکثر حوادثات جو پیش آئے اور اس کو نقصان

پہنچتا رہا اس کے دو ہی سبب ہوتے رہے. نمبر 1 سیلاب کا پانی، نمبر 2 اتفاقیہ آگ لگنا.

کعبۃ اللہ کی وہ عمارت جو حضرت عبداللہ زبیرؓ نے بنوائی تھی، ان عمارتوں میں سب سے آخری اور پختہ عمارت تھی، جو وقتاً فوقتاً بنائی جاتی رہیں اور اسی عمارت کو سب سے زیادہ سیلابوں کا مقابلہ بھی کرنا پڑتا اور یہی وہ عمارت تھی. جس کے کہنہ اور بوسیدہ ہونے سے سلطنتِ ترکی کو از سر نو کعبۃ اللہ تعمیر کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی. قبل اس کے کہ تعمیر ترکی کا ذکر کیا جائے، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان سیلابوں پر نظر ڈال لی جائے جو یکے بعد دیگرے اس کی شکستگی کا باعث بنتے رہے.

اس امر میں ہمیں سب سے عمدہ وضاحت کتاب تاریخ بیت اللہ شریف میں ملتی ہے. جس میں لکھا ہے کہ ایک سیلاب 97 ہجری میں بہ زمانہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ آیا. دوسرا 120 ہجری میں. جس کو سیل ابوشاکر کہا جاتا ہے. تیسرا 141 ہجری میں جو سیل مخبّل کہلاتا ہے. چوتھا سیل حنظلہ جو 203 ہجری میں آیا. جس سے بہت زیادہ نقصان ہوا، پانچواں 208 ہجری میں آیا جس سے تمام حرم، مٹی کنکر اور پتھروں سے بھر گیا. چھٹا 253 ہجری میں آیا اور پانی حجر اسود تک چڑھ گیا. ساتواں 266 ہجری میں اور آٹھواں 424 ہجری میں آیا، جو کسی شدید نقصان کا باعث نہ بنا. نواں 14 ذیقعد 682 ہجری میں آیا، جس سے حرم شریف میں پونے آٹھ فٹ پانی چڑھ گیا اور پانی کے زور سے مسجد الحرام کے کئی ستون اکھڑ کر گر گئے. دسواں 738 ہجری میں آیا جس کا پانی ساڑھے چار گز کی بلندی پر بیت اللہ شریف کے اندر بھر گیا. گیارھواں 10 جمادی الاول بروز پنج شبنہ 802 ہجری میں آیا جو نہایت بے پناہ تھا. بارھواں 22 ذوالحجہ 810 ہجری کو بوقت عصر آیا جس نے چھوٹی موٹی پہاڑیوں پر بھی زلزلہ پیدا کر دیا. تیرھواں 880 ہجری میں آیا جس کے پانی میں تمام شہر ڈوب گیا اور جب کچھ وقت کے بعد پانی اترا تو صرف حرم شریف میں ہی ایک سو اسی لاشیں آدمیوں کی تھیں. چودھواں 14 ذیقعد 887 ہجری میں آیا جس کا پانی خانہ کعبہ میں قدِ آدم تھا اور شہر کے سینکڑوں مکانات تباہ ہو گئے اور حرم شریف سے ستر لاشیں آدمیوں کی نکلیں. پندرھواں 1039 ہجری میں آیا جس سے ڈھور ڈنگروں اور دکانات کا کافی نقصان ہوا.

یہ تھے وہ سیلاب جن کے متواتر حملوں سے بیت اللہ شریف کی دیواریں بوسیدہ ہو چکی تھیں اور اہالیان مکہ اور شریفِ مکہ ادریس نے سلطان ترکی احمد خان بن سلطان محمد خان رابع کو لکھا کہ خانۂ خدا کی دیواریں نہایت بوسیدگی کی حالت میں ہیں. اُن کی اگر جلدی خبر گیری اور حفاظت نہ کی گئی تو عمارت کے انہدام کا خطرہ ہے. اس پر سلطان احمد خان و اراکین سلطنت نے فیصلہ کیا کہ بیت اللہ شریف کے بار بار بنانے اور گرانے کو مشغلہ نہیں بنانا چاہیے. بہتر ہے کہ پوری عمارت کو دو دو آہنی تالوں اور پیٹیوں سے مضبوط کس دیا جائے، جس سے عمارت گرنے سے محفوظ رہ سکے اور خوبصورتی کے لیے اُن پیٹیوں پر چاندی اور سونے کا پترا چڑھا دیا جائے اور میزابِ رحمت (پرنالہ) کو بھی جو سلطان سلیمان کے زمانہ

سے چاندی کا چلا آیا تھا.سونے کا لگا دیا جائے. چنانچہ ایسا ہی ہوا اور یہ تمام اشیاء 15 رجب المرجب 1030 ہجری المقدس کو قسطنطنیہ ہی میں تیار ہو کر حسن پاشا معتمد سلطنت کے ساتھ براستہ مصر مکۃ مکرمہ کو روانہ کر دی گئیں اور اُن کے متعلق ایک حکم نامہ محمد علی پاشا خادمِ مصر کو بھی لکھ دیا گیا تا کہ مکۃ مکرمہ تک محفوظ پہنچانے میں مدد کر سکے. یہ تمام اشیاء مکۃ معظمہ میں پہنچیں اور حسب ضرورت مرمت کر دی گئی مگر اِس مرمت کو ابھی صرف 19 سال ہی گزرے تھے کہ 19 شعبان المعظم 1039 ہجری بروز چہار شنبہ کو سخت سیلاب آیا اور حرم شریف میں تین دن تک پانی کھڑا رہا. 21 شعبان کی عصر کو رُکن شامی اور رُکن عراقی کی دیواریں اس زور سے گریں کہ کئی آدمی اُن کی دہشت سے لقمۂ اجل ہو گئے. اِس حادثہ کو محسوس کرتے ہوئے شریفِ مکۃ امیر مسعود نے اکابرین شہر کو جمع کیا اور اِس حادثہ کی اطلاع بذریعہ والیٔ مصرِ آستانہ کو روانہ کر دی. چنانچہ والی ٔ مصر نے قبل اس کے کہ جواب شاہی آئے، اپنے ملازمِ خاص رضوان آغا کو حکم دیا کہ ایامِ حج قریب ہیں، تم جلدی پہنچو اور حرم شریف کو صاف کرا کے مرمت کا کام شروع کر دو. رضوان آغا مکۃ مکرمہ میں پہنچا اور بہ ہزار دشواری علماء کرام کے فتووں کے بعد عملی تعمیر کی ابتدا کر دی. سبیل آفندی نے اپنے روزنامچے میں لکھا ہے کہ حرم شریف میں سے صفائی کرتے ہوئے ہر روز چالیس ہزار من بوجھ اونٹوں کے مٹی اور کنکر کے نکالے جاتے تھے. الغرض 5 شوال 1040 ہجری کو یہ تعمیر مکمل ہوئی اور یہی موجودہ عمارت ہے جو سلطان عمار بن سلطان احمد خان والیٔ قسطنطنیہ نے تعمیر کی اور آج تک بفضلہٖ تعالیٰ قائم ہے.

تاسیسِ شریعت

﴿ يَآأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ○ قُمْ فَأَنْذِرْ ○ وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ ○
وَ ثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ○ وَ الرُّجْزَ فَاهْجُرْ ○ ﴾

''اے چادر اُوڑھنے والے اُٹھ، اور لوگوں کو ڈرا، اپنے رب کی بڑائی بیان کر،
اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھ، اور بتوں کو (حسبِ سابق) چھوڑ دے۔'' [المدثر۷۴:۱-۵]

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اعلانِ نبوت فرمایا اور خفیہ تبلیغ کا آغاز کیا تو سب سے پہلے بسم اللہ گھر سے شروع کی اور حضرت خدیجہؓ سے فرمایا کہ مجھے تبلیغ کا حکم مل گیا ہے اور میں تمام دنیا کی اصلاح و ہدایت کے لیے مبعوث فرمایا گیا ہوں۔

حضرت خدیجہؓ چونکہ فطری طور پر سعید فطرت اور آپ کی غمگسار و انتہائی فرمانبردار تھیں، فی الفور ایمان لے آئیں۔ اُن کے بعد آپ کے پروردۂ آغوش حضرت علیؓ مشرف باسلام ہوئے۔ پھر ان کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت ہوش مندی و معاملہ فہمی سے اُن حضرات میں تبلیغ شروع کی، جن کو آپ کے اخلاق، شرافت، دیانت اور صحبت کا پورا تجربہ تھا اور جو مدت سے آپ کو راستباز، پاکیزہ خُو اور امین سمجھنے میں خلوص اور یقین کے تمام مدارج طے کر چکے تھے مثلاً حضرت صدیق اکبرؓ جن سے تمام معززینِ مکہ، اکثر ذاتی امور میں مشورے لیتے اور عزت کرتے تھے۔ کیونکہ یہ نہایت فیاض، دانش مند، متمول، معاملہ فہم، ذی عقل، شریف النفس، ماہر انساب تھے۔ آپ کی دعوت پر اسلام قبول کر گئے۔ پھر انہی کی ترغیب سے حضرت سعد بن وقاصؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت زبیر بن العوامؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت عثمان بن عفانؓ (جو کہ عشرہ مبشرہ میں سے تھے) رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ نورِ ایمان کے حصول میں آگے بڑھے اور مشرف باسلام ہوتے چلے گئے۔ یہ سب بزرگ اپنی اپنی جگہ ذی اقتدار اور بااثر تھے اور اسلام کو یہ شرف حاصل ہے کہ سب سے پہلے جو لوگ ایمان لائے اُن کی لیاقت، شرافت، وجاہت اور ہوش مندی مسلّم تھی اور زر و دولت میں بھی امتیازی حیثیت کے حامل تھے اور ان لوگوں کی طرح نہ تھے۔ جن پر مال و متاع اور رزق روٹی کا لالچ دے کر آج عیسائیت اور دیگر مذاہب ہاتھ صاف کر رہے ہیں۔

اس سے آپ کے ساتھ ذی اثر اور باہوش بزرگوں کی ایک مختصرسی جماعت تیار ہوگئی. جو بجائے خود اسلام کا ایک ایک مبلغ تھا اور مخفی طور پر سرگرمی کے ساتھ تبلیغِ اسلام میں مصروفیت رکھتا تھا. یہ ربّ العزت کا احسان اور سرکارِ دو عالم ﷺ کی تبلیغ کا اثر تھا کہ جس کے کانوں میں یہ حق کی آواز پہنچتی اُس کے دل میں اتر جاتی اور وہ فوراً اسلام لے آتا چنانچہ رفتہ رفتہ یہ سلسلہ اندر ہی اندر پھیلتا اور بڑھتا چلا گیا جس کے نتیجے کے طور پر حضرت عثمان بن مظعون، ابوعبیدہ، بلال، سعید بن زید، عمر بن عنسہ، عبداللہ بن مسعود، حباب بن ارث، زید بن ارقم، عبداللہ الاسد بن بلال، عامر بن فہیرہ، سائب بن عثمان، ابو حذیفہ بن عتبہ اور خالد رضی اللہ عنہم بھی زیرِ لوائے اسلام آ گئے.

گو یہ سب حضرات اپنے اپنے فیصلہ میں ایک نمایاں حیثیت کے مالک تھے مگر ابھی تک اسلام کی تبلیغ پوری طرح خفیہ اور احتیاط کے ساتھ کی جارہی تھی اور محرمانِ اسرار اور واقفانِ راز کے سوا کسی کو بھی علم نہ ہونے پاتا تھا. نماز کا وقت آتا تو وہ فریضہ بھی پوشیدہ طور پر کسی پہاڑ کی گھاٹی میں یا کسی سکوتی مکان کے کونے میں ادا کیا جاتا چنانچہ ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کسی پہاڑ کے درّے میں نماز پڑھ رہے تھے کہ آپ کے والدِ بزرگوار اُدھر آ نکلے اور دیر تک کھڑے غور سے دیکھتے رہے. آپ جب فراغت پا چکے تو سوال کیا کہ یہ کون سا دین ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ ہمارے دادا ابراہیم علیہ السلام کا یہی دین تھا. ابو طالب بولے میں اس دین کو اختیار تو نہیں کرسکتا لیکن تمہیں بھی نہیں روکتا تم کو میری طرف سے اجازت ہے اور کوئی بھی تمہاری مزاحمت نہ کر سکے گا.

تین برس تک خفیہ تبلیغ کا سلسلہ جاری رہا اور اس تمام مدت میں قریباً سوسوا سو افراد نے ایمان قبول کیا. پھر جب رحمتِ کاملہ نے دیکھ لیا کہ جتنے شریف النفس اور نیک نہاد لوگ تھے وہ تقریباً سب کے سب اسلام لے آئے ہیں تو علانیہ تبلیغ کا حکم صادر ہوا ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَ اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ﴾ یعنی تجھے جو حکم دیا گیا ہے اب علانیہ اُس کی تعمیل کر اور اپنے رشتہ داروں کو خداوندِ عالم سے ڈرا چنانچہ آپ نے لوگوں کو جمع کیا اور کوہِ صفا پر کھڑے ہو کر فرمایا:

"اے معشر قریش! اگر میں تم سے یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے سے ایک لشکرِ جرار بڑھتا چلا آتا ہے اور وہ تم پر شب خون مارے گا تو تم مجھے سچا سمجھو گے یا جھوٹا؟ تو سب نے بیک آواز کہا کہ ہم آپ کو سچا سمجھیں گے، اِس لیے کہ ہم نے تجھے کبھی جھوٹ بولتے نہیں سنا. پھر آپ نے فرمایا کہ میں تمہیں ایک آنے والے خطرے سے آگاہ کرتا ہوں اگر تم ایمان نہ لاؤ گے تو تم پر عذابِ شدید نازل ہوگا."

یہ سن کر وہ سب لوگ برہم ہوئے اور جو جی میں آیا بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے. اس کے چند روز بعد ہی آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ ایک دعوت کا انتظام کرو، جس میں تمام خاندانِ عبدالمطلب کو

مدعو کیا جائے۔ چنانچہ وہ انتظام ہو گیا اور دعوت کے بعد آپ نے فرمایا کہ دیکھو میں ایک ایسا دین لے کر آیا ہوں جو دنیا اور عقبےٰ دونوں کی فلاح کا حامل ہے۔ تم بتاؤ کہ اس کی تبلیغ میں کون کون میرا ساتھ دے گا؟ اِس آواز کے جواب میں سوائے حضرت علیؓ کی آواز کے اور کوئی آواز نہ آئی۔ آخر آپ نے حرمِ کعبہ میں پہنچ کر اعلانِ توحید فرمایا جس پر چاروں طرف سے تلواریں بے نیام ہو گئیں اور بے پناہ حملہ ہو گیا جس میں ربیب حارث جو آپ کو بچانے آئے تھے شہید ہو گئے۔ اسلام کی راہ میں یہ پہلا خون تھا، جس سے پتہ چلتا ہے کہ آئندہ کیا کچھ ہوگا اور کیا کچھ ہونے والا تھا۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ اُن کے لیے ایک ناقابل برداشت آواز ہے اور جب بھی کبھی ایسی کوئی آواز پیدا ہوگی وہ اِس کے دبانے کے لیے بزورِ شمشیر ہر ممکن کوشش کریں گے۔ قتل کا یہ واقعہ اور اُن کا متعصبانہ جذبہ معمولی شئے نہ تھا کہ کسی آئندہ وقت میں دوبارہ ایسا اقدام اور صدائے توحید کا بلند کرنا اپنے آپ کے لیے موت کے مترادف ہوگا۔

ادھر نورِ نبوت کا استقلال اور وعدۂ الٰہی پر قیام ایک وہ چیز تھی جس نے اس واقعہ اور جلادانِ مکہ کی قساوت و شقاوت کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی اور پرِ کاہ کے برابر پرواہ تک نہیں کی۔ اس اعلانِ توحید کے بعد جو حرم شریف میں ہوا، ہر جگہ اعلانیہ تبلیغ شروع کر دی گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کجا ہر شخص آپ کی شرافت اور دیانت کا معترف ہوا کرتا تھا، کجا اعلانِ توحید کے بعد یہ حالت کہ مکہ کے زمین و آسمان آپ کے دشمن ہو گئے۔ بچہ بچہ مخالفت پر آمادہ نظر آنے لگا۔ عزیز و اقارب آنکھیں پھیر گئے اور جدھر کو نکلتے مذاق اڑایا جاتا۔ جہاں جاتے مخالفت ہوتی۔ تکلیفیں پہنچائی جاتیں اور بے روک ٹوک المناک مصائب میں مبتلا کیا جاتا۔

ایک بڑا مشہور واقعہ ہے کہ ابوجہل نے ایک دن آپ کو بہت ایذا دی۔ جس سے آپ بدحال ہو کر دیوارِ مسجدِ حرام کے ساتھ تکیہ کئے کھڑے ہو گئے۔ اتفاق سے حضرت امیر حمزہؓ کی لونڈی یہ پریشان کن منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ اُس نے جا کر تمام کیفیت حضرت حمزہؓ سے عرض کی کہ آپ کے یتیم بھتیجے کے ساتھ ابوجہل نے یہ سلوک کیا ہے۔ حمزہ ہزار اختلاف ہونے کے باوجود بھی آخر چچا تھے۔ طبیعت میں جوش آ گیا۔ اٹھ کھڑے ہوئے اور غصہ میں بھرے ہوئے ابوجہل کے پاس گئے اور کہا کہ تو نے محمد ﷺ کو کمزور سمجھ کر اُس سے وحشیانہ سلوک کیا ہے۔ میں تجھے تیری اس ناجائز اکڑفوں کا مزہ چکھا دوں گا۔ اب کچھ بول کر دیکھ۔ تجھے پتہ چل جائے گا کہ تیری اِس بے ہودگی کی سزا کیا ہے؟ میں آج اسلام قبول کر کے آیا ہوں۔ ابوجہل جانتا تھا کہ حمزہؓ ہمت و شجاعت میں جواب نہیں رکھتے۔ بولوں گا تو خیر نہیں۔ خاموش ہو رہا۔ حضرت حمزہؓ نے ایک کمان اُس کے سر پر ماری اور واپس لوٹ آئے اور گھر میں آ کر اسلام قبول کرنے کا سچ مچ اعلان کر دیا۔

اِس اعلان کو سن کر کفار کے حوصلے پست ہو گئے اور وہ سمجھے کہ اب اسلام دبانے سے بھی نہیں دبے گا مگر اُن کو یہ پتہ نہ تھا کہ اِس کے بعد سرکارِ دو عالم ﷺ کی ایک اور دعا بھی قبول ہو چکی ہے جس کا نتیجہ عمر بن الخطابؓ کے ایمان لانے کی صورت میں ظاہر ہونے والا ہے۔ سرکارِ دو عالم ﷺ نے کفار کی سفا کانہ روش کے مقابلے میں ایک دن ہاتھ اٹھائے اور دعا مانگی کہ الٰہی عمر بن ہشام (ابو جہل) یا عمر بن الخطاب دونوں عمروں میں سے ایک کو ایمان عطا فرما۔ چنانچہ دعا نے یہ سرفرازی عمرؓ بن الخطاب کے مقدر میں کر دی اور ایک دن عمرؓ بن الخطاب کے ایمان کا سامان ہو گیا۔ عمرؓ بن الخطاب جہاں غصہ ور اور بہادر تھے، وہاں جابر طبیعت ہونے کے علاوہ معاملہ فہم بھی تھے۔ مجلس کفار میں کہیں بات ہوئی۔ طبیعت جوش میں آ گئی۔ مشتعل ہو کر شمشیرِ برہنہ ہاتھ میں لیے چراغِ مصطفیٰ ﷺ کو بجھانے پر آمادگی کی اور چل دیئے۔ راستہ میں بہن بہنوئی کا گھر پڑا۔ وہاں جا گھسے۔ دیکھا تو بہن بہنوئی دونوں شمعِ اسلام کے پروانے نظر آئے۔ یہ دیکھ کر بہت جھنجلائے۔ ہمشیرہ کو سخت سست کہا۔ بہت سختی کی مگر ایک نہ بنی۔ آخر وہاں سے ہی قرآنِ کریم کی چند آیات سن کر ایسے متاثر ہوئے کہ غلامانہ طور پر دربارِ نبوت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔ پھر کیا تھا آپ کے اسلام لانے کے بعد مسلمانوں کے حوصلے بڑھ گئے اور اُنہوں نے حرمِ پاک میں جا کر علانیہ نماز پڑھی۔ پھر ایک شدید ہنگامہ ہوا جس میں ممکن تھا کہ کفار کی متحدہ یورش حضرت عمرؓ کو کوئی نقصان پہنچاتی مگر عاص بن وائل ایک متمول اور رئیس مکہ نے حضرت عمرؓ کو اپنی پناہ میں لے لیا۔ جس سے لوگ ہٹ گئے اور یہ قضیہ فرو ہو گیا۔ اِس کے بعد اُس چھبیس سالہ نوجوان حضرت عمر بن الخطابؓ کے اسلام لانے سے اسلام کو اتنی تقویت حاصل ہو گئی کہ اُس روز سے فرائض الاسلام حرمِ پاک میں اعلانیہ ادا ہونے لگے۔

یہاں یہ لکھنا بے جا نہ ہو گا کہ کرۂ ارض پر جس قدر اور جتنے بھی پیشوایانِ مذاہب اور علم بردارانِ اصلاح و عمل وقتاً فوقتاً تشریف لاتے رہے ہیں وہ ضرور شکارِ مصائب اور آماجگاہِ حوادث و ذمائم ہوتے رہے مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ کے اعلانِ نبوت پر جس شقاوت و قساوت سے کفار نے کام لیا، اس کی نظیر پوری تاریخ میں نہیں ملتی۔ کسی راہنما کو ایک نمرود، ایک فرعون اور ایک اسرائیل سے واسطہ پڑا ہو گا لیکن یہاں مکہ و طائف کا ہر امیر و رئیس بجائے خود فرعون و نمرود تھا۔ پہلے راہنماؤں میں ایک یہ بات تھی کہ مدِ مقابل جتنی قوم ہے اُن میں سے کسی ایک کی ہاں، اور ایک کی نہ، پوری قوم کی ہاں یا نہ متصور ہوتی تھی مگر مکہ میں اس ''ہاں'' یا ''نہ'' کا سوال ہی نہ تھا۔ کوئی اسلام قبول کرنا چاہے بھی تو نہیں کر سکتا تھا۔ اتنے پر پیچ اور الجھے ہوئے حالات تھے کہ اُن میں تبلیغ جیسے فریضہ سے عہدہ برا ہونا قریباً ناممکن تھا۔ سیاست، سیادت، رقابت وہ رکاوٹیں تھیں کہ خدا کی پناہ۔ ایک پتھر ہٹایا تو دوسرا اس کی جگہ آ گرا۔

ابتدائے اسلام سے مسلمانوں کے ستائے جانے اور ایذا رسانی کا سلسلہ شدت کے ساتھ جاری

ہو گیا. دم لینے کی مہلت نہ تھی. سیلابِ عقوبت و اذیت امنڈے ہوئے چلے آتے تھے. اِس لیے اُس وقت عقائد اور اعمال کی صورت بھی نہایت مختصر سی تھی اور اسلام کے لیے توحید و رسالت کا اقرار اور وہ بھی چھپ چھپا کر، تاریکیوں میں دو چار رکعت نماز پڑھ لینا کافی سمجھا گیا تھا. پہلی وحی الٰہی ﴿ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ ﴾ میں روحانی نسبت کے سوا کسی بھی مخصوص عقیدے کی تعلیم نہ تھی.

اِس کے بعد دوسری وحی ﴿ يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ...... الاخر ﴾. (یعنی اے چادر اوڑھنے والے اٹھ لوگوں کو ڈرا. اپنے رب کی بڑائی بیان کر اپنے کپڑوں کو پاک رکھ) صرف اتنا بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ بہت بڑا ہے. اُس کی عبادت کرنی چاہیے. اللہ کے خوف سے لوگوں کو ڈرانا چاہیے اور اُس کی عبادت کے لیے کپڑے بھی پاک ہونے چاہئیں. اس کے بعد پھر تمام آیات میں مولا کریم کی عظمت و کبریائی، جنت و جہنم و رسالت کی خصوصیات اور اُسی کے وجوہ و دلائل کہ اِس کی کیوں ضرورت ہے. یوم محشر کا نقشہ اور بت پرستی و مورتی پوجا کی مذمت کا بیان تھا، کیونکہ نبوت کا سیزدہ سالہ عرصہ جو مکہ میں گزارا وہ اسی ضرورت کا حامل تھا کہ عوام کے دلوں میں خدا جوئی، رِقت اور دماغوں میں خدائے قدوس کے جلال و ہیبت کا تصور قائم کیا جائے اور یہ سب کچھ محض عقائد سے متعلق تھا. پھر عذاب و ثواب کی آیات نازل ہو چکنے کے بعد اوامرِ احکام کا نزول ہوا. چونکہ مکہ معظمہ کے قیام تک روزہ فرض ہی نہ تھا. اِس لیے کہ اگر ہمارے پاس غذائے لطیف نہیں، آب خوشگوار نہیں اور زوجۂ جمیلہ نہیں تو ایسی حالت میں اُن تمام اشیاء سے منہ موڑ لینا کوئی حقیقی تقویٰ نہیں سمجھا جاتا. قوتِ ایمان اور ضبطِ نفس کا صحیح مقام یہی ہے کہ جذباتِ نفسانیہ کو مشتعل کرنے والے سامان موجود ہوں. پھر احتراز کر کے زہد و تقویٰ اور صبر و توکل کا امتحان دیا جائے. اِسی طرح زکوٰۃ، اسلام کا ایک اساسی فرض ہے لیکن رات دن جنگوں میں مسلمانوں کی مالی حالت ترقی پذیر نہ ہو سکتی تھی اِس لیے اُس کی فرضیت بھی سات آٹھ سال بعد ہوئی. ایسے ہی فریضۂ حج کا بھی حکم نہ آیا. کیونکہ 8 ہجری المقدس سے پیشتر تک تو مسلمانوں کو مکہ میں قدم رکھنے کی بھی اجازت نہیں تھی. نماز گو اسلام کے وجود کے ساتھ ہی فرض ہو گئی تھی لیکن اُس کی تکمیل بھی ہجرت کے چھ سال بعد ہوئی گویا فتح مکہ کے بعد جب مشرکین اور یہود و نصاریٰ کا تمام زور ٹوٹ گیا اور اسلام اپنی آب و تاب کے ساتھ نصف الانہار پر چمکنے لگا تو نظامِ شریعت کی تکمیل کا موقعہ ہاتھ آیا بلکہ اُس وقت بھی بعض احکام کا نزول نہیں ہوا تھا.

اسلام میں عقائد کے بعد سب سے اہم فرض نماز ہے. وضو پر عمل تو پہلے ہی سے تھا، لیکن اُس کی فرضیت ہجرت کے چار پانچ سال بعد ہوئی. پہلے لوگ وضو میں خالص احتیاط نہ برتتے اور جلد جلد کر لیا کرتے مگر نماز پڑھنے کے لیے اِس آیت شریفہ کے نزول نے ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ

اِلَی الْکَعْبَیْنِ﴾ ''یعنی مسلمانو! نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہوتو تم منہ اور ہاتھ کہنیوں تک دھولیا کرو اور سروں پر مسح کرو اور پاؤں ٹخنوں تک دھولیا کرو'' جو 5 ہجری میں نازل ہوئی. وضو ٹوٹے یا نہ ٹوٹے ہر نماز کے لیے وضو کرنا لازمی کر دیا اور آخر میں پھر ہر وقت وضو کرنا بھی لازم نہ رہا اور پہلے وضو ہونے کی شرط پر معافی ہوگئی تا کہ یہ پابندی بھی لوگوں پر گراں نہ گزرے اور فتح مکہ کے وقت اِس کا عام اعلان بھی کر دیا گیا.

نماز جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اظہارِ نبوت فرماتے ہی فرض ہوئی تھی اُس کی بھی یہ صورت ابتدا میں نہ تھی جواب ہے. کفار کی دن بھر کی شرارتوں سے مامون رہنے کے لیے رات کا زیادہ وقت قیامِ نماز میں خرچ کر دینے کا حکم تھا. جس کا ذکر سورۂ مزمل شریف کی ابتدائی آیات میں ملتا ہے نماز کی تدریجی کیفیت کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں صبح وشام کی دو دو رکعتیں فرض ہوئیں. ﴿وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّ اَصِيلاً وَّ مِنَ اللَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهُ وَسَبِّحْهُ لَيْلاً طَوِيْلاً﴾ ''یعنی صبح وشام خدا کا نام لیا کرو اور رات کے وقت دیر تک سجدہ کیا کرو اور اُس کی تسبیح بیان کرو'' دیر تک رات کو نماز پڑھنے کا یہ حکم ایک سال تک رہا. اِس کے بعد اُس کی فرضیت منسوخ ہوگئی اور دوسرا حکم آگیا جو سورۂ مزمل شریف ہی کی آخری آیات میں اِنَّ رَبَّکَ سے شروع ہو کر آخر تک بیان ہوا ہے. یعنی تیرا پروردگار جانتا ہے کہ تو دو تہائی رات سے کم، آدھی رات اور تہائی رات تک نماز پڑھا کرتا ہے اور تیرے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ایسا ہی کرتے ہیں. وہ خود ہی شب وروز کا اندازہ کرتا ہے. اس نے جان لیا کہ تم اسے گن نہیں سکتے. اس نے تم پر مہربانی فرمائی. اب جتنا تم سے ہو سکے اتنا ہی قرآن نماز میں پڑھو. اس نے جان لیا ہے تم میں بیمار بھی ہوں گے. مسافر بھی ہوں گے.. جو اپنی معاش کے لیے مصروفِ سفر ہوں گے اور کچھ لوگ اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے سفر کریں گے. اس لیے اب تم سے جتنا ہو سکے اتنا ہی پڑھو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری مجبوریاں دیکھ کر تم پر فضل روا رکھا.

یہ رات کی نفل نماز تہجد ہے. اِس کے بعد مغرب وعشاء کی نمازیں فرض ہوئیں اور جوں جوں حالات رُو بہ اصلاح ہوتے گئے، احکام میں ترمیم ہوتی گئی اور پانچویں سال تک شبِ معراج میں پانچوں وقت کی نمازیں فرض ہوگئیں، مگر رکعتیں نماز کی دو ہی تھیں. مدینہ منورہ پہنچ کر صورتِ حالات میں طمانیت پیدا ہوئی تو اِس فرض نے بھی کچھ وسعت اختیار کر لی اور دو کی بجائے چار رکعتوں کی فرضیت آگئی مگر ابھی تک سکون نہ تھا. نماز میں بعض اوقات ایسی حرکات کر لی جاتیں کہ اگر آج کا مسلمان دیکھ پائے تو تعجب کرے مثلاً نماز میں منہ آسمان کو کر کے دیکھنا، نماز پڑھتے پڑھتے سلام کا جواب دے دینا، پاس پاس کھڑے نمازیوں کا آپس میں کوئی ضروری بات کر لینا، کسی ضروری کام کے یاد آجانے پر دوسرے سے کہہ دینا، سب کچھ روا تھا. 6 ہجری المقدس میں مہاجرین واپس آئے اور نماز کی حالت میں

دیکھ کر مسلمانوں کو سلام کیا. جواب نہ ملا تو حیران ہوئے. حضور ﷺ نے نماز سے فارغ ہونے کے بعد فرمایا کہ خداوندِ عالم نے نماز میں بات چیت کی ممانعت فرما دی ہے. اس وقت سے نماز پورے سکوت سے ادا ہونے لگی. تشہد کا بھی یہ طریق نہ تھا. مختلف اشخاص کے نام لے کر التحیات کے خاص الفاظ سکھائے گئے جو آج تک جاری ہیں. جب تکمیلِ فرائض ہوگئی تو نماز تمام تر خشوع و خضوع اور محویت کا پیکر بن گئی اور اٹھارہویں سپارہ کی شروع کی آیات نے نازل ہو کر نماز کو پورے سکون اور اطمینان کے ساتھ ادا کرنا فرض کر دیا اور یہ حالت ہوگئی کہ ایک شخص نے نماز جلدی جلدی پڑھی تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: نماز پھر پڑھو! تمہاری نماز نہیں ہوئی. یہاں تک کہ اُس نے تین مرتبہ نماز لوٹا کر پڑھی اور تین ہی بار حضور ﷺ نے فرمایا کہ پھر پڑھو نماز نہیں ہوئی. اس کے بعد سمجھایا کہ قیام، رکوع، قعود اور قومہ، سجدہ سکون و اطمینان کے ساتھ ادا کیا کرو اور نماز میں پوری احتیاط برتو. خشوع و خضوع کا حکم آتے ہی محویت و استغراق کا یہ عالم ہو گیا کہ حضرت فاروقِ اعظمؓ عین نماز کی حالت میں مجروح ہو کر گرتے ہیں مگر اس دلدوز حادثہ پر کوئی شخص مڑ کر بھی نہیں دیکھتا اور نماز کی محویت کسی کو اُدھر متوجہ ہی نہیں ہونے دیتی. کیسا عجیب حال ہے کہ ایک انصاری کے عین نماز کے وقت تین تیر لگتے ہیں مگر نماز کی نیت نہیں توڑتے. حضرت علیؓ کی محویت کا بھی یہی حال ہوتا تھا عین حالتِ نماز میں آپ کے پہلو میں اترا ہوا تیر کھینچ لیا جاتا ہے اور خبر ہی نہیں ہوتی.

روزہ کی تدریجی فرضیت

اس وقت تک کہ روزہ کا کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا، مسلمانوں کو حضور ﷺ نے یومِ عاشورہ کا ایک روزہ رکھنے کا حکم دیا، جس میں کھانا پینا اور عورتوں سے ہم بستری حرام تھی. چونکہ عرب لوگ روزہ کے کم خوگر تھے اور اُن پر یہ عبادت بڑی شاق تھی، اِس لیے اسلامی روزہ کی پابندیاں بتدریج نازل ہوئیں. ہجرت کے بعد آپ نے مسلمانوں کو صرف تین روزے رکھنے کا حکم دیا اور اس کے ساتھ روزہ رکھنے یا نہ رکھنے کا اختیار بھی حاصل تھا کہ اگر چاہو رکھو، نہ چاہو نہ رکھو، مگر نہ رکھنے کی صورت میں ایک مسکین کو بطورِ فدیہ کھانا ضرور کھلا دینا چاہیے. پھر فرضیتِ روزہ کا حکم آ گیا، جس میں روزہ بلا عذر شرعی نہ رکھنے کا اختیار جاتا رہا اور یہ حکم نازل ہو گیا کہ جب رمضان شریف آ جائے تو ضرور روزہ رکھو اور فدیہ کی اجازت صرف بیماروں اور مسافروں کو رہ گئی اور عملاً روزہ نہ رکھنے والے کے لیے سخت وعید اور سزا کا حکم آ گیا اور جہاں آپ نے مسلسل روزہ رکھنے کو منع فرمایا وہاں راتوں کو صبح صادق تک کھانے پینے اور تمام اشغال جاری رکھنے کی بھی اجازت فرما دی اور روزہ کا مقصد اتنی آسانیاں بہم پہنچا دینے کے بعد تعذیبِ جسمانی نہیں بلکہ ترکِ معصیت رہ گیا کیونکہ حضور ﷺ نے فرما دیا کہ جو شخص روزہ رکھ کر جھوٹ

اور معصیت کو ترک نہیں کرتا اُس کے صرف منہ باندھنے اور فاقہ کشی کرنے کی ضرورت نہیں.

زکوٰۃ کے احکام

روزہ تو 3 ہجری المقدس میں فرض ہو گیا مگر زکوٰۃ جیسا اہم فریضہ جس کا حکم قریباً نماز کے ہر حکم کے ساتھ ہے. ادا کاری کے لیے 8 ہجری میں جا کر فرض ہوا اور وہ بھی بتدریج اس منزلِ فرض تک پہنچا جس پر اب ہے. البتہ خیرات وصدقات کی تاکید شروع ہی سے جاری ہو گئی تھی اور وقت کی اقتضا کے مطابق یہ حکم آچکا تھا کہ جس کے پاس ضروریاتِ زندگی کے بعد کچھ بچے اُس کو خیرات کر دینا چاہیے کیونکہ مسلمانوں پر شدید افلاس طاری تھا اور مسلسل کئی کئی اوقات کے فاقے ہوتے تھے. پیٹ پر پتھر باندھنے تک کی نوبت آجاتی. اندریں حالات زکوٰۃ فرض بھی نہ ہو سکتی تھی. پہلا حکم ﴿ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ وَ لَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ ''یعنی جو لوگ سونا چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے اُن کے لیے آخرت میں سخت عذاب کی اطلاع ہے'' اِس کے بعد پھر وحی نازل ہوئی کہ ﴿ يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ ﴾ ''یعنی لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خیرات کرنا چاہیے؟'' اُن کو فرما دیجئے کہ مصارف و حوائجِ ضروریہ سے جو بچ رہے وہ سب خیرات کر دو. پھر حکم ہوا مسلمانو! اپنی کمائی میں سے اور اُس چیز سے جو ہم نے تمہارے لیے زمین میں پیدا فرمائی ہے اچھا حصہ خیرات کرو اِس حکم سے مسلمانوں پر واضح کرنا مقصود تھا کہ اچھا اچھا مال، پھل اور میوے محفوظ رکھنا اور بے کار وخراب اشیاء خیرات کرنا کوئی ثواب کا کام نہیں. پھر اِس حکم کی تائید میں مزید تاکید ہوئی کہ تمہیں اُس وقت تک کچھ ثواب نہ ملے گا جب تک تم اپنی محبوب چیزیں خیرات نہ کرو. اِس حکم سے ہر امیر وغریب مسلمان میں یہ رغبت پیدا ہوئی کہ وہ جو کمائے اپنے مصارف سے بعد بقیہ خیرات کر دے کیونکہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرما دیا تھا کہ خیرات کرو خواہ وہ نصف چھوہارہ ہی کیوں نہ ہو کہ وہ بھی تمہاری قبر کو روشن کرنے کے لیے کافی ہو گا. اِس سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں کم وبیش خیرات کرنے کا سوال ہی نہ رہا. جو جس کو توفیق ہوتی وہ خرچ کرتا اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں دیتا. ایسے ہی صدقہ فطر 2 ہجری میں واجب ہو چکا تھا اور فتح مکہ کے بعد مسلمانوں پر زکوٰۃ بھی فرض ہو گئی اور زکوٰۃ کے مصارف میں فقراء، مساکین، محصلینِ زکوٰۃ، مولفۃ القلوب، غلام، مقروض، مسافر اور عام. اِن کے علاوہ اُن کی راہ میں خرچ کرنا بیان فرما دیا گیا.

چونکہ ہجرت کے بعد حالات میں بڑا فرق ہو گیا تھا اور دو برس تک مسلمانوں کو کوئی اطمینان کا سانس لینا بھی نصیب نہیں ہوا تھا، اِس لیے یکم (1) ہجری میں صرف صدقۂ فطر، نمازِ عید، قربانی، روزہ اور تحویل قبلہ وغیرہ کے احکام ہی نازل ہوتے رہے پھر تعزیرات، مذمتِ شراب، احکامِ وقف و وصیت،

وراثت، نکاح وطلاق، کھانے پینے میں حلال وحرام کے احکام اِن کے بعد واضح ہوئے اور قتل وخون ریزی کی پاداش میں جزاوسزا، تحفظِ مال اور چوری اور راہزنی کاسدِ باب، زنا کا انسداد اوران کی حدود کے مسائل، شراب خوری وقمار بازی کا استیصال، تہمت، عفاف اور سزاوعفو، حفظِ جان ومال اورعزت و آبرو کے حقوق، نگہداشت، معاملات ومراتب دوسرے مذاہب اور غیر اقوام کا نظام آئین وحقوق زاں بعد بتدریج نازل ہوئے۔

نظامِ احیاءِ ملّت

﴿ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ﴾ ''پس تو اپنے رب کی نماز پڑھ اور قربانی کر'' [الکوثر ۱۰۸:۲]

قرآنِ کریم نے اعلانیہ بتایا ہے کہ حضرت خلیل اللہؑ کے مجاہدانہ کارنامے، مجاہدانہ تخیلات، مجاہدانہ تصورات اور مجاہدانہ اعمال واوصاف ہی اُن کی خلّت وعظمت کا باعث بنے. اُنھوں نے اللہ کی اطاعت کی، اُس کی محبت میں ہر محبوب شے سے اپنا رشتہ منقطع کرلیا اور اُس کے ہو رہے. اِس لیے اللہ کریم نے اُن کو نوازا اور اُن کی نسل کو بھی ساری دنیا میں برگزیدہ فرمادیا. سنتِ ابراہیمی کا یہی وہ سبق ہے جس کو سرورِ کائنات والتحیات نے دنیا والوں کے سامنے دہرایا اور اُسی کی یاددہانی کو کائناتِ انسانی و بشری کی ہدایتِ دائمی کے لیے مختص فرمادیا. سیدنا ابراہیمؑ کے انہی ارشادات واشارات کے ماتحت پیغامِ توحید باری تعالیٰ دنیا کے کونے کونے میں پہنچایا اور وحدت کے نورِ مبین کی ضیا پاشیوں سے ظلمت و ضلالت کے پردے چاک چاک کر کے صنم پرستوں اور اجرامِ سماوی کی پرستار اقوام کو آسمان وزمین کے خالق سے روشناس کرادیا.

اِبتلا وآزمائشِ ابراہیمی کے جتنے ابواب ہیں اُن میں سب سے بڑا اور واضح تر باب قربانی ہے جو انہوں نے ربِ کعبہ جل وشانہٗ کے اشارے پر بلاحیل وحجت وادیٔ غیر زرع میں کھولا اور جس پر آج مادہ پرستی کے دور میں عام جاہلوں نے وہ معاشی اعتراضات کیے جن سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کے دل ودماغ پر معاشی مفاد کی اہمیت کچھ ایسی بُری طرح مسلط ہوگئی ہے کہ معاشی قدر کے سوا کوئی دوسری قدر اُن کی نگاہوں میں باقی ہی نہیں ہے اور وہ بنیوں اور کنجڑوں کی طرح حساب لگا کر دیکھتے ہیں کہ ہر سال کتنے لاکھ یا کتنے کروڑ مسلمان قربانی کرتے ہیں اور اُس پر اوسطاً فی آدمی کتنا روپیہ خرچ ہوتا ہے. پھر اُس پر جب قربانی کے مجموعی خرچ کی ایک کثیر رقم اُن کے سامنے آجاتی ہے تو پھر اُنہیں حرص کا مروڑ پڑتا ہے اور چیخ اٹھتے ہیں کہ اتنا روپیہ جو قربانی کے ذریعے ضائع ہو رہا ہے اگر اِس کو معاشی منصوبوں پر خرچ کیا جائے تو کتنے فوائد حاصل ہوں. مگر اُنہیں معلوم نہیں کہ نظامِ احیائے ملت میں کتنے اعمالِ عشق و

محبت ہیں جو تیری معیشت کی میزان پر تول تول کر بے وزن نہیں سمجھے جا سکتے اور نہ اُن گہرے دریاؤں کا پانی فلسفیانہ خبط کے دو انچ گز سے ناپا جا سکتا ہے. اگر کوئی شخص اِسی طرح حج کے معاشی نقصانات کا ایک مہیب تخمینہ پیش کر دے یا تمام نمازیوں کے صرف اوقات کا کئی لاکھ گھنٹے جمع کر کے تضیع اوقات سے بچنے کا نقشہ بنا دے. یا یہی لغو منطق روزے کی بھوک پیاس کے خلاف استعمال کرے تو دین کے احکام کو جانچنے میں یہ معیار کہاں تک قابل قبول سمجھا جائے گا؟

بریں عقل و دانش بباید گریست

کاش کہ یہ چودھویں صدی کے ناواقف ریاضی دان، اسلامی احکام اور اُن کی اقتصادی مصلحتوں کو قرآن وحدیث کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتے اور یوں اپنی بے علمی کو آشکار ہونے سے بچا لیتے. کیا اُنہوں نے نہیں دیکھا کہ مسئلہ قربانی کے شروع ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ نبی ﷺ کے عہدِ مبارک سے لے کر آج تک مسلمانوں کی ہر نسل کے بعد دوسری نسل اِس پر عمل کرتی چلی آئی ہے. دو چار یا پانچ دس آدمیوں نے نہیں بلکہ ہر پشت کے لاکھوں کروڑوں بلکہ اَن گنت مسلمانوں نے اپنی سے پہلی پشت کے بے شمار مسلمانوں سے اِس عمل کو اخذ کیا ہے اور اپنے سے بعد والی پشت کے اربوں مسلمانوں کو پہنچایا ہے. اگر تاریخِ اسلام کے کسی مرحلے پر کسی آدمی نے اِس کو ایجاد کر کے دین میں شامل کرنے کی کوشش کی ہوتی جیسا کہ اِس کو مابعد کے مُلّاؤں کی ایجاد کہا جاتا ہے. تو کس طرح ممکن تھا کہ تمام مسلمان ہر زمانہ میں بالاتفاق اِس کو قبول کر لیتے اور کہیں کوئی بھی اس کے خلاف لب کشائی نہ کرتا اور کس طرح یہ بات تاریخ میں چھپی رہ سکتی تھی کہ اس طریقہ کو کب، کس نے اور کہاں ایجاد کیا ہے؟ آخر یہ امت ساری کی ساری نعوذ باللہ منافقوں پر ہی تو مشتمل نہیں رہی جو حدیثوں پر حدیثیں قربانی کی مشروعیت پر گھڑتی چلی جاتی اور ایک نیا اور نقصان دہ طریقہ ایجاد ہو کر رسولِ خدا ﷺ کی ذات سے منسوب ہوتا رہتا اور پوری کی پوری اُمت آنکھیں بند کر کے بلاچون وچرا اس کو اپنے عمل میں جگہ دیتی رہتی اور اگر نعوذ باللہ یہ مان لیا جائے کہ تمہارے متقدمین اسی قسم کے تھے تو ایک قربانی کیا ہے، رسالت، قرآن، نماز، روزہ، زکوٰۃ، سب کچھ ہی مشکوک ہو کر رہ جائے گا اور ایسا کون سا پہلو ہوگا جس کو اس شک سے بالاتر ٹھہرایا جا سکے گا.

افسوس ہے کہ بعض لوگ خوفِ خدا اور شرمِ خلق سے دور ہٹ کر علم اور سمجھ بوجھ کے بغیر جس دینی مسئلہ پر چاہتے ہیں کلہاڑی رکھ دیتے ہیں اور نہیں جانتے کہ ہماری اِس لاعلمی کی زد کس کس پہلو کو مجروح کرے گی اور سادہ لوح مسلمانوں کا عام طبقہ علمِ دین سے ناواقف ہوتے ہوئے اس فتنہ سے کس قدر متاثر ہوگا؟

اِن شریعت کے راندھے ہوئے بے علم علماءِ سوء کو اگر خود توفیق نہیں تھی تو کسی سے ہی مسئلہ پوچھ لیتے کہ قربانی کا شرعی حکم کیا ہے؟ اور کہاں سے ثابت ہے؟ قرآن وحدیث کے جاننے والوں کے پیر پکڑتے تو سب کچھ ملتا اور کھلی حقیقتوں کے ساتھ ملتا اور یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ عملِ قربانی صرف حج اور متعلقاتِ حج ہی سے وابستہ نہیں بلکہ دوسرے حالات میں بھی اِس کا ثبوت موجود ہے اور یہ آیت ہی ﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ ''اے محبوب فرمادیجئے میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور مرنا سب اللہ پروردگار جہانیوں کے لیے ہے'' پڑھ لیتے، جو مکہ معظمہ میں اُس وقت نازل ہوئی جب کہ نہ حج کی فرضیت نازل ہوئی تھی اور نہ اُس کے مراسم ومناسک مقرر ہوئے تھے، تو شاید اُن کے سیاہ خانۂ علم کا علاج ہو جاتا کیونکہ اِس آیت میں کوئی اشارہ بھی ایسا نہیں ہے جس سے یہ سمجھا جا سکے کہ اِس حکم سے مراد حج میں قربانی کرنا ہے اور لفظ نسک جو اِس آیت میں استعمال ہوا ہے، اِس کو خود قرآنِ کریم نے دوسری جگہ قربانی ہی کے معنوں میں استعمال فرمایا ہے. چنانچہ ارشاد ہوتا ہے. ﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِیْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْیَةٌ مِّنْ صِیَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ﴾ ''یعنی جو شخص سفرِ حج میں بیمار ہو جائے، یا اس کے سر میں تکلیف ہو اور وہ سر منڈائے تو فدیہ میں روزے رکھے، یا صدقہ دے، یا قربانی کرے'' اور آیت ﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ﴾ بھی مکی ہے. جس کا ترجمہ ہے کہ ''اپنے رب کی نماز پڑھ اور قربانی کر'' اِس میں کوئی قرینہ یا ایسا اشارہ نہیں جس کی بنا پر کہا جا سکے کہ قربانی کا یہ حکم، حج کے لیے خاص ہے. بلکہ قرآنِ کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوندِ عالم جل مجدہٗ کے حضور میں قربانی پیش کرنے کا رواج حضرت آدم علیہ السلام سے چلا آیا ہے. ﴿اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ یُتَقَبَّلْ مِنَ ...... الْاٰخَرِ﴾. اسی پر شاہد ہے یعنی ''جب کہ آدم کے دو بیٹوں نے قربانی پیش کی تو ایک کی قربانی قبول کر لی گئی اور دوسرے کی نامقبول ہوئی'' اِس بارے میں قرآنِ کریم میں کوئی اشارہ نہیں کہ یہ قربانی کس چیز کی تھی. مگر تورات شریف میں اس کی تفصیل موجود ہے کہ ہابیل نے اپنی دو بھیڑوں میں سے موٹی بھیڑ پیش کی. خداوندِ عالم ہابیل سے خوش ہو گیا اور اُس کی قربانی قبول فرمائی. اِس عبادت سے پتہ چلتا ہے کہ تمام مشہور مذاہب میں قربانی کا حکم تھا، جو کسی زمانہ میں بھی حج سے مخصوص نہیں ہوا. اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بعض صحابہ کرامؓ کے اِس سوال کے جواب میں کہ ''یارسول اللہ! ہمارے ماں باپ قربان ہوں، قربانی کیا ہے؟'' تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ﴿سُنَّةُ اَبِیْكُمْ اِبْرَاهِیْمَ﴾ کہ ''یہ قربانی تمہارے باپ حضرت ابراہیمؑ کی سنت ہے،'' سے ظاہر ہے کہ عملِ قربانی صرف حج ہی سے مختص نہیں. اور 2 ہجری میں مدینہ طیبہ میں اس سنتِ ابراہیمی کو اہتمام و پابندی کے ساتھ زندہ کرنے کی بنیاد پڑی اور بیسیوں روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ مدینہ طیبہ میں برابر قربانیاں کرتے رہے اور یہ ایک ایسا عمل ہے کہ اِس

سے انکار سوائے جاہل کے دوسرا نہیں کر سکتا.

ترمذی شریف میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ایک مشہور روایت ہے کہ ایک مرتبہ ہمیں عیدالضحیٰ سفر میں پیش آ گئی تو ہم قربانی کے لیے گائے میں سات آدمی اور اونٹ میں دس آدمی شریک ہوئے. گویا عہدِ نبوی ﷺ میں قربانی کا اتنا اہتمام کیا جاتا تھا کہ بیرونِ مکہ میں مسافر بھی سفر کی حالت میں اِس کو نہ چھوڑ سکتے تھے اور حدیث ((عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ اَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِالْمَدِيْنَةِ عَشْرَ سِنِيْنَ يُضَحِّيْ)). یعنی ''نبی کریم ﷺ مدینہ منورہ میں دس سال قیام فرما رہے اور قربانی فرماتے رہے'' سے صاف واضح ہو گیا کہ قربانی بیرونِ مکہ کا عمل تمام متقدمین اور خود سرکارِ دو عالم ﷺ کا عمل ہے اور وہ حدیث شریف ((مَنْ وَّجَدَ سِعَتَهٗ وَلَمْ يَضَعْ فَلَا يَقْرِبَنَّ مُصَلَّانَا)) کہ ''جو شخص باوجود استطاعت کے قربانی نہ کرے وہ ہماری عیدگاہوں میں نہ آیا کرے.'' صاف ظاہر فرماتی ہے کہ یہ عیدگاہوں میں نہ آنے کا حکم رسول اللہ ﷺ اُنہی لوگوں کو فرما رہے ہیں جو ایسی جگہوں میں قیام پذیر ہوں جہاں عید کی نماز ہوتی ہے، اور یہ بات ساری دنیا جانتی ہے کہ مکہ معظمہ میں عید کی نماز کا وقت ہی نہیں ملتا. اِس لیے لامحالہ یہ حکم بیرون مکہ رہنے والوں کو ہوگا اور جو آیت ﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ﴾ کا ترجمہ کرتے ہیں کہ یہ قربانی مکہ مکرمہ ہی کے رہنے والوں پر ایامِ حج میں لازم ہے. کیا وہ یہ بتا سکتے ہیں کہ اِس آیت میں اگر قربانی کا حکم اہل مکہ کے لیے ہے تو نماز بیرونِ مکہ پر کیوں واجب قرار دے دی گئی ہے؟ ایک ہی جملہ اور ایک ہی حکم ہے. پھر اسے مکہ سے باہر رہنے والوں کے لیے کیوں فرض کر دیا گیا ہے. چاہیے تو یہ کہ مکہ والے ہی قربانی کریں اور وہی نماز بھی پڑھیں حالانکہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے اِسی آیت کے ماتحت مروی ہے کہ یہ حکم عام ہے. نمازِ (عید) پڑھ اور قربانی کر، اِس میں مکہ یا بیرون مکہ کی کوئی تخصیص نہیں. ایسے ہی قرآن کریم کی دوسری آیت ﴿وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ﴾ سے صاحب عین الھدایہ نے قربانی کے وجوب پر بلا تخصیص استدلال فرمایا اور شرائع اول کو برقرار کہا گیا ہے.

احادیث اور آثار امام محمد ﷺ میں ہے ((اَخْبَرَنَا اَبُوْحَنِيْفَةَ عَنْ اِبْرَاهِيْمَ قَالَ الْاُضْحِيَةُ وَاجِبَةٌ عَلٰى اَهْلِ الْاَمْصَارِ مَا خَلَا الْحَاجَّ قَالَ مُحَمَّدٌ وَبِهٖ نَاْخُذُ وَهُوَ قَوْلُ اَبِيْ حَنِيْفَةَ)) یعنی قربانی واجب ہے شہر والوں پر، سوائے حاجیوں کے کہ اُن پر قربانی واجب نہیں، نیز حدیث شریف میں ہے کہ سید الکونین، مالکِ حرمین الشریفین ﷺ نے عرفات شریف میں خطبہ دیا اور قربانی کے متعلق ارشاد فرمایا. ((عَلٰى كُلِّ اَهْلِ بَيْتٍ فِيْ كُلِّ عَامٍ اُضْحَاةٌ)). یعنی ''ہر گھر والے پر ہر سال قربانی کرنی واجب ہے بشرطیکہ صاحبِ وسعت ہو.'' یہ حدیث عین الھدایہ میں ہے اور اس کو احمد ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابن ابی شیبہ وغیرہم سب نے روایت کیا ہے. ترمذی فرماتے ہیں کہ اِس کی سند حسن

ہے اور یہ حدیث طبرانی نے بھی روایت کی ہے کہ جس گھر میں قربانی ہو وہ گھر اپنے میں رہنے والوں کے لیے دعا کرتا ہے اور باوجود طاقت کے اگر قربانی نہ کی جائے تو وہ گھر رہنے والوں کے لیے بربادی کی دعا کرتا ہے۔ ان دونوں حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قربانی کا مسئلہ ہر ایمان اور اسلام والے گھر والوں سے تعلق رکھتا ہے۔ قطع نظر اِس کے کہ وہ گھر کس شہر، کس علاقہ اور کس ملک میں ہو۔ صاحب ہدایہ ایک اور حدیث بھی پیش فرماتے ہیں کہ ((عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ فِیْ عَامٍ اُضْحَاۃٌ))۔ یعنی ''ہر مسلمان پر ہر سال میں قربانی واجب ہے۔'' پھر اصحاب صحاح ستہ نے سوائے بخاری کے ایک حدیث روایت فرمائی ہے کہ ((مَنْ اَرَادَ اَنْ یُّضَحِّیَ مِنْکُمْ فَلَا یَاْخُذُ مِنْ شَعْرٍ وَّاَظْفَارِہٖ شَیْئًا))۔ یعنی ''جو شخص قربانی کا ارادہ کرے اور ذوالحجہ کا چاند دیکھے تو وہ اپنے بال اور ناخن نہ تراشوائے'' (یعنی حجامت نہ بنوائے)۔

اِس حدیث سے یہ لطیف اشارہ پایا جاتا ہے کہ حج کے ایام میں حج کرنے والے لوگ جب عرفات سے فارغ ہو کر اور حج کر کے منیٰ میں پہنچتے ہیں تو پہلے حجامت کراتے ہیں۔ پھر احرام کھول کر قربانی کرتے ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ یہ حجامت نہ کرانے کا حکم اُنہی لوگوں کے لیے ہے جو بیرونِ مکہ معظمہ قربانی کرنے والے ہوں اور جب تک قربانی نہ کر لیں وہ حجامت نہیں کرا سکتے۔ اور اگر یہ حکم قربانی حاجیوں کے لیے خاص ہوتا تو یہ ان کے منافی تھا۔ اِس لیے کہ احرام باندھنے والا شخص کسی جانور کو نہ خود ذبح کر سکتا ہے نہ کسی ذبح کیے جانے والے، بھاگے ہوئے جانور کے شکاری کو دلالت کر سکتا ہے، تو لامحالہ ماننا پڑے گا کہ یہ حکم اُن عام بیرونی علاقوں کے رہنے والوں کے لیے ہوگا جو مکہ معظمہ کے علاوہ دوسرے مقامات پر رہ رہے ہوں۔ خواہ وہ کہیں ہوں۔ کیونکہ حاجی پہلے حجامت کراتا ہے پھر قربانی کرتا ہے۔

ابنِ ماجہ میں ایک روایت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مدینہ طیبہ میں قربانی کی اور مسلمانوں نے آپ کے بعد قربانیاں کیں اور اِس پر سنت جاری ہوئی اور یہ بھی ارشاد ہوا کہ جب قربانی کا ارادہ کرو تو اپنے اہل و عیال کو جمع کر لو کہ وہ اُس کے گواہ بن جائیں گے اور اللہ تعالیٰ حاضرین و قائمین کو بخش دے گا۔

حضرت خلف رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایک درم کی قیمت کی بھیڑ قربان کرنا میرے نزدیک دس ہزار درہم صدقہ کرنے سے بہتر ہے، کیونکہ قربانی میں امتثالِ امر باری تعالیٰ اور سنتِ انبیاءؑ کے علاوہ باعثِ فرحتِ اہلِ زمین و آسمان ہے۔

صلوٰۃِ مسعودی میں ہے کہ آنحضرت ﷺ ہمیشہ دو مینڈھے ابلق قربانی فرمایا کرتے تھے۔ ایک اپنی طرف سے اور ایک اُن اُمتیوں کی طرف سے جن کو بوجہ ناداری یا فراموشی قربانی کی توفیق حاصل نہیں ہوئی، اور سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا ہے کہ قربانی کے تین دنوں میں یعنی (10-11-12 تاریخوں)

ذوالحج میں اراقۃ الدمِ قربانی کے جانوروں کا خون بہانے سے کوئی عمل خداوند عالم کو پیارا نہیں. بخاری شریف میں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ پہلی وہ عبادت جس سے ہم اُس روز ابتدا کریں یہ ہے کہ عید کی نماز پڑھیں. پھر واپس ہوں اور قربانی کریں، جو شخص یہ کرے پس وہ ہماری سنت کو پہنچا اور جس نے نماز سے پہلے ہی قربانی کے جانور کو ذبح کر دیا تو وہ گوشت ہے، جس کو اُس نے اپنے گھر والوں کے لیے پہلے ہی فراہم کرلیا ہے، وہ عبادت نہیں. بخاری ہی میں ابو عبیدہؓ فرماتے ہیں کہ عیدالاضحیٰ کے موقع پر مجھے مدینہ طیبہ میں خلیفۃ المومنین حضرت عمرؓ کے ساتھ نماز عید پڑھنے کا اتفاق ہوا تو آپ نے نماز کے بعد تقریر کرتے ہوئے فرمایا، کہ لوگو! رسول اللہ ﷺ نے اِن دونوں دنوں عیدالفطر اور عیدالضحیٰ میں روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے. کیونکہ ایک دن اُن میں سے افطار کا دن اور دوسرا اپنی قربانیوں کے گوشت کھانے کا دن ہے.

اِن تمام احادیث کا تعلق عید کے موقعہ پر قربانی کرنے سے ہے. حج کے ساتھ نہیں اور اِن سب کا اطلاق اُن لوگوں پر ہے جو حج کے علاوہ دوسرے مقامات پر قربانی کرتے ہیں. بعض لوگ سالِ حدیبیہ کے عمل سے دلیل پکڑتے ہیں کہ:

رسول اللہ ﷺ نے قربانی کے جانور مکہ معظمہ میں بھیجے تھے، لہٰذا قربانی مکہ معظمہ میں ہی ہوسکتی ہے. سو یہ اُن کا مغالطہ ہے. وہ نہیں جانتے کہ یہ دلیل نا قابلِ قبول ہے، کیونکہ وہ نہ عید اور نہ حج، بلکہ عمرہ کی قربانی کے جانور تھے، اور اُن کا مکہ معظمہ ہی میں قربانی کیا جانا ضروری تھا. حضرت حسین بن محمد سعید عبدالغنی مکی حنفیؒ اپنی کتاب ارشاد الساری الی مناسک ملا علی قاری مدفون جنت المعلیٰ مکہ مکرمہ میں فرماتے ہیں: لَاتَجِبُ الْاُضْحِيَةُ عَلَى الْمُسَافِرِ وَالْحَاجِّ لِاَنَّ فِيْهِ الْحَاقُ الْمُشَقَّةِ وَتَجِبُ عَلٰى اَهْلِ مَكَّةَ بِعَدَمِ الْمُشَقَّةِ فِيْهِمْ وَلَعَلَّهٗ اَرَادَ بِاَهْلِ مَكَّةَ مَنْ لَّمْ يَحُجَّ مِنْهُمْ اور اسی طرح جوہرنیرہ شرح قدوری میں ہے یعنی " قربانی مسافر اور حاجی پر واجب نہیں کیونکہ ان میں اس کے لیے مشقت پر مشقت ہے اور مکہ مکرمہ والوں پر واجب ہے کیونکہ اُن کے لیے مشقت اور تکلیف نہیں اس لیے کہ وہ مقیم ہیں، مسافر نہیں ہیں اور فجندی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ والوں پر بھی قربانی واجب نہیں، جب کہ وہ حج کا احرام باندھے ہوئے ہوں. اس کی علت یہ ہے کہ حاجیوں پر دم (قربانی) قران اور تمتع واجب ہے اور اِن کے لیے دم (قربانی) افراد (اکیلے حج) کی قربانی مستحب ہے. اس لیے ان پر یہ قربانی تخفیفاً واجب نہیں کی گئی جیسا کہ باتفاق آئمہ کرام رحمہم اللہ اُن پر سے عید کی نماز اور جمعہ ساقط ہو جاتے ہیں. اِس تشریح سے شاید منکرینِ قربانی سمجھ سکیں کہ قربانی مکہ مکرمہ میں بوجہ مشقت حاجیوں پر سے ساقط کر دی گئی ہے اور دوسرے امصار و ممالک یعنی تمام شہروں، ملکوں اور گاؤں پر واجب ہے. جس تحقیق سے وہ حاجیوں اور مکہ والوں پر قربانی کا بوجھ ڈالنا چاہتے ہیں، اِسی تحقیق سے وہ اِس مسئلہ میں متکلف ثابت نہیں ہوتے بلکہ قربانی کے جانوروں کی کھالوں کے مصرف اور گوشت کی

تقسیم وغیرہ کے بارے میں جو متعدد احادیثِ صحیحہ وارد ہیں، اُن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ سب کی سب دوسرے مقامات پر قربانی کرنے والوں کے متعلق ہیں اور ایسی کوئی حدیث نہیں ملتی جس سے حضور ﷺ کا وہ ارشاد ثابت ہو جو دوسرے مقامات پر قربانی کی ممانعت میں ہو۔

منکرینِ قربانی جب مسلمانوں کو قربانی کے مسئلے کی تحقیق میں ایڑی چوٹی کا زور لگا کر قربانی کرنے سے باز نہیں رکھ سکے تو پھر ایک اور پھُسپھسا سا اعتراض کر کے دلِ اندوہ گیں کو تسلی دلایا کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ آج کل کی ''قربانی'' رسمی ہوتی ہے۔ اِس سے کچھ فائدہ نہیں۔ گویا اُن کو سارا مغالطہ لفظ ''رسمی'' سے لگ رہا ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ رسمی تو، کوئی چیز کی بھی، ضرورت نہیں۔ نہ رسمی اسلام، اسلام ہوگا نہ رسمی ایمان، ایمان۔ ہمیشہ حقیقی اسلام اور حقیقی ایمان درکار ہے، مگر بغیر عمل کئے کے کیونکر پتہ چلے گا کہ حقیقی عمل کیا ہے؟ اگر قربانی کا کرنا ترک کر دیا جائے تو کیا اِس بے راہ روی سے حقیقی قربانی کا ثواب مل سکے گا؟ اور قربانی کرنے والے قربانی نہ کرنے والے سے حقیقی قربانی کا ثواب اور منشاء ربانی کا حصول کر سکیں گے؟

ملتِ بیضا کے پرستاروں کو اچھی طرح واقف ہو جانا چاہیے کہ یہ رسم محض رسم ہی نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا و تسلیم کے جویا، اِسی کے ذریعہ سے اپنے قلوب میں اُس کی اطاعت کے پاکیزہ اور بہترین جذبات پیدا کرتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ اِس رسم کو نہ صرف، ظاہری حیثیت سے عمل میں لایا جائے اور نہ رسم جان کر ترک ہی کیا جائے، بلکہ اِس کی غائت کو پیشِ نظر ہونا چاہئے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہے: ''قربانی کے جانوروں کے گوشت پوست اور خون کی ضرورت نہیں، بلکہ وہ اُس صمیمیّتِ قلب کا خریدار ہے، جس کے ساتھ جان و مال کی یہ قربانی کی جاتی ہے'' اور اِسی کا نام ''تقویٰ'' ہے۔

دوسرے معنوں میں یوں سمجھئے کہ جانوروں کا صرف خون بہانا ہی قربانی کی غرض و غائت نہیں، بلکہ اپنی تمام خواہشات کو اللہ تعالیٰ کی رضا پر قربان کر دینا حقیقی قربانی ہے اور اِسی میں جانوروں کی قربانی بھی شامل ہے۔ قربانی کے دن سیدنا حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کی اِس راہ کو قائم کرتے وقت اپنی جان اور اپنے مال کو راہِ خدا میں قربان کرنے کا عزم بالجزم بھی کرنا لازمی ہے۔ اس لیے کہ مسلک ابراہیمی کا یہی مقصدِ وحید ہے کہ انسان اپنی ہستی کو رب العزت جل وعلا شانہٗ کی ہستی کے سامنے کوئی شئے نہ سمجھے۔ اِس لیے کہ وہی موجوداتِ عالم کا خالق و مالک ہے اور اُسی کے ہاتھ میں سب کی فنا و بقا ہے۔ جب تک وہ اپنی تمام محبوبات کو اُس ایک محبوب کی راہ میں قربان کر کے اُس کا تقرب حاصل نہیں کرتا وہ یقیناً اپنے مفہومِ زندگی سے بہت دور ہے۔ انسان کو اِس امر پر بھی غور کرنا چاہیے کہ مسلکِ ابراہیمی میں مسلمان کا کون سا مقام ہے اور اُس مقام کو حاصل کرنے کے لیے اُس کو

کون سی شاہراہ کے اختیار کرنے کی ضرورت ہے؟ کیا اِس دنیا میں کوئی شئے ایسی تو نہیں جو اُس کو اپنے خالق و معبود سے زیادہ محبوب و مرغوب نظر آتی ہو اور جسے خدا کی راہ میں قربانی کرتے وقت اُس کے دل میں تامل اور اُس کے ہاتھوں میں رعشہ پیدا ہوتا ہو. ہمیں آج پاکستان کی خاک کا ذرّہ ذرّہ پکار کر کہہ رہا ہے کہ جب تک تمہاری رگ و پے اور تمہارے قلوب و ارواح میں مسلکِ ابراہیمی اور سنت محمدی ﷺ اختیار کرنے کے لیے صحیح جوش و خروش پیدا نہ ہوگا، اُس وقت تک وہ مقامِ رفیع جس کے حصول کے لیے تم تڑپ رہے ہو حاصل نہ ہو سکے گا.

اقوام کو زندہ رکھنے کے لیے قربانی ایک لازمی امر اور لابدی عمل ہے. جو قوم قربانی سے گھبراتی ہے اور اپنی ہر عزیز سے عزیز متاع کو اپنے محبوبِ حقیقی کے نام پر قربان کرنا نہیں جانتی، وہ قوم کبھی زندہ نہیں رہ سکتی اور نہ ہی اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب ہو سکتی ہے. اسلام قربانی اور ایثار کا مذہب ہے. وہ ہر اپنے ماننے والے کلمہ گو مسلمان سے مطالبہ کرتا ہے کہ اسلام کی صف میں شامل ہونے سے پہلے سوچ لے کہ وہ کتنی قربانی دے سکتا ہے اور کس قدر ایثار کر سکتا ہے؟ کیونکہ ایک سچے مسلمان کی زندگی اور موت محض خدا کے لیے ہوتی ہے اور وہ اپنی ہر آرزو اور اپنی ہر خواہش کو اُس کی خوشنودی کے لیے ہی وقف کرتا ہے اور اُسی سے مسرور ہوتا ہے. قربانی، شیوۂ تسلیم و رضا کی جانب قدم بڑھانے کا پہلا زینہ ہے.

عید الضحیٰ کا دن اسی شعارِ ملی کی یاد منانے کا دن ہے. کس قدر خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو اُس دن خدا کی راہ میں جانوروں کو قربان کرتے ہوئے اِس امر کا عہد کرتے ہیں کہ اگر کوئی وقت ایسا آ گیا جس میں ہماری گردنوں کے خون سے اسلام کے پودے کی آبیاری کی ضرورت ہو، تو وہ اپنی جان، اپنا مال و اولاد، بلکہ اپنی ہر چیز اللہ جل جلالہٗ کی راہ میں قربان کر کے اپنا نام اُن مسلمانوں کی صف میں لکھوائیں گے، جن کا جینا اور مرنا صرف خوشنودیٔ محبوبِ حقیقی کے لیے ہوتا ہے.

عید الضحیٰ کی تقریب پر مسلمان اپنی حیثیت اور اپنی بساط کے مطابق اپنے عمل سے حضرت ابراہیمؑ کی ہر دلنواز ادا کا اعادہ کرتا ہے کیونکہ ملتِ اسلامیہ کا یہ مؤسسِ اول جس نے دنیا میں سب سے پہلے اللہ کی عبادت کے لیے وہ گھر بنایا جو اُس وقت سے لے کر آج تک مرجعِ خلائق اور مسلمانانِ عالم کا قبلہ ہے، اللہ تعالیٰ کو اِس قدر عزیز اور پیارا تھا کہ قرآنِ پاک میں اس کی دوستی کا اقرار فرماتا ہے اور ﴿وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِیْمَ خَلِیْلًا﴾ کے مقدس ارشاد سے ہے. یعنی اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کو اپنا دوست بنایا اور اُسی مؤسسِ صادق کی ہر عظمت و عصمت و سیرت کے نقش و نگاروں سے قصرِ اسلام کو مزین فرماتا ہے. یہی وجہ ہے کہ ملتِ ابراہیمی کی پیروی ہر کہ و مہ پر لازم ہو گئی ہے.

آج یادگارِ ابراہیمی قائم کرنے والے سوچیں کہ کیا اُن کا قدم اُسی جادۂ مستقیم پر ہے، جس کو حضرت ابراہیمؑ نے اختیار کیا تھا اور اگر نہیں تو اُنہیں جلد اپنا رخ اُس کعبۂ عمل اور صراطِ مستقیم کی جانب

پھیر لینا چاہیے، جو سیدنا ابراہیمؑ کا معین کردہ ہے اور تعمیرِ ملت کے لیے یہی ایک صحیح راستہ ہے. روپے پیسے کے اندازے لگانا اور بوالہوسوں کی طرح کوڑی کوڑی کا حساب سوچنا عشاق کا شیوہ نہیں. حضرت حافظ شیرازی نے کیا مزے کی بات کہی ہے:

در عشقِ زلفِ لیلیٰ بند و کارِ عشقِ مجنوں کُن!
کہ طالب را زیاں دارد مقالاتِ خرد مندی

یعنی اگر تم لیلیٰ کی زلفوں کے عاشق ہو تو دیوانوں کے سے کام کرو، کیونکہ مطلوب کے طالب کو عشق کے کوچے میں عقل کی باتیں نقصان دیتی ہیں. جو نفع وضرر کا حساب لگا کر میدانِ عشق میں قدم رکھے وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتا.

باپ کا خواب سن کر سیدنا اسماعیلؑ نے بغیر سوچے سمجھے اور نتیجہ کا اندازہ لگائے جو یہ جواب عرض کر دیا ﴿ یَا اَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْ اِنْشَاءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ﴾. یعنی ”اے میرے باپ اُس امر کی تعمیل کر گزریں جو آپ کو ہوا ہے. میں انشاء اللہ آپ کی چھری کے نیچے صبر کروں گا“، ثابت کرتا ہے کہ باپ کا یہ عزمِ راسخ اور بیٹے کی تسلیم ورضا کا یہ عالم، عقل کی پرواز سے بہت دور ہے.

مسئلہ جہادِ اسلام

﴿ اِنَّ اللّٰہَ یُدٰافِعُ عَنِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ط اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ خَوَّانٍ کَفُوْرٍ ○
اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوا ط وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرُ ○
اِلَّذِیْنَ اُخْرِجُوا مِنْ دِیَارِھِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوا رَبُّنَا اللّٰہُ ط
وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَّھُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ
وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ یُذْکَرُ فِیْھَا اسْمُ اللّٰہِ کَثِیْرًا ط وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰہُ مَنْ
یَّنْصُرُہٗ ط اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ○ [الحج ۲۲: ۳۸-۴۰]

’’تحقیق اللہ تعالےٰ مومنوں سے دفاع کرتا ہے. اللہ کو خیانت کرنے والے
اور ناشکر گزار لوگ پسند نہیں ہیں. اُن لوگوں کو اجازت دی جاتی ہے جن سے لڑائی کی جاتی ہے.
کیونکہ وہ بہت مظلوم ہیں اور اللہ اُن کی مدد کرنے پر بڑی قدرت رکھتا ہے.
وہ لوگ ناحق اپنے گھروں سے صرف اس لیے نکالے گئے
کہ اُنہوں نے کہا ’’ہمارا رب اللہ ہے‘‘ اور اگر اللہ تعالیٰ اس طرح بعض کا بعض سے دفاع نہ کرتا رہے
تو یہ راہبوں کے تکیئے، گرجے اور یہودیوں کے معبد خانے مسمار کر دیئے جائیں.
حالانکہ اِن مکانوں میں اللہ کا نام لیا جاتا ہے
اور اللہ ضرور مدد کرے گا، جو اُس کی مدد کرتا ہے. اللہ تعالےٰ بڑی قدرت والا اور بڑی عزت والا ہے.‘‘

اس آیتِ کریمہ کی تشریح اور مسئلہ جہاد پر روشنی ڈالنے سے پہلے یہ ذکر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دنیا بھر کے عقلاء و حکماء، مدبرین و مفکرین، مبصرین و مصلحین، اِس بات پر متفق ہیں کہ جنگ دنیا بھر کے افعالِ قبیحہ سے بدترین فعل ہے. جس کا کوئی شریف و عقل مند آدمی حامی نہیں ہوسکتا. کون بھلا آدمی ہے جو بچوں کے یتیم ہو جانے، عورتوں کے سہاگ لٹ جانے، جوانوں کے بازو کٹ کر بچھ جانے، سروں کا نیزوں کی اَنی پر چڑھنے، یا خاک میں گرنے، خون کی ندیاں بہہ جانے، بستیوں کے

ویران اور کھیتوں کے اجڑنے کو مستحسن فعل سمجھتا ہو. یا مجروحین کے سینوں سے جو درد انگیز نالے اٹھتے ہیں، خون کے فوارے چھوٹتے ہیں. اُن کو دیکھ کر اپنے قلب وروح میں مسرت حاصل کرتا ہو. ہاں کوئی شقی القلب انسان ہی ایسے انسانوں کی مصائب پر خوش ہوسکتا ہے اور جارحانہ جنگ کو اپنی تفریح کا سامان تعمیر کر سکتا ہے. جس پر انسانیت نے ہمیشہ ماتم کیا ہے اور کرتی رہے گی.

پھر کیا عوام اگر اِس ظلم وستم اور قتل ونہب کو اخلاقاً جائز اور مستحسن نہیں سمجھ سکتے تو وہ رحمۃ العلمین نبی. وہ پیکرِ نورِ انسان، وہ مجیب ونجیب پیغمبر، وہ اشرف ترین رسول، وہ مجسمۂ شرافت جوان، وہ شفیق باپ، وہ بلند قدر وخوش مزاج شوہر، وہ مہربان آقا، وہ حاملِ قرآن سیّد، وہ حوصلہ مند تاجر، وہ مجاہدِ اعظم قریشی، وہ جامع اوصافِ حجازی، وہ مردِ میدان محسن، وہ ممتاز سپہ سالار، کامیاب ورحم دل فاتح، وہ کریم النفس حکمران، وہ فقید المثال مبلّغ، وہ مایۂ ناز منتظم، وہ بے مثل معلّم، وہ سادگی پسند رہبر، وہ عاقل مقنن، وہ عدیم النظیر ہادی، وہ لاثانی تاجدار، وہ پُرشکوہ فرمانروا، وہ عظیم الشان مصلح، وہ جمہوریت نواز قائد، وہ مجسمۂ رحم وکرم، وہ انسانِ کامل، وہ الوالعزم بے مثل نُوری مجسمہ ﷺ بایں ہمہ اوصاف کب جائز فرماتے کہ یوں خون ریزی ہو اور اس بہیمیت وبربریت سے انسانوں کو صفۂ ہستی سے مٹایا جائے لیکن جب خدائے قدوس کو معبود ماننا اور پُرامن طریق پر ماننا بھی ممنوع قرار دیا جائے، جب بے گناہ مردوں پر تشدد کی بجلیاں گرائی جائیں اور جب باحیا وباعصمت عورتوں پر ظلم وستم توڑے جائیں اور جب ایسی تمام خطا کاریاں جائز رکھی جائیں، جو انسانیت کے لیے دھبہ ہوں اور جب شہر چھوڑ کر پیچھے ہٹ کر سکوت اختیار کر کے بھی جان نہ چھوٹے تو اس وقت مدافعتِ فتنہ کے لیے جنگ ہر سمجھدار اور غیور انسان کے نزدیک ایک مقدس فرض نہیں تو اور کیا ہوسکتا ہے؟ اور اسی مقدس فریضہ کا نام ''جہاد'' ہے اور ایسے جہاد کو خونریزی وسفاکی سے تعبیر کرنا پرلے درجے کی نا عاقبت اندیشی اور حماقت ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ایسے مقدس جہاد سے گریز بزدلی اور قوم کے ساتھ غداری ہوگی.

چونکہ اسی فرضِ مقدس کی ادائیگی مظلوم اسلام کی حفاظت کا سبب بھی تھی، اِس لیے عیسائی مشنوں اور یہودی سوسائٹیوں وہندو سماجوں نے یہ شور مچانا شروع کر دیا کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلایا گیا ہے اور اُن کا یہ لغو اعتراض اِس لیے نہیں کہ وہ اسلام کے آئینے میں انسان کی خون ریزی دیکھ کر ترس کھاتے ہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ایک گال پر تھپڑ کھا کر جب دوسرا گال آگے ہوتا، عیسائیت میں بھی نظر نہیں آتا اور موجودہ تہذیبِ عیسائیت اِس پر پوری طرح گواہ ہے کہ یورپ کے میدانوں میں کس کس مسیح کے اُمتی نے اپنی عملی حیثیت کا ثبوت دیا ہے اور کس کس نے مدِمقابل کے سامنے دونوں گال رکھ دیئے ہیں، تو اپنے عیوب پر پردہ پوشی کا ایک نیا ذریعہ اختیار کر لیا جاتا ہے کہ دوسرے مذاہب کی عیب جوئی شروع کر دی تا کہ اِسی پردے میں موجودہ عیسائیت چھپی رہے اور اِسی طرح اُس کی

صداقت قائم کر لی جائے۔

عیسائی مذہب کے واعظ چونکہ الفاظ کا ذخیرہ عیسائیت کے پھیلاؤ کے لیے بہت کم رکھتے ہیں اور لے دے کے اُن کے پاس باپ، بیٹا، روح القدس ہی کی تین سرخیاں ہیں۔ اور یسوع خدا تھا، جو صلیب پر مر گیا تا کہ وہ اُن لوگوں کے لیے کفارہ ہو، جو اُس پر ایمان لائیں، بس یہ اِن تینوں سرخیوں کی تشریح ہے۔ اِس لیے اُن کے وعظ کا دائرہ بہت تنگ ہے۔ وہ اپنا کیچڑ دوسروں پر پھینک کر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حقیقت میں ہماری صاف گوئی اور عیب جوئی میں اسلام پر عیب نظر آتا ہے۔ ہم وہ ہیں کہ بغیر تلوار کے مذہب بھی پھیلاتے ہیں اور اسلام کی تلوار سے اپنے آپ کو بھی بچاتے ہیں، اور یہی حال ہندوؤں، آریہ سماجیوں، جینیوں اور بدھ مذہب والوں کا ہے، جس کا مختصر سا خاکہ ہم آگے چل کر پیش کریں گے اور اِس حقیقت پر کچھ کہنے کے لیے ہم ہی بحیثیت مسلمان ہونے کے مجبور نہیں ہیں بلکہ یورپین مصنفین کی بے شمار تصنیفات بھی اس پر شاہد ہیں کہ بانیٔ اسلام حضرت محمد ﷺ نے دنیا پر تحفظِ انسانیت کے لیے کیا کچھ کیا۔ اسلام دنیا میں کس امن پسند اور غیر متعصبانہ رنگ میں پھیلا۔ چنانچہ تھنک اینڈ گرو رچ (Think & Grow Rich) کے مصنف نپولین ہل (Napoleon Hill) نے اپنی کتاب کے انڈین ایڈیشن صفحہ 248 میں [بحوالہ ریویو بر تصنیف اسد بے از تھامس سگر و شائع شدہ اخبار ہیرلڈ ٹریبون] لکھا ہے کہ

> جب مکہ معظمہ کے سرمایہ دار اور تاجروں نے محمد ﷺ کی مخالفت کی تو وہ وہاں سے ہجرت کر گئے اور یہاں سے اسلامی ترقی کا دور شروع ہوا اور صحرا سے وہ شعلہ پیدا ہوا جو بجھ نہ سکا (ایک جمہوری فوج جو ایک وجود ہو کر لڑتے اور بغیر تامل کے موت کا خیر مقدم کرتے) محمد ﷺ نے یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنے ساتھ شامل ہونے کی دعوت دی تھی، کیونکہ وہ کسی نئے مذہب کی بنیاد نہیں رکھ رہے تھے۔ توحید کے مسئلے اور عقیدے میں وہ بھی اُسی طرح تھے، جیسے پہلے، تا کہ سب ایک مرکز پر جمع ہو جائیں۔ اگر یہودی اور عیسائی اِس دعوت کو قبول کر لیتے تو اسلام تمام دنیا پر چھا جاتا، لیکن انہوں نے قبول نہ کیا اور نہ ہی محمد ﷺ کی پیدا کردہ شریفانہ جنگ کی جدت کو اپنایا تا کہ بیجا طور پر غیر متحارب افراد کی خون ریزی نہ ہو۔ چنانچہ حضور ﷺ کی اُمت کی فوجیں یروشلم میں داخل ہوئیں تو کسی ایک فرد کو بھی اُس کے مذہبی عقیدہ کی بنا پر قتل نہیں کیا گیا۔ برخلاف اِس کے جب کئی صدیوں کے بعد صلیبی افواج نے دوبارہ اُسی شہر کو فتح کیا تو کسی ایک مسلمان مرد و عورت اور بچے کو باقی نہیں چھوڑا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کی خوبی نے اُن تمام مذاہب والوں کو ششدر کر دیا ہے اور وہ

دیکھتے ہیں کہ جس تیزی کے ساتھ اپنے سابقہ عقائد کو ترک کر کے اہلِ دنیا نے اسلام کو قبول کیا ہے اور کوئی مذہب اِس حالت میں قابل قبول نہیں سمجھا گیا، تو وہ اسلامی تعلیمات کی روحانی خوبیوں کو جوانوں کی جسمانی طاقت سے تبدیل کر کے یہ ڈھنڈورہ پیٹتے ہیں کہ اسلام اور اُس کی تعلیم بجائے خود قبول کر لینے کی چیز نہ تھی بلکہ سلطنت کی ظاہری طاقت نے یہ اسلام لوگوں کو قبول کروایا اور اُس کو اپنانے پر مجبور کیا.

اِس سے قبل کہ اِس الزام کا جواب اسلام اور قرآن کی روشنی میں دیا جائے یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ اسلام سے قبل جو مذاہب دنیا میں موجود تھے کیا انہوں نے تلوار اٹھائی یا اسلام نے؟ اور اگر اسلام نے اٹھائی تو اُن کی ستم رانیوں کے دفعیہ کے لیے یا اپنی اشاعت کے لیے. اور اگر اُنہوں نے اٹھائی تو اسلام کو دیکھ کر یا اُن کی پہلے ہی جبلّی عادت وفطرت تھی:

شکوہ بیجا بھی کرے کوئی تو لازم ہے شعور

آؤ! اگر سابق مذاہب کے متبعین اور مذاہب اِس بدنمائی سے بے عیب نظر آئیں تو ہم سمجھیں گے کہ اسلام کو اپنی مظلومیت کا علاج بھی کرنا ان کے مقابلہ میں اپنی حق گوئی وحق پسندی پر ایک دھبہ تھا. کاش کہ اسلام کی طرف سے حاسد آنکھیں ذرا انوارِ صداقت کو دیکھتیں اور اسلام کی امن پسندانہ اور ہمدردانہ بے عیب تعلیم پر صاد کرتیں.

اسلام اور مسلمان کا دعویٰ ہے کہ ارضِ عالم پر بڑے بڑے جلیل القدر فاتح رونما ہوئے اور دنیا کی تقریباً ہر قوم نے اپنی عمر کے کسی نہ کسی دور میں کچھ نہ کچھ فتوحات ضرور حاصل کیں لیکن کسی نے بھی مفتوحوں کے ساتھ رواداری نہ برتی بلکہ اُن کے نزدیک مغلوب قوم پر جبر وتعدی، اُس کے مذہب کو مٹانا، اُس کے معابد کو گرانا، اُس کے بال بچوں کو غلام بنانا، اُس کے سرداروں اور تاجداروں کو ذلیل کرنا، لڑنے والوں کو زندہ آگ میں جلانا اور طرح طرح کے عذابوں سے ہلاک کرنا اُن کا وطیرۂ عمل رہا ہے. صرف اسلام اور حلقۂ بگوشانِ اسلام ہی کا وہ مذہب اور قوم ہے، جنہوں نے مفتوحوں کو انسان سمجھا اور اُن کے ساتھ انسانوں جیسا سلوک روا رکھا. دیکھو بنی اسرائیل پر اِسی نیل گوں آسمان کے نیچے اور اِسی وسیع وعریض سرزمین پر بڑے بڑے خوفناک وہولناک مظالم تسلسل وتواتر کے ساتھ ہوتے رہے لیکن اپنے عہدِ اقتدار میں اُنہوں نے بھی جب کبھی قابو پایا کمی نہ کی. اُن کی فتح مندی بھی شکست خوردوں کی بے حرمتی وعصمت دری اور بچوں کی اسیری، مال ومتاع کی لوٹ، اراضیات کی بربادی، کھیتوں کی تباہی اور تمام شہروں وقلعوں کی آتش زدگی کا باعث بنتی رہی. پھر اِس پر بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی اس قوم بنی اسرائیل پر ناراض ہوئے کہ تم نے عورتوں کو جیتا کیوں چھوڑ دیا

کیونکہ تورات شریف اعداد 31 میں ہدایت موجود تھی کہ ”مفتوحوں کے لڑکوں اور بیاہی عورتوں کو قتل کر دو اور صرف کنواری لڑکیوں کو اپنے لیے رکھ لو۔“ (عہدِ قدیم) کریڈل آف اسلام میں صاف موجود ہے کہ جو عیسائی ترک مذہب کر کے یہودی ہونے سے انکار کر دیتے تھے، اُن کو یہودی بلا تکلف تلوار کے گھاٹ اتار دیتے تھے. یمن کے فرمانروا ذوتورس نے یہودی مشرب کیا اختیار کیا، عیسائیوں پر قیامتیں ٹوٹنے لگیں. اُن کو جبراً یہودی بنانا شروع کر دیا اور اگر نجران کے عیسائیوں نے یہودی ہونے سے انکار کر دیا تو اُن کو زندہ آگ میں جھونک دیا گیا. [تاریخِ عرب]

غیر مسلم فاتحین کی سنگ دلی

سلاطین باب 15 میں ملاحظہ فرمائیے کہ ”تو انہیں سرحد تک مار، اور پیٹ والیوں کے پیٹ پھاڑ ڈال!“ چنانچہ عیسائیوں نے اس ہدایت کی پوری وفاداری کے ساتھ تعمیل کی. ہسپانیہ، سسلی اور شام کے مسلمانوں کے ساتھ آتش زدگی، قتل و غارت، اخراج و بربادی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا گیا. روسیوں، یونانیوں اور صلیبی مجاہدوں نے رچرڈ اور فلپ بن کر جو قیامتیں اٹھائیں وہ تاریخ کا ایک المناک و خونی باب ہے. کوہستان البکراز میں کاؤنٹ آف سیرین نے عورتوں اور بچوں سے بھری ہوئی ایک مسجد کو بارود سے اڑا دیا (کارنامۂ مُور) اہلِ پرتگال نے اسی ہندوستان کے جنوب مغربی گوشے میں مسلمانوں کو زبردستی عیسائی بنایا اور مسجد کو آگ لگا کر انتہائی سفاکی کا مظاہرہ کیا (تاریخِ ہند) ہرقل نے نینوا کی تاریخی اور فیصلہ کن جنگ کے بعد ”شاہزادۂ امن کا اوتار“ کہلانے کے باوجود ایرانیوں کے ساتھ کون سی کسر اٹھا رکھی؟ آذربائیجان کو تباہ کر دیا اور پرانی عداوتوں و ذلتوں کا دل کھول کر انتقام لیا. اُس کے حکم سے آتش پرستوں کی آتشِ بہرام بجھا دی گئی. مجوسیوں کے آتش کدے برباد کرائے گئے اور زرتشت کے مولد یعنی جائے پیدائش قریۂ ارمیا کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی.

قسیس میکائیل اُس ہرقل اعظم کے متعلق لکھتا ہے کہ اُس نے یعقوبی عیسائیوں کے گرجے اور خانقاہیں بے دریغ لوٹیں اور اُن کو بلاوجہ ستایا. مورخ رینی ڈاٹ لکھتا ہے کہ مصر کے قبطیوں پر رومیوں نے مظالم کے پہاڑ توڑ رکھے تھے. بعض شکنجوں میں کسے جاتے تھے، بعض سمندروں میں گرائے جاتے تھے اور بعض اپنے پیشواؤں سمیت جلا وطن کر دیئے جاتے تھے. شاہ جسٹنمین نے صرف ایک شہر اسکندریہ میں دو لاکھ قبطیوں کو ایک ہی یلغار میں قتل کیا. پھر مورخ میکاڈ صلیبی عیسائیوں کے ظلم و جور کے متعلق لکھتا ہے کہ اُن عیسائیوں نے وہ ظلم و ستم کیے جن کے ذکر سے دل کانپ اٹھتا ہے. شہر فالس تک وہ شہروں کو تباہ کرتے اور لوگوں کو تلوار کے گھاٹ اتارتے چلے گئے. محض جوان عورتوں کو اپنی خرمستیوں کے لیے رکھ لیتے تھے.

سلطان صلاح الدین مرحوم نے اُن کو درست کیا. پانچویں صلیبی جنگ نہایت دہشت ناک ہے. گاڈفرے شاہِ بولان کے ماتحت تمام یورپ کی سات لاکھ فوج روانہ ہوئی اور انطاکیہ میں دو ہزار مسلمانوں کے سر کاٹ کر مثلہ کیا اور محصورین کو دکھا دکھا کر مزے سے کھا گئے اور دوسرے موقع پر مسلم نعشیں قبروں سے اکھاڑ کر اور اُن کی کھوپڑیاں نیزوں پر رکھ کر مظاہرہ کیا گیا اور انطاکیہ و مرۃ الیغمان کو فتح کر کے ہر گھر میں قصاب خانہ بنا دیا. بیت المقدس میں عالی شان عمارتوں، مدرسوں اور خانقاہوں سب کو تباہ کر دیا. بچوں، بوڑھوں، عورتوں کسی کو بھی زندہ نہ چھوڑا اور مکانوں میں بند کر کے آگ لگا دی.
ساتویں صلیبی جنگ میں رچرڈ شاہِ انگلستان اور فلپ شاہِ فرانس و فریڈرک شاہِ جرمنی شریک تھے. شہر عقر کا دو برس محاصرہ رہا. آخر امان کے وعدہ پر باہر نکلے لیکن رچرڈ نے عہد شکنی کی اور سب کو قتل کر دیا. نویں صلیبی جنگ میں موحد عیسائیوں ہی کے تمام معابد اور گرجوں میں قسطنطنیہ کے اندرونی عیسائی سورماؤں نے آگ لگا دی اور سینٹ صوفیہ کا عظیم الشان گرجا صرف بیش بہا پتھروں کی خاطر گرا دیا گیا.
غرض یہ ہے کہ گو یہ جنگیں خالص مذہبی جنگیں تھی مگر ان عیسائیوں نے جدھر سے گزرے قتل و نہب کے طوفان برپا کر دیئے. مسلمان اور یہودی تو درکنار اپنے ہم مذہب عیسائیوں تک بھی اُن کے ہاتھوں سے محفوظ نہ رہے. آگ لگانا، معابد جلانا، امان کا معاہدہ کر کے بھی سب کو قتل کر دینا اور بدعہدی کرنا اُن کے لیے معمولی بات تھی. اسی طرزِ عمل کے ماتحت اُنہوں نے شام کو بھی تباہ کر کے رکھ دیا اور لاکھوں انسانوں کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا. یہ تو تھا یہودی اور عیسائی فاتحوں کی انسانیت سوز اور خون آشامی کی داستانوں کا اجمالی خاکہ، اب ایرانیوں کی فاتحانہ تاختوں کا حال سنئے تا کہ اسلام پر طعن کرنے والوں کی بگلا بھگتی کا پتہ چل جائے.

ایرانی فاتحوں کی خون آشامی

یہ وہ لوگ ہیں جو مجوسی کہلاتے اور مجوسی مذہب رکھتے تھے. شیر بابکان کا بیٹا شاہ پور بڑا پُر شکوہ اور اقبال مند حکمران تھا. وہ حریفوں کے شانے اکھڑوا دیا کرتا تھا. اُس نے رومیوں پر بڑے بڑے خوف ناک حملے کئے اور ایک معرکہ میں اُس نے قیصر ولیریٹین کو گرفتار کر لیا اور اُس کی وہ توہین و تذلیل کی کہ جب شاہ پور گھوڑے پر سوار ہونے لگتا تو اُس کی گردن پر جوتے سمیت پاؤں رکھ کر چڑھتا. مرنے پر بھی اُس کا جوشِ انتقام ختم نہ ہوا اور اُس کی کھال اتروا کر اُس میں بھس بھروا دیا. نوشیرواں نے بھی رومیوں کو سخت شکستیں دیں. افریقہ کی مہم کو حق بجانب بنانے کے لیے منذر کو حارث سے لڑوا دیا گیا اور انطاکیہ کو جلا کر خاکِ سیاہ کر دیا اور فرقہ مزدکیہ کے 68 ہزار افراد کو قتل کرایا [تاریخِ ایران] گشتاسپ کے بیٹے اسفندیار نے متعدد

جہاد کیے اور جہاں گیا زبردستی اپنے مجوسی مذہب کو رواج دیا۔ [مشاہیر عالم] خسرو پرویز بھی بڑے طنطنہ کا بادشاہ گزرا ہے۔ ہرقل نے اُس کی خدمت میں بڑی مستمندانہ سفارش بھیجی اور بہت منت و خوشامد کا پروانہ لکھا۔ اسکے سپہ سالار سینا نے بھی سفارش کی، خسرو بجائے اس کے کہ متاثر ہوتا آگ بگولا ہوگیا اور کہنے لگا نابکار سینا کا تو فرض تھا کہ وہ ہرقل کو جکڑ کر میرے قدموں میں لا ڈالتا۔ میں تو اُس پر اُس وقت تک رحم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں جب تک وہ اپنے مصلوب خدا کی پرستش چھوڑ کر آفتاب کو سجدہ نہ کرنے لگے۔ تمام سفیروں کو قید کرلیا گیا اور سینا کو محض اُس کی سفارش کے جرم میں یہ سزا دی گئی کہ اُس کی کھال کھنچوالی گئی اور فوراً قسطنطنیہ پر چڑھ دوڑا اور ان شرائط پر صلح کر کے لوٹا کہ ہرقل ہر سال ایک ہزار ٹن چاندی، ایک ہزار حلۂ ریشمی، ایک ہزار گھوڑے اور ہزار دوشیزہ لڑکیاں بطورِ خراج ادا کیا کرے چونکہ ہرقل اُس وقت مجبور تھا اِس لیے اُس کو تمام شرائط منظور کرنی پڑیں۔ اسی خسرو پرویز نے ایک اور حملہ کے دوران میں بیت المقدس میں پہنچ کر مرقد مسیح، کلیسائے ملکہ لہینا اور کلیسائے قسطنطین اعظم میں آگ لگادی۔ مقدس صوامع و معابد کے جواہرات لوٹ لیے اور صلیبِ مقدس اُکھڑوا کر مدائن بھیج دی۔ بیت المقدس میں قتل عام کیا اور ۹۰ ہزار عیسائیوں کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا اور قدرتی طور پر یہ تناسب عمل میں آیا کہ اس شہر کو فتح کرتے ہوئے عیسائیوں نے بھی اسی تعداد پر مسلمان شہید کیے تھے۔

از مکافاتِ عمل غافل مشو

گندم از گندم بروید جو ز جو!

رومی اور ہندو فاتح

بختِ نصر بابل کا بڑا مقتدر اور صاحبِ جبروت بادشاہ تھا۔ صابی مذہب رکھتا تھا، جسے اُس نے اپنی فرمانروائی اور شمشیر کے زور سے پھیلایا تھا۔ اُس نے یہودیوں پر یلغار کر کے اُن کے تباہ کر ڈالنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ بیت المقدس میں آگ لگادی اور جس قدر قتل ہو سکے قتل کیے، جو بچ گئے سب کو قید کر کے بابل لے آیا، جہاں سے ستر برس کے بعد اُن کو رہائی نصیب ہوئی۔ اُس نے وہ خوف ناک مظالم کیے جن کی نظیر صلیبی مجاہدین ہی میں مل سکتی ہے۔ 71 قبل مسیح میں ایک رومی فرمانروا اینٹوکس (شاہ سیریا) یہودیوں پر صحیح درندوں کی طرح جھپٹا۔ بیت المقدس اور ہیکل متبرک کو نیست و نابود کردیا۔ ہزارہا بنی اسرائیلی تہ تیغ ہوئے۔ صرف شہر اور ہیکل ہی کو نہیں بلکہ اُن کی تمام کتبِ مقدسہ کو ڈھونڈ کر جلا دیا اور ساتھ ہی ایک حکم نامہ کے ذریعے اعلانِ عام کرایا کہ جس کسی کے پاس عہدِ عتیق کی کوئی کتاب نکلے گی یا وہ اپنی شریعت کے احکام کی بجا آوری کرتا پایا جائے گا، مار ڈالا جائے گا اور اس حکم کی ہر ماہ باضابطہ تحقیق

بھی کی جاتی تھی۔ 270ء میں روم کے بادشاہ ٹیٹس نے ہلہ بول دیا۔ لاکھوں آدمی تہ تیغ کیے اور شہر بیت المقدس اور ہیکل میں آگ لگا دی اور تورات کے تمام نسخے اپنے ساتھ لے گیا۔ ابھی اِس حملہ اور تباہی پر 65 سال بھی پورے نہ گزرنے پائے تھے کہ آدرین قیصرِ روم، شام فلسطین پر چڑھ آیا۔ اُس نے شہر اور ہیکل کو تباہ کر کے اُس پر ہل چلوائے پھر اُس پر پیسٹیر بت کا مندر بنوایا اور اپنے ہی خاندان کے نام پر بیت المقدس کا نام ایلیہ رکھ دیا۔

روم کی سلطنت اُس عہد میں دور دور تک پھیلی ہوئی تھی اور ستارہ مشتری کی پوجا اُن کا شعار تھا۔ اُس زمانہ میں جو لوگ عیسائی مذہب اختیار کرتے تھے اُن کو گوناگوں عذابوں میں مبتلا کیا جاتا تھا۔ مثلاً زندہ آگ میں جلانا، لوہے کی میخوں سے کچوکے دینا، دہکتی آگ میں اُن کا بدن جھلسانا عام باتیں تھیں۔ پھر چوتھی صدی میں ایک نیا انقلاب ہوا سلطنت کا مذہب عیسائی قرار دیا گیا اور مشتری کی پوجا ترک کر کے حضرت مسیح کے اتباع کے حق میں فیصلہ ہوا اور ساتھ ہی ساتھ قلمرو میں بت پرستی کے استیصال کے احکام صادر کر دیئے گئے۔ بت پرستوں کے بتوں پر قربانیاں اور چڑھاوے جرم قرار دیئے گئے اور فرمان جاری ہو گیا کہ بت پرستی کے تمام آلات و اسباب اور پجاریوں کی تمام جائدادیں بحق حکومت ضبط کر لی جائیں اور مندروں کو مقفل کر دیا جائے۔ غرضیکہ رومن سلطنت نے بت پرستی اور بت پرستوں کے متعلق وہ جابرانہ رویہ اختیار کیا کہ 28 سال میں بت پرستی جڑ سے نکل گئی اور تثلیث کا سکہ بیٹھ گیا۔ یہ تو ہے اُن لوگوں کی داستانِ انصاف و رواداری اور اُن کی مہذب سلطنتوں کے انصاف کا مرقع، جنہوں نے اسلام کو ہمیشہ تلوار اٹھانے کا الزام دیا ہے اور کس قدر تعجب انگیز منظر ہے کہ پہاڑ کی جلتی نظر آتی ہے۔ گھر کی جلتی نظر نہیں آتی۔ اِس خونچکاں داستان کی کتبِ تاریخ گھر میں رکھ کر پھر اسلام کو تلوار کا الزام دینا کہاں تک دانش مندی اور معقولیت پر مبنی ہے۔

اب اُن کی سنئے جو آزاد اور زندہ اقوام کی دیکھا دیکھی صرف اِس لیے اسلام پر طعن کرتے ہیں کہ اُس نے اُن کو آزادی کی زندگی اور عہدہ داری کی ملازمت اور رشتے داری کی نعمت سے ایسا نوازا کہ اپنی بربادی میں بھی شاہانِ اسلام نے اُن گئی گزری اقوام کی آبادی برقرار رکھی۔ یہاں تک کہ اُن کی رعائتوں کے پیش نظر بعض اسلامی شعائر ترک کر دیئے تاکہ اُن کے حق میں رواداری قائم رہے اور اُن کی حفاظت کے لیے ہی اُنہوں نے اپنی ہڈیاں بھی سرزمینِ ہند کے سپرد کر دیں۔ اپنے آپ کو جوکھوں میں ڈالا مگر اُن کی آبرو ریزی کے آڑے آتے رہے۔ پھر بھی اُن کا یہ گلہ ہے کہ اسلام اور مسلمان تلوار سے غیر اقوام پر غالب آئے۔ علامہ شبلی نے کیا خوب لکھا ہے کہ:

اُنہیں لے دے کے ساری داستاں سے یاد ہے اتنا
کہ عالمگیر ہندو کُش تھا، ظالم تھا، ستمگر تھا

مگر مسلمانوں اور اسلام کی حکومت کا ایک چھوٹا سا نمونہ پیش کر کے پھر بیان کیا جائے گا کہ ہندوستان کا ہندو اسلام پر تیغ کا الزام دینے میں کہاں تک حق بجانب سمجھا جا سکتا ہے. مومن خاں لاہور کا گورنر تھا. ایک دن سیر کو نکلا. راستہ میں ایک نوجوان ہندو لڑکی اُس کے گھوڑے کی باگ تھام کر کھڑی ہو جاتی ہے تو گورنر نے پوچھا کیا چاہتی ہے؟ (گورنر چونکہ نہایت حسین جوان تھا) لڑکی نے کہا کہ میں چاہتی ہوں کہ پرماتما مجھے تجھ جیسا ایک خوبصورت بچہ عطا کرے. اُس نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ اِن الفاظ سے تیرا منشا مجھ سے شادی کرنے کا ہے. جبھی یہ تمنا پوری ہو سکتی ہے. لڑکی نے اُس کا جواب ہاں میں دیا تو گورنر نے کہا کہ شادی کے بعد بھی لڑکا ملنا خدا کے بس میں ہے. پتہ نہیں ملے یا نہ ملے اور تمہیں چونکہ مجھ جیسے ایک خوبصورت بچے کی تمنا ہے. لہٰذا تو مجھے ہی اپنا بیٹا سمجھ اور میں تجھ کو اپنی ماں سمجھتا ہوں اور جب تک زندہ رہا اُس کو ماں ہی سمجھ کر خدمت کرتا رہا.

کیا ظالم، بدکردار، ستمگر اور ہندو کش اِسی خوبی کے ہوا کرتے ہیں؟ یا وہ جن کی مختصر روئداد نیچے درج کی جاتی ہے. تعصب تو ایک لاعلاج مرض ہے. اگر یہ پٹی کھول کر دیکھا جائے تو یجر وید کے منتر 228/2 اور 13/12 اور نمبر 4 کے کیا معنی ہیں؟ جس میں دشمنوں اور مخالفوں کو بلاوجہ ہی ہلاک کرنے، جلانے اور تباہ کرنے کے احکام موجود ہیں. لالہ لاجپت رائے نے اپنی تاریخِ ہند کے حصہ اوّل میں اعتراف کیا ہے کہ ہندوؤں نے بدھوں اور جینیوں پر اور جینیوں اور بدھوں نے ہندوؤں پر ظلم کیئے. پانڈیہ خاندان کے راجہ کو جب جینیوں نے بہت ستایا حالانکہ یہ خود جینی تھا مگر اپنی رانی کی ترغیب سے اُس نے شیومت اختیار کر کے آٹھ ہزار جینیوں کا چمڑا اتروا دیا اور نہایت عذاب سے مارا. گورو گوبند بھی مسلمانوں کے قتل کرنے کو ثوابِ عظیم اور اپنی نجات کا موجب سمجھتے تھے. [تاریخ پنجاب کنہیا لال] جنم ساکھی میں لکھا ہے کہ خالصہ جی کے لیے مسلمانوں کا مٹانا فرض و واجب ہے. برہمنوں کی لیلا ایک کتاب ہے اُس میں لکھا ہے کہ جینیوں نے وید اور ہندوؤں کی جتنی اور کتابیں ہاتھ لگیں سب کو تلف کر دیا. آریوں پر حکومت کی اور خوب ستایا. ٹاڈ راجستان میں ہے کہ 881ء میں جینیوں کو بڑا اقتدار حاصل ہوا تو اُنہوں نے مفتوحوں پر جزیہ قائم کیا. ہنود کو بہت ایذائیں دیں. یعنی اُن کے شدید ترین دشمن تھے آخر شنکر اچاریہ نے اُن کو غارت کیا.

سدا شیو مرہٹہ دہلی پر حملہ آور ہوا تو دیوانِ خاص و دیوانِ عام کی نقرئی چھتیں توڑیں اور سلاطین و اولیائے کرام دہلی کے مزرات سے جس قدر بھی آلات نقرہ دستیاب ہو سکے لوٹ لیے اور سب کے

روپے ڈھال کر لے گیا[گلستان ہند راجہ درگا پرشاد] بدن سنگھ مہاراجہ بھرت پور نے بھی دہلی کو لوٹ کر بے شمار دولت حاصل کی[وقائع راجپوتانہ جولار سہائے] میلوکوٹ میں سری وشنو برہمن رہا کرتے تھے۔ یہ مندر زر و جواہر سے لبریز تھا۔ مرہٹوں نے اُسے لوٹ لیا اور تمام مندروں اور متبرک مقامات میں آگ لگا دی[سوانح عمری حیدر علی] نالتھ کی خانقاہ، بدھوں کا معبد برہمنوں کے ہاتھ سے تین بار لٹا اور منہدم ہوا[تاریخِ ہند] چندیری، رنتھور اور سارنگ پور کی مسجدوں و خانقاہوں کو رائے سین نے رانا اور میدنی رائے کے حکم سے گوبر سے لیپ کروایا اور اُن میں مویشی (ڈنگر ڈھور) باندھے[تاریخِ فرشتہ] راجہ دیو رائے نے فیروز شاہ کی سلطنت کا کچھ حصہ فتح کر کے مساجد مسمار کیں اور بہت سے مسلمانوں کو تلوار کے گھاٹ اتارا[اریخِ فرشتہ] راجپوتوں نے قاضیوں کو پکڑ کر ان کی ڈاڑھیاں منڈوائیں اور قرآن کریم کے نسخوں کو کنوئیں میں پھینک دیا[ٹاڈ راجستان جلد اول] بندہ بیراگی کے متعلق تو کچھ کہنا فضول ہے۔ جہاں پہنچا مسجدیں گرائیں۔ مسلمانوں کا قتلِ عام کیا۔ سرہند میں قاضیوں اور مولویوں کی ڈاڑھیاں نچوائیں اور امان کے وعدہ پر تمام مسلمان بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کو مسجد میں داخل ہونے کی اجازت دی اور پھر بدعہدی کر کے سب کو قتل کروا کر آگ لگوا دی۔ ماؤں (حاملہ عورتوں) کے پیٹ چروا کر بچے نکلوا دیئے۔ بڑے بڑے پیروں، بزرگوں مثلاً پیر بہاؤالحق، پیر قطب الدین کی قبریں کھدوا کر اُن کی ہڈیاں نکلوا کر جلا دیں۔[شمشیر خالصہ حصہ دوم مصنفہ گیان سنگھ] ہنٹر صاحب کی تحقیق کے مطابق راجپوت اکثر مساجد کو مسمار کرتے رہتے تھے۔

الغرض فرمانروا ہر ملک و ہر قوم میں لڑتے بھڑتے رہے ہیں اور ان کی لڑائیاں اکثر ذاتی مفاد کے لیے ہوتی تھیں۔ بعض ہم قوم بادشاہ بلکہ حقیقی بھائی بھائی بھی لڑے۔ لیکن ہمیں دکھانا یہ ہے کہ غیر اقوام نے (جو امن و آشتی کا دعویٰ کرتی اور اسلام پر تیغ زنی کا الزام دیتی تھیں)99 فیصدی مذاہب و معابد پر حملے کئے اور مسلمانوں نے 99 فیصدی ہی مذاہب و معابد کا احترام کیا، کیونکہ دوسرے مذاہب والوں سے اسلامی حکم کے ماتحت ایک مسلمان حکمران کو سختی و تشدد مذہباً حرام ہے اور دیگر مذاہب میں یہی کارِ ثواب ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دیگر مذاہب کے پیشواؤں اور فرمانرواؤں نے بالعموم دوسرے مذاہب کے معابد کو تباہ کرنے اور اُن کو ہر قسم کی گزند پہنچانے میں کوئی باک نہں کیا مگر مسلمانوں کے برگزیدہ رسول اور رحمدل راہنما ﷺ اور اُن کے غلاموں نے کبھی غیر مذاہب والوں کو محض مذہبی مخالفت کی بنا پر نہ ستایا اور نہ حملہ کیا، نہ اُن کے منادر و معابد کو گرایا، اور نہ ہاتھ لگایا قبل اِس کے کہ ہم اسلامی پیشوا اور مسلم فاتحوں کی رواداری پر تاریخی حوالہ جات پیش کریں، یہ ذکر کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ مسلمان فاتحین کو جن پاکیزہ

اصولوں نے ایسے ناروا مظالم کرنے سے باز رکھا. وہ کیا تھے؟ چونکہ مسلمان کی زندگی، موت، کھانا، پینا، ماتحتی اور حکمرانی، حُبِّ وطن اور غریب الوطنی، سب کچھ خدا کے لیے ہوتا ہے، اپنی ذات کے لیے نہیں ہوتا. اِس لیے وہ ہر حال میں حکمِ الٰہی کو مقدم رکھتا رہا ہے اور اُسی کے حکم کے ماتحت اُس نے حکومت بھی کی ہے. فاتحین کے قصے ذکر کرنے سے ممکن ہے، ہمارے معترضین حضرات جانب داری پر محمول کریں. بہتر یہ ہے کہ اس مذہب کے جنگی قوانین ہی کا مطالعہ فرمالیں، جس کی وجہ سے اور جس پر وہ تلوار کے ذریعے ترقی کا الزام دیتے ہیں. پھر اگر ضرورت ہوئی، تو فاتحین کے قصے بھی برائے درس پیش کر دیئے جائیں گے. قرآنِ کریم کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ اپنے آپ پر وارد شدہ اعتراضات کا جواب خود دیتا ہے. اُس کو اعانت، جانب داری اور پردہ پوشی کی ضرورت نہیں.

اسلام کے جنگی قوانین

تعصب کی عینک اتار کر دیکھا جائے تو ایک حق بین اور غیر جانب دار نگاہ خود بخود اس نتیجہ پر پہنچ جاتی ہے کہ دنیا جس قدر جہالت سے دور بھاگتی ہے اسی قدر اسلام کے قریب آتی جاتی ہے. کیونکہ اسلام دینِ فطرت ہے اور اس کا یہ خاصہ ہے کہ جب لوگ ہر طرف سے مایوس ہو جاتے ہیں اور باطل پرستی کے فریب سے نکل کر حقیقت کی تلاش میں اِدھر اُدھر مارے مارے پھرتے ہیں تو وہ اُن کے لیے رحمت کا دروازہ کھول دیتا ہے. اُس کے نورانی چہرے کی جھلک اُن کی راہنمائی کرتی ہے. کفر کی تاریکیاں دور ہو جاتی ہیں. تعصب کے پردے اٹھ جاتے ہیں. راستے کی مشکلات سامنے سے ہٹ جاتی ہیں اور اُن کو اسلام کے درس میں پناہ لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا. اِس دعویٰ کی دلیل یہی آیتِ جہاد ہے جو اوپر ابتدائے مضمون میں درج کی گئی ہے. جس کے معنی یہ ہیں ''کہ اگر نہ ہوتا دفع کرنا اللہ کا آدمیوں کو ایک کا دوسرے سے، تو ضرور گرائی جاتیں عیسائی درویشوں کی خانقاہیں اور گرجے اور یہودیوں کے عبادت خانے اور مسلمانوں کی مسجدیں، جن میں کثرت سے خدا کا ذکر کیا جاتا ہے.''

اِس سے ظاہر ہے کہ اسلامی جہاد کا منشاء تیغ زنی، جفا کاری، غارت گری یا ہوسِ ملک گیری کے ماتحت قتل و نہب نہ تھا، بلکہ اِس کا مقصد صرف یہ تھا کہ مسجدوں، گرجوں، یہودیوں کے معبدوں، زاہدوں اور عابدوں کی خانقاہوں اور کمزور انسانوں کو حفاظت میں لے کر ایک ایسا امن قائم کیا جائے جس کی وجہ سے جملہ مذاہب کامل آزادی سے دنیا میں رہ سکیں. وہ کفار کو جبراً مسلمان کرنا نہیں چاہتا تھا. بلکہ اپنے غلاموں اور پیروؤں کو جو بغیر کسی جرم وقصور کے ناحق ستائے جاتے تھے، اغیار کی دستبرد سے اپنی تلوار کے سائے میں محفوظ رکھنے کا متمنی تھا. اِس سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ اسلامیوں نے تلوار اٹھانے میں ابتدا نہیں

کی، بلکہ اینٹ کا جواب پتھر اُس وقت دیا اور تلوار کو متحرک کیا، جب اُن کے خلاف پہلے ہتھیار اٹھائے گئے۔ چونکہ مسلمانوں کی تعداد اتنی کافی نہ تھی کہ وہ دشمن کی نظم اور متفقہ افواج کا مقابلہ کر سکتی، اِس لیے اللہ کریم نے خود بھی مدد دینے کا وعدہ فرمایا۔ یہ آیت اِس بات کی بھی پوری تردید کرتی ہے کہ اسلام نے اِس لیے مسلمانوں کو تلوار نہیں اٹھوائی کہ اس کے ذریعے سے اسلام کی اشاعت کی جائے اور لوگوں کو جبراً مسلمان بنایا جائے، بلکہ سب سے پہلی آیت جو جہاد کے حکم میں آئی، جس میں مسلمانوں کو لڑنے کی اجازت دی گئی، اُس میں فرمایا گیا ہے کہ ہر مذہب کے متعلقین و متبعین کو اجازت دی جائے کہ وہ کھلے بندوں اپنے خدا کی عبادت کریں جس طرح چاہیں، اور اُن کی عبادت گاہوں کی عزت کی جائے۔ پھر اس حکم کے ہوتے ہوئے اور مسلمانوں کے اِس پر عمل پیرا رہتے ہوئے یہ خیال کرنا کہ دوسرے مذاہب والوں کو جبراً مسلمان کرنے کا ارشاد تھا، کہاں تک صداقت پر مبنی اور معقولیت کی دلیل ہو سکتا ہے۔

دشمن چونکہ اسلام کو جڑ سے کاٹ دینا چاہتے تھے اِس لیے اِس کے دفعیہ کی سعی لازمی امر تھا اور اگر اُن کو اِس بدارادے سے روکنے کی کوشش نہ کی جاتی تو مسلمانوں کی یہ چھوٹی سی جماعت دنیا سے بالکل نابود ہو جاتی۔ چنانچہ قرآنِ کریم اس کی شہادت دیتا ہے ﴿ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ﴾ ترجمہ: ''اور تم سے ہمیشہ وہ لڑتے رہیں گے، یہاں تک کہ تم کو کافر بنا ئیں۔ اگر وہ طاقت پاسکیں۔'' [سورۃ بقرہ، رکوع 27]

اِس آیت سے معاندین و حاسدین کے پروگرام اور برے ارادوں کی قلعی کھل گئی اور ساتھ ہی معلوم ہو گیا ہے کہ اسلام کو تلوار ہاتھ میں لینے کی ضرورت کیوں پڑی؟ مسلمان پر طعن آخر اسی کتاب کی بنا پر یا بانیٔ اسلام ﷺ (فداہ امی وابی) کے عمل کی وجہ سے ہی ہو سکتا ہے۔ کتاب کے الفاظ تو سامنے ہیں اور دستور العمل بانیٔ اسلام یہ ہے کہ آپ یتیم ہیں، بے یار و مددگار اور بے کس ہیں، کوئی پارٹی نبرد آزما، کوئی جماعت جنگ جُو، کوئی گروہ کوہ شکن ساتھ نہیں رکھتے جن پر بھروسہ ہو سکتا تھا قومی، ملکی، عزیز و اقارب، برادری، اپنے پرائے، سب دشمن ہیں اور الگ تھلگ۔ ایسی حالت میں اسلام کا ظہور اس یتیم کی گود میں ہوتا ہے اور اِس کو قبول کرنے والی ایک مختصر سی جماعت بعد کو پیدا ہوتی ہے جو تلوار اٹھانا تو در کنار خود اُن مظالم کا تختۂ مشق نظر آتی ہے جن سے انسانیت کو بھی عار ہے۔ پھر یہ جماعت معاندین سے اگر کبھی اپنے مظالم سے دفعیہ کے لیے ہاتھ اٹھاتی ہے، تو گردن زدنی ٹھہرتی ہے اور جو قوم لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی پر امن اور پر سکوت سچی آواز پر تلواریں سونت لیتی ہے وہ معترض کی نگاہ میں نہایت پاکیزہ، شرافت کا مجسمہ، مظلوم، حق بجانب اور معصوم ہے۔ سبحان اللہ اِن انصاف پسندوں اور حق پرستوں کی کیا شان ہے؟

رنگی کو نارنگی کہیں، اور کڑھے دودھ کو کھویا
چلتی کو گاڑی کہیں دیکھ کبیرا رویا

عقل کے دھنی اتنا نہیں سمجھ سکتے کہ اگر اسلام کو تلوار کے ذریعے تبلیغ کرنا مقصود ہوتا تو وہ ایک یتیم کی ڈیوڑھی نہ تلاش کرتا. بلکہ کسی سلطنت کی گود میں پرورش پاتا، جہاں اُس کو مصائب اٹھانے سے قبل ہی تلوار کی فضا ساز گار ملتی اور اِس طرح اپنی تمنا پوری کرتا کہ چودہ سو سال تک بے معنی منہ کھولنے والے معترضین کا تخم بھی نہ چھوڑتا. کیا یہ اُس کی رأفت ورحمت کا ہی نتیجہ نہیں کہ وہ اُن کو اپنے سائے میں نہایت آشتی وامن کی زندگی گزارنے کو بلاتا ہے اور بد اندیش اس پر اعتراض کرتے ہیں. بات اصل میں یہ ہے کہ ہر انسان اپنی فطرت پر متحرک ہوتا ہے. کسی دریا کے کنارے کوئی مردِ خدا بیٹھا اللہ اللہ کر رہا تھا کہ اُس نے ایک بچھو کو پانی میں بہتے ہوئے دیکھا. اُس کے دل میں رحم آیا اور اُس کو پانی سے بچا کر باہر نکال دیا. جونہی کہ اُس نے بچھو کو زمین پر رکھا، اُس نے زہر آلود ڈنگ مار دیا اور پھر دریا کے پانی میں چلا گیا اور اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا. مردِ خدا کو پھر ترس آیا اور سوچا کہ بے عقل ہے مر جائے گا. اُس نے پھر اُس کو نکالا. جونہی اپنے ہاتھ سے رکھنے لگا اُس نے پھر ڈس دیا. اُس مردِ خدا نے اُس سے کہا کہ میں نے تیری جان بچانے کی کوشش کی اور تو نے مجھے ڈسنے سے دریغ نہیں کیا، یہ کیا بات ہے؟ بچھو نے جواب دیا کہ اے رحمدل انسان یہ کوئی بڑی غور طلب بات نہیں. تو نے جو کچھ کیا وہ تیری فطرت ہے اور میں نے جو کچھ کیا یہ میری فطرت ہے. لہٰذا مجھے چھوڑ دے. بعینہٖ یہی حال اسلام کی ہمدردی ورواداری کا اور اُن معترضین کا ہے جن کو وہ ہلاکت سے بچانا چاہتا ہے اور وہ ڈنگ مارتے چلے جاتے ہیں. ہمارے کہنے سے اگر اسلام کی صداقت، رحمت، رأفت اور نوعِ انسان کے لیے مابہ الامتیاز حفاظت پر ایمان لانا اپنے مذہب کو سہلانے کے مترادف ہے تو آؤ غیر مسلم انصاف پسند محققین کی آواز کو سنو وہ کیا کہتے ہیں:

اسلام کی فراخدلی اور رواداری کے متعلق پروفیسر آرنلڈ لکھتے ہیں کہ اگر خلفائے اسلام دل میں ٹھان لیتے تو اپنی قلمرو سے مسیحی دنیا کو اس طرح ملیامیٹ کر دیتے، جیسے بادشاہ فرڈینانڈ اور ملکہ ازابیلا نے اسلام کو ہسپانیہ سے نکالا تھا، یا لوئی چہاردہم بادشاہ فرانس نے پروٹسٹنٹ (Protestant) مذہب کو اپنے ملک میں جرم قرار دے دیا تھا، یا جس طرح سلطنتِ انگلستان نے پینتیس برس تک یہودیوں کو اپنے ملک میں داخل نہ ہونے دیا تھا. مشرقی کلیسا جتنے بھی ایشیاء میں تھے اُن کا تعلق باقی مسیحی دنیا سے بالکل منقطع ہو گیا تھا اور اُن میں کوئی ایسا شخص نہ تھا جو اُن کی طرف انگلی بھی اٹھا سکتا، کیونکہ مشرقی کلیساؤں کو اصل دین سے منحرف سمجھا جاتا تھا. پس اُن کا آج تک مشرقی ممالک میں زندہ رہنا اسلامی حکمرانوں کی مذہبی رواداری کا بین ثبوت ہے اور کسی کو زبردستی مسلمان کرنا، کسی قسم کے ظلم وستم روا رکھنا،

عربی فتوحات میں کہیں بھی نظر نہیں آتا. اسلامی ممالک میں بجز ایسے جرائم کے جو شریعتِ اسلامیہ کے خلاف سرزد ہوں عیسائیوں کے کل مقدمات اُن ہی کے ججوں کے سامنے اور اُن ہی کے قانون کے مطابق فیصلہ پاتے تھے. مذہبی پیروی میں عیسائیوں کا کوئی مزاحم نہ تھا. وہ دینی رسوم آزادی کے ساتھ ادا کرتے تھے. باجوں میں مسیحی گیت گایا جاتا تھا اور مسیحی واعظ لوگوں کو سناتے تھے اور گرجاؤں کے سب تہوار حسبِ معمول منائے جاتے تھے. [آرنلڈ صفحہ 135] پھر مسٹر رابنس لکھتے ہیں کہ اہل اسلام کی مظفر و منصور فوجوں نے جدھر کا بھی رخ کیا قرآنی تعلیمات اُن کے ساتھ ساتھ گئیں. اُنہوں نے کہیں بھی جور و ظلم نہیں کیا اور نہ ہی کسی کو اس بنا پر قتل کیا کہ وہ اسلام کے قبول کرنے سے منکر تھے. مسٹر جان ڈیون پورٹ، مسٹر ایچ. ڈی سینٹ بلیئر، موسیو لیبان، پروفیسر آرنلڈ، لالہ لاجپت رائے اور مسٹر ٹی. ایل وسوانی سب اِس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام کی اشاعت ہرگز بزورِ شمشیر نہیں ہوئی. سلطان محمود غزنوی، اورنگ زیب اور سلطان ٹیپو رحمہم اللہ کے خلاف جس قدر مندر شکنی اور ہندو آزادی کے منافی الزامات لگائے جاتے ہیں وہ سب بے بنیاد ہیں. [دیکھئے واقعاتِ ہند از تلسی رام] مسٹر سیل کہتے ہیں کہ وہ لوگ نہایت دھوکہ کھاتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ مذہبِ اسلام بزورِ شمشیر پھیلا ہے. حالانکہ اسلام تو اُن لوگوں نے بھی قبول کیا ہے جن پر مسلمانوں نے کبھی بھی فوج کشی نہیں کی.

ابھی کل کی بات ہے کہ چودھری چھوٹو رام وزیر پنجاب نے اپنی تقریر کے دوران بیان کیا تھا کہ جو لوگ یہ شبہ کرتے ہیں کہ اسلام ہندوستان میں تلوار کے زور سے پھیلایا گیا ہے غلط ہے. ہندوستان میں اسلام کی اشاعت مسلمان صوفیوں اور درویشوں کی مرہون منت ہے.

آمدم برسر مطلب: یہ امر کہ اسلام نے تلوار صرف ظلم کرنے والوں کے مقابلے میں اٹھائی تھی، کتاب اللہ کی مندرجہ ذیل دوسری آیات سے بھی ثابت ہوتا ہے. خدا کرے کہ معترضین فراخدلی سے ان کا مطالعہ کرسکیں:

1- ﴿ اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ ﴾ ''کیا تم ایسی قوم سے نہیں لڑتے جنہوں نے اپنے عہد و پیمان کا کچھ پاس نہیں کیا اور اُسکو توڑ دیا اور اُنہوں نے رسول علیہ السلام کے نکالنے کا ارادہ کیا اور اُنہوں نے ہی اس فتنے میں ابتدا کی، کیا تم اُن سے ڈرتے ہو؟'' [9:13]

اِس آیت سے بھی تین امور پر اطلاع ہوتی ہے. ایک یہ کہ کسی قوم کا لڑائی کے لیے ابتداء کرنا موجبِ لڑائی ہے. دوم کسی قوم کا معاہدہ کر کے توڑنا اور عہد کے بعد جنگ کی شرارتوں کو خفیہ طور پر جاری رکھنا بھی کسی معہود الیہ قوم کو جنگ پر آمادہ کرنا ہے. سوم پُر امن دعوت و تبلیغ کے مقابلہ میں اللہ کے رسول ﷺ کو گھر اور وطن سے نکالنے کے لیے ارادہ کرنا اور فساد و قتل پر آمادہ ہونا، امن پسند قوم کو دعوتِ

مجادلہ ہے. کیا قرآنِ کریم بلاوجہ لڑائی کے لیے اجازت دے رہا ہے یا مفسدہ پرداز اقوام کے افعال و اعمال کے بدلے میں اہل اسلام کو ذلت سے بچنے کا علاج جنگ بتا رہا ہے؟

2- ﴿ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا ﴾ ''اور تمہیں کیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں نہیں لڑتے ہو، اور ضعیف مرد اور عورتیں اور بچے جو ہر وقت یہ دعائیں مانگتے رہتے ہیں کہ اے رب ہمارے! ہم کو اِس گاؤں سے نکال دے جن کے رہنے والے ظالم ہیں اور ہمارے لیے تو اپنی بارگاہ سے ہمارا مددگار بھیج''. [75:4]

اِس آیت سے بھی یہ ثابت ہوا کہ مسلمان اپنے جانی دشمن سے بھی جنگ کرنے پر آمادہ نہ تھے اور نہ چاہتے تھے کہ خونی دشمنوں سے لڑا جائے. کیونکہ خون ریزی و بدامنی کے علاوہ وہ تعداد و قوت میں بھی مسلمانوں سے بڑھے ہوئے تھے اور اگر خدا کا حکم اور متواتر مدد کا وعدہ نہ ہوتا تو مسلمان اپنے ایسے قوی دشمنوں سے لڑنے کا ارادہ اور مخاصمت کی جرأت نہ کرتے. اس مقابلہ پر نکلنا ضعیفوں اور مظلوموں کی مدد کے لیے اور خداوندِ عالم کی مدد کے وعدے پر تھا. شوقِ ملک گیری یا ذوقِ قتل و جدل کے لیے نہ تھا اور ساتھ ہی یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اُن دشمنوں سے جنگ کی اجازت دی گئی تھی. جو اُن سے جنگ کریں نہ ہر کافر کے ساتھ جنگ کی اجازت تھی اور نہ محض کفر کی وجہ سے ہر کافر اُن کا مدمقابل فرمایا گیا تھا. ایسے کفار جو جنگ کی چھیڑ چھاڑ سے اپنے آپ کو الگ رکھتے. اُن سے صرف لڑنا ہی منع نہ تھا. بلکہ ان سے دوستانہ تعلقات بھی رکھنے کی اجازت تھی اور اُن سے اچھے برتاؤ و عمدہ سلوک کا حکم تھا اور جو کافر مسلمانوں سے برسرِ پیکار بھی تھے اُن سے بھی حد سے زیادہ گزرنا اور آگے بڑھنا جائز نہیں رکھا گیا تھا اور اگر وہ لڑائی سے باز آجائیں تو پھر اُن سے بھی لڑنے کی اجازت نہ تھی. لڑائی صرف اُسی وقت جاری رکھنے کا حکم تھا جب تک دوسری جماعت اُن سے لڑتی رہے اور اگر دوسرا فریق لڑائی سے دست کش ہو جاتا تو اسلامیوں کو بھی فوراً لڑائی بند کر دینے کا ارشاد تھا بلکہ اثنائے جنگ میں بھی مسلمانوں کو انصاف ہاتھ سے چھوڑنے کی اجازت نہیں دی گئی. مثلاً حکم ہوتا ہے:

3- ﴿ وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ﴾ '' اور لڑو اللہ کی راہ میں اُن لوگوں سے جو تم سے لڑتے ہیں اور حد سے آگے مت گزرو کیونکہ اللہ تعالیٰ کو حد سے تجاوز کرنے والے پسند نہیں ہیں.'' [190:2]

یہ آیت اُن لوگوں سے لڑائی کی اجازت فرماتی ہے جو لڑائی میں مسلمانوں سے پہل کرتے ہیں اور وہ بھی اِس شرط کے ساتھ کہ تم اُن کی بے ہودگی و بے راہ روی سے تنگ آ کر زیادتی نہ کر بیٹھنا. یہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں. اِس لیے کہ وہ تو خود پسند، حیلہ جو اور حاسد ہیں. ایک خدا کی مرضی کے متبع اور اسی کے حکم

پر چلنے والی اور انصاف پسند قوم کو اُن کے عادات نہیں لینی چاہیں. ایک خود سر اور مصلح قوم میں یہ امتیاز رہنا چاہیے. دوسری جگہ ارشاد ہو رہا ہے.

4- ﴿ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴾ ''پس جو کوئی تم پر زیادتی کرے تم بھی ان پر زیادتی کرو جتنی اس نے تم پر زیادتی کی ہے، اور اللہ سے ڈرو. اللہ متقیوں کے ساتھ ہے.'' [194:2]

جس قوم کو میدانِ جنگ میں بھی انصاف پر قائم رہنے کا حکم ہو جو مشتعل جذبات کے ماتحت انصاف قائم کر سکنے کا مقام نہیں اور ساتھ ہی انصاف کو چھوڑنے پر رب العزت کے خوف کو مدنظر رکھنے کا حکم بھی ہو اُس قوم پر یہ الزام کہ وہ ذاتی اغراض لے کر اور ہوسِ سلطنت کو مذہب کی آڑ دے کر تلوار سونتے ہوئے میدان میں آئی، تاکہ اپنے مذہب کو دنیا پر پھیلا دے اور غلبہ حاصل کرے. کس قدر بعید از عقل و ہوش بات ہے. کون سی قوم ہے، جس نے دشمنوں پر ماپ تول کر اتنا ہی ہاتھ اٹھایا ہو جتنا دشمن اٹھائے اور زیادتی پر خدا کے ہاں پکڑے جانے کا خوف بھی رکھتی ہو. کاش کہ معترض اسلام کی تعلیم کو پاکیزہ نگاہ سے مطالعہ کرے اور اپنے آپ کو خداوندِ عالم جل ومجدہٗ کی منشاء پر زندگی گزارنے کا اہل بنالے.

5- ﴿ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ﴾ ''پھر اگر وہ تم سے کنارہ کشی کریں اور تم سے لڑائی نہ کریں اور تمہاری طرف صلح کا پیغام بھیج دیں تو اللہ نے تمہارے لیے اُن پر کوئی (زیادتی کرنے کی) راہ نہیں رکھی یعنی اس کے بعد تمہارے لیے یہ جائز نہیں کہ تم ان سے لڑو.'' [90:4]

غور کا مقام ہے کہ زیادتی نہ کرو، زیادتی کے برابر زیادتی کرو اور اگر دشمن لڑائی سے کنارہ کر جائے اور صلح پر آمادگی ظاہر کرے تو تم بھی کنارہ کشی کرو اور صلح پر آمادہ ہو جاؤ. اِس کے علاوہ اُن کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کے لیے تم کو اجازت نہیں دی جاتی. اللہ اکبر! کس قدر صلح جُو، محافظِ انسانیت، قاطعِ جنگ، امن پسند، احکام ہیں، جن سے خوہ مخواہ کی لڑائی اور حرص و آرزو کی جنگ کا کوئی پہلو ہی مترشح نہیں ہوتا. فافہم

6- ﴿ فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَيُلْقُوْٓا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴾ ''پس اگر وہ تم سے کنارہ کشی اختیار نہ کریں اور تمہیں صلح کا پیغام نہ دیں اور تم سے اپنے ہاتھوں کو بند نہ کریں تو اُن کو پکڑو اور اُن سے لڑائی کرو، جہاں تم اُن کو پاؤ. یہ وہ لوگ ہیں جن کے ساتھ لڑنے کا تم کو حق پہنچتا ہے.'' [91:4]

اِس آیت میں بھی صلح کا جواب صلح اور لڑائی کا جواب لڑائی فرمایا گیا ہے. جو بالکل غیر موزوں نہیں ہے.

7- ﴿قُلْ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ﴾ ''اے میرے محبوب کافروں کو اعلان کر دیجیے کہ اگر وہ اپنی شرارتوں سے (اب بھی) باز آ جائیں تو اُن کے گذشتہ ظلموں اور زیادتیوں کو معاف کر دیا جائے گا.'' [38:8]

یہ آیت کس قدر لڑائی کے مٹانے اور امن قائم کرنے پر دلالت فرماتی ہے. ورنہ قابو پانے پر اسلام کو اور مغلوب ہونے پر اُن کو حق پہنچتا تھا کہ بجائے معاف کئے جانے کے اُن کو قرار واقعی سزائیں دی جاتیں. مگر اسلام کی فراخدلی اور رحیمانہ فطرت نے یہ بھی جائز نہیں رکھا کہ غلطی والے کو ضرور ہی سزا دی جائے. بلکہ معاف فرما دینے کی حیثیت بھی سمجھا دی ہے. جو نہایت وسیع ظرفی اور عالی حوصلگی کی دلیل ہے.

8- ﴿وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ﴾ ''اور اگر صلح کی طرف جھکیں تو تُو بھی صلح کے لیے جھک جا، اور اللہ پر بھروسہ رکھ. وہ سننے والا اور جاننے والا ہے، اور اگر وہ تجھ کو دھوکا دینا چاہیں تو اللہ تجھ کو کافی ہوگا.'' [61:8]

اِس آیت میں یہ حکم دیا کہ جب کبھی کافر صلح کی درخواست کریں اُن سے صلح کر لیں. رہا یہ خیال کہ دشمن شاید دھوکہ سے صلح کر رہا ہو اور جب کبھی موقع پائے گا. پھر مخالفت پر آمادہ ہو جائے گا. رسولِ کریم ﷺ کو صلح کرنے سے مانع نہیں ہو سکتا تھا. صلح کے لیے حضور نبی کریم ﷺ کی اِس قدر مستعدی صاف بتا رہی ہے کہ آپ کیسے امن پسند اور صلح جُو پیامبر تھے. آپ کی طرف سے ہر دشمن کے ساتھ جو تلطّف و کرم نوازی اور فیاضی ظہور پذیر ہوتی رہی وہ دشمنوں کی جانب سے کبھی ظاہر نہیں ہوئی اور پُوری تاریخ اسلام میں اِس کی ایک مثال بھی نہیں ملتی. اللہ تعالیٰ نے اِس آیت کے آخر میں دشمنوں کی دھوکہ دہی اور دغابازی کا اشارہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ اُن کی طرف سے جو دھوکہ دہی کا خیال ہے اُس کا نبٹنا اور بدلہ خدا پر چھوڑ دیجیے. دشمنوں کی ہر ایسی فریب دہی کا وہ بہتر منتقم حَکَم ہے.

الغرض اِس قسم کی اور بھی آیات ہیں جن میں سے اسلام کا جنگی پہلو اور کافروں کی حاسدانہ چالیں واضح ہو جاتی ہیں لیکن پھر بھی اسلام کی تعلیم یہی ثابت ہوتی ہے کہ کسی قوم کی دشمنی سے مسلمانو! یہ رغبت نہ کرو کہ انصاف کو چھوڑ کر اُس کو سزا دینے یا قتل پر تُل جاؤ. وہ جو کریں، تم ہر حال میں نرمی، انصاف اور عفو کو مدنظر رکھو اور عمدہ تدابیر اور احسن طریقوں سے برائی کو دور کرو. یہاں تک کہ وہ شخص کہ آپ کے اور اُس کے درمیان عداوت ہے پکا اور گہرا دوست بن جائے اور یہی وجہ تھی کہ حضور ﷺ ہمیشہ اپنے مخالفوں کی گذشتہ بے رحمیوں اور ظلموں کو معاف کرنے کے لیے تیار رہتے تھے. معلوم ہو گیا کہ مسلمانوں کی لڑائیاں دشمنوں کی تلوار کو روکنے کے لیے تھیں، نہ جبراً مسلمان بنانے کے لیے اور یہ

ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اگر اسلام اس کی بھی اجازت نہ دیتا تو وہ مخالفین اسلام اور مسلمانوں کے نام تک کو صفحۂ دنیا سے مٹا دیتے.

یہاں یہ امر بھی یادداشت کے قابل ہے کہ مسلمانوں کو جو فتوحات نصیب ہوئیں وہ مسلمانوں کی طاقت کی وجہ سے نہ تھیں بلکہ وہ تائیدِ ایزدی تھیں. جن کا ابتداء ہی میں اُن سے وعدہ ہو چکا تھا اور یہی وجہ تھی کہ جہاں وہ فاتحانہ صورت میں داخل ہوئے اُن کی حرکات و سکنات اللہ کی مشیّت کے ماتحت ہوا کرتی تھیں. اُن کے جلو میں وہ شوخی، وہ غارت گری، وہ قتل و نہب، وہ خود پسندی، وہ طمطراق، وہ دبدبہ، وہ جلال نہ ہوتا تھا جو ایک دنیا کے دلدادہ بادشاہ اور ملک گیری کے شیدائی ایک حکمران کا ہو سکتا ہے.

فاتح اور پیغمبر کا امتیاز

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایک فاتح بادشاہ اور ایک فاتح نبی کا کچھ فرق بیان کر دیا جائے جو معترض کی آنکھ کو حقیقت کا نُور پانے میں مدد دے سکے. کیونکہ جہاد اسلامی کی حقیقت جن مقاصد پر مشتمل ہے اُن کے لحاظ سے وہ دُنیوی لڑائیوں سے بالکل مختلف ہے اور یہ اختلاف اِس قدر بدیہی ہے کہ ہم کو اُس کی ظاہری شکل کے ایک ایک خدوخال کے اندر نمایاں طور پر نظر آ سکتا ہے.

ایک فاتح جب ملک گیری کے ارادے سے میدانِ جنگ کا رخ کرتا ہے تو طبل و ڈھل کے غلغلے اور قرنا و برق کے ترانے اُس کا خیر مقدم کرتے ہیں. سر پر چتر شاہی ہوتا ہے. جو سورج کی بھی گرم شعاع کو اُس کے قریب آنے کی جرات نہیں کرنے دیتا اور سامنے پرچم لہراتا ہے، جس کے پاس یہ جاہ و جلال کا مجسمہ کھڑا ہو جاتا ہے اور تمام فوج اس مرصع بت کے گرد طواف کرنے لگتی ہے. عظمت و ہیبت کا یہ منظر دنیا کو دفعتاً مرعوب کر دیتا ہے اور اِس رُعب و داب کے احساس سے اُس دنیا دار فاتح کا سرِ پُرغرور بادۂ نخوت سے لبریز ہو جاتا ہے اور یہاں تک کہ اُس کا یہ نشہ خاک و خون میں مل کر بھی نہیں اترتا.

لیکن ایک اللہ کے نبی برحق کی حالت اس سے بالکل جداگانہ اور مختلف ہوتی ہے.

1- وہ گھر سے جب نکلتا ہے تو باوجود مخلصین کی ایک قربان ہونے والی جماعت ہمراہ ہونے کے وہ اپنا رفیقِ سفر صرف خدائے واحد ہی کو بناتا ہے. جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ آنحضرت ﷺ جب بغرض جہاد روانہ ہوتے تھے تو یہ دعا فرماتے. ((اَللّٰھُمَّ اَنْتَ الصَّاحِبُ فِی السَّفَرِ وَالْخَلِیفَۃُ فِی الْاَھْلِ الْاٰخِرِ)). یعنی اے خدا تو ہی ہمارا رفیق سفر ہے اور تو ہی ہمارے بال بچوں میں ہمارے پیچھے محافظ و قائمقام ہے.

2- وہ سواری کی پشت پر قدم رکھتا ہے تو خدا کا شکر ادا کرتا ہے کہ وہ خدا بزرگ و برتر ہے. جس نے اس سواری کو ہمارا فرمانبردار بنا دیا ہے. ورنہ ہم اِس کی قدرت و طاقت نہ رکھتے تھے.

3- وہ سفر سے پلٹتا ہے تو خدا کی حمد کا ترانہ سناتا ہے اور اُس کی بندگی کا اظہار فرماتا ہے. کوئی بلندی ایسی نہیں جہاں وہ چڑھتا ہوا خداوندِ عالم کی بڑائی نہیں پکارتا اور کوئی نچان نہیں جہاں اُس کی ترنم ریز تسبیح و تہلیل کے نعرے نہیں مارتا.

4- وہ فوج کو میدانِ جنگ میں بھیجتا ہے تو اُس کو طاقت کا غرور نہیں سمجھاتا اور نہ اُس کے جوشِ قوم کو دو آتشہ کرتا ہے. بلکہ اُس کے سفر اور تمام نتائجِ اعمال کو خدا کے سپرد کر کے رخصت کر دیتا ہے.

5- وہ منزل پر اترتا ہے تو نہ تو سلاطین کی طرح اُس کے لیے خیمے نصب کئے جاتے ہیں اور نہ فروشِ شاہانہ سے زمین آراستہ ہوتی ہے. وہ خدا کا نام لے کر زمین پر ہی لیٹ جاتا ہے اور اپنی حفاظت کی خدمت اِن الفاظ میں زمین ہی کی سپرد فرما دیتا ہے. ((يَا أَرْضُ رَبِّي وَ رَبُّكِ اللّٰهُ أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شَرِّكِ وَ شَرِّ مَا فِيكِ وَ مِنْ شَرِّ مَا يَدُبُّ عَلَيْكِ)). یعنی اے زمین میرا اور تیرا خدا ایک ہی ہے. میں تیرے شر سے، تیری سطحِ باطنی کے شر سے اور تجھ پر چلنے والوں کے شر سے پناہ مانگتا ہوں.

6- وہ سفر جہاد سے پلٹ کر گھر پہنچتا ہے تو سب سے پہلے اُس کو خدا کا گھر یاد آتا ہے اور مسجد میں جا کر دو رکعت نمازِ نفل ادا کرتا ہے.

7- جب وہ فتح کی خبر پاتا ہے تو نہ خوشی میں شادیانے بجتے ہیں اور نہ جشنِ شاہانہ منایا جاتا ہے. بلکہ صرف اپنے خدا کے حضور میں فوراً سجدہ ریز ہوتا ہے اور شکر بجا لاتا ہے.

8- اگر وہ مشیت ایزدی کے ماتحت کبھی پسپائی کا منہ دیکھتا ہے تو وہ فوج کے افراد کو جوش و غیرت نہیں دلاتا. بلکہ اپنے مولا کریم ہی کی غیرت کی اِن الفاظ میں سلسلہِ جنبانی کرتا ہے. ((اَللّٰهُمَّ إِنَّكَ إِنْ تَشَاءَ لَا تُعْبَدُ فِي الْأَرْضِ)). یعنی اے خدا کیا تو چاہتا ہے کہ اب زمین میں تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ ہو؟

9- وہ اپنی فوج کی قِلّت اور دشمن کے لشکر کی کثرت کو دیکھتا ہے تو صرف رحمتِ الٰہی و نصرتِ آسمانی ہی سے مدد طلب فرماتا ہے. کسی دُنیوی طاقت کے آگے دستِ سوال دراز نہیں کرتا.

10- جنگ میں اُس کو زخم لگ جائے تو بجائے انتقام لینے کے وہ یہ فرما کر خاموش ہو جاتا ہے. ((رَبِّ اغْفِرْ لِقَوْمِي فَإِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ)). یعنی اے خدا میری قوم کو معاف فرما. کیونکہ یہ لوگ مجھ کو نہیں جانتے.

11- اگر وہ بحیثیت فاتح مفتوحین پر اپنے آپ کو قابض دیکھتا ہے تو جانی دشمنوں اور غیر مسلموں سے بھی انتقام نہیں لیتا. اُن کو قتل کا حکم نہیں دیتا. بلکہ انہیں آرام کے ساتھ رکھا جاتا ہے. پیٹ بھر کر

کھلاتا ہے اور جو ننگے ہوں اُن کو کپڑا بھی پہناتا ہے. خاندانوں کی، شریفوں کی، شریف زادوں کی، عزت داروں کی عزت کو ملحوظ رکھتا ہے اور بدلگاموں کو معاف فرما کر رہائی دے کر یہ اشارہ کرتا ہے کہ جاؤ امن کی زندگی گزارو اور رحم کرنا مجھ سے سیکھو. میں بدلہ نہیں لیا کرتا. کیا دنیا کی کوئی حکومت اپنے جانی دشمنوں اور غداروں سے وہ سلوک کر سکتی ہے جو اللہ کے بھیجے ہوئے رحم دل اور کریم النفس نبی ﷺ کی ذات نے فرمایا اور اگر اس پر بھی معاندین مطمئن نہیں. تو ہم یہاں مختصراً مثالی طور پر وہ چند واقعات تاریخ کی روشنی میں پیش کرتے ہیں. جن سے پتہ چل جائے کہ بقولِ معترض تیغ زن نبی اور تلوار کے دھنی رسول ﷺ کی فتوحات کا رنگ کیا تھا. کیونکہ بہترین معیار رواداری اور پرکھ کی کسوٹی آپ ہی کی فتوحات قرار پا سکتی ہیں.

فاتح رسول ﷺ کی فتوحات

حضور ﷺ کی فتوحات عرب اور حدودِ شام سے لے کر یمن، بحرین، حضر موت اور عمان تک پھیل گئیں تھیں اور آپ کی تمام لڑائیاں غیر مسلموں ہی سے نہیں بلکہ اپنے قومی تشنہ خون اور جانی دشمنوں سے بھی ہوئیں اور اس حالت میں ہوئیں جب کہ مسلمانوں کے جذبات انتقام کی آگ سے بھڑکے ہوئے تھے اور جو اُن کے مسلمہ معاند و دشمن تھے، مثلاً کفر و اسلام کی پہلی جنگ بدر ہے، جس میں اسلام کو تباہ و برباد کرنے کے لیے قریش پورے زور اور بڑے حوصلے سے اٹھے تھے. مگر اُن کی تمام اکڑفوں غارت ہوگئی اور خدا کے برگزیدہ رسول ﷺ نے فتح پائی. پھر کیا تھا. دشمنانِ اسلام بند و سلاسل میں جکڑے ہوئے میدانِ جنگ سے حضور ﷺ کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں. آپ نے نہ تو اُن کے قتل کا حکم دیا اور نہ اُن سے اسلام قبول کروایا. بلکہ فرمایا تو یہ کہ ان کو آرام سے رکھا جائے. پیٹ بھر کر غذا دی جائے اور جو ننگے ہیں ان کو لباس بھی ملے درانحالیکہ اسلام کا حقیقی دشمن سمجھتے ہوئے حضرت عمرؓ نے اُن سب کے قتل کی رائے بھی دی مگر آپ نے منظور نہ فرمائی. مکہ میں گھر گھر ماتم بپا تھا کہ سردار تو جنگ میں مارے گئے اب جو گرفتار ہیں اُن کو بھی قتل کر دیا جائے گا. مگر ایسا نہ ہوا بلکہ رحمت اللعالمین نبی کریم ﷺ نے مغرور و گردن فراز دشمنوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اب تم مجھ سے کیا توقع رکھتے ہو؟ یہ لوگ سنگ دل اور شقی قلب ہونے کے ساتھ اداشناسِ رسالت بھی ضرور تھے. فوراً مجمع کا مجمع بول اٹھا تو کریم ابن کریم ہے. آج ہمیں آپ سے وہی توقع ہو سکتی ہے. جو حضرت یوسفؑ سے اُن کے بھائیوں کو تھی. تو حضور ﷺ فرماتے ہیں ((لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ اِذْھَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ)) یعنی آج کے دن تم پر کوئی سختی اور تنگی نہیں ہے. جاؤ تم سب کے سب آزاد ہو.

یہ وہ جبارانِ قریش تھے۔ جو مسلمانوں کو جھلستی ہوئی دھوپ میں، تپتی ریت پر لٹا کر سینوں پر بھاری پتھر رکھ دیا کرتے تھے اور جن کی زبانیں حضور ﷺ کے حق میں کبھی گالی اور بکواس کے سوا نہ کھلیں۔ جن کی کوششیں اسلام کی بیخ کنی کے سوا اور کچھ نہ تھیں۔ جن کی رعونت کی پیاس خدا کے نبی کے خون کے سوا نہ بجھنے والی تھی۔ جن کی دل لگی اوقاتِ تبلیغ میں حضور ﷺ کو پتھروں سے زخمی کرنا تھا۔ جنہوں نے حضور کو زندگی سے مٹانے کے لیے تین برس تک شعب ابو طالب میں بھوکا پیاسا محصور رکھا۔ جنہوں نے بارہا قتل نبی ﷺ کے ارادے پر کاشانہ نبوت کا محاصرہ کیا۔ جنہوں نے راستے میں کانٹے بچھائے اور گڑھے کھودے۔ جنہوں نے سیلاب بن بن کر مدینہ طیبہ پر حملے کیے۔ جنہوں نے آپ کے چچا حمزہؓ کا جگر چبایا اور خون پیا۔ جنہوں نے آپ کی معصوم صاحبزادی زینبؓ کو نیزہ مار کر ہلاک کر دیا اور جنہوں نے پورے اکیس سال تک حضور ﷺ پر اور تمام مسلمانوں پر سکھ کی نیند حرام کر دی تھی۔ مگر واہ رے رحمتِ عالم کی عالی ظرفی و بلند حوصلگی اپنے "رحمت" ہونے کا پورا پورا ثبوت دیا اور فرمایا میں تم سب کو بری کرتا ہوں اور بخشتا ہوں۔

وہ ابو سفیان جس کی زندگی کا ہر لمحہ رسولِ کریم ﷺ کو اذیت دینے میں گزرتا تھا اور جو دشمنانِ اسلام کا سرغنہ ہونے کی حیثیت سے ہر برائی میں پیش پیش رہا کرتا تھا۔ ایک وقت آ گیا کہ جاسوسی کرنے گیا اور گرفتار ہوا۔ مجرمانہ حیثیت میں دربارِ نبوت میں پیش کیا جاتا ہے۔ آئینِ جنگ اِس امر کا تقاضہ کرتے ہیں کہ ایسے شریر انسان کا سر قلم کر دیا جائے اور وہ خود بھی سمجھتا ہے کہ آج خیر نہیں کیونکہ خدا کے نبی کی ایذارسانی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ جس پر آج تخلصی کی توقع کر سکوں۔ مستقبل نہایت تاریک نظر آ رہا ہے۔ چہرہ زرد، جسم میں لرزہ۔ رنگ فق اور بید کی طرح تھر تھر کانپ رہا ہے۔ قدم رکھتا کہیں اور پڑتا کہیں۔ حضور ﷺ نے اُس کی اِس دہشت زدگی اور بے بسی کو دیکھ کر فرمایا ابو سفیان گھبراؤ نہیں آگے آؤ نہایت رافت و رحمت کا سلوک فرمایا اور پاس بٹھا لیا اور ارشاد کیا۔ کیا اب بھی یقین ہوا کہ نہیں اللہ ایک ہے اور اُس کے سوا کوئی معبود نہیں؟ یہ سن کر ابو سفیان نے سر جھکا لیا اور دبی آواز سے عرض کی کہ اگر اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہوتا تو وہ آج میری مدد ضرور کرتا۔ پھر حضور ﷺ نے فرمایا۔ کیا میری رسالت میں کوئی شک ہے؟ تو کہنے لگا نہیں، آپ اللہ کے سچے رسول ہیں، اُس وقت حضور ﷺ نے لشکرِ اسلام کی شان و عظمت دکھانے کے لیے اُس کو ایک پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا کر دیا اور اپنے مسلح جانبازوں کا وہ ایک متلاطم سمندر دکھایا جس کی صولت وہیبت اور جلال واحتشام دیکھ کر ابو سفیان کے ہوش اُڑ گئے اور آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور اُسی وقت ابو سفیان کا اپنی قلبی قوت اور رئیسانہ سطوت کے ماتحت ایمان لا کر لشکرِ اسلام کے ساتھ ہو جانا اس شان کا حامل ہو گیا کہ فتحِ مکہ کے وقت اُن دشمنان دین کی پناہ گاہ اسی ابو سفیان کا گھر بنتا ہے جو فتحِ مکہ کے دن مرعوب ہو کر قتل سے پناہ لینا چاہتے ہیں یعنی مکہ مکرمہ میں فاتحانہ طور پر داخل

ہوتے ہی حضور ﷺ نے یہ اعلانِ عام فرما دیا تھا کہ جو ہتھیار ڈال دے گا یا دروازہ بند کرلے گا یا ابوسفیان کے گھر میں پناہ گزین ہو جائے گا، اسکو امان دی جائیگی۔

سبحان اللہ، ظہورِ عالم سے لے کر رہتی دنیا تک اس کرم وعفو کی مثال بھی زمانہ نہ پیش کرسکا ہے اور نہ کر سکے گا کہ ایسے اشقیاء اور جان کے لاگوؤں کے ساتھ اس قسم کی مکرمت وعفو اور اس نوع کی فتح مندانہ نوازش کی گئی ہو یا کی جاسکے۔ یہ تھا فاتح اعظم کی فتح کا مظاہرہ جس کو ایک حاسد آنکھ آج تک اسلام کی تلوار کی چمک سے چندھیا کر بے رحمی، قتل ونہب اور غارت گری کے الزام سے ملوث کرنا چاہتی ہے موسیو لیباں نے کیا سچی اور مزے کی خدالگتی بات کہی ہے کہ دنیا کو مسلمانوں جیسے رحمدل فاتح بھی نصیب ہی نہیں ہوئے: شعر

گر نہ بیند بروز شپرّہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ معترض کی آنکھ کا دوسرا کانٹا بھی نکالنے کے لیے اُن لوگوں کے بھی چند نمونے پیش کردیئے جائیں۔ جو بقول اُس کے اسلام کی تلوار سے مرعوب ہو کر اور آبائی دین ترک کر کے اسلام کی آغوش میں آئے تھے اور اُن کو اسلام سے کیا محبت وعشق اور دل پذیری و دلچسپی تھی جس سے معترض کے بے معنی قول کے مطابق (متنفّر اور کینہ رکھنے کے باوجود) بھی اس سے منہ نہ موڑ سکے اور وطن کی دوری، احباب واقارب کی مجبوری، تنگدستی ولاچاری، قوم وملک کی عداوت بھی اُن کے اسلامی استقلال وثبات کے قدموں کو جنبش نہ دے سکی۔

اسلام کی مفتوح جمعیّت

یہ عنوان قائم کرنے کی ضرورت اِس لیے پیدا ہوئی ہے کے بزورِ شمشیر اسلام کی اشاعت کے طعن کا ہم وہ نتیجہ پیش کرسکیں۔ جو معترض کی اندورنی جلن اور بیرونی سوزش کو ٹھنڈا کردے اور جس سے یہ واضح ہو جائے کہ وہ سب لوگ جن سے بزورِ شمشیر کلمہ پڑھوایا گیا اُن کا انجام کار کیا ہونا چاہیے تھا اور وہ کب تک مسلمان رہ سکتے تھے۔ ایک بہت کم فہم بے علم و بے سمجھ انسان بھی اِس سوال کا جواب دے سکتا ہے اور اِس حقیقت پر زبان کھول سکتا ہے کہ جبر وتشدد سے ہمیشہ نفرت بڑھتی ہے اور نفرت سے عداوت کی آگ بھڑکتی ہے۔ لہٰذا جو لوگ جبر و اِکراہ سے ایمان لائے، حقیقتاً ان کو اسلام کے لیے مارِ آستین بننا اور موقعہ ملنے پر اسلام جیسی ٹھونسی گئی چیز کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہیے تھا۔ مگر یہ نہیں ہوا اور جس شخص نے تاریخِ اسلام کا مطالعہ کیا ہے۔ اس پر بخوبی روشن ہے کہ وہ لوگ اسلام کے لیے مارِ آستین نہیں

بنے بلکہ وہ اسلام کی مار میں لذت حاصل کر کے یہی پکارنے والے عاشق زار ثابت ہوئے: شعر

ادیمِ طائفی نعلینِ پا کن
شراکِ رشتۂ جانہائے ما کن

الف- حضرت صدیق اکبرؓ ایک برگزیدہ و با اثر رئیس اور نامور تاجر تھے، ہزاروں لوگوں سے لین دین رکھتے اور سینکڑوں ان کے مقروض تھے. باوجود اس عزت و توقیر کے اسلام لاکر ان دشواریوں میں مبتلا ہوئے کہ زدوکوب ہوتا ہے لوگ نیم مردہ کر کے چلے جاتے ہیں. وطن عزیز سے ہجرت کرنا پڑتی ہے. بال بچوں کو نہایت المناک حالات میں چھوڑتے ہیں. مگر یہ نہیں ہوسکا کہ اسلام چھوڑ دیں.

ب- حضرت عمار، اُن کے والد یاسر اور اُن کی والدہ سمیہ رضوان اللہ علیہم تینوں اسلام لاتے ہیں. ابوجہل مردود نے بی بی سمیہؓ کو رانوں میں نیزہ مار کر ہلاک کر دیا. حضرت یاسرؓ کو سنگ باری اور نیزے کی نوکیں مار مار کر شہید کیا گیا. حضرت عمارؓ اپنے والدین کے ساتھ ہر رنج والم میں شریک رہے. مگر سب صعوبتیں برداشت کر کے دکھا دیا کہ اسلام کی جدائی گوارا نہیں.

ج- حضرت بلالؓ کی گردن میں رسی باندھ کر شریر لونڈوں کے سپرد کر دیا جاتا ہے تاکہ اُن کی ایذا رسانی سے تنگ آکر اسلام کو خیر باد کہہ دیں. لڑکے اُن کو کہیں گلی کوچوں میں گھسیٹتے ہیں، تو کہیں تپتی ریت پر لٹا دیتے ہیں. مگر یہ عاشقِ رسولِ انام صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ اپنی انتہائی ذلت منظور ہے مگر دین حق کی اتنی بھی منظور نہیں کہ بلال انکار کر کے اُس پر کذب کی توہین کا موجب بنے.

د- حضرت طلحہؓ کو جنگ میں 75 زخم لگتے ہیں اور بے ہوش ہو کر گر جاتے ہیں. سیدنا ابوبکرؓ اُن کے منہ میں پانی ڈالتے ہیں تو ہوش آجاتا ہے. ہوش آنے پر سب سے پہلا سوال جو صدیق اکبرؓ سے کرتے ہیں یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیسے ہیں؟ صدیق اکبرؓ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے مجھ کو آپ کی خبر کو بھیجا ہے. حضور صلی اللہ علیہ وسلم بعافیت ہیں. طلحہؓ فرماتے ہیں کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم بخیریت ہیں تو مجھے اپنی جان کی پرواہ نہیں.

ہ- سعد بن ربیعؓ مخلصانِ بارگاہ سے تھے. ایک جنگ میں زخموں سے چُور پائے گئے. ایک صحابی نے پوچھا کیا حال ہے؟ فرماتے ہیں میری وصیت سن لو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں میرا اسلام پیش کر کے یہ عرض کرنا کہ مولا کریم آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے. آپ کی مہربانیوں اور عطاؤں سے ہم کو کیا کیا مراتبِ رفیعہ و مدارجِ شفیعہ حاصل ہوئے ہیں. گویا جان توڑ رہے ہیں مگر حضور کے شکر گزار رہیں.

و- حضرت عمر بن معاذؓ جنگِ اُحد میں شہادت پا جاتے ہیں. جنگ سے واپسی پر رسول اللہ ﷺ نے اُن کی والدہ ماجدہ سے چند کلماتِ تعزیت فرمائے تو وہ سننے کے بعد بڑے اطمینان سے عرض کرتی ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ (آپ) نے بسلامت مراجعت فرمائی ہے تو میں سب کچھ حضور ﷺ پر قربان کر سکتی ہوں.

ز- اسی جنگ میں ایک اور انصاری عورت کے باپ، بھائی، بیٹا اور شوہر شہید ہو گئے. چار کوس پر شہر تھا. اس کو بھی خبر جا پہنچی. اسلامی فوج کی واپسی پر شام کو سرِ راہ آ کھڑی ہوئی. پوچھا کیا اللہ تعالیٰ کے نبی تو بخیریت واپس تشریف لائے ہیں؟ لوگوں نے کہا ہاں. تو کہنے لگی اگر حضور ﷺ زندہ ہیں تو مجھے کسی عزیز کی موت کا غم نہیں.

ح- حضرت حنظلہؓ جن کو "غسیل الملائکہ" فرمایا گیا ہے. ایک رات کی بیاہی دلہن کو چھوڑ کر جذبۂ دین کے ماتحت میدانِ جنگ میں پہنچتے ہیں اور شادی کے جوڑے کو بجائے عیش وطرب کے رنگ کے، اپنے ہی خون سے رنگین بناتے ہیں.

ط- حضرت خبیبؓ بن عدی (بلیع الارضؓ) کو قریش نے زندہ گرفتار کر لیا اور کچھ مدت قید رکھا. پھر پھانسی دینے کے ارادے پر باہر لے جا کر پھانسی کے نیچے کھڑا کر کے کہا کہ اب بھی اسلام چھوڑ دے تو تجھے آزاد کر دیا جائے گا. حضرت خبیبؓ بن عدی فرماتے ہیں اگر روئے زمین کی حکومت بھی میرے سامنے پیش کرو تو اسلام نہیں چھوڑا جا سکتا. پھر کفار قریش نے کہا. کیا تو یہ پسند کرتا ہے کہ تیری جگہ یہاں محمد ﷺ محصور ہوتے اور تو گھر میں آرام سے بیٹھا ہوتا. آپ نے فرمایا. حضور علیہ السلام کے پاؤں مبارک میں ایک معمولی کانٹا لگ کر بھی میری جان بچتی ہو تو مجھے یہ بھی گوارہ نہیں اور نہایت خندہ پیشانی سے پھانسی کو بوسہ دیا اور اوپر چڑھ گئے.

ی- حضرت زبیر بن العوامؓ جو عشرہ مبشرہ صحابہ سے ہیں. باوجود رئیس زادہ ہونے کے 16 سال کی عمر میں اسلام لاتے ہیں اور اپنے والدین کے مصائب کا شکار بنتے ہیں. کھجور کی چٹائی میں لپیٹ کر آپ کو نیچے سے دُھواں دیا جاتا ہے تاکہ اسلام سے نفرت وترک کا اظہار کر دیں مگر اسلام کا وہ نشہ نہ تھا کہ جسے حرب وضرب کی تُرشی اتار سکتی.

یہ ہیں مشتے نمونہ از خروارے عاشقانِ رسول اللہ ﷺ صحابہ رضوان اللہ علیہم کے خلوص و جان نثاری کے واقعات اور ان کے فدائیانہ جوش کے زندہ تذکار جن کو تاریخِ اسلام رہتی دنیا تک نورانی حروف میں آنے والی نسلوں کے سامنے پیش کرتی رہے گی. بھلا معترض سے کوئی پوچھے کہ جن لوگوں کو مجبور کر کے نئے دین میں داخل کیا گیا ہو اور تلوار کے زور سے ان کا پیارا آبائی مذہب چھڑایا گیا ہو. ان میں یہ محبت وخلوص اور یہ عقیدت واستقامت ہو سکتی ہے؟ اور کیا وہ لوگ اسی نمونہ کے ہوا کرتے ہیں؟

بہ بین تفاوتِ راہ از کجاست تا بہ کجا

کیا دلوں میں نفرت رکھتے ہوئے عمر بھر ہر روز پانچ نمازیں ادا کرتے رہنا، ہر سال اپنی آمدنی کا چالیسواں حصہ غرباء و مستحقین کی نذر کرتے رہنا، گرم سے گرم موسم میں جملہ مقتضیاتِ طبع کو چھوڑ کر خوشنودیءِ باری تعالیٰ کے لیے متواتر ایک ماہ تک بھوک اور پیاس کو برداشت کرنا اور ہزاروں کوس سے بحر و بر کو چیر کر اور آفاتِ ارضی و سماوی کو جھیلتے ہوئے پا پیادہ عرفات و منیٰ میں پہنچنا، اسلام کی محبت و صداقت کی دلیل ہے، یا معترض کی یاوہ گوئی اور ہرزہ سرائی کی؟

هٰذَا بَصَائِرُ لِلنَّاسِ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی

برکاتِ غزواتِ اسلامیہ

اور میدانِ قتال میں بادشاہ فاتح اور پیغمبر فاتح کا امتیاز

﴿ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ؕ﴾

"اور تم بھی اللہ کی راہ میں اُن لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور حد سے نہ گزرو،
تحقیق اللہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔" [البقرہ۲:۱۹۰]

حرب یا قتال کیا ہے

عربی زبان کی وسعت اِس قسم کے سینکڑوں الفاظ پیش کرسکتی ہے۔ جن سے مقاصد جنگ کا مفہوم واضح ہو جائے لیکن سب سے زیادہ متداول لفظ حرب تھا۔ جو لغوی معنوں کے لحاظ سے اِس مفہوم کی ایک جامع تفسیر ہے۔ دنیا میں صرف لوٹ مار یا بغض و انتقام کے لیے شعلہ ہائے جنگ بھڑکائے جاتے تھے۔ جن کو عادتاً اہل عرب نہایت معمولی چیز سمجھتے تھے اور اِس قسم کی لڑائی اُن کی نگاہ میں کوئی گناہ نہ تھی مگر دوسری قسم کی لڑائیوں کی عبرت انگیز داستانوں کو تاریخ نے محفوظ رکھا۔

لفظِ حرب ان دونوں قسموں کی لڑائیوں کے اسباب و مقاصد پر محیط ہے۔ جیسا کہ تصریحاتِ لغت سے ثابت ہوتا ہے کہ حرب کے معنی غصے ہونے کے ہیں اور تحریب کے معنی بھڑکانے، غصہ ہونے، غصہ کرنے، غصہ دلانے اور نیزہ تیز کرنے کے ہیں۔ حربہ اُس مال کو کہتے ہیں جس پر آدمی زندگی بسر کرتا ہے اور حرب کا اطلاق کسی کے مال لے لینے اور قلاش رہ جانے پر بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ لٹے ہوئے شخص کو محروب اور حریب بھی کہتے ہیں۔

یہی قوم، یہی لٹریچر اور یہی زبان تھی جس میں قرآنِ کریم کا نزول ہوا اور اب ہم کو معلوم کرنا چاہیے کہ اُس نے عرب کے عقائد، عرب کے اعمال اور عرب کی تہذیب و تمدن میں جو اصلاحیں کیں اُن کا اثر عرب کی تاریخ، جنگ اور دنیا بھر کی تہذیب اور جنگ پر بھی پڑا ہے یا نہیں؟

حرب اور قرآن

قرآنِ حکیم کے عقائد، اعمال، اخلاق اور تہذیب وتمدن کے متعلق جو اصلاحیں کیں وہ صرف اُن کی سطحِ باطنی تک محدود نہیں ہیں بلکہ ان کی سطحِ ظاہری پر بھی نمایاں نظر آتی ہیں. الفاظ و اصطلاح اگرچہ کوئی حقیقی چیز نہیں بلکہ معانی کا غلاف ہیں، جو اُن کے اوپر چڑھا دیا جاتا ہے. تاہم اسلام کی اصلاحیں مغز و پوست دونوں کو شامل ہیں اور اُس نے تمام چیزوں کے ساتھ عربی زبان اور عربی لٹریچر کی بھی اصلاح کی ہے. اسلام کی اصلاحیں اُن خیالات کے طریقِ اظہار کے متعلق نہیں تھیں، جن کی حقیقت کو اسلام نے نہیں بدلا تھا. لیکن اسلام نے جنگ کی حقیقت، جنگ کے اسباب اور اُس کے مقاصد میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا تھا، جس کی وجہ سے جنگ کے متعلق عرب کا لٹریچر اس کی اصلاح کا سب سے زیادہ مستحق تھا.

عرب میں جنگ کے لیے سینکڑوں الفاظ، سینکڑوں محاورے، ہزاروں ترکیبیں اور ہزاروں ہی استعارے پیدا ہو گئے تھے، لیکن وہ سب کے سب صرف ایک وحشیانہ جنگ کے لیے موزوں تھے. ایک متمدّن قوم، ایک ترقی یافتہ نظام، ایک صلح جُو مذہب اور ایک امن پسند پیام رساں جماعت، اُن کی قطعاً متحمل نہ ہو سکتی تھی.

جہاد

اِس لیے حقیقتِ جنگ کے انقلاب کے ساتھ اسلام نے اُن تمام الفاظ و محاورات کو بھی یک قلم متروک کر دیا جو اُس کی شانِ امنیت کے خلاف تھے اور غزواتِ اسلامیہ کے لیے صرف ایک سادہ لفظ ''جہاد'' وضع کر لیا اور اِسی کو قابلِ استعمال سمجھا، جس سے لفظ حرب کی طرح نہ غیظ و غضب کے جذبات ظاہر ہوتے تھے، نہ لوٹ مار، سلب ونہب اور خون خواری و وحشت کی بُو آتی تھی بلکہ وہ صرف اِس انتہائی کوشش پر دلالت کرتا ہے، جو ایک اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے کی جا سکتی ہے. وہ خواہ بذریعہ قویٰ ہو، خواہ بذریعہ زبان، خواہ بذریعہ افعال جوارح، بالواسطہ قبضہ شمشیر وسنان، کیونکہ انسان کو صرف اپنی کوشش ہی کا صلہ مل سکتا ہے.

قرآنِ حکیم نے جنگ کے ہر موقع پر اِسی لفظ کا استعمال کیا ہے اور اِس کی اصطلاح میں اُس کا اطلاق صرف جنگ کی خون ریزی ہی تک محدود نہیں بلکہ عموماً اِس کے ذریعہ سے علم، ایثار، ضبط، خاموشی، تزکیۂ نفس اور اخلاق کا اظہار کیا گیا ہے. جیسا کہ ارشاد باری ہو رہا ہے. ﴿لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَه جَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ ''لیکن رسول اور وہ لوگ جو رسول ﷺ کے ساتھ ایمان لائے یہ وہ لوگ ہیں کہ انہوں نے اپنی جان و مال دونوں سے جہاد کیا۔تمام بھلائیاں صرف اُن ہی کے لیے ہیں اور وہی کامیاب و فائزالمرام ہیں اور جن لوگوں نے ہمارے لیے جہاد (ریاضت و سعی) کی تو ہم اُن کو اپنے پانے کے راستے بتائیں گے اور خدائے معبود صرف اربابِ احسان ہی کے ساتھ ہے۔''[88:9]

اِن آیتوں میں جس جہادِ نفس و روح کا ذکر کیا گیا ہے۔ اُسے آنحضرت ﷺ نے ام الاحادیث، یعنی حدیث جبرائیلؑ میں بہ تشریح ذیل ''احسان'' واضح تر کر دیا ہے۔ ((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ)) ''یعنی خدا کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو اور اگر اس طرح نہیں ہو سکتا تو کم از کم اس قدر استغراق تو ہو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔''

پھر دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ ﴿ ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جَاهَدُوْا وَصَبَرُوْا اِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ ''یعنی ان لوگوں کے لیے جنہوں نے سخت آزمائش کے بعد ہجرت کی پھر جہاد اور صبر کیا۔اللہ کا فضل تیار ہے خدائے قادر ایسی صداقتوں کے بعد بڑا معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔''[110:16]

قتالِ اسلامی

اِن آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جہادِ اسلامی کی حقیقت صرف صبر و استقلال اور ضبط و ایثار سے متقوم ہوتی ہے۔ مالِ غنیمت، اظہارِ غیظ و غضب اور قتل و نہب وغیرہ نہ تو اُس کی حقیقت میں داخل ہیں اور نہ اُس کا کوئی خاصہ لازمی۔ وہ محض عارضی چیزیں ہیں جن سے جہاد کے مقصد اعلیٰ و اشرف کا دُور کا واسطہ بھی نہیں اور یہی وجہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں طلبِ مالِ غنیمت پر عتابِ الٰہی نازل ہوا تھا جب کہ واقعہ بدر پیش آیا تو صحابہؓ مالِ غنیمت جمع کرنے میں مصروف ہو گئے حالانکہ وہ اُس وقت تک حلال نہیں ہوا تھا۔ اِس پر رب العزت کی جانب سے یہ حکم نازل ہوا کہ اگر خدا کی مشیّت نے اُس کا فیصلہ نہ کر دیا ہوتا تو جو مال بطور غنیمت تم نے لوٹا ہے اِس پر بہت بڑا عذاب نازل ہوتا۔ اِس سے ثابت ہوا کہ اسلام کے سب سے پہلے اور سب سے بڑے معرکہ جہاد میں غنیمت حرام تھی۔ حالانکہ اگر اسلامی جہاد کا مقصد لوٹ مار ہوتا تو قریش کا کاروانِ تجارت اسلام کے دامنِ مقصود کو اچھی طرح بھر سکتا تھا اور وہی اس کا بہترین موقعہ بھی تھا۔

ہم دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ جنگ کے یہی وحشیانہ افعال، مال ہتھیانے، ظلم و ستم، غیظ و غضب،

قتل و غارت وغیرہ تھے۔ جن پر لفظِ حرب کا مفہوم لغوی مشتمل تھا اور اسلام سے پہلے اہل عرب نے عملی طور پر حرب کا یہی نمونہ پیش کیا تھا۔ جیسا کہ دنیا کی اور تمام اقوام نے کیا لیکن اسلام نے جنگ کے اُن تمام آثار و علائم کو مٹا کر ایک نیا مدنی نظام قائم کیا۔ جس کی بنا پر لغت و حقیقت کی کسی حیثیت سے بھی جہاد اسلامی پر حرب کا اطلاق نہیں ہو سکتا تھا۔ پس یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاد پر ایک جگہ بھی اِس لفظ کا استعمال نہیں کیا گیا۔ البتہ جہاد کی ایک خاص صورت کی تعبیر قتال سے کی گئی ہے جو ظاہری مفہوم کے لحاظ سے کوتاہ بینوں کے نزدیک نہایت خطرناک لفظ ہے۔ حالانکہ جہاد اور قتال کے الفاظ و معانی اور مفہوم و مقصود میں ایک طرح کے عموم و خصوص اور زمین و آسمان کا فرق ہے۔ مثلاً ﴿ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوهُمْ ﴾۔ یعنی ''مشرکین کو جہاں پاؤ قتل کرو'' اور ﴿ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُمْ مِنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ ﴾۔ یعنی ''کفار کو جہاں پاؤ قتل کرو اور جہاں سے اُنہوں نے تم کو نکال دیا ہے وہاں سے تم بھی اُنہیں نکال دو'' لیکن دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مشاکلتہ اللفظ باللفظ ہے۔ جو کلام میں زور پیدا کرنے کا ایک طریقہ یا متکلم بہٖ کو کامل متوجہ کرنے کا ایک قاعدہ ہے۔ اِس کی وہ کیفیت تعصب اور سینہ زوری یا شوراشوری قطعاً مراد نہیں جو تنگ نظروں نے لی ہے، جیسا کہ قرآنِ کریم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے ﴿ مَكَرُوا وَمَكَرَ اللَّهُ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ ﴾ حالانکہ رب العزت مکار نہیں بلکہ یہ عقیدہ ہی اُس کی ذات کے لیے ممتنع بالشان ہے، تو مقصود اِس ارشاد کا یہ ہے کہ پُرزور طریقہ سے کفار کے اعمالِ شنیعہ کا جواب دیا جائے۔ ایسے ہی ہم اپنی زبان میں کہہ دیتے ہیں کہ برائی کا بدلے برائی ہے۔ حالانکہ برائی خود برائی ہے لیکن اُس کا بدلہ برائی نہیں ہے بلکہ وہ قانونِ عمل کا ایک احسن نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زید اگر بکر کو قتل کرتا ہے تو ظالم و بے راہرو ٹھہرتا ہے اور عدالت وہی سلوک بکر کے قتل کے عوض میں زید سے کرتی ہے یعنی زید کو مار ڈالتی ہے تو وہ عادل و منصف سمجھی جاتی ہے۔ جَزَآءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا یعنی ''برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی'' ہے، کا محاورہ اسی طریقہ پر استعمال کیا جاتا ہے، ورنہ اِس قول سے اس کی حقیقتِ سیہ مقصود نہیں۔ جس طرح خدا کے مکر سے حقیقی مکر مراد نہیں لیا جا سکتا اور اُس کا مفہوم مکر کا بدلہ ہے۔

اِسی طرح یہاں قتال سے بھی دنیا کا عام قتال مراد نہیں کیونکہ اِس کی تھوڑی سی تشریح اِس آیت میں موجود ہے۔ ﴿ فَإِنْ قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ ﴾ اور ﴿ فَمَنِ اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ﴾۔ یعنی ''اگر وہ تم سے مقابلہ کریں تو تم بھی اُن سے مقابلہ کرو'' اور ''جو شخص تم پر زیادتی کرے تم بھی اُس کی مثل زیادتی کر سکتے ہو لیکن اُس سے زیادہ تجاوز کرنے میں خدا سے ڈرو اور یقین کرو کہ خدا پرہیزگاروں ہی کے ساتھ ہے'' اور اگر اِس شرح پر بھی معترض کی تسلی نہ ہو اور تسلیم نہ کرے تب بھی یہ قتال خود کفر ہی کی شامت اعمال کا

نتیجہ ہے. جہاد کا اصل مقصد یہ نہیں ہے اور تمام قرآنِ پاک میں کہیں بھی جہاد پر حرب کا اطلاق نہیں کیا گیا، کیونکہ وہ قوم جو صرف اعلاء کلمۃ اللہ کا جھنڈا بلند کرنے آئی تھی اور جس کی زندگی کا مقصدِ وحید محض معبودِ حقیقی کی بڑائی کا سبق دہرانا تھا اور جو ایک دینِ قیم کی صداقت کو دنیا کے تمام ظلم و فساد پر غالب کرنا چاہتی تھی، وہ صرف تمدن و تہذیب کی گلکاریوں پر فریفتہ نہیں ہو سکتی تھی، بلکہ اُس کا مقصدِ ظہور اُس بلندی سے جس کے بعد چشمِ مادی کچھ نہیں دیکھ سکتی اور اُس وسعت سے. جس کے بعد ہماری بڑی سے بڑی رصدگاہیں بھی جواب دے دیتی ہیں،. بہت بلند تھا، جس پر کتاب اللہ کا یہ اشارہ گواہ ہے.

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾. یعنی ''تم کو خداوند عالم نے دنیا کی بہترین قوم بنا کر نمایاں کیا ہے. تم سچائی کا حکم دیتے ہو اور دنیا کی برائیوں اور منکرات سے روکتے ہو.'' (110:3)

پس جس قوم کے ظہور کا مقصد قیامِ صلوات، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہو، ضرور تھا کہ وہ جو کچھ کرتی اِسی مقصد کے لیے کرتی اور اپنے سفرِ سعی کے ہر قدم پر اِسی کی تلاش میں منہمک رہتی. چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا پر تمام اقوام کی جنگی یادگاریں، بربادی و ہلاکت اور عدوان وطغیان کی صورت میں صفحۂ زمین پر باقی ہیں، مگر اسلام کے غزوات و جہاد کی یادگاریں ایک اور ہی رنگ اور ایک دوسری ہی حالت میں نظر آتی ہیں، جو سرتاپا علم و تمدن اور ہر پہلو سے ایک روشنی کا روحانی مینار ہیں.

جنگ کے اسباب

جنگ اپنی ظاہری و باطنی کیفیتوں کے لحاظ سے دو قسم پر منقسم سمجھی جاتی ہے اور دو ہی قسم کے اسباب کا نتیجہ ہوتی ہے. ایک تو یہ کہ حرص و طمع کی ایک بے پناہ فوج جو ہمیشہ اپنی کمین گاہ بادشاہوں کے دلوں کو بناتی ہے اور دنیا کی ضعیف قوموں کے دبانے کی فکر میں گھات لگائے رکھتی ہے اور ہمسایہ سلطنتوں پر دھاوا بول دیتی ہے. جس کے جواز کے لیے سیاست کی زبان میں ظاہری اسباب کی بنا پر اہلِ جہان کے علماء سیاست سے فتوے حاصل کر لینا اس کے لیے کوئی دشوار چیز نہیں ہوتی اور جب تک حملہ کا کوئی نام نہاد ظاہری سبب پیدا نہیں ہوتا، جنگ کے حقیقی اسباب کو بدنیتی کے تاریک پردوں میں چھپائے رکھتی ہے. پھر جب خوش قسمتی سے اس قسم کا موقع ہاتھ آ جاتا ہے تو علانیہ میدانِ جنگ میں اتر آتی ہے اور اپنے مظالم و وحشت پر ظاہری اسباب کا پردہ ڈال کر دنیا کو خدع وفریب میں مبتلا کر کے خوب قتل و نہب کرتی ہے مگر کہتی یہ ہے کہ امن و تہذیب کے قیام کی ایک مقدس خدمت انجام دی جا رہی ہے. دوسرے یہ کہ کبھی کبھی عاشقانہ رقابت یا چند ناگوار الفاظ بھی جنگ کا سبب بن جاتے ہیں جن سے

بغض وانتقام کی آگ دفعۃً دنیا میں بھڑک اٹھتی ہے اور سلاطین جب تک انتقام لینے کی قدرت رکھتے ہیں، شخصی سلطنتوں میں ان کو اظہارِ سبب اور توجیہہ وتعلیل کی ضرورت پیش نہیں آتی. تمام فوج اور تمام ملک اُن کے اشارۂ چشم ابرو کے ساتھ فی الفور حرکت میں آجاتا ہے لیکن جب وہ کمزور اور ضعیف ہو جاتے ہیں اور ان کا قدم میدانِ جنگ کی جانب نہیں بڑھ سکتا تو اس وقت حیلہ آفرینی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور بعض اختراعی اسباب کی بنا پر ملک کے جذبات کو مشتعل کر کے آمادۂ جنگ کیا جاتا ہے. اس حالت میں تمام قوم دھوکے سے یقین کرتی ہے کہ وہ اپنی عزت، اپنے وطن اور اپنے مصالح پر، اپنی جان قربان کر رہی ہے حالانکہ درحقیقت میدانِ جنگ سلاطین کی اغراضِ شخصیہ کی شکارگاہ ہوتا ہے، جس کو ہمیشہ مصنوعی مصلحتیں برقع پوش رکھتی ہیں.

جہادِ اسلامی کی ''روحانی یادگاریں''

دنیا کی موجودہ اور گذشتہ جنگوں کے نتائج ہمارے سامنے ہیں جن میں قتل ونہب، غارت گری و آتش زدگی، بربادیٔ علم، ہلاکتِ تمدن، تباہیٔ عمران اور خرابیٔ امن وامان کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا. مگر اہلِ اسلام کی جنگوں کا مقصد ظہور ان نتائج کا حامل نہیں بلکہ وہ قیام صلوٰۃ الٰہی، امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور ایمان باللہ کا حامل ہے. اس قوم کو اس کے دشمنوں نے اول روز ہی سے مسلح ہونے پر مجبور کر دیا تھا، ورنہ وہ ان علائم وآثار کی مدعی نہ تھی اور نہ ہی اس نے خون اور مٹی کے کیچڑ پر سے گزرتے وقت اپنا کوئی ایسا نقش چھوڑا جس سے اس بربریت ودرندگی کی بُو آئے، جو باقی اقوام کے میدانِ قتال اور جدال سے آتی ہے کیونکہ اسلامیوں کے جہاد کی علتِ غائی پر غور کیا جائے تو اس کی یادگاریں کچھ اور ہی حقیقت کو لیے ہوئے سامنے آئیں گی مثلاً:-

1-**نماز:** اِس کی پہلی روحانی یادگار نماز ہے جو روحانیت کا سرچشمہ، ہدایتِ قلبی کا منبع، نیکی کا مرکز، برکاتِ الٰہیہ کا مہبط اور انسان کو تمام بہیمی قوتوں اور نفسانی جوشوں سے بچانے والی ہے، جس کے لیے قرآنِ کریم کا دعویٰ ہے کہ وہ انسان کو تمام برائیوں اور بے حیائیوں سے روک دیتی ہے. کیونکہ اُس کی وجہ سے ہمیشہ خدا کے تعلق کا تصور قائم رہتا ہے. پس وہ ایک قلعہ ہے جو برائیوں کے لشکر کو اپنے اندر گھسنے نہیں دیتا لیکن اِس قلعہ کے ستونوں کو اسلامیوں کے سفرِ جہاد وغزوات ہی نے قائم کیا تھا.

ابوداؤد جلد 1 صفحہ 319 کتاب الجہاد میں ہے کہ آنحضرت ﷺ اور مجاہدین کی افواج جب بلندیوں پر چڑھتی تھیں تو ''غلغلۂ تکبیر'' بلند ہوتا تھا اور جب پستیوں کے نشیب کو طے کرتی تھیں تو ''سبحان اللہ'' کا نعرہ مارتی تھیں. پس نماز میں قیام وقعود، رکوع وسجود اور تسبیح وتکبیر کو اِسی قالب میں ڈھالا

گیا. اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نماز کے ارکان صرف لڑائی ہی کی بدولت وجود میں آئے. لہٰذا نماز مسلمانوں کی جنگوں کی پہلی یادگار ہے اور صلوٰۃ الخوف تو بالخصوص جہاد ہی کے لیے مخصوص ہے. جس کے احکام دوسری نمازوں سے بالکل مختلف ہیں اور جس کے متعلق قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے کہ جب تم مجاہدین کی صف میں نماز پڑھنا چاہو تو پہلے ایک گروہ تمہارے ساتھ اپنے ہتھیار لے کر شریکِ نماز ہو جائے. پھر جب وہ سجدہ کر چکیں تو پیچھے ہو جائیں تا کہ حفاظت کرتے رہیں اور دوسرا گروہ آئے جس نے نماز ابھی نہیں پڑھی ہے اور چاہیے کہ نہایت ہوشیاری کے ساتھ مسلح ہو کر تمہارے ساتھ نماز ادا کریں، کیونکہ کفار موقعہ ڈھونڈ رہے ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں اور مال و متاع سے غافل ہو جاؤ تو وہ دفعۃً تم پر ٹوٹ پڑیں.

القصہ مسلمانوں نے اپنی اس یادگار کے ذریعہ دنیا کو دکھا دیا ہے کہ خدا کی صداقت کی محافظ قوم دشمن کے مقابلہ میں اپنی روحانی یادگاروں کو کیونکر قائم رکھ سکتی ہے. جب کہ میدان جنگ میں دنیا کی تمام قومیں فرصت کے اوقات کو ستانے اور کھانے پینے میں صرف کرتی ہیں. مسلمانِ تلواروں کے سائے کے نیچے بھی اپنی مہلت کی گھڑیاں صرف اللہ ہی کی عبادت میں گزارتا ہے.

2- **طہارت**: عباداتِ اسلامیہ کی آسانیوں میں تیمّم بھی خدا کی عطا کردہ ایک "یادگار آسانی" ہے. جس کی برکات کا ظہور زیادہ تر سفر ہی میں ہوتا ہے. آنحضرت ﷺ وصحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا سفر اکثر جہاد ہی کے لیے ہوا کرتا تھا، اس لیے سفر ہی میں مسلمانوں کو یہ عطیۂ الٰہی بھی دیا گیا. چنانچہ ایک سفر میں حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا آپ کے ساتھ تھیں اور سوءِ اتفاق سے راستہ میں اُن کا ہار گم ہو گیا. آنحضرت ﷺ تمام صحابہؓ کے ساتھ اسے ڈھونڈنے کے لیے ٹھہر گئے لیکن منزل پر دور تک پانی کا نام ونشان نہ تھا. صحابۂ کرامؓ نے حضرت صدیق اکبرؓ سے شکایت کی تو اُنہوں نے حضرت عائشہؓ پر ناراضگی ظاہر فرمائی کہ تمہاری ہی غفلت نے تمام قوم کو اِس مشقت و مصیبت میں ڈال دیا ہے چنانچہ عین اُسی موقعہ پر آیت تیمّم نازل ہوئی اور تمام صحابہ مسرت کے لہجہ میں پکار اٹھے. مَاهِيَ بِاَوَّلِ بَرَكَتِكُمْ يَا اٰلَ اَبِيْ بَكْرٍ یعنی "اے آلِ ابی بکر یہ کچھ تمہاری پہلی ہی برکت نہیں". لہٰذا تیمّم بھی اِسی بنا پر جہاد و غزواتِ اسلامیہ کی یادگار ہے.

3- **صلوٰۃ وصیام**: حالتِ سفر میں قصرِ صلوٰۃ اور رمضان شریف میں افطارِ صوم کی اجازت بھی جہاد ہی کی راہ میں آسانیاں پیدا کرنے کے لیے دی گئی قرآنِ کریم کی آیات قصر میں صاف طور پر جہاد کے مواقع کا ذکر ہی بالوضاحت فرمایا گیا ہے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حکم قصرِ نماز درحقیقت جہاد ہی کے لیے ہوا تھا.

4- **حج البیت**: عباداتِ اسلامیہ میں حج ایک بزرگ ترین یادگار اور بہت سی مختلف یادگاروں

کا مجموعہ ہے. وہ جس گھر سے اپنی ادائیگی کے لیے متعلق ہے وہ بھی خدا کے ایک برگزیدہ بندے سیدنا ابراہیمؑ کے ہاتھ کی قائم کی ہوئی یادگار ہے. بلکہ دنیا بھر کی مذہبی یادگاروں سے سب سے قدیم یادگار رہی ہے. صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنا، حضرت سیدہ ہاجرہؓ کی اُس سراسیمگی کا منظر تازہ کرتا ہے. جب وہ پانی کی جستجو اور بچے کی محبت میں پریشان حال تھیں. ''چاہِ زمزم'' قدرتِ الٰہی کی اِس کرشمہ سازی کو یاد دلاتا ہے. جس نے وادیءِ غیر ذی زرع میں، خدا کی رحمت کے دبے ہوئے چشمے کا منہ کھول دیا تھا اور ''قربانی'' حقیقتِ اسلامیہ کی اُس جاں فروشی اور فدویت کے سِرّ روحانی کو محسوس و ممثل کر دکھاتی ہے، جس نے حضرت خلیل اللہ ابراہیمؑ اور ذبیح اللہ اسمٰعیلؑ کے اندر سے ظہور کیا تھا. رمی جمار اُن بہیمی و ابلیسی قوتوں سے دنیا کو روکتا ہے، جو اُن پاک مقاصد کی تعمیل میں سنگِ راہ ہو رہی تھیں.

سیاست

لیکن غزواتِ اسلامیہ نے اُن یادگاروں میں ایک یادگار کا اور بھی اضافہ کر دیا. یعنی فتحِ مکہ سے ایک سال پہلے آنحضرت ﷺ نے قریشِ مکہ سے صلح کر لی تھی. جو ''صلح حدیبیہ'' کے نام سے مشہور ہے. اِس صلح کے بعد آنحضرت ﷺ صحابہ کے ساتھ عمرہ کے لیے تشریف لائے تو صحابہ کو مدینہ طیبہ کی آب و ہوا نے چور چور کر دیا تھا اور بخار کے عام ابتلاء نے اُن کی طاقتِ رفتار سلب کر دی تھی. اِس ضعیفی کا اثر طوافِ کعبہ شریف کی حالت میں بھی صاف نمایاں ہوتا تھا اور مکہ والے دیکھتے تھے. اِس پر کفار نے جو اسلام کی فوجی طاقت کا ہر موقعہ پر امتحان لیتے رہتے تھے، طنز آمیز لہجہ میں کہنا شروع کر دیا کہ مدینہ کے بخار نے تو اِن کو چور چور کر دیا ہے. اگرچہ ابھی تک عملاً اُن کو یہ یقین نہیں دلایا جا سکتا تھا کہ یہی ناتواں ہستیاں، یہی کمزور و نحیف بندے، یہی ضعیف اجسام، ایک دن اُن کی قوت کے سرِ پُر غرور کو کچل دیں گے. تاہم علامات و آثار دکھلائے جا سکتے تھے. اِس لیے آنحضرت ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو تندرستوں اور طاقتوروں کی طرح اکڑ کر چلنے کا حکم دیا تاکہ روح کی ایمانی قوت کو جسم ضعیف کے پردے میں بھی نمایاں کریں. چنانچہ پہلوانوں کی طرح ''کندھے ہلا ہلا کر چلنے'' کی یہ یادگار آج تک قائم ہے، جس کو فقہا نے رَمَل کے نام سے تعبیر کیا ہے. اِس یادگار کو ایک وقت میں حضرت عمرؓ نے یہ خیال فرما کر کہ یہ ایک وقتی حکم سے متعلق تھی موقوف کرنا چاہا، مگر پھر یہ سمجھ کر رک گئے کہ یہ یادگار مسلمانوں کے لیے ہمیشہ درسِ شجاعت و تحریکِ عزائم کا وسیلہ ہے اور ہر سال یہ یاد دلاتی ہے کہ اُن کے اسلافِ کرام نے ضعفِ جسمانی کی حالت میں بھی کس طرح اپنی صولتِ اسلامی کو قائم رکھا تھا.

واقعۂ افک

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ ؓ کا واقعۂ افک بھی ایک سفرِ جہاد ہی میں پیش آیا تھا، جو اسی سلسلہ کی ایک روحانی یادگار ہے۔ یہ یادگار اگرچہ ابتداء میں نہایت درد انگیز معلوم ہوئی لیکن حقیقت میں خدا کی رحمت کا بہت بڑا خزانہ اِس کے اندر مستور تھا قرآنِ مجید میں عورتوں کے تمدنی حقوق کی حفاظت کے لیے ایک خاص سورت، سورۂ نساء نازل ہوئی جس کو عورتوں کی مخصوص یادگار کہا جا سکتا ہے، لیکن اُن کی وضع، معاش، طرزِ معاشرت اور حقوقِ منزلی وغیرہ کی عام اصلاح کے متعلق اب تک کوئی آیت نازل نہیں ہوئی تھی مگر اِس واقعہ کے بعد ہی سورۂ نور نازل ہوئی جو زیادہ تر اُن ہی احکام سے مملو ہے۔

چھٹی صدی عیسوی میں یہ انسان کا شریف تر نصف حصہ انتہا درجہ کی بے کسی و ذلّت میں ڈال دیا گیا تھا تمدن اور مذہب دونوں نے اسکے ساتھ بے رحمی کی تھی۔ صرف اسلام ہی ایک وہ قانونِ الٰہی ہے۔ جس نے سب سے پہلی مرتبہ عورتوں کے حقوق کا اعلان کیا اور اُن کے معاشرتی درجہ کو خاندان میں سب سے زیادہ نمایاں جگہ دی اور اِس انقلاب کا بڑا حصہ سورۂ نور کے نزول سے ہی وجود میں آیا ہے اور سورۂ نُور ایک سفرِ جنگ کو یاد دلاتی ہے۔ پس عورتوں کے حقوق کی سب سے بڑی اور سب سے پہلی اصلاح بھی غزواتِ اسلامیہ ہی کی یادگار ہے

حدِ قذف و حدِ زنا

حدِ قذف اور حدِ زنا کے متعلق بھی اب تک کوئی آیت نازل نہیں ہوئی تھی مگر اِس واقعہ کے بعد ہی اُن حدود کی تعین کے لیے بھی آیاتِ الٰہی نازل ہوئیں، جن میں اِس معصیت کا سدِ باب کر دیا گیا۔

اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ ؓ کی فضیلت اگرچہ عام طور پر مسلّم تھی لیکن قرآنِ مجید کی برات نے اسکو اور بھی روشن اور قطعی کر دیا۔ پس یہ واقعہ اُن احکام کی روحانی یادگاروں کا ایک مجموعہ ہے جن کو حدود اللہ کے جامع و مختصر لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وہ اُمہات المومنین رضوان اللہ علیہن اجمعین کے فضائلِ مخصوصہ کا ایک باب اور حضور ﷺ کی ازواجِ مطہرات کی پاکیزگی کا ایک مقدّس تذکرہ ہے۔ جس کو کفار نے کسی اور رنگ میں پیش کرنا چاہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے اِس کو مسلمانوں کے لیے خیر و برکت فرمایا ہے اور کفار کی تمام خباثت کی تردید فرما دی ہے۔

برکاتِ جہاد

یہ امر متحقق ہو چکا ہے کہ جہادِ اسلامی کی حقیقت جن مقاصد پر مشتمل ہے، اُس کے لحاظ سے وہ

دیگر اقوام کی دینوی لڑائیوں سے بالکل مختلف ہے اور یہ اختلاف اِس قدر بدیہی ہے کہ ہم کو اُس کی ظاہری شکل کے ایک ایک خد وخال کے اندر نمایاں طور پر نظر آ سکتا ہے. اِس بدیہی اختلاف کے علاوہ، پہلے تذکار کے، ایک واضح حیثیت یہ بھی ہے کہ ایک بادشاہ فاتح جس نے حرص وآز کے ماتحت میدانِ جنگ وجدال میں قدم رکھا اور ایک پیغمبر خدا جس نے دنیا کی بھلائی کے لیے جہاد کیا برابر نہیں ہو سکتے. ایک غرض پرست حملہ آور اور نفس پرست فاتح جب ملک گیری کے ارادہ سے میدانِ جنگ کا رخ کرتا ہے تو طبل ودھل کے غلغلے اور قرناء وبرق کے ترانے اس کا خیر مقدم کرتے ہیں. سر پر پرچم نخوت لہراتا ہے اور چتر شاہی آفتاب کی شعاعوں کو بھی اُس کی طرف نگاہ کرم سے دیکھنے نہیں دیتا. جاہ وجلال کے یہ دیوتا میدانِ جنگ میں ایک مجسمے کی طرح کھڑا ہوتا ہے اور تمام فوج اس مرصع بت کے گرد طواف کرنے لگ جاتی ہے. عظمت وجبروت کا یہ منظر دفعتہً دنیا کو مرعوب کر دیتا ہے اور اِس رعب وداب کے احساس سے اس دینوی فاتح کا سر غرور بادۂ کبر ونخوت سے لبریز ہو جاتا ہے. یہاں تک کہ خاک وخون میں مل کر بھی اُس کا یہ نشہ نہیں اترتا. اگر کوئی اہل فہم اس سر متکبر کو ٹھکرا بھی دیتا ہے تو اس سے مغرورانہ صدائیں بلند ہوتی رہتی ہیں.

لیکن ایک پیغمبر خدا کی حالت اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے. وہ گھر سے جب نکلتا ہے تو گو مخلصین ومومنین کی ایک مختصر سی جماعت اُس کے ساتھ ہوتی ہے. مگر وہ اپنا رفیق سفر صرف خدائے واحد ہی کو بناتا ہے. حدیث شریف میں ہے. جب آنحضرت ﷺ بغرض جہاد اپنے مقام سے روانگی فرمایا کرتے تو یہ دعا پڑھا کرتے. ((اَللّٰھُمَّ اَنْتَ الصَّاحِبُ فِی السَّفَرِ وَالْخَلِیْفَۃُ فِی الْاَھْلِ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ وَّعْثَاءِ السَّفَرِ وَکَاٰبَۃِ الْمُنْقَلَبِ وَسُوْءِ الْمَنْظَرِ فِی الْاَھْلِ وَالْمَالِ اَللّٰھُمَّ اَطْوِنِ الْاَرْضَ وَھَوِّنْ عَلَیْنَا السَّفَرَ)). یعنی حضور ﷺ جب بغرض جہاد روانہ ہوتے تھے تو یہ دعا زبان پر لاتے. خدایا! تو ہی ہمارا رفیق سفر ہے تو ہی ہمارے بال بچوں میں ہمارا قائمقام ہے. خدایا سفر کی شدائد اور پلٹ کر اہل وعیال کو برے حال میں دیکھنے کی مصیبت سے پناہ مانگتا ہوں. خداوند عالم مسافت سِفر کو کم کر دے اور ہمارے لیے آسان بنا دے.

وہ سواری کی پشت پر قدم رکھتا ہے تو بایں الفاظ خدا کا شکر ادا کرتا ہے:

﴿ سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَلَنَا ھٰذَا وَمَا کُنَّالَہٗ مُقْرِنِیْنَ﴾ یعنی ''پاک وبرتر ہے وہ ذات جس نے اس جانور کو ہمارا فرمانبردار بنا دیا ہے. ورنہ ہم اس کی قدرت نہیں رکھتے تھے''.

وہ سفر سے پلٹتا ہے تو راستہ میں خداوند قدوس کی حمد کا ترانہ گاتا ہوا چلتا ہے کہ ہم توبہ کر کے لوٹتے ہیں. ہم خدا کے عبادت گزار بندے ہیں اور اپنے رب کی حمد وثناء کرتے ہیں. وہ پہاڑ کی بلندیوں پر چڑھتا ہے تو غلغلہ تکبیر بلند کرتا ہے اور اگر میدانی نشیب میں اترتا ہے تو ترنم ریز تسبیح وتہلیل ادا کرتا ہوا. وہ

فوج کو میدان جنگ میں روانہ کرتا ہے تو اس کو مغرورانہ طاقت کی یاد نہیں دلاتا اور نہ اس کے جوش کو وہ آتشہ کرتا ہے نہ قدیم کا زمانہ ہائے شجاعت کا تذکرہ کر کے اس کے دل کو گرماتا ہے بلکہ اس کے دین کو، اس کی امانت کو اور اس کے تمام نتائجِ اعمال کو خدا کے سپرد کر کے رخصت کر دیتا ہے۔

وہ منزل پر اترتا ہے تو نہ تو سلاطینِ زمانہ کی طرح اُس کے لیے خیمے نصب کئے جاتے ہیں، نہ فرش وبساطِ شاہانہ سے اُس کے لیے زمین آراستہ ہوتی ہے اور نہ میدان کا نشیب وفراز ہموار کیا جاتا ہے۔ وہ خدا کا نام لے کر فرشِ خاک پر لیٹ جاتا ہے اور اُسی نام کی عظمت کے سہارے پر زمین ہی کو اپنی حفاظت کی خدمت سونپ دیتا ہے۔ ((یَا اَرْضُ رَبِّیْ وَ رَبُّکَ اللّٰہُ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شَرِّکِ وَ شَرِّ مَا فِیْکِ وَ مِنْ شَرِّ مَا یَدُبُّ عَلَیْکِ)) یعنی ”اے زمین میرا اور تیرا خدا دونوں کا ایک ہی ہے۔ میں تیرے شر سے تیری سطحِ باطنی کے شر سے اور تجھ پر چلنے والوں کے شر سے پناہ مانگتا ہوں۔“

وہ سفرِ جہاد سے پلٹ کر گھر پہنچتا ہے تو سب سے پہلے اُس کو خدا کا گھر یاد آتا ہے اور مسجد میں جا کر دو رکعت نمازِ نفل ادا فرماتا ہے۔ پھر جب اُس کو فتح وظفر کی خبر ملتی ہے تو نہ اُس کے سامنے شادیانے بجائے جاتے ہیں نہ جشنِ شاہانہ کی تیاریاں کر کے عیش وطرب کے ترانے گائے جاتے ہیں۔ وہ صرف اپنے خداوندِ جل وعلا شانہٗ کے سامنے سربسجود ہو جاتا ہے اور سجدہ شکر بجالاتا ہے اور اگر اُس کو کبھی مشیت ایزدی سے شکست ہوتی ہے تو وہ نہ تو فوج کو جوش وغیرت دلاتا ہے اور نہ اُس کو مطعون کرتا ہے بلکہ اپنے خدا ہی کی غیرت کی سلسلۂ جنبانی کرتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنی فوج کو اپنی نہیں بلکہ خدا ہی کی فوج یقین کرتا ہے۔ ((کَانَ یَقُوْلُ یَوْمَ اُحُدٍ اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ اِنْ تَشَاءُ لَا تُعْبَدُ فِی الْاَرْضِ)) یعنی آپ نے معرکہ احد کے دن فرمایا اے خدا! کیا تو چاہتا ہے کہ اب زمین میں تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ ہو۔

وہ اپنی فوج کی قلت اور دشمن کے لشکر کی کثرت کو دیکھتا ہے تو صرف رحمت آسمانی ہی سے مدد طلب کرتا ہے اور کسی دینوی طاقت کے آگے دست سوال دراز نہیں کرتا۔ چنانچہ بدر کے دن آنحضرت ﷺ نے جب مشرکین کی جانب دیکھا اور معلوم ہوا کہ ان کی جمعیت ایک ہزار یا زیادہ کی ہے اور مسلمان صرف تین سو انیس ہیں تو اب قبلہ شریف کی طرف متوجہ ہو گئے اور دونوں ہاتھ پھیلا کر خدائے قدوس کو پکارنا شروع کیا کہ اے خدا! تو نے مجھ سے فتح وظفر کا وعدہ فرمایا ہے اِس کو پورا فرما۔ اے میرے مولا! اگر مسلمانوں کا یہ مختصر سا گروہ فنا ہو گیا تو تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ رہے گا۔ اسی طرح ہاتھ پھیلا کر متواتر پکارتے رہے۔ یہاں تک کہ جوشِ استغراق میں آپ کی دوش مبارک سے چادر گر گئی۔ حضرت ابوبکرؓ نے آپ کے اِس تضرع والحاق کو دیکھا تو خدمت میں حاضر ہوئے اور چادر اٹھا کر آپ نے کندھے پر ڈال دی پھر پیچھے سے آ کر آپ سے لپٹ گئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ آپ اپنی مناجات ختم فرمائیے۔ مولا کریم نے جو آپ سے جو وعدہ کیا ہے اُس کو بہت جلد پورا فرمائے گا۔

وہ میدان جنگ میں اگر شدید زخم کھاتا ہے تو اِس حالت میں صرف یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے.
((رَبِّ اغْفِرْ لِقَوْمِيْ فَإِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ)) یعنی اے خدا میری قوم کو معاف فرما. کیونکہ وہ لوگ حق کو نہیں جانتے.

الغرض ایک ہوسِ ملک گیری رکھنے والا بادشاہ فاتح میدان جنگ میں سر پُر غرور اور ایک پیغمبرِ خدا مجسم جبیں نیاز ہوتا ہے. ایک بادشاہ میدانِ جنگ میں زبانِ خودستا مگر ایک داعیِ حق زبان شکر سنج ہوتا ہے. ایک بادشاہ میدان جنگ میں غیظ و غضب کا آتش کدہ لیکن ایک منادِ توحید رحم و کرم کا سرچشمہ ہوتا ہے. پھر اُن دونوں متضاد حالتوں کا انجام بھی نہایت مختلف اور عبرت خیز ہے. بادشاہوں کے سرِ پُر غرور بارہا ٹھکرا دیئے گئے. لیکن کسی موید من اللہ کی جبینِ نیاز مذلت سے آلودہ نہیں ہوئی. بادشاہوں کی زبان خودستا بارہا ذلت کے ساتھ خاموش کر دی گئی. لیکن کسی داعیِ رب کا نغمۂ حمد و شکر کبھی بھی ساکت نہیں ہوا. بادشاہوں کے غیظ و غضب کے شعلے بارہا بجھا دیئے گئے مگر کسی پیغمبر کے دریائے کرم کو دنیا کے خس و خاشاک نہیں روک سکے.

﴿وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ۝ وَإِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُوْنَ﴾

”اور ہمارا وعدہ اپنے بندوں کے ساتھ جو رسول ہیں پہلے ہو چکا ہے
کہ ان کی ضرور مدد کی جائے گی. اور بیشک ہمارا لشکر ہی غالب ہو کر رہتا ہے.“

[173-171:37]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سانحہ ارتحال

اور نمازِ جنازہ

کتاب "جمالِ رسول" کے پہلے ایڈیشن کی طباعت کے بعد بعض احباب نے لکھا کہ اِس میں سرکارِ دوعالم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت اور نمازِ جنازہ کا ذکر نہیں کیا گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نمازِ جنازہ کس طرح ادا ہوئی؟ لہٰذا کتاب میں اِس بات کا بھی اضافہ فرما دیجیے۔ فقیر کے نزدیک گو یہ مسئلہ جس کا عمل تمام دنیائے اسلام کے علم میں ہے، کوئی قابلِ بحث چیز نہیں، چونکہ بعض کوتاہ اندیشوں اور خام عقیدوں کی تحقیق نے اِس کو بھی مشتبہ کر کے قابلِ بحث بنا ہی دیا ہے، اِس لیے جواب میں فقیر اِس کے اُن تین پہلوؤں پر بحث کرتا ہے جو سائلین نے لکھے ہیں:

1- عشاقِ رسول علیہ السلام کے عقیدہ میں چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حیات النبی ہیں لہٰذا آپ پر نمازِ جنازہ کیسی؟ بلکہ اُن کے نزدیک لفظِ جنازہ کا اطلاق ہی غلط ہے۔

2- اگر صحیح معنوں میں جنازہ کی صورت قائم تھی تو کس نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور اسمیں کون کون سی دعائیں اور آئیتیں پڑھیں؟

3- تمام جماعت پر جو اُس وقت موجود تھی عقیدتی تعصب کا کیچڑ اچھالنے کے لیے یہ کہا جانا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جنازہ دو تین یوم پڑا رہا اور لوگ متوجہ نہ ہوئے کہاں تک صحیح ہے؟

پہلے سوال میں چونکہ عشق ومحبت کا تعلق ہے اِس لیے اِس کا جواب بھی اِسی روشنی میں معلوم کر لیجیے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر قول وفعل اپنی نجات ومناجات پر منتج نہیں ہوتا بلکہ وہ تمام تر مَل تعلیم اُمت کے لیے تھا۔ لہٰذا جو کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اُمت کو پہنچا اُس پر چلنا اُمت کے لیے لازم وواجب تھا چاہے وقت اُس کی ضرورت کو ظاہر کرے یا نہ کرے۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن عمرؓ ایک جگہ سے اپنے ہمراہیوں سمیت گزر رہے تھے تو ایک مقام پر سے سیدھا اور صاف راستہ چھوڑ کر کچھ فاصلہ کا چکر کاٹا اور پھر آگے جا کر

راستہ پر آ گئے۔ ہمراہیوں نے پوچھا کہ راستہ صاف تھا آپ نے اُس کو چھوڑ کر ٹیڑھی راہ کیوں اختیار فرمائی؟ تو آپ نے فرمایا کہ ایک مرتبہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے اور یہاں راستہ میں پانی تھا تو حضور ﷺ نے اِس راہ کو چھوڑ کر اسی طرح عبور فرمایا جیسے میں نے کیا ہے اور میرا دل نہیں چاہا کہ اگرچہ اب راہ صاف ہے، میں حضور ﷺ کے نقشِ قدم کو چھوڑ کر سیدھا گزر جاؤں۔ صحابہؓ کی یہی وہ محبت تھی جس کی وجہ سے عقیدت مندوں کو یقین ہی نہیں آتا تھا کہ حضور ﷺ اِس دنیا سے تشریف لے گئے ہیں۔ حضرت فاروقِ اعظم عمرؓ نے تلوار کھینچ لی کہ جو یہ کہے گا کہ حضور ﷺ وفات پا گئے ہیں اُس کا سر قلم کردوں گا، مگر یہ حقیقت کسی حد تک وضاحت طلب ہے کہ اس حیاتِ انبیاء علیہم السلام والصلوات سے مراد حیاتِ برزخی ہے جو کہ ورودِ موت سے بعد حاصل ہوتی ہے اور اُس کا ظہور کامل طور پر کفن ودفن کے بعد ہوتا ہے۔ جس کی تفصیل یوں ہے کہ روح اور بدن کا اتصال ووفاق چونکہ ایک عادی وعارضی امر ہے، لہٰذا یہ زائل ہوسکتا ہے اور اِسی ازالۂ اتصال کو شریعت میں موت کہتے ہیں اور اِسی کو فنا سے بھی اطلاق کرتے ہیں۔ یعنی روح اور بدن کے اتصال کو حیات اور اُن دونوں کے افتراق کو موت کہتے ہیں اور یہ افتراق ہر ذی روح و متنفس پر وارد ہوتا ہے گو کہ ایک آن کے لیے ہی کیوں نہ ہو۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے۔ ﴿ كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ﴾ اور ﴿ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ ﴾ اور ﴿ إِنَّكَ مَيِّتٌ وَّ إِنَّهُمْ مَّيِّتُونَ ﴾ اور حدیث شریف میں ہے کہ ((فَإِنِّي رَجُلٌ مَّقْبُوضٌ)) اور سیّدنا صدیق اکبرؓ فرماتے ہیں۔ فَإِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ اور عقلی طور پر یہ ازالۂ اتصال ممکن ہے۔ کیونکہ ہر عارضی کا ازالہ ایک بدیہی حقیقت ہے۔ بہر صورت موت کا معنی روح وجسم کی باہمی آمیزش اور رقابت کو فنا کردینے کا نام ہے جس سے ہر متنفس متاثر ہوگا۔ نہ یہ کہ ازالۂ اتصال کے ساتھ بدن اور روح بھی فنا اور معدوم ہو جائیں، بلکہ حق یہ ہے کہ بدن اور روح مطلقاً باقی رہتے ہیں۔ ہاں بعض ابدان بجز اجزاءِ اصلیہ کے بعض عوارض کی وجہ سے نابود ہو جاتے ہیں، مگر نیک حضرات کے ابدان باقی رہتے ہیں مثلاً اولیائے اکرام، شہدائے عظام اور صالحین وغیرہم۔ اور بالخصوص انبیائے کرام علیٰ نبینا علیہم السلام کے اجسامِ مطہرہ وابدانِ طیبہ دائمی طور پر صحیح وسالم رہتے ہیں اور اُن کی ارواحِ طیبہ کو اُن کے پاکیزہ اجسام میں لوٹا دیا جاتا ہے اور وہ ابدانِ مثالیہ کے علاوہ اصلی اور حقیقی بدنوں کے ساتھ ہی عالمِ کائنات میں تصرف کرتے ہیں۔ عباداتِ الٰہیہ میں بطریقِ تلذذ مستغرق رہتے ہیں اور متوسلین کی فریادرسی کے ساتھ خاص شغف رکھتے ہیں۔

رہا یہ امر کہ جب موت کا ورود انبیاء کرام ﷺ پر بھی حتمی طور پر ثابت ہے تو پھر انبیائے کرامؑ کو زندہ، بالخصوص ختمی مآب سرورِ کائنات ﷺ کو ''حیات النبی'' کے تصور سے یاد رکھنے کا کیا مطلب ہوگا؟ سو اس کی چند وجوہات ہیں:

1- یہ کہ انبیائے کرامؑ گو موت سے متاثر ہوتے ہیں مگر یہ تاثر محض آنی ولمحی ہوتا ہے، نہ کہ دائمی و

استمراری. پھر اُن کی ارواحِ مقدسہ کو واپس دوبارہ اُن کے حقیقی ابدان میں لوٹا دیا جاتا ہے جس کا ظہور عموماً کفن و دفن کے بعد ہوتا ہے. لہٰذا اُن کو زندہ کیا جاتا ہے اور اُسی کو حیاتِ برزخی و حیات جسمانی کہتے ہیں. امام بیہقی کتاب الاعتقاد، مواہب لدُنّیہ، عین الورود شرح ابی داؤد، کتاب الشفاء، مدارج النبوہ وغیرہ میں موجود ہے کہ "اَلْاَنْبِیَاءُ بَعْدَ مَا قُبِضُوْا رُدَّتْ اِلَیْھِمْ اَرْوَاحُھُمْ" یعنی "بعد قبض روحِ انبیاءؑ کے، ارواحِ طیبان اُن کے اجسام میں لوٹا دی جاتی ہیں."

2- یہ کہ بالخصوص حضور ﷺ کی پیدائش اُس اِمکان سے ہوئی ہے جو صفاتِ الٰہیہ اضافیہ کے ساتھ تعلق رکھتا ہے، نہ کہ اُس اِمکان سے جو تمام ممکناتِ عالم میں ثابت ہے. [مکتوب نمبر 100 از مکتوبات امام ربانیؒ] اور آپ کو اِس انداز پر پیدا فرمایا گیا ہے کہ نہ آپ کی مثل پہلے کوئی ہوا اور نہ ہی بعد میں ہوگا. تو ثابت ہوا کہ جب آپ کی پیدائش عالمِ امکاں سے جداگانہ ہے اور آپ کی مثال مفقود و معدوم ہے، تو آپ کی موت بھی اوروں سے الگ نوعیت کی ہوگی اور وہ بھی کہ آپ کی موت صرف آنی تھی. بعدہٗ وہی حیاتِ حقیقی و جسمانی دوبارہ لوٹا دی گئی. یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم کی آیت ﴿ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ﴾ میں آپ کی موت کو علیحدہ ذکر فرمایا گیا ہے. لہٰذا آپ کی "حیاتِ برزخی" "حیاتِ حقیقی" ہے اور آپ کو اِسی وجہ سے "حیات النبی" ﷺ کہا جاتا ہے.

3- سرورِ کائنات، مختارِ شش جہات، سید عالم ﷺ کی حیاتِ طیبہ جیسے اوروں کی حیاتِ مستعار سے الگ شان رکھتی ہے، ایسے ہی آپ کی موت بھی دوسروں کی موت سے جداگانہ کیفیت کی حامل ہے، اور وہ یہ کہ سرکارِ دوعالم ﷺ کی موت "ساترِ حیات" ہے نہ کہ "مزیلِ حیات"، یعنی آپ کی موت نے آثارِ حیاتِ طیبہ (مثلاً حس و حرکت اور دیگر تصرفات و مشاغل وغیرہ) کو چھپا دیا ہے، نہ یہ کہ اُن کو فنا کر دیا ہے، جیسا کہ شرعی طور پر مسح ساترِ حدث تسلیم کیا گیا ہے، نہ کہ مُزیلِ حدث اور وہ بھی کفن و دفن تک. بعدہٗ پھر وہی اصلی، حقیقی جسمانی حیات حاصل ہوگئی، بخلاف عوام کے کہ اُن کی موت کُلاً یا بعضاً سالب و مزیل حیات ہوا کرتی ہے. جس سے حیاتِ حقیقی اور جسمانی ختم ہو جاتی ہے، بنا علیہ حضور سرورِ عالم ﷺ کی ذات کو "حیات النبی" کہا جاتا ہے.

بہ ہر نہج اِن وجوہِ مذکورہ کی وجہ سے جناب کو حیاتِ برزخی میں بلحاظ اوروں کے، ایک خصوصی امتیازِ حیات حاصل ہے اور آپ کے مشاغل و مصارفِ برزخیہ اپنی نظیر میں بے نظیر ہیں اور ورودِ موت کے تاثرات آنی و لمحی ہونے کے اعتبار سے بہ نسبت دائمی و استمراری تصرفاتِ برزخیہ کے کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتے. گویا کہ موت حضور ﷺ پر واقع ہی نہیں ہوئی جس سے حضور ﷺ کو "حیات النبی" کہتے ہیں اور بلحاظ تادب آپ پر موت کا اطلاق نہیں کرتے، نہ یہ کہ آپ پر آثار

موت مرتب ہی نہیں ہوئے۔

اِس سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ چونکہ آپ کی موت "سالبِ حیات" نہیں، بلکہ "ساترِ آثارِ حیات" ہے اور کلیتہً وحقیقتاً حیاتِ دُنیوی ختم نہیں ہوئی، اِس لیے آپ کی متروکات کو وراثت نہیں تصور کیا جائے گا اور کسی قسم کی اُن میں تقسیم جاری نہیں ہوگی، کیونکہ تقسیمِ ترکہ اور اجزاءِ توریث انتقالِ ملک پر متفرع ہے اور وہ انتقالِ موت استمراری اور دائمی کی وجہ سے ہوتا ہے جو کہ یہاں منشاءِ نزاع میں غیر متصور ہے۔ نیز یہ امر بھی واضح ولائح ہوگیا کہ آپ کی حیاتِ دنیوی چونکہ کلیتہً منعدم نہیں ہوئی، بلکہ مِن وجہٍ حقیقی حیاتِ جسمانی موجود رہتی ہے، بنابریں آپ کے جنازہ کی کیفیتِ ادائیگی عام نمازِ جنازہ سے الگ ہونی چاہیے اور یہی وجہ ہے کہ آپ کی نمازِ جنازہ عام طریقِ مسنون پر ادا نہیں کی گئی، بلکہ ایک خاص، الگ طرز پر ادا کی گئی ہے، جیسا کہ مشہور مسائل میں کتبِ معتبرہ سے پتہ چلتا ہے کہ حضور ﷺ کی نمازِ جنازہ میں کوئی امام نہ تھا اور نہ ہی اُس میں وہ دعائیں پڑھی گئیں جو عام جنازوں میں پڑھی جاتی ہیں جس کو فقیر آگے ذکر کرے گا۔

لہٰذا اِن حقائق کی بنا پر یہ بھی وضاحت ہوگئی چونکہ آپ کی حیاتِ طیبہ بالکل منعدم نہیں ہوئی اِس لیے آپ کی ازواجِ مطہرات سے کسی اور کا نکاح ناجائز اور قطعی حرام قرار دیا گیا اور وہ "امہات المومنین" کے خصوصی اور ممتاز لقب سے نوازی گئی ہیں جیسا کے قرآنِ کریم میں ﴿ وَ اَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ ﴾ کے ارشاد سے ظاہر ہے۔

رہا نمازِ جنازہ کا مسئلہ، سو جب یہ معلوم ہوگیا کہ حضور ﷺ پر آنی ولمحی طور سے کیفیتِ موت طاری ہوئی تو سنت نمازِ جنازہ کی ادائیگی بھی لازم نہیں تھی، مگر جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے وہ تمام جنازوں کی طرح نہ تھی، لہٰذا اس کی صورت یوں الگ پیدا کی گئی جیسا کہ ابن اسحٰق نے سیرت میں لکھا ہے کہ حضور ﷺ کی وفات پیر (سوموار) کے دن دوپہر کو ہوئی اور حضرت انسؓ کی روایت کے مطابق پیر کے دن آخری وقت میں وصال ہوا اور حافظ ابن حجرؒ نے دونوں روایتوں میں تطبیق دے کر وصال کا وقت یہ لکھا ہے کہ جب دوپہر ڈھل چکی تھی تو گویا اُن کی تحقیق میں بعد زوال، وصال قریبِ عصر ہوا اور اس کے بعد اتنا وقت نہیں تھا کہ غروبِ آفتاب سے پہلے تکفین وتدفین سے فراغت ہوسکے۔ اِس لیے دوسرے دن منگل کو پورا پورا انتظام ہوا اور اُسی دن حضور ﷺ کے جسم اطہر کو قبرِ مقدس میں رکھ دیا گیا۔ جس حجرہ میں آپ نے وفات پائی تھی وہیں لوگ علی الترتیب تھوڑے تھوڑے ہوکر اندر جاتے تھے اور نمازِ جنازہ ادا کرتے تھے اور سہ شنبہ یعنی منگل کا دن گزار کر شام کو فارغ ہوئے ابنِ سعد کی بعض روایات میں یوں بھی ہے کہ بدھ یعنی چہار شنبہ کو تدفین ہوئی۔ لیکن یہ تمام روائتیں موضوع ہیں، خود ابنِ سعد سے جو صحیح روایات ہیں اُن میں یہ ہے کہ منگل کے دن تدفین ہوئی اور بدھ کی شام شروع ہوگئی تھی (یہ یاد رہے کہ اسلامی تاریخ بعد از غروبِ آفتاب شروع ہوتی ہے) اور

ابن ماجہ کتاب الجنائز میں بھی یہی ہے «فَلَمَّا فرغُوا مِنْ جنَازِہٖ یَوْمَ الثَّلٰثَا» اور جب فارغ ہوئے حضور ﷺ کی تجہیز سے منگل کا دن تھا. گویا وصال پیر (سوموار) کے روز ہوا اور تدفین منگل کو ہوئی اور سارا دن منگل کا صرف ہو کر شام کو فراغت پائی گئی. حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے غسل دیا تھا اور فضل بن عباسؓ اور اسامہ بن زیدؓ پردہ کرنے والے تھے. اوس بن خولی انصاریؓ پانی لاتے تھے اور حضرت عباسؓ کے دونوں صاحبزادے قثم اور فضلؓ مدد دیتے تھے. بعدازاں تین سُوتی سفید کپڑے کفن میں استعمال ہوئے. پھر غسل و کفن کے بعد سوال پیدا ہوا کہ آپ کو کہاں دفن کیا جائے؟ تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا کہ نبی جس جگہ وفات پاتے ہیں وہاں ہی دفن ہوتے ہیں. چنانچہ اُسی جگہ جہاں وصال ہوا قبر کھودی گئی، قبر کھودنے والے ابوطلحہؓ تھے جنہوں نے لحد والی قبر کھودی.

جنازہ تیار ہو گیا تو لوگ نماز کی سعادت حاصل کرنے کے لیے بڑھے. ترمذی کی روایت میں ہے کہ حضرتِ صدیق اکبرؓ نے مشورہ دیا کہ دس دس آدمی باری باری آئیں اور نماز پڑھیں. چنانچہ پہلے مردوں نے پھر بچوں نے یعنی تمام مہاجرین وانصار نے نماز پڑھی. امام کوئی نہ تھا اور نہ وہ دعائیں پڑھی گئیں جو عام جنازوں پر پڑھی جاتی ہیں بلکہ نمازِ جنازہ کی صورت یہ تھی کہ لوگ نہایت ادب واحترام کے ساتھ حاضر ہوتے اور صلوٰۃ وسلام عرض کر کے واپس ہو جاتے. سب سے بعد ازواجِ مطہرات نے نمازِ جنازہ ادا کی مگر عوام کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ نماز میں کیا پڑھیں، تو انہوں نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے دریافت کیا تو اُنہوں نے فرمایا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے پوچھو. چنانچہ آپ سے پوچھنے پہ ارشاد ہوا کہ یہ دعا پڑھو:

«اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا. لَبَّیْکَ اللّٰھُمَّ رَبَّنَا وَسَعْدَیْکَ صَلَوَاتُ اللّٰہِ اللّٰہُ اَکْبَرُ الرَّحِیْمِ وَمَلَائِکَتُہُ الْمُقَرَّبِیْنَ وَالنَّبِیِّیْنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَاءِ وَالصّٰلِحِیْنَ وَمَا سَبَّحَ لَکَ مِنْ شَیْئٍ یَا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ عَلٰی مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِاللّٰہِ خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ وَ سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَاِمَامِ الْمُتَّقِیْنَ وَرَسُوْلِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ شَاھِدِ الْبَشِیْرِ الدَّاعِیْ اِلَیْہِ بِاِذْنِکَ السِّرَاجِ الْمُنِیْرِ وَعَلَیْہِ السَّلَامُ»

[ذَکَرَہُ الشَّیْخُ زَیْنُ الدِّیْنِ بْنِ الْحُسَیْنِ الْمُرَاغِیِّ فِیْ کِتَابِہٖ تَحْقِیْقُ النُّصْرَۃِ]

اِس حدیث کو شیخ زین الدین بن حسین مراغیؒ نے اپنی کتاب تحقیق النصرۃ میں ذکر کیا ہے.

اِس بحث کا تیسرا پہلو یہ ہے ایک مقدس گروہ پر یہ کہہ کر طعن کرنا کہ اُنہوں نے جنازہ نہ پڑھایا، زیادہ وقت پڑا رہا. یہ حقیقتاً ایک ایسے رنج والم کے موقع کو افسانہ بنانا مقصود ہے. جس سے کہنے والوں نے بے باکانہ طور پر کہنے سے دریغ نہیں کیا. اِس پر بحث کرنا ضروری معلوم نہیں ہوتا کہ اِن الفاظ کے قائل کون تھے. مگر اتنا کہنا پڑتا ہے کہ وہ اہل اسلام کے خیر خواہ نہ تھے. جنہوں نے انتقال کے فوراً ہی بعد

معاندت کا ثبوت دے کر یہ ثابت کر دیا کہ عوام اہل اسلام میں تخریبِ اسلام کا جال پھیلانا اُن کا مقصود ہے۔ ورنہ ایک چھوٹی عقل کا آدمی بھی یہ سوچ سکتا ہے کہ جس کمرہ میں صرف دس آدمی نمازِ جنازہ کے لیے کھڑے ہو سکتے ہوں، وہاں لاکھوں یا ہزاروں کی تعداد میں باری باری حاضر ہو کر نماز ادا کرنا کتنا وقت لے سکتا ہے اور کثرتِ ہجوم کے باعث چھوٹی جگہ میں اِس تاخیر کا امکان کس حقیقت کا حامل ہوگا؟ اور اگر ایک عامیانہ نگاہ سے بھی اِس تاخیر کے اشارہ کو دیکھا جائے تو اِس قاعدہ کی رعایت بھی ملحوظ ہوگی کہ کسی بادشاہ کی وفات کے بعد حکومتیں اُس وقت تک اُس کے جسم کی حفاظت کرتی ہیں اور قبر میں داخل بلکہ موت کا ہی اعلان نہیں کرتیں جب تک اُس کے قائم مقام کا انتخاب نہ ہو جائے اور بالخصوص ایسی صورت میں جب کے خلافت کا مسئلہ نہایت اہم ہو۔ یہ تاخیر کس حد تک وقت کی نزاکت کی مؤید ہوگی اور شاید زمانہ کی سلطنتوں کا یہ الفاظ بیک وقت استعمال کرنا ''بادشاہ مرگیا''، ''بادشاہ زندہ باد'' اُسی کا ترجمان ہو۔ حقیقت میں یہ تاخیر تھی ہی نہیں، کیونکہ تاخیر یا پڑا رہنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی نے توجہ ہی نہ کی ہو۔ ایسے موقعہ کے لیے ''تاخیر'' کا لفظ استعمال کرنا حق وصداقت کا خون کرتا ہے۔ ع

بریں عقل و دانش بباید گریست

متروکاتِ نبوی ﷺ

﴿ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ﴾

''آج میں نے تمہارے لیے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور تمہارے لیے مذہب اسلام پر راضی ہو گیا۔'' [المائدہ ۵:۳]

یہ آخری وحی الٰہی جو حضور ﷺ پر نازل ہوئی، محبوبِ خدا محمد رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی کے دنیا سے تشریف لے جانے کا ایک اشارہ اور پیش خیمہ تھی جس کے نزول کے تین ماہ بعد حضور ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے۔ ابن اثیر نے لکھا ہے کہ جب یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی تو بعض دور اندیش صحابہؓ بھانپ گئے کہ حضور ﷺ کے وصال کا زمانہ قریب آ گیا ہے کیونکہ جس فرض کی ادائیگی کے لیے حضور ﷺ تشریف لائے تھے وہ پورا ہو چکا ہے۔ بعض روایتوں میں یوں بھی آیا ہے کہ اِس آیتِ کریمہ کے نزول پر اکثر صحابہ تکمیلِ دین سے نہایت مسرور ہوئے، مگر اداشناسِ قدرت، حضرت صدیق اکبرؓ جن کی حیاتِ طیبہ، حیاتِ نبوت کا صحیح عکس تھی رونے لگے، احبابؓ واصحابؓ نے پوچھا کہ تکمیل دین کا پیغام ایک مسرت وشادمانی کا مقام ہے جو کسی اُمتِ سابقہ کو حاصل نہیں ہوا، آپ روکیوں رہے ہیں؟ فرمایا یہ صحیح ہے کہ تکمیلِ دین کا پیغام مسرور کن پیغام ہے مگر اس آیت کے نزول سے مترشح ہوتا ہے کہ اب حضور ﷺ ہم کو داغِ مفارقت دے جائیں گے اور ہم میں نہیں رہیں گے اور ہم اس بے مثل دولتِ عظمٰی سے ہمیشہ کے لیے ظاہری طور پر محروم ہو جائیں گے، پھر کون ہے جو اُس صدمہ جان کاہ پر اشکباری نہ کرے گا؟

چنانچہ ہجرت کے گیارہویں سال ربیع الاول کی دسویں شنبہ کے دن حضور اقدس ﷺ کی علالت کا آغاز ہوا۔ دردِ سر اور بخار کی شکایت بڑھتی گئی دو روز تک طبیعت ناساز رہی۔ وصال کے دن دوشنبہ کے

روز بوقتِ نمازِ فجر مزاجِ مبارک میں کسی قدر سکون ہوگیا اور صحت محسوس کی جانے لگی۔ مسجدِ نبوی میں نماز باجماعت پڑھی جارہی تھی، سرکارِ دو عالم ﷺ سر مبارک کو کپڑے سے باندھے حجرہ شریف کے دروازہ تک تشریف لائے اور پردہ کو اٹھا کر نمازیوں کا مشاہدہ فرمایا اور متبسم ہوئے۔

مسلمانوں نے جب حضور ﷺ کے چہرۂ انور کو دیکھا تو نہایت خوش ہوئے اور قریب تھا کہ قدم بوسی کے لیے دوڑ پڑتے مگر حضور ﷺ نے اُن کو اشارے سے منع فرمایا اور وہ دعاؤں میں مشغول ہوگئے پھر اُن کے دعا کے فارغ ہو جانے کے بعد حضور ﷺ نے باآواز بلند ارشاد فرمایا:

''مسلمانو! میں نے تم کو اللہ کا کلام پہنچا دیا اور اُس کے احکام بتا دیئے۔ اب تمہارا فرض ہے کہ عمل کرو اور سعادتِ دارین سے حصہ پاؤ''۔ اِس کے بعد رسالت مآب ﷺ نے پردہ گرا دیا اور بسترِ استراحت پر واپس ہو کر لیٹ گئے۔ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہؓ سرہانے بیٹھی ہوئی تھیں کہ ذرا دیر کے بعد طبیعت اقدس پھر ناساز ہوئی اور زبانِ مبارک پر یہ کلمات جاری ہو گئے ((اَللّٰھُمَّ فِی الرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی)) اور یہ کل کائنات کا آفتاب ہدایت غروب ہوگیا۔

وَصَلَّی اللّٰہُ عَلٰی حَبِیْبِہٖ مُحَمَّدٍ وَّآلِہٖ وَسَلَّمْ.

سرکارِ انبیاء علیہ التحیۃ والثناء حیات النبی اور ایک ابدی زندگی کے مالک تھے۔ مگر قانون قدرت کے ماتحت اِس جہان فانی سے بفحوائے ﴿ کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمُوْتِ ﴾ آپ کا بھی تشریف لے جانا اُمت کے لیے ایک سبق ہی تھا، تاکہ یہ آخری منزل بھی عملاً طے کر کے دکھا دی جائے اور بتا دیا جائے کہ ایک مومن اِس جہان سے کوچ کر جانے کے بعد بھی ایک لازوال حیاتِ ابدی کا حامل ہو سکتا ہے۔ اگر یہ مسئلہ حیات بعد الممات کا یوں حل کر کے دکھانا نامنظور ہوتا تو حضور ﷺ یقیناً مرضیءِ مولا کے ماتحت ہمیشہ اس جہان میں قیام فرما سکتے تھے کیونکہ یہاں سے رحلت کے لیے بھی تو مولا کریم نے مرضی مبارک معلوم فرمائی تھی اور فرشتہ کے ذریعہ پوچھا تھا کہ اِس جہان کو چھوڑنے کے متعلق کیا ارادہ ہے؟

حضور ﷺ کا واقعۂ رحلت ایک وہ عظیم الشان واقعہ ہے۔ جس پر مؤرخین وشعراء نے ان الفاظ میں خامہ فرسائی کی ہے۔ شعر

نمے دانم حدیثِ نامہ چونست
ہمے بینم کہ عنوانش بخون است

تقریباً بتیس گھنٹے کے بعد حضور ﷺ کی تکفین وتدفین ہوئی اور اِس کے بعد مہاجرینؓ وانصارؓ جنابہ سیدہ فاطمہ زہراؓ کے دولت کدہ پر حاضر ہوئے۔ جنابہ سیدہؓ نے حضرت انسؓ سے پوچھا کہ سرکارِ دو عالم محمد رسول اللہ ﷺ کو دفن کر آئے؟ اُنہوں نے عرض کیا کہ ہاں! حضرت سیدہؓ نے پھر فرمایا

کہ تمہارے دلوں نے کیونکر گوارا کیا کہ آپ پر خاک ڈالی جائے؟ اِس سوال کا جواب کیا ہو سکتا تھا. سب نے پرنم آنکھوں سے بات کرتے ہوئے کہا کہ اے بنتِ رسول اللہ ﷺ ہم میں سے کون ہے جس کو آنحضرت محبوبِ خدا کی جدائی کا صدمہ نہ ہو؟ لیکن رب العزت جل شانہٗ کے حکم کے سامنے سر جھکانا ہی پڑتا ہے اور صبر و شکر کے سوا کوئی چارہ نہیں.

اِس مضمون کے ماتحت ''وفات نامہ'' لکھنا مقصود نہیں، ورنہ اُس صدمۂ دل دوز پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے. بتانا یہ مقصود ہے کہ شہنشاہِ کونین نے اِس جہان سے رحلت فرماتے وقت دنیا میں اپنی دنیا پسندی کے عنوان پر کیا کچھ چھوڑا اور دنیا میں کیونکر زندگی گزاری. چنانچہ صحیح روایات کے مطابق کتب صحاح ستہ سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جو کچھ چھوڑا وہ برائے نام تھا اور وہ بھی ایسا کہ جس کا عالمِ حیات میں ہی فیصلہ فرما دیا تھا یعنی ﴿ نَحْنُ مَعْشَرُ الْاَنْبِيَاءِ لَانَرِثُ وَلَا نُوْرَثُ مَا تَرَكْنَا صَدَقَةٌ ﴾. یعنی ''ہم گروہِ انبیاءؑ کا کوئی وارث نہیں ہوتا. ہم جو کچھ چھوڑیں وہ صدقہ ہوتا ہے'' یہ حدیث صحیح بخاری میں موجود ہے اور صدقہ سے مراد عام مسلمانوں کا حق ہے. سرکارِ دو عالم ﷺ کے مختار کے ترکہ کی جو فہرست کتبِ دین میں ملتی ہے اُس کا کچھ اجمالی خاکہ یہ ہے:

جانور

صحیح بخاری کی دوسری حدیث بروایت عمرو بن الحارثؓ برادر اُم المومنین حضرتِ جویریہؓ یہ ہے: ((مَاتَرَكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عِنْدَ مَوْتِهٖ دِرْهَماً وَلَا دِيْنَاراً وَلَا عَبْداً وَلَا اَمَةً وَلَا شَيْئاً اِلَّا بَلْغَةُ الْبَيْضَاءَ وَسَلَاحَه، وَاَرْضاً جُمْلَه، صَدَقَةٌ)). یعنی رسول اللہ ﷺ نے اپنی موت کے وقت کچھ نہیں چھوڑا، نہ درہم، نہ دینار، نہ غلام، نہ لونڈی، نہ کچھ اور، صرف اپنا ایک سفید خچر، اسلحہ، زمین اور اُن کو بھی صدقہ کر گئے. یہ وہ خچر ہے جس کو مقوقس شاہِ مصر نے ہدیۃً پیش کیا تھا اور اُس کا نام تیہ تھا. جس کو دُلدُل بھی کہا جاتا ہے اور اربابِ سیَر کی روایات کے مطابق وفات سے پہلے مختلف اوقات میں آپ کے پاس سات گھوڑے بھی رہے ہیں، جن کے نام یہ ہیں: سکب، سبحہ، مرتجز، ظرب، لحیف، ورد اور لزاز. اِن گھوڑوں کے علاوہ ایک تیز رفتار اونٹنی بھی جو صفات کے لحاظ سے عضباء، قصوا یا جدعا مشہور تھی اور ایک گدھا جس کا نام عفیر یا یعفور تھا حضور ﷺ کے پاس تھے.

اراضیات

مدینہ طیبہ کی اراضیات سے بنو نضیر کے نخلستان (کھجوروں کے باغ مراد ہیں) جو اُن کی جلاوطنی کے بعد حضور ﷺ کے قبضہ میں آ گئے تھے، اِن باغات کی آمدنی اتفاقیہ مصارف کے لیے مخصوص تھی اور

''بمدِ امانت'' محفوظ رکھی جاتی تھی۔ باقی کچھ خیبر کی اراضیات بھی تھیں۔ جو فتح کے بعد مجاہدینؓ میں تقسیم کر دی گئی تھیں اور اُن میں سے کوئی ایک ٹکڑا بھی حضور ﷺ کے لیے مخصوص نہ تھا البتہ لگان کی مجموعی آمدنی سے خمس (پانچواں حصہ) نبی کریم ﷺ کا ہوتا تھا۔ چنانچہ اِسی رقم سے ایک حصہ ازواجِ مطہراتِ حضور ﷺ کے سالانہ مصارف میں دیا جاتا تھا۔ پھر اگر کچھ باقی رہ جاتا تو فقراء مہاجرین پر بانٹ دیا جاتا۔ اِن کے علاوہ دو حصے عام مسلمانوں کے لیے وقف تھے اور باغِ فدک کی کل آمدنی مسافروں کے لیے مخصوص تھی۔ چنانچہ شروع سے اخیر تک یعنی تاریخِ قبضہ سے لے کر حضور ﷺ کی رحلت تک اِن زمینوں کی آمدنی کا یہی مصرف رہا اور اِسی اصول پر حضرات خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی پابندِ عمل رہے۔ سرکارِ دوعالم ﷺ کے سانحۂ ارتحال پر جب بنی ہاشم اور حضرت سیدہ فاطمہ زہراؓ نے فدک کی تقسیم کا مطالبہ کیا تو حضرت خلیفۂ اوّل صدیق اکبرؓ نے اِسی اصول کی بنیاد پر اُن کے مطالبے کے دعویٰ کو خارج کر دیا۔

کیونکہ نبی کریم ﷺ اراضیِ خیبر کے بطورِ ''ملکیتِ ذاتی'' مالک نہ تھے، بلکہ ''بحیثیتِ وقف'' آپ اُس کے متولی تھے۔ یہی وجہ فتوح البلدان بلاذری میں لکھی ہے۔ اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ حضرت سیدہ فاطمۃ زہراؓ اِس جواب اور فیصلہ پر ناراض ہوگئیں اور ساری عمر حضرت صدیق اکبرؓ سے ہم کلام نہ ہوئیں۔ یہ غلط ہے۔ اِس کا مطلب ناراضگی کا نہ تھا بلکہ یہ کہ حضرت سیدہؓ نے جب حضور ﷺ کی یہ حدیث سنی تو تعمیلِ ارشاد کے طور پر آپ نے سکوت فرمایا اور اِس امر کا پھر تمام عمر مطالبہ یا ذکر نہیں کیا کیونکہ آنحضرت ﷺ کے ارشادات کا آپ سے زیادہ احترام کرنے والا اور کون ہوسکتا تھا؟

اسلحہ جات

جہاد کی ضرورت کے پیشِ نظر سرکارِ کائنات، مختارِ شش جہات ﷺ کے پاس اسلحہ بھی موجود رہتا تھا اور ذاتی مصارف سے جس قدر رقم پس انداز ہوتی تھی وہ بھی اسلحہ کی خریداری میں صرف فرما دیا کرتے تھے، جو اکثر مجاہدین ہی کے کام آتے تھے۔ البتہ ذاتی طور پر جو گیارہ تلواریں تھیں وہ سرکار کے پاس ہی رہتی تھیں اور اپنی صفات کے لحاظ سے الگ الگ ناموں پر پکاری جاتی تھیں مثلاً:

(1) ماثور: ترکۂ پدری کی یادگار تھی۔

(2) عضب: جو معرکۂ بدر کے موقع پر حضرت سعد بن عبادہؓ نے نذر کی تھی۔

(3) ذوالفقار: اِس میں ریڑھ کی ہڈی کی طرح گرہیں تھیں۔ بدر کے مالِ غنیمت میں آئی تھی جو عاص بن منبہ سہمی کی ملکیت تھی، اِس کا قبضہ چاندی کا تھا اور حضور ﷺ نے حضرت

مولا مشکل کشا علیؓ کو عطا کر دی تھی. جو بعد میں حضرت امام زین العابدینؒ کے بعد خلفائے عباسیہ کے قبضہ میں آئی.

(4) قلعی

(5) بتّار: یہ دونوں تلواریں نہایت تیز اور دھار دار تھیں.

(6) حتف: (موت)

(7) مخذم: جو زید الخیر نے نذر کی تھی بڑی شاندار اور جوہر والی تھی.

(8) قضیب: (شاخِ درخت) نہایت خوبصورت اور نازک تھی.

(9) رُسُوب: (زخم میں پیوست ہو جانے والی) یہ ایک تاریخی یادگار تھی، ملکۂ سبا نے حضرت سلیمانؑ کو جو سات تلواریں نذر کیں تھیں اُن میں سے ایک یہ تھی.

(10) قبیعہ: یہ حضور ﷺ کی اتنی پسندیدہ تھی کہ ہر غزوہ میں زیبِ کمر رہی.

(11) صمصام: یہ عمر بن معدی کرب کی مشہور تلوار تھی جو سرکار ﷺ کے پاس رہی.

اِن تلواروں کے علاوہ دو ڈھالیں بھی تھیں. ایک کا نام ذلوق تھا اور دوسری کا عقاب تھا، جس پر مینڈھے کے سر کی تصویر تھی بدیں وجہ حضور ﷺ اِس کو استعمال نہ فرماتے تھے. آج کل کے تصویروں کے دلدادہ اور فوٹوؤں کے عاشق ذرا غور کریں کہ وہ تصویریں بنا کر کس حد تک ادائے سنت کا ثواب حاصل کر رہے ہیں.

زِرہیں

حضور ﷺ کے اسلحہ جات جنگ کے ساتھ جو مذکور ہوئے ہیں، سات عدد زرہیں بھی تھیں اور سب آہنی تھیں. عرب میں چونکہ چمڑے کی زرہیں بھی استعمال ہوتی تھیں، اس لیے ان کو لوہے کی ہونے کا خاص درجہ حاصل تھا. ان کے نام یہ تھے: ذات الفضول، ذات الرشاح، ذات الحواشی، سفلایہ، فضہ، تبرا، فرنق، ان کے علاوہ آہنی مغفر: دو عدد تھے. ایک کا نام البیوع اور دوسرے کا نام الموشح تھا. اکثر غزوات میں زرہ اور مغفر دونوں کا استعمال ہوتا تھا. چنانچہ غزوہ اُحد اور حنین میں جسمِ اطہر پر دو زرہیں، ذات الفضول اور فضہ تھیں.

نیزے

سرکار ﷺ نے اِس غرض وغایت کے لیے پانچ نیزے بھی رکھے ہوئے تھے، جن میں ایک کا نام مثوی (قاتل) اور دوسرے کا نام مثنی تھا. ایک برچھی تھی جس کا نام عنزہ تھا جو شاہ حبش نجاشی نے نذر کی تھی.

کمانیں

زوراء، روحا، بیضاء، صفرا، سداد، شداد، کتوم، سات کمانیں تھیں۔ اِن سے کتوم غزوہ اُحد میں ٹوٹ گئی تھی، جو حضور ﷺ نے حضرت قتادہؓ کو دے دی تھی۔

ترکش

ایک ترکش تھا جس کا نام کافور تھا۔ ترکش کو عربی میں کنانہ کہتے ہیں۔

عَلَمْ

سفید، سیاہ اور سبز متعدد علم بھی تھے۔ مشہور سیاہ عَلَم عقاب تھا۔ یہ غزوۂ خیبر میں تھا۔ ایک سفید علم بھی تھا۔ جس پر کلمہ طیبہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ لکھا ہوا تھا۔ اکثر علم امہات المومنین کے دوپٹوں سے تیار کئے گئے تھے۔ ایک اور سفید علم بنام زینتہ تھا۔

عصا

حضور ﷺ نے اپنی ضرورت کے لحاظ سے متعدد دستی لاٹھیاں بھی رکھی ہوئی تھیں جن میں سے ایک الیمین تھی، جو عیدین کے موقع پر اکثر دستِ مبارک میں ہوتی۔ دوسری عرجون جو بقدرِ نصف، قد کھجور سے بنی ہوئی تھی اور عصائے دراز بھی دو تھے۔ ایک نام ممشوق اور دوسرے کا مجحن پکارا جاتا تھا جن میں سے ایک سیدنا ابوبکر صدیقؓ کو عطا ہوا اور ایک خود سرکارِ دو عالم ﷺ کے پاس رہتا تھا۔

خطاط

یہ بالوں کا ایک خیمہ تھا۔ جس کا نام الکن رکھا ہوا تھا۔ (محافظِ گرما و سرما) غزوات میں یہ ساتھ رہتا تھا۔ سرکارِ دو عالم ﷺ کی عادت مبارک تھی کہ ہر چیز کا نام اُس کی صفت کے لحاظ سے رکھا کرتے تھے اور وہی پکارا بھی جاتا تھا۔

لباس

آپ کے لباس مبارک میں تین عدد جُبّے تھے، جن کا جنگوں میں استعمال ہوتا تھا۔ ایک سیاہ رنگ کا عمامہ شریف تھا۔ جس کا نام سحاب تھا۔ فتح مکہّ کے دن یہی سرِ اقدس پر زینت بنا رہا۔ اِس کے علاوہ روایتوں میں آیا ہے کہ چار جوڑے چرمی مُوزوں کے بھی تھے جو وقتاً فوقتاً استعمال ہوا کرتے تھے۔

انگوٹھی

سرکارِ دو عالم ﷺ کے پاس ضرورتِ زمانہ کے مطابق ایک چاندی کی انگوٹھی جس پر تین سطور میں محمد رسول اللہ (ﷺ) کندہ تھا، آپؐ کے بعد استحقاقِ خلافت کی بنا پر یہ انگوٹھی خلفائے کرامؓ کے قبضہ میں رہی اور عہدِ عثمانی میں جب فتنہ برپا ہوا تو ضائع ہوگئی۔

ظروف یعنی برتن وغیرہ

ایک الصادرہ نامی کوزہ تھا اور ایک العقبہ نامی قعب یعنی رکابی تھی۔ ایک قلاح (پیالہ) جس کا نام الریان ومعیث تھا اور دو پیالے لکڑی کے تھے اور ایک پیالہ کانچ کا بھی تھا۔ ایک پتھر کا طشت تھا جس میں آپ وضو فرمایا کرتے تھے اور ایک لوہے کا مُخَضب نام کھلاتب (کٹھیلا) تھا اور ایک لکڑی کا بڑا وزنی (قصعہ) یعنی کاٹھڑا تھا۔ جس میں دعوت وغیرہ کے موقع پر تخمیناً دس بارہ آدمیوں کا کھانا پڑ جاتا تھا۔ اس کا نام الغرّیٰ تھا۔

اشیاءِ متفرقات

ایک تھیلی کپڑے کی جس میں آئینہ، ایک کنگھی جو کچھوے کی پشت کی ہڈی کی تھی، سرمہ دانی، سوئی، دھاگہ، قینچی، سوسومۃ الجامع (تیل کی کپی) اور مسواک رہا کرتی تھیں۔ یہ تھیلی سفر و حضر میں ہمیشہ ساتھ رہتی۔

تخت پوش چوبی

ایک لکڑی کا تخت ہوتا تھا، جس کے پائے ساج کے تھے۔ یہ اسد بن زرارہؓ نے نذر کیا تھا۔ حضور نبی کریم ﷺ کا جسمِ پاک جنازہ کے وقت اسی پر تھا اور آپ ﷺ کے بعد سیدنا ابوبکر صدیقؓ اور حضرت سیدنا عمر فاروقؓ خلیفہ دوم کے جنازے بھی اسی تخت پر اٹھائے گئے تھے۔

مسکن شریف

سرکارِ دو عالم ﷺ کا مکہ معظمہ والا موروثی مکان جو حضرت عقیلؓ (برادر حضرت علیؓ) کے قبضہ میں رہا۔ مدینہ طیبہ میں سکونت کے لیے ازواجِ مطہرات کی نسبت سے نو حجرے تعمیر کیے گئے تھے، جن میں سامانِ آرائش میں صرف ایک چادر اور ایک چارپائی تھی، بستر اور چمڑے کا ایک گدا (دلائی) اور ایک ایسا ہی تکیہ تھا۔

غلام اور کنیزیں

غلامانِ خاص میں سب سے پہلے غلام زیدؓ بن حارثہ تھے۔ دوسرے ابو عبداللہ حمیری، تیسرے ابو کبشہ شقران، چوتھے ابو رافع اسلم، پانچویں ابو موتیہہ مزینہ، چھٹے سفینہ، ساتویں بشار، آٹھویں ابو حمیرہ، نویں مدحم، دسویں البینہ، گیارہویں فضالہ رضوان اللہ علیہم اجمعین تھے اور کنیزوں میں ام ایمن (برکہؓ نامی) حبشیہؓ جو ترکہ ءِ پدری میں آئیں تھیں اور حضور ﷺ کی دایہ اور خادمہ تھیں اور باقی مختلف اوقات میں 18 کنیزیں رہی تھیں۔ اُن سب غلاموں اور کنیزوں کی تفصیلی حالات معلوم کرنے کے لیے الخمیس اور زرقانی کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اِس مختصر کتاب میں اِس کی گنجائش نہیں۔

تقبیلِ ابہامین اور برکاتِ
اسمِ محمد ﷺ

اہل اللہ رحمہم اللہ نے فرمایا ہے کہ محبوب کا ہر قول وفعل، محبوب اور مطلوب کی ہر ادا، مطلوب ہوتی ہے. کیونکہ محبت ہی ایمان کی علامت ہے. جس میں محبت نہیں اُس میں ایمان نہیں. بعض خشک زاہد اس رسمی اسلام پر عامل ہو کر (جو اُن کے اپنے نفسوں نے گھڑ لیا ہے) مدعی ہوتے ہیں کہ صراطِ مستقیم ہمارے ہی حصے میں آیا ہے. مگر جب اسلام لانے والے سے محبت کا اظہار کرنا پڑے تو فوراً شرک گوئی کی مشین متحرک ہو جاتی ہے اور بے معنی توحید پرستی کے گیت گائے جاتے ہیں. نہیں سمجھتے کہ اسلام اور خدائے قدوس اُسی کا ہے، جس نے جہالت کی گھٹا ٹوپ تاریکیوں میں خداوندِ عالم کا تصور سمجھایا تھا اور فرمایا تھا کہ وہ ایک ہے، وَحدہٗ لاشریک ہے، خالق الکل ہے اور ساری کائنات کا خالق ورازق ہے. اُسی کے فرمانے سے پتہ چلا کہ خدا ہے اور ایک ہے. وہی قابلِ پرستش ہے اور وہی رازقِ مطلق ہے. اگر بتانے والے اور شناسائے خدا کرانے والے محبوبِ خدا ﷺ کو اپنے اور خدائے واحد کے درمیان سے الگ کر دیں تو ساری توحید پرستی کر کری ہو کر رہ جاتی ہے. کہاں کی توحید اور کیسی توحید پرستی؟ انسانیت ہو تو یہ سمجھ آئے گی کہ محمد ﷺ کے خدائے واحد سے ہمارا کوئی رشتہ نہیں، کیونکہ ''ایک'' منوانے والے کو اور ''خدا کے محبوب'' کو ہم نے درمیان سے نکال دیا ہے اور توحید وہی قبول ہو سکتی ہے جو بواسطہ محمد رسول اللہ ﷺ ہو. اُس ماننے والے کی اپنی کیا حیثیت ہے؟ جو کسی کے کہے پر خدا کو ایک مانے، پھر اُسے اگر ''منوانے والا'' سات خدا بھی منوا دیتا تو اُسے ماننا ہی پڑتا کیونکہ اُس کی اپنی تحقیق کی کوئی عینک نہیں اور اگر محمد ﷺ کی محبوبیت ورسالت کے بغیر توحید کوئی قابلِ قبول عمل وعقیدہ ہوتا تو سکھ قوم یقیناً ایسے توحید پرستوں سے پہلے درجۂ مؤحدیت پر فائز ہوتی.

بے تحقیق محبت ''کانبیائے بنی اسرائیل'' کے مدعی اور ''خلیفۃ اللہ فی الارض'' کہلانے والے اور اپنے آپ کو حضور ﷺ کی گدّی کا مستحق خیال کرنے والے ذرا غور تو کریں کہ حضور ﷺ کے کلمۂ توحید

پڑھانے کا یہی احسان ہے کہ خداوندِ عالم کا پیغام سن پانے کے بعد، پیغام لانے والے ہی سے بے ادبی کا ارتکاب کیا جائے؟ لاحول ولا قوۃ! اِس خودستائی اور خودنمائی کی بھی کوئی حد ہے، جو بزعمِ خود اپنے وجودِ فانی کو خدائے واحد کا عرش قرار دیئے بیٹھے ہیں. بڑے بڑے خطابوں سے اپنے آپ کو لکھوا لکھوا کر مشہور کراتے ہیں مگر حق پسندی اس قدر بھی نہیں جتنی شہرت پسندی ہے. انہیں خدا کے پیارے کی نہ کوئی شرم و حرمت ہے اور نہ اُس کی عزت و عصمت کا کچھ پاس، نہ اس کے نام و ناموس پر مٹنا جانتے ہیں. اپنے کسی فرقہ وار مولوی کی توہین ہو تو لاٹھیاں اٹھالیں اور سرکارِ دو جہاں بانی اسلام ﷺ کی عزت پر لاکھوں راجپال چڑھ آئیں تو اُن کے قلوبِ قاسیہ، موحدیہ، نام نہاد پر کوئی شکن نہ آئے. ''توحید توحید'' کے نعرے مار مار کر لوگوں کے سر میں درد لگا دیتے ہیں. حدیث حدیث اور سنّت سنّت پکارتے کھپا دیتے ہیں لیکن خود ترکِ شرک و بدعت نہیں کرتے. آج کے اِس فرقہ کے پاس ادائے سنت کے لیے کئی لاکھ احادیث واجب العمل سے صرف آمین بالجہر، رفع یدین اور فاتحہ خلف الامام کا جھگڑا رہ گیا ہے اور کچھ نہیں. حضور ﷺ کے معاملہ میں ہر بات پر شرکِ مجسم کا فتویٰ ہے اور پورے بے ادب. اللہ کریم اُن کو توفیق عطا فرمائے کہ یہ سرکارِ دو عالم ﷺ کو پہچان سکیں. لطیفہ:

چند مسلمان ریل میں سفر کر رہے تھے کہ گاڑی ایک سٹیشن پر رکی. نمازِ ظہر کا وقت تھا. کسی مقامی مسلمان نے سٹیشن کی مسجد میں اذان دینی شروع کر دی اور جب کلمہ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ پر پہنچا تو بعض نے ادبِ رسول ﷺ سے قُرَّۃُ عَیْنِیْ بِکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ کہہ کر ہاتھوں کے انگوٹھے چومے. وہاں ایک امرتسری موحد بھی موجود تھے. اُنہوں نے ٹوکا اور ترشروئی سے ٹوکا، پھر کیا تھا وہ بحث چھڑی کہ اگر چند دوسرے ہم سفر مزاحمت نہ کرتے تو یہ مسئلہ جوتے گھونسے سے کچھ آگے جیل تک کا ثواب بھی معترض کے نامۂ اعمال میں لکھوا دیتا.

حیرانگی ہوتی ہے کہ یہ حسد و کاوش کیوں ہے، جب کہ مولا کریم نے اپنی اطاعت کو اطاعت رسول ﷺ پر ہی موقوف رکھا ہے اور ﴿مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ﴾ سے ثابت فرما دیا ہے کہ میرے محبوب کی محبت و اطاعت ہی میری محبت و اطاعت ہے.

قرآنِ کریم میں دو قسم کے احکام آئے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے دو ہی طرح پر تخاطب فرمایا ہے. ایک تو ﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ﴾ یعنی اللہ اور اُس کے رسول ﷺ پر ایمان لاؤ اور دوسرے ﴿اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو. پہلا مرحلہ اٰمَنُوْا کا ہے اور دوسرا عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کا. گویا ایمان و عمل دونوں ہی لازم و ملزوم چیزیں ہیں. اگر ''ایمانِ مابعدُ'' سے ''ایمان بالرسول'' کو الگ کر دیا جائے اور ''اطاعتِ الٰہی'' کے ساتھ ''اطاعتِ رسولِ الٰہی'' کو شرک سمجھ کر چھوڑ دیا جائے تو اسلام کس شئے کا نام ہوگا؟ حالانکہ اٰمَنُوْا سے مراد ہے انسانیت کے بلند

ترین مقاصد کو بواسطہ رسول ﷺ سامنے رکھنا اور کسبِ سعادت کی استعداد وقوت کا اظہار کرنا اور اطیعوا وعملوا الصلحٰت سے مقصود ایسے عملی ذرائع اختیار کرنا ہے جن سے اشخاص اور اقوام اپنے مطلوبہ مقاصد تک پہنچ سکیں. یعنی اٰمَنُوْا عالمِ روحانیات کی جانب پرواز اور کسبِ سعادت کی سچی طلب اور تیاری ہے اور اطیعو آلاتِ پرواز اور حصولِ مطلب کا ذریعہ ہیں گویا اٰمَنُوْا روح ہے اور اطیعوا جسم ہے. جب تک دونوں کا اشتراک نہ ہو صحیح مذہبی زندگی نہیں بن سکتی.

یہ مسئلہ جس کا لطیفہ میں ذکر کیا گیا ہے، بھلا کون سا شرک وکفر کا اقدام ہے، جس میں دھینگا مُشتی تک نوبت پہنچائی جائے. صحابہ کرامؓ نے فضلاتِ خارجہ، تھوک، پیپ وغیرہ حضور ﷺ سے لے کر چہروں پر مل لیا یا خون، پیپ پی کر محبتِ ایمانی کا ثبوت دیا اور حضور ﷺ نے اُنہیں بدعمل کہنے کی بجائے یہ فرما دیا کہ تم پر دوزخ حرام ہوگئی ہے. کیونکہ تمہارے اندر نبی ﷺ کا خون چلا گیا ہے. تو یہ کس بات کا صلہ تھا؟ حالانکہ قرآن کریم خون، پیپ اور مردار وغیرہ کو حرام فرماتا ہے. اِس بیان سے دو باتیں ثابت ہوئیں. ایک اختیاراتِ نبوی ﷺ کہ جنتی کو جہنمی اور جہنمی کو جنتی، حرام کو حلال اور دو گواہوں کی بجائے ایک گواہ کافی فرما دیں. دوسرے محبت کے میدان میں بھی ایسے افعال بھی پسندیدہ ہو جاتے ہیں جو اگرچہ مواخذہ کے قابل ہوتے ہیں مگر مواخذہ تو درکنار وہ موجبِ نجات ہو جاتے ہیں.

فقیر اپنی تالیف جمالِ رسول ﷺ کو مکمل کر چکا تو ایک دن نماز کے بعد کسی کہنے والے نے کہا کہ اِس کتاب میں "مسئلہ تقبیل ابہامین" بھی لکھو. تاکہ اہلِ ایمان اِس سے کماحقہ، نفع حاصل کر سکیں. چنانچہ اُسی آواز کا نتیجہ یہ چند اوراق بھی قارئین کے پیش خدمت ہیں. مطالعہ فرمائیں اور ایمانوں کو مجلّٰی کریں.

تقبیل ابہامین یعنی دونوں انگوٹھوں کا بوقت تکلم مؤذن اشھد ان محمد رسول اللہ چومنا کتبِ احادیثِ قدسیہ میں ثابت ہے. چنانچہ ایک روایت میں آیا ہے کہ حضرت آدمؑ کو زمانۂ قیامِ جنت میں آنحضرت ﷺ کو دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا. پس اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ پر وحی بھیجی کہ محمد ﷺ تمہارے صلب سے ہیں اور اُن کا ظہور آخری زمانہ میں ہوگا مگر جب حضرت آدمؑ کا اشتیاق زیادہ ہوا تو حق تعالیٰ جل وعلا شانہ، نے حضور ﷺ کی صورت مبارک حضرت آدمؑ کے دونوں انگوٹھوں کی صاف سطح میں ظاہر فرما دی اور حضرت آدمؑ نے فرطِ محبت سے دونوں انگوٹھوں کو چوم کر اپنی دونوں آنکھوں پر رکھ لیا. پس یہ انگوٹھوں کا بوسے دے کر آنکھوں پر محبت سے لگانا آدمؑ کی اولاد کے لیے اپنے دادا کی سنت ہوئی. اِس قصہ کو جب جبرائیلؑ نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے میرا نام اذان میں سنا اور محبت سے انگوٹھے چوم کر آنکھوں پر ملے تو وہ کبھی اندھا نہ ہوگا. ایسے ہی یہ واقعہ تفسیر ابوطالب مکی میں ہے کہ جب آدمؑ کو جنت میں داخل کیا گیا تو آپ دیدارِ محمد رسول

اللہ ﷺ کے متمنی ہوئے. مولا کریم نے وحی فرمائی کہ وہ آپ کی پشت مبارک میں ہیں اور آخری زمانہ میں ظہور فرمائیں گے. پھر اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کے لیے آپ کے نورِ پاک کو آدمؑ کی انگشتِ شہادت میں ظاہر فرمایا تو اُس نُور نے تسبیح پڑھنی شروع کر دی. ایک دوسری روایت میں یوں بھی آیا ہے کہ مولا کریم نے اپنے محبوب کے نور کو انگوٹھوں کے ناخنوں میں آئینہ کی طرح چمکایا اور حضرت آدمؑ نے دیکھتے ہی انگوٹھوں کو چوم لیا اور آنکھوں پر مسح فرمایا.

اور محیط میں ہے کہ ایک روز حضرت بلالؓ اذان دے رہے تھے اور اُنہوں نے جب کلمہ اشھد ان محمد رسول اللّٰہ پکارا تو حضرت عمرؓ نے اپنے دونوں انگوٹھوں کو چوم کر آنکھوں سے لگایا. حضور ﷺ نے یہ فعل دیکھ کر حضرت عمرؓ سے دریافت فرمایا کہ اے عمر! تم نے یہ کیا کام کیا ہے؟ ((فَقَالَ سَمِعْتُ اِسْمُكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فِي الْاَذَانِ فَقَبَلْتُ اِبْهَامِيْ فَوَضَعْتُ عَلٰى عَيْنِيْ فَقَالَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ مِنْ مِّثْلِ مَافَعَلَ عُمَرُ فَاَنَا طَالِبَه، فِيْ صُفُوْفِ الْقِيَامَةِ قَائِدُه، اِلَى الْجَنَّةِ)) "پس حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ میں نے آپ کا اسم مبارک اذان میں سنا اور بوجہ غلبۂ محبت کے اپنے دونوں انگوٹھوں کو چوما اور آنکھوں سے لگایا تو حضور ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ جو شخص حضرت عمرؓ کی طرح کرے گا تحقیق میں اُس کو قیامت کی صفوں میں تلاش کروں گا اور اُس کو جنت میں لے جاؤں گا."

ایسا ہی بروایت حضرت ابوبکر صدیقؓ میں بھی مذکور ہے اور تفسیر ابوطالب میں ہے کہ جب ابتداء میں اذان شروع ہوئی اور اس کا اہتمام قبل از نماز پنجگانہ ہونے لگا تو ایک دن 20 محرم الحرام بروز جمعہ کو آنحضرت ﷺ مسجد میں تشریف لائے اور مسجد کے ستون سے تکیہ لگا کر بیٹھ گئے. اتنے میں حضرت بلالؓ مسجد میں حاضر ہوئے اور وضو فرما کر اذان دینے لگے. جب کلمہ اشھد ان محمد رسول اللّٰہ پر پہنچے تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے دونوں ہاتھوں کے دونوں انگوٹھوں کو بوسہ دیا اور آنکھوں پر رکھ کر فرمایا. قُرَّةُ عَيْنِيْ بِكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ. جب اذان ختم ہو چکی تو نبی مکرم ﷺ نے فرمایا کہ "اے ابوبکر جو کوئی شوق و محبت سے ایسا کرے اور کہے جو تو نے کیا اور کہا ہے، تو اللہ تعالیٰ اُس کے تمام گناہ قدیم و جدید اور پوشیدہ و ظاہر کو بخش دے گا اور میں اُس کے گناہوں کا شفیع ہوں گا." یہ بروایت ابن عینیہؓ کی ہے اور وہ فرماتے ہیں کہ حضرت سیدنا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ بھی اسی طرح عمل فرماتے اور رَضِيْتُ بِاللّٰهِ رَبًّا وَّ بِالْاِسْلَامِ دِيْنًا وَّ بِمُحَمَّدٍ نَّبِيًّا پڑھ کر ہاتھوں کے دونوں انگوٹھوں کو چومتے اور آنکھوں پر مسح فرماتے اور در المختار باب الاذان اور کنز العباد میں ہے جب مؤذن کلمہ اشھد ان محمد رسول اللہ اذان میں کہے تو سننے والا درود شریف پڑھے اور مستحب ہے کہ انگوٹھوں کو بوسہ دے کر آنکھوں پر لگائے اور منہ سے یہ الفاظ کہے. قُرَّةُ عَيْنِيْ بِكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ مَتِّعْنِيْ بِالسَّمْعِ وَالْبَصَرِ اور فتوح الاوراد میں ملا فتح محمد محدث رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں کہ اذان میں سننے والا بوقتِ شہادتِ ثانیہ اپنی دونوں انگشت شہادت کو اپنی

دونوں آنکھوں پر رکھے. کیونکہ حضرت علی المرتضی کرم اللہ وجہ کا ایسا ہی معمول تھا.

اور صلوٰۃ مسعودی میں ایک روایت بایں الفاظ درج ہے. رُوِیَ عَنِ النَّبِیِ صلی اللہ علیہ وسلم مَنْ سَمِعَ اِسْمِی فِی الْاَذَانِ وَوَضَعَ اِبْهَامَیْهِ عَلٰی عَیْنَیْهِ فَاَنَا طَالِبُه، فِی صُفُوْفِ الْقِیَامَةِ قَائِدُه، اِلَی الْجَنَّة. یعنی ''روایت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ جس نے اذان میں میرا نام سنا اور اپنے دونوں انگوٹھوں کو اپنی دونوں آنکھوں پر رکھا میں اُس کو صفوفِ قیامت میں یقیناً تلاش کروں گا'' اور اُس کو جنت کی طرف لے جاؤں گا اور کتاب مقاصد جنت میں ہے. مَنْ قَبَّلَ عِنْدَ سَمَاعِهٖ مِنَ الْمُؤَذِّنِ كَلِمَةَ الشَّهَادَةِ ظُفْرَیْ اِبْهَامَیْهِ وَمَسَّهُمَا عَلٰی عَیْنَیْهِ وَقَالَ عِنْدَ الْمَسِّ اَللّٰهُمَّ اِحْفِظْ حَدَّقَتِیْ وَنَوِّرْ بِبَرَكَتِهٖ حَدَّقَتِیْ مُحَمَّدٌ وَنَوِّرْ هُمَا لَمْ یَعْمَ. یعنی ''جو شخص مؤذن سے کلمہ شہادتِ ثانیہ سنے اور اپنے دونوں انگوٹھوں کے ناخنوں کو چومے اور اپنی دونوں آنکھوں پر ملے اور کہے. اللھم احفظ الآخر. وہ کبھی اندھا نہ ہوگا'' اور اِسی سے ملتی جلتی عبارت قریباً مفتاح السعادت میں بھی ہے. جس کا مختصر ترجمہ یہ ہے کہ جو شخص اِس عمل پر مداومت کرے اس کی آنکھیں اس کی برکت عظیمہ سے اندھی ہونے سے محفوظ رہیں گی اور شیخ زادہ نے وقایہ کی شرح میں لکھا ہے کہ یہ فعل سنت ہے اور خلفائے کرام رضوان اللہ علیہم کا طریقہ ہے. بوقت سننے کلمہ شہادت ثانیہ کے انگوٹھوں کو بوسہ دے کر یہ کہنا چاہیے اَللّٰهُمَّ اِحْفِظْ عَیْنَیَّ وَنَوِّرْهُمَا اور صاحبِ مضمرات نے بھی اِس کو مسنون لکھا ہے اور کنز العباد میں اس کے عمل کا طریق یوں لکھا ہے کہ جب اشھدان محمد رسول اللہ پہلی بار سنے تو کہے صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْكَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اور دوسری بار کہے قُرَّةُ عَیْنِیْ بِكَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اور انگوٹھوں کو بوسہ دے کر اپنی آنکھوں پر لگائے. مقاصد حسنہ میں حضرت حسنؓ سے روایت بیان فرمائی گئی ہے کہ جو شخص کلمہ اشھد ان محمد رسول اللہ سن کر مرحباً بِحَبِیْبِیْ وَ قُرَّةُ عَیْنِیْ مُحَمَّدُ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم کہے اور اپنے انگوٹھوں کو بوسے دے کر اپنی آنکھوں پر ملے. لَمْ یَعْمَ وَلَمْ یَرْمُدْ وہ کبھی اندھا نہ ہوگا اور نہ کبھی اُس کی آنکھیں دکھیں گی اور مولانا جمال بن عبداللہ بن عمر مکی ؒ اپنے فتاویٰ میں لکھتے ہیں کہ اذان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک سن کر انگوٹھے چومنا اور اُن کو آنکھوں پر رکھنا جائز بلکہ مستحب ہے اور اِس کی ہمارے مشائخ نے تصریح فرمائی ہے.

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ انگوٹھے چومنے اور آنکھوں پر لگانے کے متعلق بعض لوگ غیر شرعی عمل ہونے کا فتویٰ دے دیتے ہیں اور بعض روایات کو حدیثِ ضعیف وموضوع کہہ کر انکار کر دیتے ہیں. اِس کا مفصل جواب تو بہت سے علمائے کرام احناف نے اپنی اپنی تصانیف میں دے دیا ہے مگر فقیر کہتا ہے کہ معترضین کے کتنے اعمال ہیں جو وہ صحیح احادیث کی روشنی میں عمل میں لاتے ہیں. تفصیل نہ پوچھیے ورنہ ابھی اسلامی حیثیت معلوم ہو جائے گی. سینما، پریس، انجکشن، سواریاں، بنکوں کا سود، پراویڈنٹ فنڈ، ولایتی حجامت، فیشن دار لباس، پردۂ نسواں، رشوت ستانی، نئی دنیا کے اعمالِ سیاہ، کس کس کو نہ حدیثِ صحیحہ سے

ثابت کرنا پڑے گا. یہ فعل چونکہ نیکی کے میدان سے متعلق ہے. اِس لیے ضعف ووضع کا شور اٹھ رہا ہے. ایک کام کی نسبت ہو پسندیدگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور دور افتادہ مسلم شور مچائے منکرانہ - ہائے افسوس! بات صرف اتنی ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت نہیں. مثل مشہور ہے کہ جس کی طرف سے آنکھ میلی ہو اُس کا ثواب بھی عیب دکھائی دیتا ہے اور جس کی طرف سے آنکھ صاف ہو اس کا عیب بھی ثواب نظر آتا ہے. لطیفہ:

ایک مرتبہ انجمن نعمانیہ لاہور کے سالانہ جلسہ پر علمائے کرام کا کثیر اجتماع ہوا اور اتفاق سے کسی شخص نے یہی مسئلہ دریافت کیا. ایک مولوی صاحب نے جواب دیا کہ کلمۂ شہادت ثانیہ پر انگوٹھے چوم کر آنکھوں پر ملنا مستحب ہے اور ساتھ ہی یہ فائدہ بھی ہے کہ آدمی اندھا نہیں ہوتا اور اُس کی آنکھیں بیمار نہیں ہوتیں. پھر دوسرے مولوی صاحب نے تشریح کی کہ میاں اگر تعظیم و توقیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ عمل کوئی نہ بھی کرے تو اپنی آنکھوں کے فائدے کے لیے ہی کرے. یہ سن کر مفتی محمد اعظم صاحبؒ بہت برہم ہوئے اور فرمانے لگے یہ کون سا ایمان ہے کہ مسلمان ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و محبت پر اپنی آنکھوں کی بینائی یا صحت کو ترجیح دے؟ جب بھی کرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کے لیے کرے. سبحان اللہ کس قدر پاکیزہ جذبۂ ایمانی ہے.

حضرت شیخ علامہ نورالدین خراسانیؒ سے منقول ہے کہ بعض لوگ اُن کو اذان کے وقت جب اُنہوں نے مؤذن کو کلمہ شہادت ثانیہ کہتے ہوئے سنا تو اُنہوں نے اپنے انگوٹھے چومے اور ناخنوں کو اپنی آنکھوں کے کونے سے لگایا اور کنپٹی کے کونے تک پہنچایا. پھر ہر شہادت کے وقت ایک ایک بار کیا. جب اُن سے اِس بارے میں پوچھا گیا تو فرمانے لگے میں پہلے انگوٹھے چوما کرتا تھا پھر میں نے چھوڑ دیئے. پس میری آنکھیں بیمار ہو گئیں. اِسی اثناء میں، میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا کہ تم نے اذان کے وقت انگوٹھے آنکھوں پر لگانے کیوں چھوڑ دیئے؟ اب اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری آنکھیں اچھی ہو جائیں تو پھر انگوٹھے آنکھوں سے لگانا شروع کرو. پس بیدار ہوا اور یہ مسح شروع کیا. جس سے مجھے فوراً صحت ہو گئی اور اِس سے بعد اب تک میری آنکھیں خراب نہیں ہوئیں.

فقیر اِس تمام بحث کا نتیجہ یہ نکالنا چاہتا ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم مبارک پر انگوٹھے چومنا اور آنکھوں پر لگانا مستحب اور حضرت آدمؑ و حضرت حسنؓ اور حضرت سیدنا عمر فاروقؓ اور صدیق اکبرؓ کی سنت ہے اور اکثر فقہا و محدثین اِس عمل کے استحباب پر متفق ہیں اور ہر ملک و زمانہ کے دیندار مسلمان مستحب جانتے اور کرتے چلے آئے ہیں اور سب سے بڑا انعام اِس فعل کے کرنے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنت میں داخل کرانے کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وعدہ ہے. پھر معلوم نہیں ہوتا کہ مسلمان اِس پر انکار کے دلائل کیوں تلاش کرتا رہتا ہے؟ اللہ کریم رحم فرمائے اور ہدایت بخشے.

اربعین
رَحْمَۃِ وَّاسِعَہ

اکثر بزرگانِ دین متقدمین ومتاخرین رحمہم اللہ نے ارشاداتِ نبی الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پھیلانے میں بے شمار اربعین یعنی چالیس احادیثِ مبارکہ کے مجموعے شائع کیے ہیں جن کی غرض وغایت یوں ارشاد فرمائی ہے کہ ہماری مقدس روایات اِس امر کی حامل ہیں کہ حضور سرورِ کائنات، مختارِ شش جہات، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چالیس احادیث جمع کرنا باعثِ فوز وفلاحِ عظیم ہے لہٰذا اِسی خیال کے پیش نظر فقیر بھی ایک مجموعہ اربعین مختصر طور پر عاشقانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتا ہے. جس کی احادیثِ مبارکہ کے ساتھ بخوف طوالت کتاب ہٰذا (میں) اسماء شریفہ راویانِ احادیث کو درج نہیں کرتا. اِس اربعین منیفہ کی حقیقت صرف یہ ہے کہ عوام کو ارشادات رسالت کے سمجھنے اور یاد کرنے میں سہولت کے علاوہ کتاب ہٰذا میں برکت حاصل ہو کیونکہ یہ ساری کی ساری کتاب محبوبِ خدا، محمد مصطفیٰ، احمد مجتبیٰ، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے جمالِ بے پناہ میں لکھی گئی ہے. سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم شرفِ اجابت بخشیں آمین ثم آمین.

☆☆☆☆

۱- ((لَایُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ))

”تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک اپنے بھائی سے وہی الفت نہ رکھے جو اپنے نفس سے رکھتا ہے یا وہی اپنے بھائی کے لیے پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے.“

۲- ((مَنْ اَعْطٰی لِلّٰہِ وَمَنَعَ لِلّٰہِ وَاَحَبَّ لِلّٰہِ وَاَبْغَضَ لِلّٰہِ فَقَدِ اسْتَکْمَلَ اِیْمَانَہٗ))

”جو شخص عطا کرنے اور منع کرنے اور محبت کرنے اور بغض رکھنے میں صرف اللہ تعالیٰ ہی کی رضا

کا خواہش مند ہو وہی ایمان میں کامل ہوتا ہے. یعنی اُس کی عطا و منع اور محبت و کینہ میں کسی غیر خدا کا دخل اور نفس کی خوشنودی مراد نہ ہو.''

۳- ((اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ))

''مسلمان کی تعریف یہی ہے کہ اُس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان سلامت رہیں. یعنی مسلمانوں کو اُس کے ہاتھوں اور زبان سے ایذا نہ پہنچے.''

۴- ((خَصْلَتَانِ لَا يَجْتَمِعَانِ فِيْ مُؤْمِنٍ اَلْبُخْلُ وَسُوْءُ الْخُلُقِ))

''مومن کی سرشت میں بخل اور بداخلاقی دونوں خصلتیں جمع نہیں ہوتیں. یعنی ایمان دار نہ بخیل ہوتا ہے نہ بداخلاق.''

۵- ((يَشِيْبُ ابْنُ اٰدَمَ وَتَشِيْبُ فِيْهِ خَصْلَتَانِ الْحِرْصُ وَطُوْلُ الْاَمَلِ))

''اِبن آدم کی زندگی کا خضاب ہوا و حرص ہوتی ہیں. جن سے بڑھاپے میں جوانی کا رنگ چڑھتا ہے یعنی حرص و آز ہی کا پابند ہو کر انسان ضعیفی میں جوان بنتا ہے.''

۶- ((مَنْ لَّمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَمْ يَشْكُرِ اللّٰهَ))

''جو شخص کسی انسان کے احسان کا منت پذیر نہیں ہو سکتا، وہ اللہ تعالیٰ جلّ وعلاشانہٗ کا بھی شکر گزار نہیں بن سکتا.'' گویا بندے کے احسان کا شکریہ ادا کرنا رب العزت کے شکر گزار بننے کی نشانی ہے.

۷- ((مَنْ لَا يَرْحَمُ النَّاسَ لَا يَرْحَمُهُ اللّٰهُ))

''جو شخص بے کس لوگوں پر رحم نہیں کرتا اُس پر اللہ تعالیٰ بھی رحم و رحمت نہیں فرماتا.'' یعنی اللہ کریم کے رحم کو قریب لانے والی چیز اُس کی نادار مخلوق پر رحم کرنا ہے.

۸- ((اَلدُّنْيَا مَلْعُوْنَةٌ وَمَلْعُوْنٌ مَافِيْهَا اِلَّا ذِكْرَ اللّٰهِ تَعَالٰى))

''دنیا اور جو کچھ اُس میں ہے لعنت کی گئی چیز ہے. مگر وہ جس کا تعلق اللہ کریم جل وعلاشانہٗ کے ذکر سے ہے قابل رحمت ہے.''

۹- ((لُعِنَ عَبْدُ الدِّيْنَارِ وَلُعِنَ عَبْدُ الدِّرْهَمِ))

''درہم و دینار یعنی مال و زر میں گرفتار جس قدر انسان ہیں جن کے دلوں پر درہم و دینار کی ہوس ہی قابض ہو چکی ہے اُن کے لیے لعنت و پھٹکارِ الٰہی ہے.''

۱۰- ((لَيْسَ الشَّدِيْدُ بِالصُّرْعَةِ اِنَّمَا الشَّدِيْدُ الَّذِيْ يَمْلِكُ نَفْسَهٗ عِنْدَ الْغَضَبِ))

''جنگ کی صفوں میں شدید ہونا بہادری نہیں. بلکہ بہادر و شدید وہ شخص ہے جو غصہ کی حالت میں اپنے دیو نفس پر قبضہ پالے. یعنی اپنے نفسِ امارہ پر غصہ کی حالت میں قابو رکھنا جنگ کی صفیں الٹنے سے زیادہ سخت ہے.''

۱۱- ((لَیْسَ الْغِنٰی عَنْ کَثْرَۃِ الْعِرْضِ اِنَّمَا الْغِنٰی عَنِ النَّفْسِ))

''مال وزر رکھنے والا غنی نہیں ہوتا بلکہ غنی وہ شخص ہے جو دل کا غنی ہو. یعنی تونگری دل سے ہوتی ہے. مال سے نہیں ہوتی.''

۱۲- ((اَلْغِنٰی الْیَاسُ مِمَّا فِی اَیْدِی النَّاسِ))

''غنی کی صحیح تعریف یہ ہے کہ دوسروں کے پاس جو کچھ ہے اُس پر جلبِ منفعت کے لیے نظر نہ رکھے یعنی غیر کے مال سے بے نیاز ہونا حقیقت میں غنی ہونا ہے.''

۱۳- ((طُوْبٰی لِمَنْ شَغَلَہٗ، عَیْبُہٗ، عَنْ عُیُوْبِ النَّاسِ))

''وہ شخص مبارک ہے جو اپنے عیبوں پر نگاہ رکھتا ہے اور اُس کی نظریں غیروں کے گناہوں میں نہیں الجھتیں.، یعنی اپنے گناہوں پر دھیان دینا دوسروں کی عیب چینی سے بہتر ہے.''

۱۴- ((دُمْ عَلَی الطَّھَارَۃِ یُوْسَعُ عَلَیْکَ الرِّزْقُ))

''طہارت پر ہمیشگی کرنا روزی میں کشائش پیدا کرتا ہے. گویا جو شخص ہمیشہ پاک وصاف اور باوضو رہنا اپنی عادت بنا لے اُس کو رزق کی تنگی نہیں ہوتی.''

۱۵- ((لَایُلْدَغُ الْمُؤْمِنُ مِنْ جُحْرٍ وَّاحِدٍ مَّرَّتَیْنِ))

''مومن ایک سوراخ سے دوبارہ نہیں ڈسا جاتا. یعنی ایک مرتبہ دھوکا کھا کر پھر داؤ کھانا مومن کا شیوہ نہیں. ایک بار جس سوراخ سے کوئی موذی جانور کاٹ کھائے دوبارہ اُس پر انگلی رکھنا عقل کی دلیل نہیں ہوتی.''

۱۶- ((اَلْوَعْدَۃُ دَیْنٌ))

''کسی سے وعدہ کر کے وفا کرنا لازم ہے کیونکہ یہ ایک دین کا جز ہے. یعنی وعدہ جب کیا جائے تو وہ ایک قرض ہو جاتا ہے. جس کی ادائیگی فرض ہے.''

۱۷- ((اَلْمَجَالِسُ بِالْاَمَانَۃِ))

''کسی محفل میں بیٹھنا اُس کی پوشیدہ گفتگو کا راز دار ہونا ہے اور راز ایک امانت ہوتا ہے. جس کے اہل مجلس حامل ہوتے ہیں. یعنی جو شخص مجلس کے بھید کو محفوظ نہیں رکھتا وہ امانت دار نہیں رہتا.''

۱۸- ((نَوْمُ الصُّبْحَۃِ تَمْنَعُ الرِّزْقَ))

''چڑھے دن تک فجر کے بعد سوئے رہنا رزق کے لیے مانع ہوتا ہے یعنی ایسے شخص کو جو صبح کے بعد بستر پر خراٹے لیتا ہو، اُس کے لیے روزی تنگ ہو جاتی ہے.''

۱۹- ((اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ))

''کسی مشورہ میں کسی کا مشورہ کا رہونا اُس کا راز دار بننا ہوتا ہے. یعنی مشیر کو مشورہ لینے والے کے

راز کا امانت دار ہونا چاہیے۔ یہ دین کے مسائل میں ایک مصلحت ہے۔''

۲۰- ((اَلسِّمَاحُ رَبَاحٌ))

''یقینی نفع والی تجارت، سخاوت ہے۔ یعنی خدا کی راہ میں دینا اکارت نہیں جاتا اُس میں نفع ہی نفع ہوتا ہے۔''

۲۱- ((اَلدَّیْنُ شَیْنُ الدِّیْنِ))

''قرض دین کا پھندا اور مقراضِ محبت ہے۔ لہٰذا مسلمان اور مومن کو قرض کی پھانسی گلے میں نہیں ڈالنی چاہیے۔''

۲۲- ((اَلْقَنَاعَةُ مَالٌ لَایَنْفَدُ))

''قناعت وہ مال ہے جو گھٹائے سے بھی نہیں گھٹتا۔ یعنی قناعت کو ہر لحظہ بڑھاؤ ہی بڑھاؤ متصور ہوتا ہے۔''

۲۳- ((اٰفَةُ السِّمَاحِ الْمَنُّ))

''سخاوت کے لیے سب سے بڑی نقصان دہ چیز سخاوت کرنے کے بعد احسان جتانا ہے۔ گویا سخاوت پر احسان جتانا اُس کو باطل کر دیتا ہے۔ داناؤں نے کہا ہے سخاوت کا سُود احسان جتانا ہے جو حرام ہے۔''

۲۴- ((اَلسَّعِیْدُ مَنْ وُّعِظَ بِغَیْرِہٖ))

''سعادت کو وہ پا سکتا ہے۔ جس کو دوسروں کے حال سے عبرت حاصل ہو اور بدوں کی برائی سے نیکی کا سبق اخذ کرے۔ یعنی غیروں کے حال سے نصیحت پکڑنا خدا کے نزدیک سعید بنتا ہے۔''

۲۵- ((کَفٰی بِالْمَرْءِ اِثْمًا اَنْ یُّحَدِّثَ بِکُلِّ مَاسَمِعَ))

''زبان کا بہت بڑا گناہ یہ ہے کہ کان کی ہر سُنی ہوئی بات کو بیان کر دے۔ یعنی زبان کو کان کا پردہ دار ہونا چاہیے، اگر ایسا نہ ہو تو یہ انسان کی ایک بڑی لغزش ہے۔''

۲۶- ((کَفٰی بِالْمَوْتِ وَاعِظًا))

''موت بہترین واعظ ہے اور واعظ اِس سے بڑھ کر نکتہ آموزی کیا کریں گے۔ موت سے عبرت پکڑنی چاہیے۔''

۲۷- ((خَیْرُ النَّاسِ اَنْفَعُھُمْ لِلنَّاسِ))

''بہترین لوگوں میں وہ بندہ ہے جس کی ذات سے لوگوں کو بہترین نفع پہنچے۔ یعنی جس انسان سے دوسرے انسانوں کو نفع پہنچے وہ نہایت بلند شخصیت ہے۔''

۲۸- ((اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ السَّھْلَ الطَّلْقَ))

''تحقیق اللہ تعالیٰ خوش خُو اور خندہ پیشانی شخص کو دوست رکھتا ہے۔ یعنی وہ انسان اللہ تعالیٰ کو زیادہ

پسند ہے جو شگفتہ فطرت اور کشادہ ابرو، ہنس مکھ ہو۔"

۲۹- ((تَهَادَوْا تَحَابُّوا))

"ہدیہ اور سوغات سے محبت بڑھاؤ یعنی تحائف و ہدیہ سے محبت بڑھتی ہے۔"

۳۰- ((اُطْلُبُوا الْخَيْرَ عِنْدَ حِسَانِ الْوُجُوهِ))

"اچھی صورت اور اچھے چہرے والوں سے سوال کرو اور حاجت مانگو۔ کیونکہ جس کا حال اچھا ہے اُس کا قال بھی اچھا ہے۔ اُس سے ترش روئی کی امید نہیں ہوتی۔"

۳۱- ((زُرْ غِبًّا تَزْدَدْ حُبًّا))

"کچھ کچھ دنوں کے فاصلے پر آپس میں ملاقات کرو اور محبت سے ملتے رہو۔ گویا متواتر ہر روز صبح و شام کا ملنا محبت والفت کو گھٹاتا ہے۔"

۳۲- ((مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَالَا يَعْنِيهِ))

"اسلام کی خوبی کا راز اس سے عیاں ہو جاتا ہے کہ بے ضرورت اور لایعنی حصص اعمال و خصائل کو چھوڑ دیا جائے یعنی مذہب بے ضرورت باتوں کو پسند نہیں کرتا۔"

۳۳- ((اَلْحَزْمُ سُوْءُ الظَّنِّ))

"محتاط ہونے کی نشانی یہی ہے کہ انسان اعمال کے لحاظ سے اپنے نفس پر ہمیشہ بدگمان رہے اور اس کی پاک بازی کا فریب نہ کھائے۔"

۳۴- ((اَلْعِلْمُ لَا يَحِلُّ عَنْهُ صَدٌّ))

"علم وہ چیز ہے کہ اُس سے روکنا کسی حال میں بھی جائز نہیں۔ اِس سے انسان کو فائز ہونا چاہیے۔"

۳۵- ((اَلْكَلِمَةُ الطَّيِّبَةُ لِلسَّائِلِ صَدَقَةٌ))

"پاکیزہ بات اور نرمی کا جواب سائل کے لیے صدقہ ہی ہے۔ اگر جیب خالی ہو تو میٹھی بات خیرات کا نعم البدل ہے۔"

۳۶- ((كَثْرَةُ الضَّحِكِ تُمِيتُ الْقَلْبَ))

"بہت ہنسنا دل کو مردہ کر دیتا ہے۔ ہر کام اعتدال پر ہونا چاہیے۔ یعنی اتنا ہنسو کہ طبیعت مُنغّص مذاق، افسردہ نہ ہو جائے۔"

۳۷- ((اَلْجَنَّةُ تَحْتَ اَقْدَامِ الْاُمَّهَاتِ))

"جنت ماؤں کے پاؤں کے نیچے ہے۔ یعنی جو شخص جنت کا طلب گار ہو اُس کو ماں کی خدمت کرنی چاہیے۔"

۳۸- ((اَلْبَلَاءُ مُوَكَّلٌ بِالْمَنْطِقِ))

''زبان ایک وہ شئے ہے جس کے بے قابو ہونے سے انسان مصائب و آلام میں گھر جاتا ہے. یعنی منہ سے بُری بات نکلی ہوئی آدمی کو وطن سے نکال دیتی ہے۔''

۳۹- ((اَلنَّظْرَةُ سَهْمٌ مَسْمُوْمٌ مِنْ سِهَامِ اِبْلِيْسَ))

''غیر شرعی طور پر نامحرم کو دیکھنا شیطان کے زہر آلود تیروں سے ایک تیر ہے. گویا تیرِ نظر کو جائز طور پر استعمال کرو. ناجائز دیکھنا حرام ہے۔''

۴۰- ((لَايَشْبَعُ الْمُؤْمِنُ دُوْنَ جَارِهٖ))

''مومن کے لیے اِس میں اسلامی خُو کا شائبہ بھی نہیں ہوگا کہ وہ پیٹ بھر کر کھائے اور اُس کا ہمسایہ بھوکا ہو. گویا ہمسایہ کی خبر گیری مومن پر واجب و لازم ہے۔''

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی اِحْسَانِهٖ وَمَنِّهٖ وَحُسْنِ تَوْفِيْقِهٖ وَ

صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰی حَبِيْبِهٖ وَنُوْرِ عَرْشِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ

وَاِتِّبَاعِهٖ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ

آمین

اشاریہ

آیاتِ قرآنی

احادیثِ نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم

ابیات ومصراع ہائے فارسی، عربی اور اردو

یا صاحب الجمال و یا سید البشر
من وجہک المنیر لقد نور القمر
لایمکن الثنا کما کان حقہٗ
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

۱۰

بلغ العلی بکمالہ
کشف الدجی بجمالہ
حسنت جمیع خصالہ
صلو علیہ و آلہ

۱۲

اے حبیبِ کبریا اے منبعِ جُود و صفات
باعثِ تکوینِ عالم مرکزِ کل کائنات
ہو گیا پیدا تیری خاطر نظامِ ہست و بود
بارگاہِ حق میں ہے مقبول کتنی تیری ذات
تو نہیں، کچھ بھی نہیں، تو ہے تو سب موجود ہے
تیرے ہی دم سے ہوا قائم وجودِ شش جہات
کیوں نہ ہم سمجھیں محبت کو تری، ایمانِ اصل
جب اسی اک بات پر موقوف ہے اپنی نجات
جس کے منہ میں پڑ گیا اک مرتبہ تیرا لعاب
اُس نے ٹکرے کر دیا پیمانۂ آب حیات
تو نے فرمایا ھُوَ اللہُ اَحد دُنیا میں جب
سر بسجدہ تیرے قدموں میں گرے لات و منات
ریزہ چیں تیری بساطِ حسن کے شمس و قمر
اے مجسّم نورِ حق!، اے مشعلِ کُل کائنات!
عاصیوں کو ناز ہو کیوں کر نہ تیری ذات پر
مانی جائے گی تری، محشر کے دن ہر ایک بات

تیرے نورِ پاک سے ضو ریز مہر و ماہ ہوئے
تیرے حسنِ لم یزل کی اس طرح نکلی زکات
مرجعِ خلقِ خدا ہے تیری ذات باصفا
ہو ریاضِ دل حزیں پر بھی نگاہِ التفات

۱۳-۱۴

خدا کو مانا ہے دیکھ کر تجھ کو، اُس کی شانِ جمیل تُو ہے
خدا کی ہستی پہ میرے نزدیک، سب سے روشن دلیل تو ہے

۱۵

دو عالم تجھ پہ صدقے اے زمینِ گنبدِ خضرا
تری آغوش میں آسودہ ہے وہ برزخِ کبریٰ
وہ جس کی ذاتِ والا اک نویدِ رحمتِ عالم
وہ جس کا روئے زیبا شمعِ ظلمت خانۂ دنیا
وہ جس کا نُطق شیریں، نغمۂ الہامِ ربّانی
وہ جس کا خُلق نوشیں، شہد سے بڑھ کر حلاوت زا
وہ جس کی ہستیِ اقدس، سراپا معنیِ قرآن
وہ جس کا ہر نفس، وقفِ پیامِ ملتِ بیضا
وہ جس کے درگہِ سامی کا جبریلِ امیں چاکر
وہ جس کے عتبۂ عالی پہ قدسی، ناصیہ فرسا
وہ جس کے آستاں پہ رفعتِ عرشِ بریں صدقے
وہ جس کے بوستاں میں نغمہ پیرا بلبلِ طوبےٰ
وہ جس کے عالمِ جاں میں نوائے قدس برق افشاں
وہ جس کے ذوقِ ایماں میں پیامِ شوق، شور افزا
وہ جس کے قدسیان پاک گوہر، دید کے طالب
وہ جس کے نوریانِ عرشِ اعظم، والا و شیدا
وہ جس کی مدحتِ خوبی میں ہے رطب اللساں قرآں
وہ جس کی شانِ محبوبی ہے سُبحٰن الذی اسریٰ

وہ جس کے خم کدہ کے، حضرتِ فاروق صہبائی
وہ جس کے گل کدہ کے حضرتِ صدیق، اک طوبیٰ
وہ سرشارِ مئے باقی، تصدق جس پہ مے خانہ
وہ ساقی، جس کے دم سے ضوفشاں خمخانۂ بطحا!
وہ جس کے بادہ نوشوں میں، بلالؓ و بوذرؓ و سلمانؓ
وہ جس کے سرفروشوں میں ابنِ زیدؓ و سیدالشہداؓ
وہ جس کی موجِ مے میں جلوہ پیرا برقِ سینائی
وہ جس کا تا ابد باقی خمارِ نشۂ صہبا!
وہ جس کا نقشِ پا سجدہ گہِ مہر و مہِ کامل
وہ جس کا داغِ سیما مطلعِ نورِ سحر گویا
وہ جس کی برقِ ایماں بیقرارِ جلوۂ ایمن
وہ جس کا ذوقِ عرفاں، زندہ دارِ خلوتِ شبہا
وہ جس کے بوریا پر سطوتِ تختِ شہی قرباں
وہ جس کے فقر سے لرزاں، شکوہِ قیصر و کسریٰ
محمدؐ وہ، کمالِ آخرینِ محفلِ عالم
محمدؐ وہ، جمالِ اوّلینِ شاہدِ معنیٰ!
محمدؐ وہ، نسیمِ نوبہارِ گلشنِ ہستی
محمدؐ وہ، شمیمِ مشک بارِ جنت الماویٰ
محمدؐ وہ، شبستانِ ازل کی شمعِ نورانی
محمدؐ وہ، زِ سرتاپا جمالِ جلوۂ سینا
محمدؐ وہ، دُرِ تاجِ الرسل، وہ خاتم المُرسلِ
محمد وہ، ظہورِ نورِ کُل، وہ جلوۂ یکتا
محمدؐ وہ، گروہِ اولیاء کے سیّدِ والا
محمدؐ وہ، کلاہِ انبیاء کے طرۂ زیبا
محمدؐ وہ، نبوت کے شرف کے مبداءُ و خاتم
محمدؐ وہ، رسالت کی صدف کے لولوئے لالا
محمدؐ وہ، شہنشاہِ دو عالم، سرورِ انجم
محمدؐ وہ، مہِ دوہفتۂ یثرب، شہِ بطحا!
محمدؐ وہ، نویدِ لطفِ عام و رحمتِ عالم
محمدؐ وہ، پیامِ نو بہارِ گلشنِ دنیا

محمدؐ وہ، سحابِ رشحہ بارِ مزرعِ گیتی
محمدؐ وہ، شبابِ روزگارِ ملتِ بیضا
محمدؐ وہ، بہارِ تازۂ باغِ براہیمی
محمدؐ وہ، چمن پیرائے باغِ ملتِ آباء
وہ خورشیدِ ضیاء بارِ عرب جس کی تجلّی سے
عرب کا ذرّہ ذرّہ آسمانِ قدس کا تارا
وہ رشکِ مہرِ عالمتاب جس کی جلوہ ریزی سے
شبستانِ جہاں میں پھر ہوا نورِ سحر پیدا
ہوا پھر مطلعِ انوارِ ظلمت خانۂ عالم
سرِ فاراں جو ماہِ ضوفشانِ مصطفےٰ چمکا
سیاہی ہو گئی کافور یکسر شامِ ظلمت کی
صبا لائی پیامِ نور پھر صبحِ سعادت کا
نئے اندازِ بیداری سے کروٹ لی زمانے نے
خمارِ خوابِ نوشیں سے یکا یک جاگ اُٹھی دنیا
جہاں کے گلشنِ پژمردہ میں تازہ بہار آئی
رگِ افسردۂ ہستی میں خونِ زندگی دوڑا
دلِ بے نور میں رخشاں ہوئی پھر شمعِ ایمانی
یہ خاکستر ہوئی پھر سوزِ ایماں سے شرر افزا
نگاہِ معرفت پیدا ہوئی پھر دیدۂ دل میں
عطا ہر کور باطن کو ہوئے پھر دیدۂ بینا
عرب کی وادیاں تکبیر کے نعروں سے گونج اٹھیں
ہوا عالم میں آوازہ بلند، ''اللہ اکبر'' کا!
زبانِ کفر، وقفِ کلمۂ حق ہو گئی یکسر
زمیں سے آسماں تک غلغلہ توحید کا اٹھا
فضائے کفر و باطل ہو گئی پر شور شیون سے
نوائے اہلِ دل سے ہو گئی معمور پھر دنیا
جھکا دیں گردنیں اربابِ طغیانِ تمرّد نے
ہوئے نام آورانِ کفر، اک اک بندۂ مولا
ہر اک کافر بڑھا لبیک کہہ کر دعوتِ حق پر
ہر اک منکر نے مضبوطی سے پیمانِ وفا باندھا

فدایانِ محمدؐ بن گئے، جو دشمنِ جاں تھے
تہ ءِ تیغِ محبت ہو گئی یکسر، صفِ اعدا
کہیں لطف و محبت تھی، کہیں تہدید و شدت تھی
کہیں شانِ جمالی تھی، کہیں فرِّ جلالی تھا
جہاں کے گوشہ گوشہ میں صدائے دینِ حق پہنچی
لوائے حق پرستی مشرق و مغرب میں لہرایا
دیا علم و عمل سے درسِ آئینِ جہانبانی
پڑھایا پھر سبق دنیا کو تدبیر و سیاست کا
"شتربانی" بھی کرتے تھے، "جہانبانی" بھی ہوتی تھی
ابھی وہ بینوا تھے، اور ابھی تھے وہ جہاں آراء
ہوا سکہ رواں عدل و مساوات و اخوت کا
ہوئی پھر از سرِ نو مجلسِ صدق و صفا برپا

فضائل سے ہوئی آراستہ پھر بزمِ انسانی
محاسن کا بنی گہوارہ پھر، یہ فسق کی دنیا
دلوں کی خشک کھیتی لہلہائی جوشِ باراں سے
سدا بُستانِ جاں میں چشمہ پھوٹا، نورِ عرفاں کا
شرف بخشا گیا انسانیت کو پھر سعادت کا
بلند اِس دور میں پایہ ہوا، پھر آدمیت کا
مٹی ظلمت سرائے دہر سے لعنت غلامی کی
زمانہ سے اٹھی، رسمِ تمیزِ بندۂ و آقا
جسے دیکھو وہ اب سرشارِ صہبائے اخوت ہے
جسے دیکھو وہ اب ہے بادۂ وحدت کا متوالا
ہوا ختم آہ وہ دورِ شرابِ مجلسِ دوشیں
نہ وہ ساقی ہے اب باقی، نہ وہ خمخانۂ بطحا!
کہاں وہ عہد سرشاری، کہاں یہ دورِ محرومی
کہاں کیفِ مئے عرفاں، کہاں رنجِ خمار افزا
وہی مینا ہے اب بھی، پر نہیں وہ بادۂ رنگیں
وہی صہبا ہے اب بھی، پر نہیں وہ شورشِ صہبا
کرے گو دورِ گردوں لاکھ اپنی سعیٔ امکانی
پلٹ کر پھر کبھی وہ عہدِ اقدس آ نہیں سکتا
نہ دیکھی ہوگی چشمِ آسماں نے بزمِ قدس ایسی
سنے ہوں گے نہ عالم نے یہ نغماتِ طرب افزا
نہ پائے گا زمانہ پھر کبھی، مجد و شرف ایسا
نہ ایسی پھر سعادت دیکھے گی، یہ دیدۂ دنیا
مظاہر تھے یہ سارے رحمت اللعالمینی کے
کرشمے تھے یہ سب، بس آپ کی لطف آفرینی کے

۱۹-۴۴

ادب گاہیست زیرِ آسمان از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ اینجا!

۳۱-۴۵

جو اُس کے جلووں سے ہو منور، اُس آئینے میں نہ بال آئے
مٹے خیالِ گناہ دل سے، جو دل میں اُس کا خیال آئے!

۵۹

"بریں عقل و دانش بباید گریست." ۹۳

راخ سینت بھو پریت دکھائے
آپن مت سب کا سمجھائے
تم اگم سوئی چتّ او پارا
پتی ابا اونمت مجھارا
تب لگ سلازم چھے کوئی
بنا محمد پار نہ ہوئی
ماہر سلازم نمان نہینہ ہوئے
تلسی بچن ست مت کوئے

۹۷

کاشی پربت یادھن تیرتھ سبھی ناکام
بیکنٹھ باس نہ پائی بناں محمد (ﷺ) نام

۱۰۰

پاک پڑھیو کلمہ ربّ دا محمدؐ نال ملائے
او معشوق خدائیدا ہویا مُثل الائے

۱۰۰

یہاں نہ کچھ بات میں راکھوں
بید پران ست مت بھاکھوں
برکھس دس سندام ہوئی
پتہ کی بات نہ پائے کوئی
دیس عرب پھر کتھا سہائی
سوتھل بھوئیں گت سنو کھک رائی
سنبھو سمت تاکر ہوئے
سندام اویس تھتھ سھوئی
سمت بکرم کی دو وانگا
مہا کوک تس چھیتر سانگا
راج پنٹ بھو پریت دکھاوے
ابن مت سب کو سمجھاوے
تب لگ جے سندام چہ کوئی
بنا محمد ﷺ پار نہ ہوئی!
۱۰۰

توریت زبور انجیل ترے سن ڈھٹے وید
رہے قرآن کتاب کل جگ میں پروار
۱۰۱

جگ میں مورکھ بندہ کیا بوجھے
اندھے کو دیپک کیا سوجھے
بن احمد کچھوے بھید نہ پائیو
مورکھ اندھا گنوار کہلائیو
الف احد سے احمد بھیو
ایسا بھید کچھو نہ لئیو!
احمد بھیو احد کے رنگا
جیسی جوت چاند سنگا
۱۰۱

اول آدم مہیش ہوئے دوجا برہما ہوئے
تیجا آدم مہادیو محمد ﷺ کہے سب کوئے!
۱۰۱

سمجھ کر پاؤں رکھنا میکدہ میں خادمِ مرزا
یہاں پگڑی اُچھلتی ہے اِسے میخانہ کہتے ہیں
۱۱۴

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است ۱۱۵

وائے آرزو کہ خاک شدہ ۱۱۷

پس خدا بر ما شریعت ختم کرد
بر رسولِ ما رسالت ختم کرد
رونقِ از ما محفلِ ایام را
او رُسل را ختم و ما اقوام را
خدمتِ ساقی گری برما گذاشت
داد ما را آخرین جامے کہ داشت
"لانبی بعدی" زاحسانِ خدا ست
پردۂ ناموسِ دینِ مصطفےٰ است
قوم را سرمایۂ قوت ازو
حفظ سرِّ وحدتِ ملت ازو
حق تعالےٰ نقشِ ہر دعویٰ شکست
تا ابد اسلام را شیرازہ بست
۱۲۱

نرفت "لا" بزبانِ مبارکش ہرگز
مگر در "اشہد ان لا الہ الا اللہ" ۱۲۹

"شکوہ بیجا بھی کرے کوئی تو لازم ہے شعور"
۱۳۱

عبد دیگر عبدہٗ چیزے دگر
او سراپا انتظار ایں منتظر
۱۴۳

اے ہزاراں جبرائیل اندر بشر
بہرحق سوئے غریباں یک نظر! ۱۴۳

آنکھوں میں ہیں وہ مثلِ نظر، اور دل میں ہیں جیسے جسم میں جاں
ہیں مجھ میں و لیکن مجھ سے نہاں، کس شان کی جلوہ نمائی ہے
۱۴۵

واللہ وہ سُن لیں گے فریاد کو پہنچیں گے
ارے اتنا بھی تو ہو کوئی، جو آہ کرے دل سے

۱۴۵

مٹ گئے، مٹتے ہیں، مٹ جائیں گے اعدا تیرے
نہ مٹا ہے، نہ مٹے گا، کبھی چرچا تیرا

۱۶۷

زنجیر بھی ہلتی رہی، بستر بھی رہا گرم
ایک دم میں سرِعرش گئے، آئے محمد (ﷺ)

۱۸۲

رسائی نہیں عالمِ ھُو میں اُس کی
گزر خاک پر ہے نظر خاک پر ہے
یہ باعث ہے الفت کا اس خاک داں کی
کہ وہ عالمِ پاک سے بے خبر ہے

۱۸۸

بریں عقل و دانش بباید گریست!

۲۸۴،۲۰۸

وہ اندھے ہیں جو ہیں منکر نبی کی غیب دانی کے
اندھیرے میں ہیں اب تک شمعِ کافوری کے پروانے

۲۱۳

در عشقِ زلفِ لیلیٰ بند و کارِ عشقِ مجنوں کُن!
کہ طالب را زیاں دارد مقالاتِ خرد مندی

۲۹۱

از مکافاتِ عمل غافل مشو
گندم از گندم بروید جو ز جو!

۲۹۹

اُنہیں لے دے کے ساری داستاں سے یاد ہے اتنا
کہ عالمگیر ہندو کُش تھا، ظالم تھا، ستمگر تھا

۳۰۱

رنگی کو نارنگی کہیں، اور کڑ ہے دودھ کو کھویا
چلتی کو گاڑی کہیں دیکھ کبیرا رویا

۳۰۵

گر نہ بیند بروز شپرّہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

۳۱۴

ادیمِ طائفی نعلینِ پا کُن
شراکِ رشتۂ جانہائے ما کُن

۳۱۵

۳۱۷ ببین تفاوت راہ از کجاست تابہ کجا

نمے دانم حدیثِ نامہ چونست
ہمے بینم کہ عنوانش بخون است

۳۳۸

اسمائے گرامی حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کتب ورسائل

اشخاص وطوائف

اشاریہ

مختصر احوال و آثار قدوۃ السالکین

حضرت سید ابوالفیض قلندر علی سہروردی رحمۃ اللہ علیہ

از: سیّد اویس علی سہروردی

قدوۃ السالکین شیخ الاسلام حضرت سید ابوالفیض قلندر علی سہروردی رحمۃ اللہ علیہ کا شجرہ نسب ۲۴ واسطوں سے قطب ربانی، غوث صمدانی حضرت شیخ سیّد ابو محمد عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ (م ۵۶۱ھ) سے اور سلسلہ بیعت ۱۹ واسطوں سے حجت الفقر و فخری شیخ الشیوخ حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردی رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے۔

ولادت

آپ کی ولادت بروز پیر ۱۸ نومبر ۱۸۹۵ء بمطابق ۳۰ جمادی الاوّل ۱۳۱۳ھ کوٹلی لوہاراں شرقی ضلع سیالکوٹ میں ہوئی۔ آپ کا خاندان علمی لحاظ سے علاقے میں جانا پہچانا تھا۔ آپ کے والدِ گرامی حضرت مولانا حافظ قاضی سیّد رسول بخش (م ۱۹۰۳ء) مفتی اور حافظ قرآن تھے۔ اِس لیے علم و فضل آپ کو ورثہ میں ملا۔

سلسلہ نسب

قدوۃ السالکین حضرت سیّد قلندر علی سہروردی بن حافظ قاضی سیّد رسول بخش قادری بن قاضی سیّد محمد جمال الدین قادری بن حضرت سیّد مولوی کرم الٰہی کوٹلوی بن حضرت سیّد غلام مصطفیٰ بن حضرت سیّد سلطان محمد (مدفون کوٹلی لوہاراں شرقی) بن حضرت سیّد مفتی خدا بخش (یہ پہلے بزرگ تھے جو چک قاضیاں سے کوٹلی منتقل ہوئے) بن حضرت سیّد محمد مقیم بن حضرت سیّد نعمت اللہ بن حضرت سیّد عطا اللہ بن حضرت سیّد محمد حفیظ شاہ بن حضرت سیّد لقمان شاہ بن حضرت سیّد محمد موسیٰ قادری بن حضرت سیّد ابوالفتح فیروز الدین قادری بن

حضرت سیّد ابوالحسن علی قاری شاہ بدیع الدین معروف بہ آغا شہید بن حضرت سیّد محی الدین ثالث بن حضرت سیّد علی بن حضرت سیّد عباس میر مسعود بن حضرت سیّد محمد ضو عرف شمس الدین بن حضرت سیّد ابوالفضل احمد ضو بن حضرت سیّد ابو محمد عبداللہ محی الدین ثانی بن حضرت سیّد ابو نصر محمد صالح قادری الرزاقی بن حضرت سیّد ابو بکر عبدالرزاق قدس سرہٗ بن حضرت غوث الثقلین سیّد ابو محمد محی الدین عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ العزیز.

مختصر خاندانی حالات

خاندان ساداتِ گیلانیہ کی جس شاخ سے ہمارے شیخ کا تعلق ہے اُس کے سب سے پہلے بزرگ جو ہندوستان تشریف لائے وہ مغل شہنشاہ ہمایوں کے دوسرے دور ۱۵۵۵ء میں اُسی کے ساتھ ہند میں وارد ہوئے. اُن کا اسم گرامی سیّد بدیع الدین قادری ہے. آپ کے والد گرامی سیّد محی الدین قادری اور دادا سید علی قادری پشت در پشت سے حضور غوث الثقلین شیخ محی الدین عبدالقادر گیلانی قدس سرہٗ کی خانقاہ کے متولی تھے. ہمایوں بادشاہ جلاوطنی کے پندرہ سالہ دور میں آپ کے دادا سیّد علی قادری سے ملا اور درخواست کی کہ اپنے خاندان میں سے کسی فرد کو میرے ساتھ روانہ فرمایئے تاکہ اُس کی خیر و برکت سے مجھے نصرت حاصل ہو. شیخ نے اپنے جوان سال پوتے بہ عمر ۳۳ سال، سیّد بدیع الدین قادری کو اُس کے ساتھ روانہ کیا. بعدازاں چونکہ آپ شہید ہوئے اور براستہ ایران آنے کی وجہ سے آغا کہلائے اِس لیے مقامی لوگ جناب کو آغا شہید کے اسم گرامی سے پکارتے ہیں. شہنشاہ ہمایوں جب دوبارہ ہندوستان کا بادشاہ بنا تو اُس نے مذہبی امور، اوقاف اور عدل وانصاف کے ضمن میں آپ سے بھرپور مدد لی. ہمایوں کی وفات کے وقت آپ اُس کے بیٹے اکبر کے ساتھ کشمیر اور پنجاب کی سرحد (قرب گورداسپور) پر سرحدی راجاؤں اور ملہی جاٹوں سے نبرد آزما تھے. آج یہ علاقہ پاکستان کا حصہ اور نارووال کی تحصیل شکر گڑھ کے تھانہ شاہ غریب کا علاقہ ہے.

ہمایوں کی اچانک وفات کے بعد اکبر خود تو اپنے اتالیق بیرم جان کے ہمراہ دہلی روانہ ہو گیا اور جاتے ہوئے فوج کا کچھ حصہ سیّد ابوالحسن آغا بدیع الدین کی قیادت میں وہیں چھوڑ گیا. کلانور پہنچ کر اُس کی رسم تاج پوشی کی ادا کی گئی. بقول بوٹے شاہ مولف تاریخ پنجاب، ہمایوں نامہ و دیگر کتب تاریخ مقامی ہندو راجاؤں اور ملہی جاٹوں نے جو بغاوت اختیار کر رکھی تھی کچھ عرصہ تو فرد رہی مگر وقت کے ساتھ ساتھ پھر سر اُٹھانے لگی حتٰکہ شاہی فوج کے لیے خوراک اور جانوروں کے لیے چارہ حاصل کرنا بھی دشوار

ہوگیا، چنانچہ شیخ بدیع الدینؒ نے بڑی محتاط مدافعانہ جنگ کا آغاز کیا تاکہ خوراک اور چارہ حاصل کیا جاسکے۔ یہ جنگ تھانہ شاہ غریب کے ایک گاؤں گھونہ اور سہاری کے درمیان لڑی گئی۔ ایک موقع پر آپ تن تنہا دشمنوں میں گھر گئے، ایک وار سے آپ کا سر تن سے جدا ہوگیا مگر دھڑ لڑتا رہا، ملحد یہ دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے، کوئی دو میل دور جا کر ملحدوں کے سردار نے تلوار میان میں رکھ لی کہ اِس کرامت کا جواب اُس کے پاس نہیں تھا۔ جونہی تلوار میان میں گئی دھڑ بھی وہیں گر گیا، یہیں (موضع گھونہ) میں آپ کے دھڑ کو دفن کر دیا گیا جبکہ سرِ مبارک موضع سہاری میں مدفون ہے۔ مقامی لوگ آپ کے گھوڑے کا مدفن موضع ببرال فتوال میں بتاتے ہیں جسے شادی شہید بھی کہا جاتا ہے۔ (دیکھئے نقشے صفحہ ۹۷-۳۹۶)

شہنشاہ اکبر نے بغاوتوں کا سدباب کر لیا تو سیّد آغا شہید کی دین داری، عمدہ خدمات اور جانفشانی کے اعتراف میں اُن کے فرزند ارجمند سیّد ابوالفتح فیروز الدین قادری کو ابوالمکارم کا خطاب دے کر پرگنہ مینگری کا قاضی مقرر کیا اور تمام علاقہ بطور جاگیر حوالے کیا۔ ۹۸۳/ ۱۵۷۵ھ میں سیّد ابوالفتح فیروز الدین نے اپنے والد کے مربی سے محبت کے ثبوت میں اپنی جاگیر میں اکبر پور نام کا ایک گاؤں آباد کیا۔ مغلوں کے سارے دور میں اِس خاندان کے کئی افراد کو اُن کے علم و فضل اور دینداری کی وجہ سے مختلف علاقوں میں قاضی مقرر کیا گیا اور یہ خاندان، خاندانِ قاضیاں کے نام سے مشہور ہوگیا۔ انگریز دور میں بندوبست دوامی کی آڑ میں مسلمانوں کو اُن کی زمینوں سے محروم کر دیا گیا اور جب پنجاب میں سکھوں کی حکومت قائم ہوئی تو اُنہوں نے اکبر پور کو خوب لوٹا بلکہ برباد کر دیا کیونکہ اس قصبہ کے مکینوں نے بندہ بیراگی کی گرفتاری میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ سکھوں نے نہ صرف اس گاؤں کو برباد کیا بلکہ اس کا نام بھی تبدیل کر کے ''چک قاضیاں'' رکھ دیا۔ قصبے میں بنے عدالت گھر، جامع مسجد اور گھروں کی تمام اینٹوں کو اکھاڑ کر موضع ربیہ تحصیل شکر گڑھ میں ایک قلعہ تعمیر کروا دیا۔

سیّد ابوالفتح فیروز الدین قادری اپنے والد آغا شہید کی عزت و ناموس اور زہد و تقویٰ کی منزلت کو آگے بڑھانے میں کوشاں رہے حتّٰی کہ وقت نے کروٹ لی اور بزرگی کے اِس نشان نے اگلی نسل کو علم و فضل کی امانت سپرد کر کے خود عدم کی راہ لی۔ آپ کے وصال کے بعد اُن کے فرزند ارجمند سیّد موسیٰ قادری نے اپنے آباء کی فضیلت کو چار چاند لگا دیئے۔ آپ اپنے زمانے کی عجوبہ روزگار شخصیت کے طور پر جانے اور پہچانے جاتے تھے۔ آپ نے عبادات میں انہماک اور علمی مشاغل کی وجہ سے حکومتی معاملات سے اپنے آپ کو تقریباً الگ کر لیا تھا۔ درس و تدریس میں ایسا انہماک ہوتا کہ آس پاس کا خیال نہ رہتا۔ ایک بار شہنشاہ اکبر کے ایک امیر نے جو علاقے کے احوال کے لیے مقرر تھا آپ کے درس میں داخل ہوا،

آپ بڑے انہماک سے اُس وقت شرح موافقات للشاطبی جو اصول فقہ کی مشہور اور دقیق کتاب ہے کا درس دے رہے تھے. ایک فقی مسئلہ جس کی دلیل اُس امیر کو عرصہ سے کہیں نہیں مل رہی تھی، سیّد والا صفات نے بیان فرمادی. بعداز درس وہ امیر آپ سے بڑی عقیدت واحترام سے ملا اور کئی علمی فوائد حاصل کر کے لوٹ گیا. خاندانی وسائل اور تحقیق سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آپ کے زیر مطالعہ مشکوۃ المصابیح کا جو نسخہ رہتا تھا وہ آپ کے جدّ اعلیٰ سیّد آغا شہید کا تھا جس پر آپ کے والد سید ابوالفتح فیروز الدین اور خود آپ کے حواشی موجود تھے جو آپ کے خاندان کے پاس محفوظ رہا اور اُس کا آخری سراغ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد تک ملتا ہے کہ اُس نے اس نسخہ کو منگوا کر زیارت کی تھی. اس نسخہ کی اہمیت یہ تھی کہ تینوں باپ، بیٹے اور پوتے نے ہر اُس حدیث کے بارے میں لکھ دیا تھا کہ یہ حدیث ہم نے خود حضور علیہ السلام سے سنی ہے.

اس خاندان سادات گیلانیہ کے کئی حضرات کابل، کشمیر اور دیگر ممالک میں قاضی اور کئی نامور ولی ہوئے. ہمارے شیخ سیّدنا قلندر علی سہروردی کی چھٹی پشت کے ایک بزرگ سیّد مفتی خدا بخش قادری ”چک قاضیاں“ سے بہ وجوع سیالکوٹ کے ایک قصبہ کوٹلی لوہاراں ہجرت کر گئے. یہی قصبہ آپ کے خاندان کا مستقل مستقر بنا اور یہیں آپ والا قدر کی ولادت ہوئی. سیّد مفتی خدا بخش قادری سے آگے سادات گیلانیہ کوٹلی شرقی کا شجرہ یوں ہے

☆- سیّد مفتی خدا بخش قادری کے چار بیٹے مولوی سیّد سلطان محمد (مدفون کوٹلی) سیّد غلام مصطفیٰ، سیّد عطا محمد اور سیّد جان محمد تھے.

☆- سیّد مولانا غلام مصطفیٰ شاہ سات بیٹے سیّد مولوی قطب الدین سیالکوٹی، سیّد مولوی رکن الدین بستوی، مولوی سیّد نجم الدین کوٹلوی، جدّ بزرگوار مولوی کرم الٰہی کوٹلوی، مولوی قاضی سیّد عبدالکریم، مولوی سیّد محمد جمیل حمیر پوری، سیّد محمد ابراہیم (لاولد) تھے.

☆- جدّ بزرگوار مولانا سیّد کرم الٰہی کوٹلوی کے دو بیٹے قاضی سیّد محمد رفیع الدین اور قاضی سیّد جمال الدین تھے.

☆- قاضی سیّد جمال الدین کے دو بیٹے حافظ سیّد رسول بخش ہمارے شیخ کے والد گرامی اور دوسرے قاضی سیّد علمدار حسین ہمارے شیخ کے چچا تھے.

☆- حافظ سیّد قاضی رسول بخش: ہمارے شیخ سیّدنا ابوالفیض قلندر علی سہروردی کے والد گرامی تھے. حافظِ قرآن، مفتی اور عالم تھے. انہی کے زیر سایہ آپ نے ابتدائی تعلیم حاصل کی. آپ کا وصال

۱۹۰۳ء کو ہوا اور کوٹلی لوہاراں شرقی ضلع سیالکوٹ میں مدفون ہیں.

تعلیم

ابتدائی تعلیم اپنے والدِ ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کی. چار سال کی عمر میں والدہ اور آٹھ سال کی عمر میں والدِ گرامی کا سایہ سر سے اٹھ گیا. گاؤں کے سکول سے مڈل تک تعلیم سندِ امتیاز سے حاصل کی. پھر ۱۹۱۰ء میں دینی تعلیم کے لیے مدرسہ نعمانیہ اندرون بھاٹی گیٹ، لاہور چلے گئے. ۱۹۱۴ء میں وہاں سے فارغ التحصیل ہوئے اور ۱۹۱۷ء میں امام اہل سنت حضرت احمد رضا خان فاضلِ بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بریلی چلے گئے. وہاں سے علم حدیث وفقہ کے علاوہ فلسفہ منطق، کلام اور تفسیر میں سند امتیاز لے کر واپس وطن مالوف ۱۹۱۹ء میں تشریف لائے. عرصہ قیام بریلی میں آپ کے اساتذہ میں اعلیٰ حضرت کے علاوہ مولانا نعیم الدین مراد آبادی (م ۱۹۴۸ء)، مولانا وصی احمد محدثِ سورتی پیلی بھیتی (م ۱۳۳۴ھ-۱۹۱۶) اور مولانا ہدایت اللہ وغیرہم تھے.

شیخ طریقت

علم شریعت حاصل کرنے کے بعد آپ نے علم طریقت حاصل کرنے کی طرف رجوع فرمایا. اس سلسلے میں آپ نے مختلف مشائخ وقت سے ملاقات کی، جنہوں نے آپ کی توجہ سلسلہ سہروردیہ کی طرف مبذول فرمائی چنانچہ ۱۹۲۲ء میں آپ سلطان العارفین، قطب عالم حضرت میاں غلام محمد سہروردی قدس سرہٗ العزیز (حیات گڑھ، گجرات) کی خدمت میں حاضر ہوئے جو عارفِ کامل ہونے کے علاوہ عالم بے بدل و بے مثیل بھی تھے. آپ نے اُن کی صحبت میں کچھ وقت گزارا اور جناب کے سلسلہ ارادت میں داخل ہو گئے.

دعوت تبلیغ

شیخ کامل کے حکم سے لاہور تشریف لے آئے. یہاں آپ تعلیم و تعلم کے ساتھ ساتھ مجاہدہ و ریاضت میں مشغول رہتے. ۱۹۲۶ء میں آپ نے واعظ و پند کا سلسلہ شروع کیا اور حضرت شیخ عبدالحق محدثِ دہلوی کے شیخ حضرت شاہ ابوالمعالی قادری کے مزار سے متصل جامع مسجد میں خطبہ دینے لگے. جلد ہی لوگوں کا رجوع آپ کی طرف ہو گیا اور ایک جمع کثیر آپ کے خطبات میں شریک ہونے لگا. جس طرح آج سید ہجویر معروف بہ داتا گنج بخش کا آستانہ مرجع خلائق ہے ٹھیک اِسی طرح قیامِ

پاکستان سے قبل اور کچھ عرصہ بعد تک شاہ ابوالمعالیؒ کا روضہ مرجع خلائق تھا۔ اُس وقت کے لاہور شہر کے درمیان ہونے کی وجہ سے لاکھوں لوگ سارا سال یہاں آتے۔ یہ سلسلہ خطابت نو سال ۱۹۳۴ء تک جاری رہا۔ اُسی سال محلّہ اویاں، قلعہ گوجر سنگھ میں مکان تعمیر کروایا اور مستقلاً تبلیغ دین کے لیے ہمہ وقت اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ کچھ عرصہ گھر کے قریب مسجد (چودھریاں) میں بھی خطابت فرمائی مگر علالتِ طبع کی وجہ سے یہ سلسلہ موقف کرنا پڑا۔

اپنے گھر جو دو منزلہ اور دو کمروں پر محیط تھا کی نچلی منزل کے ایک کمرہ میں ایک چوبی تخت پوش پر دن کا وافر حصہ تشریف فرما ہوتے۔ یہاں بیٹھ کر آپ نے لوگوں کے دلوں پر حکمرانی کی۔ ہر طبقہ ہائے فکر کے لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے، اُن میں حکومتی وزرا، علماء، تکوینی فقراء اور درویش، مجاذیب اور طالب علم شامل ہوتے۔ جو بھی آپ کی مجلس میں حاضر ہوتا بغیر پوچھے اُس کا حل دورانِ گفتگو بیان فرما دیتے۔ طبعیت میں کمال درجے کا تحمل اور نکتہ آفرینی تھی۔ فقی مسائل یا تفسیر قرآن کا معاملہ ہوتو بڑی محکم دلیل اور سادہ انداز سے حل پیش فرماتے۔ اندازِ بیان اتنا دلکش اور پُر اثر ہوتا کہ سننے والے کے قلب و ذہن میں اتر جاتا۔

ایک انداز دیکھیے: ایک چکڑالوی (منکرِ حدیث) مولانا تشریف لائے، آپ کچھ تحریر فرما رہے تھے کہ اُس نے آتے ہی سوال کر دیا حضرت جب قرآن ہمیں سب کچھ بتا رہا ہے تو پھر حدیث میں معاملات کو کیوں دیکھا جائے۔ قرآن کے ہوتے ہوئے ہمیں حدیث کی کیا ضرورت ہے؟ آپ نے لکھنا جاری رکھا اور اُسے پوچھا مولانا آپ قرآن کو اچھی طرح سمجھتے ہیں، اُس نے کہا جناب آپ الحمد سے والناس تک جہاں سے چاہیں پوچھیں؟ آپ نے سر اقدس اوپر اٹھایا اور پوچھا مولانا! کیا آپ اچھی طرح سمجھتے ہیں یا وہ اچھی طرح سمجھتا ہے جس پر یہ نازل ہوا۔ مولانا کو ساری بات سمجھ آ گئی۔ اُٹھے، چکرائے اور تیز قدموں سے کمرے سے باہر نکل گئے۔

حق گوئی، دین داری اور نبی کریم ﷺ سے محبت کا بیان مذہبی اور مسالکی مباحث سے اوپر نکل کر پیش فرماتے یہی وجہ ہے کہ علم الدین سالک سے لے کر ابوبکر غزنوی جیسے لوگ بھی آپ کے پاس آتے اور جدید مسائل پر گفتگو کرتے۔ مجھ تک یہ روایت پہنچی ہے کہ کسی خاندانی نزاع میں جب وکیل بنانے کا موقع آیا تو مولانا داؤد غزنوی جو اہل حدیث طبقہ فکر سے تعلق رکھتے تھے نے کہا میرا وکیل مولانا قلندر علی ہوگا۔ غرضیکہ پاکستان بننے سے پہلے اور بعد ازاں آپ کے وصال تک نہ صرف لاہور بلکہ اکناف کے عوام اور سنجیدہ طبقے کا آپ کی طرف بھرپور رجوع تھا۔ کمرہ کے جس کونے میں آپ تخت

پوش پر تشریف فرما ہوتے وہ تشنگان علم وعرفان کا مرکز نگاہ تھا۔آپ کی نگاہ فیض بار سے ہزار ہا مسلمان فیض یاب ہوکر داخلِ گلستانِ سہرورد ہوئے۔سلسلہ سہروردیہ جوکئی عشروں سے پس منظر میں جا چکا تھا پیش منظر پر جلوہ گر ہوا۔آج جو بھی سہروردی آپ کو نظر آئے گا وہ آپ ہی کی محنت شاقہ کا نتیجہ ہوگا۔لاریب! آپ ہی کی ذات اقدس کو مجددِ سلسلہ سہروردیہ کہنا حق اور سچ ہوگا نوراللہ مرقدہٗ

ملّی اور قومی خدمات

مسجد شہید گنج کا معاملہ ہو یا کوئی اور ملّی یا قومی تحریک ہو اُس میں شامل رہے۔نہ صرف تکوینی اعتبار سے بلکہ عملی طور پر بھی آپ نے پاکستان بنانے میں بھرپور محنت کی۔زمانہ طالب علمی سے ہی جب کہ آپ دارالعلوم منظرالاسلام بریلی میں تعلیم حاصل کر رہے تھے فکراً تحریک پاکستان سے وابستہ ہو گئے تھے۔ فاضلِ بریلوی کو جو سیاسی زعما ملنے آتے آپ اُن کی گفتگو بڑے غور سے سنتے اور مستقبل کے حالات کو پیشِ نظر رکھتے۔آپ اکثر اُن زعما کی باتیں،طرزِ عمل اور اعلیٰ حضرت کی سیاسی وعلمی بصیرت کے واقعات بیان فرماتے۔اعلیٰ حضرت فاضلِ بریلوی سیّد اور ذہناً فطین ہونے کی وجہ سے آپ پر بڑا اعتماد رکھتے۔ ڈاک پڑھوا کر جوابی نوٹس لکھواتے جسے بعدازاں منشی عبادت علی فتوی کی صورت میں تحریر فرماتے۔وطن مالوف واپس آکر خاص کر لاہور منتقلی کے بعد تو آپ نے تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لینا شروع کر دیا۔مسلم لیگ کے جلسوں میں تقریر کا موقع ہو یا تنظیمی کام ہو آپ اُس میں حتی المقدور شرکت فرماتے۔جب مولانا عبدالحامد بدایونی نے پنجاب کا دورا کیا تو آپ اُن کے ساتھ مسلم لیگ کے جلسوں میں تقاریر فرماتے،اندازِ تقریر دھیما مگر پُر اثر اور مدلل ہوتا کہ سننے والوں کو عمل پر قائل کر دیتا۔اسی طرح دارالعلوم حزب الاحناف یا مدرسہ نعمانیہ ہو آپ دامے درمے سخنے اِن مراکز کی خدمت میں تادم مرگ پیش پیش رہے۔جمعیت علماءِ پاکستان کے بانی ارکین میں سے تھے بلکہ پہلے سکریٹری نشرواشاعت بھی بنائے گئے۔یہاں اُن تمام خدمات کا ذکر طوالت کا باعث ہوگا،آپ کے مفصل حالات جاننے کے لیے اس مضمون کے آخر میں جن کتابوں کا حوالہ دیا گیا ہے اُن کی طرف رجوع کیا جانا چاہیے۔

سیرت و معمولات

مختصراً اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ آپ سنت نبوی علیہ السلام کے حامی اور بدعت کا قلع قمع کرنے والے تھے جن کی شاہد آپ کی تصنیفات ہیں۔آپ کا شمار اُن شیوخ میں ہوتا ہے جو اکناف عالم کے لیے حجت اللہ بن کر ابھرتے ہیں اور تعلیم وعمل کے ساتھ ساتھ اپنے نور نظر سے بیمار اور کوڑھی روحوں پر

مرہم عیسیٰ رکھ کر شفایاب فرماتے ہیں. آپ علوم وقواعد میں مہارت تامہ رکھنے اور اصولی وفروعی مسائل کے متعلق نظرِ عمیق رکھنے والے تھے. تفسیر قرآن میں ایسے ایسے مطالب عام فہم انداز میں بیان فرماتے کہ سننے والا حیران وششدرر رہ جاتا نہایت متواضع، رحم دل، حد درجہ شفیق اور مہمان نواز تھے. ہمیشہ مریدین کو اپنے برابر بٹھاتے اور دوست کہہ کر تعارف کراتے. بڑے صابر، حلیم اور غصہ پر قابو پانے والے تھے مگر دین کے معاملے میں بڑے سخت اور صاف گو تھے. ذکر واذکار اور عبادت الٰہی میں مشغول رہتے مگر دن بھر احباب سے ملنے کے لیے کچھ وقت گھر کے ایک کمرہ میں تشریف فرما ہوتے، جہاں دن میں کئی بار عقائد، تفسیر، حدیث، فقہ، اصول اور تصوف کے بارے میں اپنے ارشادات سے آنے والوں کے دلوں کو گرماتے. غرضیکہ آپ کی حیات طیبہ صلاح، نیک سیرت اور طہارت باطنہ کی ایسی مکمل تفسیر تھی کہ آپ کی مجلس میں داخل ہونے والا ہر شخص یہ محسوس کرتا کہ وہ کسی دور اوّل کے بزرگ کی مجلس میں بیٹھا ہوا ہے.

علمی خدمات اور تصنیفات وتالیفات

اِس مختصر مضمون میں اُن تمام خدمات کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا، مختصراً یہ کہ سینکڑوں دینی علمی اور اخلاقی مضامین کے علاوہ آپ کی چند تصانیف کا مختصر تعارف یہ ہے.

جمال الٰہی: علم الٰہیات اور محبتِ الٰہی پر ایک جامع اور صوفیانہ تحقیقی کتاب.

جمال رسولؐ: مقامِ رسالت اور حقیقتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ضمن میں ایک عالمانہ اور صوفیانہ تصنیف ہے جس کا مطالعہ حب رسول رکھنے والے ہر مسلمان کے سینے کو ذوق عشق سے فگار کر دیتا ہے. جناب خود فرماتے ہیں کہ یہ کتاب میں نے ایسے شخص کے لیے نہیں لکھی جو سرور کائنات مختارِ شش جہات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا منکر، معجزات میں طعنہ زن، معین آثار ونشانات سے منحرف، وقیع خصائل وجمیع کمالات سے روگرداں اور خصائص کبریٰ وفضائل عظمیٰ میں شک وشبہ کرنے والا ہو، اِس میں جو کچھ لکھا گیا ہے اہل محبت کے لیے ہے جو حضور کی ہر دعوت پر لبیک کہنے والے اور نبوت ورسالت کی تصدیق کرنے والے ہیں تا کہ اُن کی محبت میں تاکید، ایمان میں مضبوطی اور اعمال میں زیادتی ہو.

الفقر وفخری: یہ علم تصوف وعرفان کے ضمن میں صوفیاءِ متقدمین اور متاخرین کے اصول وضوابط کی تشریح کی روشنی میں سالکین کی رہنمائی کے لیے ایک فاضلانہ کتاب ہے. اس کتاب

میں اس علم شریف کے ہر پہلو پر سیر حاصل بحث اور تشریح کی گئی ہے۔

سیاح لامکاں: جمہور اہل سنت کے عقیدہ کہ نبی کریم ﷺ کو معراج شریف جسمانی طور پر حاصل ہوا، کے مطلق ایک فاضلانہ اور مدلل تصنیف ہے۔

موعظۃ للمتقین: عقائد اہل سنت کے مسائل کی تشریح پر بہترین کتاب ہے۔

صحیفہ غوثیہ: یہ تصنیف حضور سیدنا غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کے مشہور قصیدہ غوثیہ کی حضوری میں لکھی گئی شرح ہے جو اپنے اندر کمال درجے کی قبولیت رکھتی ہے۔

رسائل: حلیۃ النبی ﷺ، دعوت الحنفیہ، پردہ نسواں، لباس التقویٰ، رسالہ علم غیب، تعارف سہروردیہ، تذکرہ سہروردیہ، انوار سہروردیہ، میلاد الرسول ﷺ، شعبان المعظم، کتاب الصوم، صوتِ ہادی ﷺ، رمضان المبارک، دختر ملّت اور زکوٰۃ کا اسلامی نظام۔

کچھ عرصہ آپ رسالہ ''فقیر'' کے مدیر بھی رہے۔

رحلت

آنجناب کی وفات حسرت آیات کے دن قریب تھے کہ آپ کو بخار ہوا اور اسی حالت میں آپ ۶۳ برس کی عمر میں بروز بدھ (آخری چہار شنبہ) ۲۴ صفر المظفر ۱۳۷۸ھ بمطابق ۹ نومبر ۱۹۵۸ء کو واصل حق ہوئے۔

عرس مبارک اور جلسہ عید میلاد النبی ﷺ

جناب اپنی حیات طیبہ میں بڑی باقائیدگی سے عید میلاد النبی ﷺ کے سلسلے میں تقریبات منعقد فرماتے، جس میں تین دن ۹، ۱۰، ۱۱ ربیع الاول نعت خوانی، وعظ اور کھانا کھلایا جاتا۔ ان تقریبات میں آپ کا طرز عمل دیکھئے کہ ان تقریبات کے ضمن میں آپ نے کبھی بھی دال نہیں پکوائی، فرماتے جس کے صدقے ہمیں ایمان کی دولت نصیب ہوئی اُس کی ولادت کے دن ہوں اور ہم اچھا کھانا نہ پکوائیں یہ کیسے ممکن ہے۔ پاکستان بننے سے پہلے اور بعد ازاں ۱۹۵۷ء تک یہ شہر لاہور کی مرکزی تقریبات کا حصہ تھا۔ دور دور سے علماء، نعت خواں اور مریدین اس میں شریک ہوتے، ہزار ہا کا مجمع ہوتا، آپ کے شیخِ کریم قطب عالم حضرت میاں غلام محمد سہروردی رحمۃ اللہ علیہ خود جلوہ افروز ہوتے۔ ۱۱ دسمبر ۱۹۵۱ء بمطابق ۱۲ ربیع الاوّل ۱۳۷۱ھ کو جب آپ کے شیخ کا وصال ہوا تو آپ جلسہ عید میلاد النبی ﷺ سے اگلے روز شیخ

طریقت کے عرس کے لیے حیات گڑھ کھیوا (گجرات) تشریف لے جاتے جہاں جناب مدفون تھے.
اس تسلسل کو آپ کے مریدین باصفاء نے چند سال تو برقرار رکھا، مگر ۱۹۵۸ء میں ۲۴ صفر کو جب خود آپ
کا وصال ہو گیا تو دور دراز سے مریدین کے لیے چند روز کے وقفہ سے دوبار لاہور اور گجرات پہنچنا دشوار
ہو گیا. آپ کے خلفاء اور عقیدت مند سر جوڑ کر بیٹھے اور بہ اتفاق یہ فیصلہ کیا کہ جلسہ عید میلاد النبی ﷺ
چونکہ آپ علیہ الرحمہ کا جاری کردہ ہے اس تقریب کو اُسی طرح جاری رکھا جائے، مگر جناب کا اور آپ
کے شیخ کریم حضرت خواجہ میاں غلام محمد سہروردی کا عرس لاہور میں ہی ۱۲ ربیع الاوّل کو منا لیا جائے تا
کہ تمام مریدین اور عقیدت مند ساری تقریبات کے فیوض حاصل کر سکیں. ان روحانی محافل کا یہ سلسلہ
آج تک اسی طرح چند تبدیلیوں کے ساتھ آپ کے مزار اقدس واقع ہنجر وال، ملتان روڈ جاری و ساری
ہے.

آپ اور آپ کے شیخ کریم کے تفصیلی حالات جاننے کے لیے مندرجہ ذیل کتب کی طرف رجوع
فرمائیں.

۱- تذکرہ سیّد ابوالفیض قلندر علی سہروردی: احسان الحق خاور سہروردی، ۱۹۸۵ء
۲- نسب نامہ سادات کرام گیلانی کوٹلوی: دین محمدی پریس، لاہور، ۱۹۲۵ء، مملوکہ سید عابد رسول سہروردی
۴- ''تاریخ پنجاب'' از بوٹے شاہ (خطی) پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور
۵- یادگارِ سہروردیہ (تذکرہ مشائخ و وابستگانِ سلسلہ سہروردیہ): احسان الحق خاور سہروردی، ۱۹۹۸ء
۶- اجتماع ضدین فی شانِ قلندر: محمد یوسف سہروردی، دوسرا ایڈیشن، اورینٹل پبلی کیشنز، ۳۵ رائل پارک، لاہور
۷- جادۂ جویائے حق (احوال، مقامات و ملفوظات حضرت صوفی محمد نذیر غوری سہروردی)، سید اویس علی سہروردی
دوسرا ایڈیشن، اورینٹل پبلی کیشنز، ۳۵ رائل پارک، لاہور
۸- تذکرہ علمائے اہل سنت: سفیر اختر راہی، مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار، لاہور
۹- تذکرہ شیخ والمخدوم (احوال و مقامات حضرت میاں غلام محمد سہروردی و حضرت سید ابوالفیض قلندر علی سہروردی علیہما الرحمہ
سید اویس علی سہروردی، ادارۂ معارف سہروردیہ، ۳۵ رائل پارک، لاہور

۱۰- کشف الصدور فی معدن الملفوظ (ملفوظات حضرت میاں غلام محمد سہروردی و حضرت سید ابوالفیض قلندر علی سہروردی)

بیان کردہ: خلفاء و مریدین حضرت میاں غلام محمد سہروردی و حضرت سید ابوالفیض قلندر علی سہروردی

مرتبہ: سید اویس علی سہروردی، ادارہ معارف سہروردیہ، ۳۵ رائل پارک، لاہور

۱۱- تذکرہ علماءِ اہل سنت والجماعت: پیرزادہ اقبال احمد فاروقی، مکتبہ نبویہ، گنج بخش روڈ، لاہور

۱۲- اولیائے سہرورد: محمد دین کلیم، لاہور

۱۳- مدینۃ الاولیاء: محمد دین کلیم، مکتبہ نبویہ، گنج بخش روڈ، لاہور

۱۴- شاہ جہان نامہ:

۱۵- شجرۃ الرسول: صاحب زادہ بک ڈپو، بٹالہ

۱۶- یادِ رفتگاں: پیر سید ابوالحسن علی قاری سید آغا بدیع الدین، سید سخاوت حسین گیلانی، نوائے وقت ۳ جنوری ۲۰۰۳

مسلمانانِ لاہور کا ایک

عظیم الشان

جلسہ

مورخہ ۱۷ مارچ

[illegible]

حضرت مولینا عبدالحامد صاحب بدایونی کے علاوہ مندرجہ ذیل حضرات اپنے خیالات کا اظہار کرینگے

(۱) ملک برکت علی صاحب ایڈووکیٹ ایم ایل اے

(۲) مولانا محمد بخش صاحب مسلم ایم اے

(۳) میاں فیروز الدین احمد

(۴) محمد نذیر مقبل صاحب ایم اے

(۵) شیخ نذیر احمد محمود

(۶) چوہدری کلیم الدین صاحب

(۷) مولینا ابوالفیض قلندر علی سہروردی

الداعی

عبدالکبیر قریشی پروپیگنڈا سیکرٹری مسلم لیگ لاہور

عکس تاریخی پوسٹر مطبوعہ لاہور مارچ ۱۹۴۰ء

مقبوضہ کشمیر
ظفروال
شکرگڑھ
پاکستان
بھارت
پٹھان کوٹ
گورداسپور
کلانور
نارووال
اکبرپور
چک قانیاں
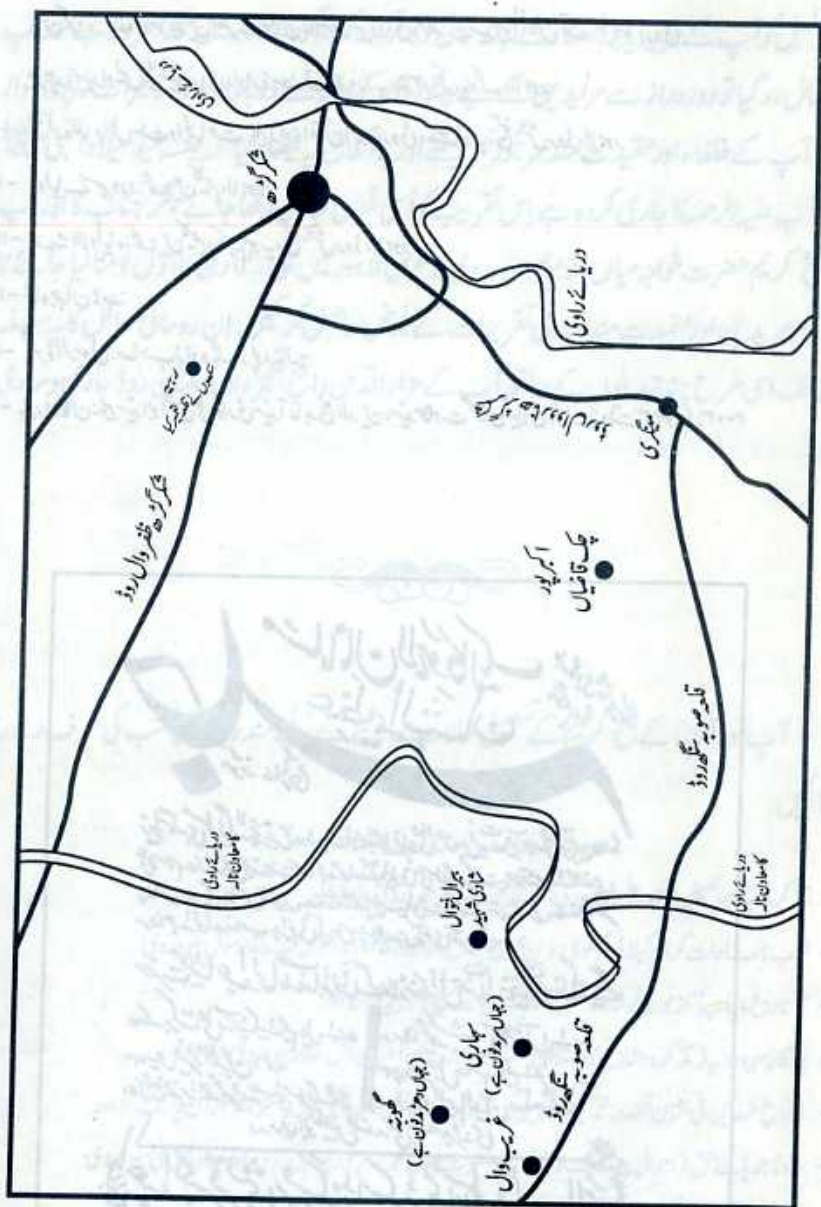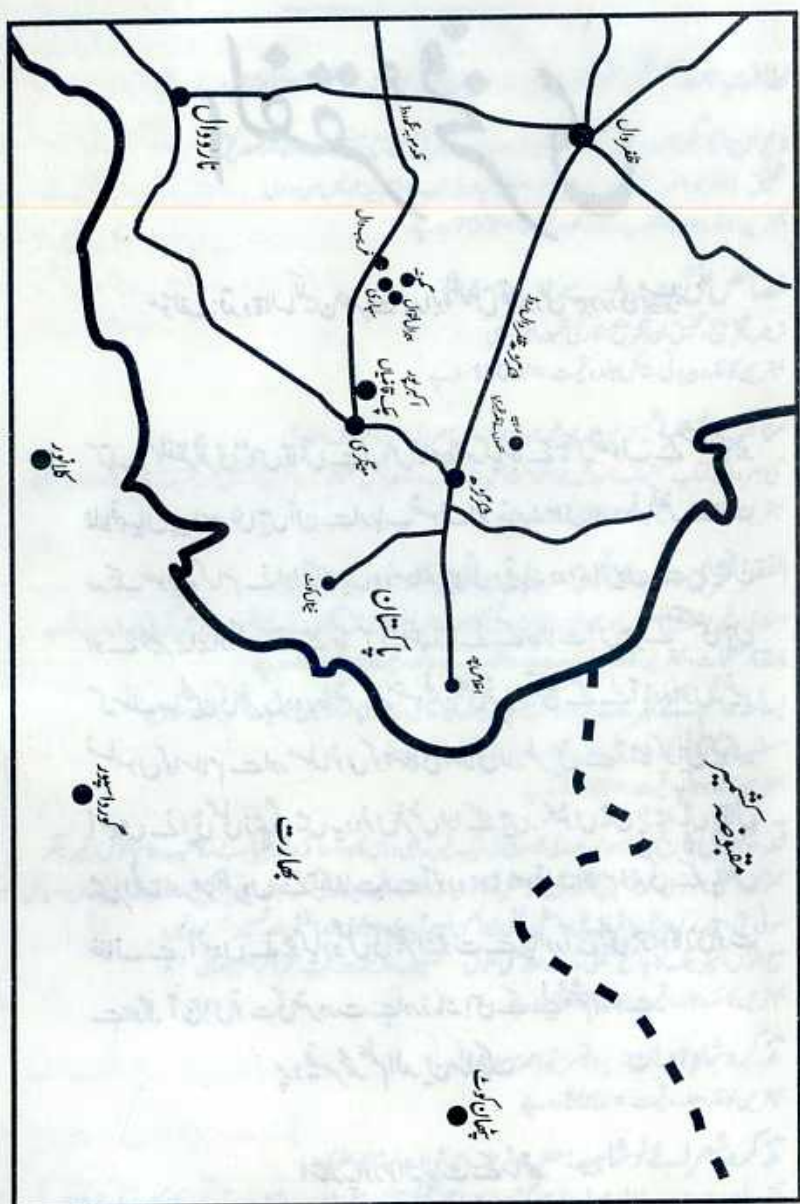
الفقر فخری

مؤلف: قدوۃ السالکین حضرت سید ابوالفیض قلندر علی سہروردی رحمۃ اللہ علیہ

کتاب "الفقر فخری" اِس قابل ہے کہ اس کا مطالعہ کیا جائے تاکہ تصوف کے متعلق جو غلط فہمیاں پیدا ہو رہی ہیں اُن سے اربابِ تصوف اثر پذیر نہ ہوں اور وہ فرائض جو بہت حد تک صوفیاء کرام نے ادا کئے ہیں وہ معاندین کی رقیبانہ در اندازیوں سے پریشان ہوئے بغیر برابر ادا کرتے چلے جائیں کیونکہ زمانے کے حالات اِس امر کے مقتضی ہیں کہ سلف صالحین کی طرح دورِ حاضر کے متصوفین بھی فریضہ تبلیغ کے لیے آمادہ ہوں. غیر مسلموں کو اسلام سے اور مسلمانوں کو اسلامی اخلاق اور طریق سے آشنا کریں کیونکہ اُنہوں نے اپنی عملی زندگی میں یہ دونوں فرض ادا کئے ہیں. بحثوں میں پڑنا، قیل وقال میں الجھنا اور مناظروں کے تکلفات سے آلودہ ہونا، صوفیانہ نظام زندگی کے بالکل خلاف ہے. اُنہوں نے جو کیا وہ عمل کی معجزانہ قوت سے کیا اور آج بھی جو ہوگا اِسی قوت سے ہوگا. آج اِسی قوت کی ضرورت ہے اور زمانہ اِسی کے لیے چشم براہ ہے.

پروفیسر محمد علم الدین سالک

اشاریہ اور حوالہ جات کے ساتھ

بہترین کریم کلر سنچری پیپر، 20x26/16 سائز، مضبوط جلد مع ڈسٹ کور

قیمت:=/800

فہرست مطبوعات

1- **لطافتِ جسدِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم** : تصنیف: قاری ظہور احمد فیضی   قیمت:=/600 روپے

2- **دیوانِ ابوبکر صدیقؓ** : کا اولین اردو ترجمہ معہ عربی متن مع تذکرہ سیدنا ابوبکر صدیقؓ
تحقیق: ڈاکٹر عمر الطباع، ترجمہ: استاذ ظفر اقبال کلیار، ترتیب و اشاریہ: اویس سہروردی
بہترین کاغذ و جلد، اشاریہ کے ساتھ، قیمت:=/700 روپے

3- **خصائص علیؓ**: احمد بن شعیب معروف بہ امام نسائی
ترجمہ، تخریج، تحقیق اور تشریح: قاری ظہور احمد فیضی
بہترین کاغذ و بیرونی سٹائل جلد، قیمت:=/1500 روپے

4- **مناقب الزہراؓ**: زین الدین محمد بن عبد الرؤف معروف بہ امام روف مناوی
کی معروف کتاب ''اتحاف السائل بما الفاطمہ من المناقب والفضائل'' کا ترجمہ، تخریج، تحقیق اور تشریح: قاری ظہور احمد فیضی
بہترین کاغذ و جلد قیمت:=/1200 روپے

5- **الفقر فخری** : قدوۃ السالکین حضرت سید ابوالفیض قلندر علی سہروردی رحمۃ اللہ علیہ
اسلامی و غیر اسلامی تصوف اور صوفیانہ نظام زندگی کو عصر حاضر کی روشنی میں سمجھنے کے لیے تصوف پر لکھی گئی ایک نایاب کتاب
424 صفحات، بہترین کاغذ و جلد ڈسٹ کور، اشاریہ کے ساتھ، قیمت:=/800 روپے

6- **بساطِ عالم کے مہرے**: (وسائل دنیا پر قبضہ کی عالمی یہودی سازشیں) ایک چشم کشا دستاویز
مصنف: ولیم گائی کار، امریکی نیول کمانڈر، ترجمہ: رضی الدین سید
بہترین کاغذ و جلد، قیمت:=/480 روپے

7- **قدیم دہلی کالج**: انیسویں صدی عیسوی کی ایک غیر مذہبی درس گاہ، اساتذہ اور طلباء کے مکاتیب بنام الوئس اشپرینگر
مملوک العلی نانوتوی، محمد احسن نانوتوی، محمد مظہر نانوتوی، ذوالفقار علی دیوبندی، کریم الدین پانی پتی، سدید الدین خاں، سید علی اکبر سونی پتی، سید برکت علی، اشرف علی واسطی، منشی ابوالحسن فرید آبادی، مولوی خدا بخش اور محسین آزاد و غیرہ
مع الوئس اشپرینگر کا جامع تحقیقی تذکرہ اور عکسی نقول   تصنیف، ترجمہ و ترتیب: محمد اکرام چغتائی
بہترین کاغذ و جلد، قیمت:=/1400 روپے

8- **تذکرہ شاہِ ہمدان**: پروفیسر سید احمد سعید ہمدانی
بہترین کاغذ و جلد، قیمت:=/500 روپے

9- **تذکرہ شعرائے نوشاہیہ**: حضرت شریف احمد شرافت نوشاہی علوی
تقریباً ۵۷۵- اردو، پنجابی، عربی، فارسی گو شعراء کا جامع تحقیقی تذکرہ مع اشاریہ۔ ترتیب و تدوین: ڈاکٹر عارف نوشاہی
56+1080=1136 صفحات، بہترین کاغذ و جلد مع ڈسٹ کور، اشاریہ کے ساتھ، قیمت:=/1200 روپے

10- **نقد عمر** : (دوسرا ایڈیشن) پروفیسر ڈاکٹر عارف نوشاہی ماہر کتابیات و مخطوطات شناس کے مقالات کا مجموعہ
برعظیم پاک و ہند کے فارسی ادب سے متعلق ایک جامع تحقیقی کتاب
650 صفحات، بہترین کاغذ و جلد، اشاریہ کے ساتھ، قیمت:=/800 روپے

11- **فارسی گفتاری:** فارسی زبان سیکھنے کے لیے سائنٹفک طریقے سے لکھی گئی ایک بہترین کتاب
مؤلفین: ڈاکٹر محمد سلیم مظہر، ڈاکٹر نجم الرشید، ڈاکٹر محمد صابر 324 صفحات، بہترین کاغذ و جلد، قیمت:=/350 روپے

12- **مصدر نامہ ولغت نامہ فارسی:** فارسی زبان سیکھنے کے لیے جتنے زیادہ مصادر یاد ہوں گے اتنی ہی جلدی فارسی زبان سیکھی جا سکے گی۔ طلباء اور عام فارسی سیکھنے والوں کی اسی ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے تقریباً 8500 ہزار مصادر مع اردو ترجمہ کا مجموعہ
مؤلفین: ڈاکٹر محمد سلیم مظہر، ڈاکٹر نجم الرشید، ڈاکٹر محمد صابر 324 صفحات، بہترین کاغذ و جلد، قیمت:=/250 روپے

13- **اسلام میں انتخاب زوج:** ملک عبدالرؤف سہروردی قیمت:=/250 روپے

14- **مطالعۂ آزاد (مجموعۂ مقالات):** محمد اکرام چغتائی قیمت:=/500 روپے

15- **تاریخ رزمیات ایران (شاہنامہ فردوسی):** مترجم: پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال (اورینٹل کالج) قیمت:=/500

16- **تذکرہ نوشاہیہ:** حضرت حاجی محمد نوشہ گنج بخش اور اُن کے مشایخ، اولاد اور خلفا کا مستند تذکرہ
تالیف: حافظ محمد حیات ربانی نوشاہی، تصحیح و تدوین: ڈاکٹر عارف نوشاہی قیمت:=/1800 روپے

زیر طبع مطبوعات

1- **موطأ المتقین:** حضرت سید ابو الفیض قلندر علی سہروردی رحمۃ اللہ علیہ، تخریج، تحقیق اور تشریح: سید اویس سہروردی

2- **رشف النصائح الایمانیہ وکشف الفضائح الیونانیہ:** شیخ الشیوخ شہاب الدین عمر سہروردی رحمۃ اللہ علیہ
عوارف المعارف کے بعد آپ کی سب سے مقبول اور نایاب کتاب کا اولین اردو ترجمہ
اردو ترجمہ: مولانا غلام حسن سہروردی تخریج تعلیقات و اشاریہ: سید اویس علی سہروردی

3- **السکینہ بہ اخبار المدینہ** (تاریخ مدینہ با تصویر): حافظ ابن نجار، ترجمہ تحقیق و تدوین: اویس سہروردی

4- **وثائق السیاسیہ:** ڈاکٹر حمید اللہ، ترجمہ تخریج، تحقیق اور تشریح: اویس سہروردی

5- **تذکرہ شیخ ابوبکر شبلی:** عبدالحلیم شرر

6- **تاریخ اُچ:** زبیر شفیع غوری

7- **رسائل قشیریہ:** ترجمہ پیر ڈاکٹر محمد حسن رحمۃ اللہ علیہ، تحقیق و تدوین: ملک عبدالرؤف سہروردی

8- **کتاب لا ریب فیہ:** (علوم قرآن پر ایک شاہکار کتاب) مصنف: مولانا محمد منظور آفاقی

9- **لطائف اشرفیہ:** حضرت نظام الدین یمنی اردو ترجمہ: مولانا محمود عبدالستار تحقیق و تدوین: اویس سہروردی

10- **سیرت بلال:** ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی

11- **اہل کتاب صحابہ وتابعین:** مولوی حافظ مجیب اللہ ندوی
(ترانوے ۹۳ ایسے صحابہ، صحابیات، تابعین رحمہم اللہ وانخ جو پہلے مذہباً یہودی یا نصرانی تھے)

12- **تذکرہ شعرائے عرب:** (ایامِ جاہلیت سے تیرویں صدی تک کے ۳۹۷ شعراء کا تذکرہ) مولوی کریم الدین

رسائل شاہ ہمدان: امیر کبیر شاہ ہمدان کے ۲۴ رسائل کا اردو ترجمہ: غلام حسن حسنو

رسائل یحیٰ منیری: تحقیق و تدوین: اویس سہروردی

جمالِ رسول ﷺ
مؤلف: حضرت سید ابوالفیض قلندر علی سہروردی رحمۃ اللہ علیہ
یہ کتاب ایسے شخص کے لیے نہیں لکھی گئی جو سرورِ کائنات مختارِ شش جہات محمد رسول ﷺ
کی نبوت کا منکر، معجزات میں طعنہ زن، معین آثار ونشانات سے منحرف، وقیع خصائل وجمیع کمالات
سے روگرداں اور خصائص کبریٰ وفضائل عظمیٰ میں شک وشبہ کرنے والا ہو
اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے اہل محبت کے لئے ہے
جو حضور کی ہر دعوت پر لبیک کہنے والے اور نبوت ورسالت کی تصدیق کرنے والے ہیں
تا کہ اُن کی محبت میں تاکید، ایمان میں مضبوطی اور اعمال میں زیادتی ہو
اورینٹل پبلی کیشنز ®
35- رائل پارک، لاہور 54000
فون: 0333-4262450 / 042-36363009